انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

مستقل سلسلے

جنوری 2017
جلد 31 شمارہ 5
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 37، اردو بازار کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری کا شعاع لیے حاضر ہیں۔

ہزاروں لاکھوں سال پرانی یہ دنیا، ہر لمحہ ایک نقشِ تازہ بناتی زندگی اپنے دامن میں لاتعداد خوشیاں اور دل کو اداسی سے بھر دینے والے واقعات سمیٹے ایک سال مزید پرانی ہونے کو ہے۔ وقت کے اس سفر میں کتنے ہی محبت کرنے والے ہم سفر بنے اور کتنی ہی محبتیں وقت کی دھول میں گم ہو گئیں۔ کتنے ہی نایاب لوگ ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ گئے۔ فرقتیں، اداسیاں، محرومیاں دے کر وقت آگے بڑھ گیا۔ یہی زندگی ہے۔ یہی دنیا۔

اس کائنات میں جو لاکھوں سال پرانی ہے۔ زندگی کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ بس اتنی کہ جو تھا نہیں ہے۔ جو ہے نہ ہوگا۔ اگر ہمارا آج گزشتہ کل سے بہتر ہے تو کامیاب ورنہ سب کچھ بے کار۔ خسارہ، بڑا خسارہ۔

سال گزشتہ میں بہت کچھ بدلا، بہت کچھ بدل رہا ہے۔ نہیں بدلی تو انسان کی ازلی سرشت۔ اس کی سفاکی۔ وحشت و بربریت، ہوس، اقتدار، بے رحمی، تعصب اور نفرتیں۔ طاقت کا وحشیانہ کھیل آج بھی جاری ہے۔ خطۂ ارض پر انسانی خون بے دریغ بہہ رہا ہے۔ شام ہو یا فلسطین یا کشمیر آج بھی کمزور، مظلوم لوگ جینے کے حق سے محروم ہیں۔ ہنستے کھیلتے پھول سے معصوم بچے خاک و خون میں نہا رہے ہیں۔

وطن عزیز کے حوالے سے دیکھیں تو سال گزشتہ کچھ حوالوں سے خوش آئند رہا۔ خصوصاً امن و امان کی صورتِ حال میں بہتری آئی۔ دہائی عشروں پر محیط قتل و غارت گری، بھتہ خوری میں نمایاں کمی ہوئی۔

بہت سی خوش کن امیدوں اور خوش گمانیوں کے ساتھ نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

قارئین کو نیا سال مبارک۔

ہماری دعا ہے نیا سال آپ کے آنگن میں پُرنور صبحیں اور رنگوں بھری شامیں لے کر آئے۔ دھرتی پُرامن ہو۔ ظالم اور ظلم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- ایمل رضا کا مکمل ناول۔ میں، محبت اور تو،
- مصباح علی کا مکمل ناول۔ تکی جیتی ہاں،
- نایاب جیلانی اور عزہ خالد کے ناولٹ،
- ثوبیہ جبیں گل، ماورا خان، فوزیہ اشرف، ربیعہ طارق اور شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے،
- صائمہ اکرم چودھری، عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- نازیہ علی اور عدنان علی کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- کیسے جاناں میں کون۔ قارئین سے سروے،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
- پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں!

نئے سال کا پہلا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

حرارت نبضِ ہستی کی، فقط تیری رضا دیکھے
تماشا ہر قدم، بے تاب چشمِ آشنا دیکھے

غمِ جاں ڈوبنے کو ہو، اگر بے درد موجوں میں
تیرا ہی آسرا چاہے، تجھے مشکل کُشا دیکھے

بکھر سکتا نہیں اس ملتِ بیضا کا شیرازہ
کریمی شان تیری، آپ سارا ماجرا دیکھے

حقیقت رنگ و بو کی پوچھ، چشمِ عشق پیشہ سے
جہاں کے ذرّے ذرّے اُسے جلوہ نما دیکھے

مقامِ بندگی یہ ہے، مٹا کر ما سوا یکسر
نظر احساس کی، اللہ کو حاجت روا دیکھے

گلوں کی نازکی، دشت و جبل کی داستانوں میں
جمالی شان کے جلوے زمانہ جا بجا دیکھے

جبینِ شوق میں اختر، سجا اس ذات کا سجدہ
خدا کو دیکھتا ہو تو، ترا جُھکنا خدا دیکھے

اختر حسین شیخ

نعت رسول مقبول ﷺ

کس کا جمال ناز ہے جلوہ نما یہ سُو بہ سُو
گوشہ بگوشہ، دربدر، قریہ بہ قریہ کُو بہ کُو

جلوۂ عارضِ نبی، رشکِ جمالِ یوسفی
سینہ بہ سینہ، سر بہ سر، چہرہ بہ چہرہ، ہُو بہ ہُو

بزمِ جہاں میں آج بھی یاد ہے ہر طرف تری
قصّہ بہ قصّہ، لب بہ لب، خطبہ بہ خطبہ، رُو بہ رُو

کاش ہو ان کا سامنا عینِ حریمِ ناز میں
چہرہ بہ چہرہ، رُخ بہ رُخ، دیدہ بہ دیدہ، دُو بہ دُو

عالمِ شوق میں رئیس کس کی مجھے تلاش ہے
خطہ بہ خطہ، رہ بہ رہ، جادہ بہ جادہ، سُو بہ سُو

رئیس امروہوی

ادارہ

تقویٰ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔" (آل عمران 102)

اور فرمایا: "اللہ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھو۔" (التغابن 16)

یہ دوسری آیت پہلی آیت کے مفہوم و مراد کو واضح کر رہی ہے۔(یعنی کما حقہ ڈرنے کا مطلب مقدور بھر ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی اور درست بات کہو۔" (الاحزاب 70)

نیز فرمایا: "جو اللہ سے ڈرتا ہے' اللہ اس کے لیے نکلنے کا راستہ آسان کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔" (طلاق...2'3)

اور فرمایا: "اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمہیں (حق و باطل کے درمیان) فرق کرنے والی (بصیرت) عطا فرما دے گا اور تم سے تمہاری برائیاں دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔" (الانفال:29)

فائدہ آیات : تقویٰ وقایہ سے ماخوذ ہے۔ وقایہ' ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جس سے سر کو ڈھانپا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ احتیاط اور رویہ وقایہ ہے' جس کے ذریعے سے ان چیزوں سے بچنا مقصود ہو' جو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ تقاۃ بھی اسی کے ہم معنی ہے۔

اس اعتبار سے اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے سے اللہ کے عذاب سے بچنے کی سعی کرے اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو بجا لائے اور اس کی منع کردہ چیزوں سے باز رہے۔ مذکورہ آیات میں قول اور فعل میں اللہ کے تقویٰ کے التزام کی تاکید ہے' نیز اسے شدائد میں نجات کا اور رزق حلال کے حصول کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تقویٰ سے دل اور دماغ میں ایسی نورانیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے حق اور باطل کا پہچاننا اور ان کے درمیان تمیز کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ سے ڈرنے والا

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ معزز کون ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو ان میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "اس کے بارے میں ہم آپ سے نہیں پوچھ رہے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پھر یوسف علیہ السلام ہیں جو خود بھی اللہ کے پیغمبر ہیں' نیز باپ بھی پیغمبر' دادا بھی پیغمبر اور پردادا بھی پیغمبر اور اللہ کے خلیل ہیں۔"

انہوں نے کہا: "ہم اس کے متعلق (بھی) نہیں پوچھ رہے ہیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ "تو کیا پھر تم مجھ سے عرب کے خاندانوں کے متعلق پوچھ رہے ہو؟ (تو سنو!) ان کے جو افراد جاہلیت میں بہتر تھے' وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں' (یعنی اسلام نے

کسی کی دنیوی جاہ و مرتبت میں کمی نہیں کی ہے) بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔" (بخاری و مسلم)

فوائدو مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو خاندان 'اسلام سے قبل دنیوی شرف و فضل اور اپنی امتیازی خصوصیات 'مثلاً" سخاوت 'شجاعت 'صداقت وغیرہ میں ممتاز تھے 'قبول اسلام کے بعد ان کے اعزاز و اکرام کو نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ اسے دین کے علم اور عمل کے ساتھ مشروط کردیا گیا اور ان کی صلاحیتوں اور خودداری وغیرہ اوصاف حمیدہ کا رخ بدل دیا گیا 'پہلے یہ صلاحیتیں کفر کے لیے استعمال ہوتی تھیں 'اب اسلام کے لیے وقف کردی گئیں۔

2۔ اسلام نے اگرچہ حسب و نسب اور خاندانی شرف کا لحاظ رکھا ہے لیکن اسے معیار عزت قرار نہیں دیا۔ عزت کا معیار اللہ کے تقویٰ کو قرار دیا کہ جو شخص جس قدر زیادہ متقی ہے وہ زیادہ باعزت ہے۔ ہاں اگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا خاندانی شرف بھی ہے تو یہ ایک زائد چیز ہے۔ جس کی قدر کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو کبار اور معزز صحابہ کی موجودگی میں کمانڈر مقرر کیا۔

دنیا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بے شک دنیا شیریں اور شاداب (سرسبز) ہے 'بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس میں تمہیں جانشین بنانے والا ہے 'چنانچہ وہ دیکھے گا کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔ تم (اگر کامیاب ہونا چاہتے ہو تو) دنیا (کے دھوکے) سے بچو اور عورتوں (کے فتنے میں مبتلا ہونے) سے بچو کیونکہ بنی اسرائیل کی پہلی آزمائش عورتوں ہی کے بارے میں تھی۔" (مسلم)

فوائدو مسائل :

1۔ جس طرح تر و تازہ پھل 'ذائقے میں میٹھا اور دیکھنے میں خوش رنگ اور دلوں کو لبھانے والا ہوتا ہے 'یہی حال دنیا کے مال و اسباب کا ہے 'انسان کو یہ بہت مرغوب ہیں اور دل ان کی طرف کھنچتے ہیں اور دنیا کا لذیذ ترین اور خطرناک ترین پھل عورت ہے۔ جو شخص احکام شریعت سے بے پروا ہو کر دنیا کا طلب گار اور عورت کی طرف مائل ہوگا 'سمجھ لو کہ اس کا دین و ایمان خطرے میں ہے اور جو شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان سے استفادہ کرے گا 'وہ ان کی حشر سامانیوں اور غارت گری سے محفوظ رہے گا۔

2۔ اس آزمائش میں کامیابی کا راز تقویٰ ہے کیونکہ حلال و حرام کی تمیز کا دارومدار تقویٰ پر ہے۔ اگر دل تقویٰ اور اللہ کی عظمت و وقار سے خالی ہے تو لامحالہ وہاں پر مال و دولت گھر کر جائے گی۔

3۔ عورت ہر صورت میں انسان کے لیے آزمائش ہے۔ ماں ہے تو اس کے حقوق اور فرماں برداری میں کوتاہی ہو جائے تو انسان کی نجات مشکوک ہو جاتی ہے۔ بیٹی اور بہن ہے تو اس کی پرورش بہت بڑی آزمائش ہے اور اگر بیوی ہے 'نیک ہے تو خیر المتاع ہے اور اگر بد اخلاق ہے تو انسان کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ اور غیر محرم عورتوں کا فتنہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان تمام صورتوں میں تقویٰ ہی انسان کا ممدو معاون ہو سکتا ہے۔

دعا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللھم! انی اسالک الھدیٰ والتقیٰ والعفاف والغنیٰ۔

"اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت 'پرہیزگاری (تقویٰ) پاک دامنی اور (لوگوں سے) بے نیازی کا سوال کرتا ہوں۔" (مسلم)

فائدہ :

1۔ ہدایت کا مطلب ہے زندگی کے ہر موڑ پر صحیح رہنمائی اور دین ہدیٰ پر استقامت ' تقویٰ اور اللہ کا ڈر جو نیکی کا سب سے اہم سبب اور گناہوں سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ عفاف (پاک دامنی) کا مطلب ہے جو چیزیں حلال نہیں ہیں ' ان سے دامن بچا کر رکھنا۔ غنیٰ ' فقر کی ضد ہے۔ مراد غنائے نفس ہے ' یعنی لوگوں سے اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے ' ان سے بے نیاز رہنا۔ اس لحاظ سے یہ بڑی جامع اور نہایت مفید دعا ہے۔

حضرت ابو طریف عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

"جو شخص کسی بات پر قسم کھالے ' پھر اس سے زیادہ پرہیز گاری والی بات دیکھے تو اس کو چاہیے کہ وہ پرہیز گاری والا عمل اختیار کرے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں تقویٰ کے التزام کی تاکید ہے حتیٰ کہ اگر کسی نے کسی معصیت پر قسم بھی کھالی ہے تو قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرے اور معصیت کا یا خلاف تقویٰ کام کا ارتکاب نہ کرے۔

2۔ حرام کام کے ارتکاب کرنے کی قسم توڑنا واجب اور ضروری ہے۔ اس قسم کے مطابق عمل ناجائز اور حرام ہے۔ اور اگر قسم کسی ایسے کام کے نہ کرنے کے بارے میں اٹھائی ہے کہ اس کا کرنا اور نہ کرنا دونوں امور جائز ہوں اور پھر بعد میں اس کے کرنے میں بہتری محسوس ہو اور وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہو تو قسم کا کفارہ ادا کر کے وہ کام کرنا افضل ہے۔

اللہ کا ڈر

حضرت ابو امامہ صدی بن عجلان باہلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجتہ الوداع کے موقع پر خطبہ ارشاد فرمارہے تھے ' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ سے ڈرو ' اپنی پانچوں (فرض) نمازیں ادا کرو ' اپنے (رمضان کے) مہینے کے روزے رکھو ' اپنے مالوں کی زکوۃ ادا کرو اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرو تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔"

(امام ترمذی نے اسے کتاب الصلاۃ کے آخر میں روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ وداع ' تودیع (الوداع کہنا) سے ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج تھا۔ اس میں آپ نے لوگوں کو الوداع کیا تھا ' اس لیے اسے حجتہ الوداع کہا جاتا ہے۔ حکام وقت کی اطاعت کی یقیناً تاکید ہے لیکن وہ مشروط ہے ' یعنی جب تک وہ اللہ کی معصیت کا حکم نہ دیں ' اسی طرح ان سے کفر صریح کا اظہار نہ ہو۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ہو گی تو ان کی اطاعت ضروری نہیں ہو گی۔

2۔ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی انسان کو راہ راست پر رکھتا ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجتہ الوداع کے خطبے میں بھی اس کی ترغیب دلائی ' نیز نماز اور روزے جیسے ارکان اسلام سے بھی اسے مقدم رکھا۔

یقین اور توکل کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور مومنوں نے جب (کافروں کے) لشکر دیکھے تو کہا: یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا ' اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا ' اور اس چیز نے ان کو ایمان و تسلیم ہی میں زیادہ کیا۔"

(الاحزاب۔22)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ لوگ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف ایک فوج جمع ہوئی

ہے، چنانچہ تم ان سے ڈرو! تو اس بات نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور انہوں نے کہا: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ پھر وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ اس حال میں لوٹے کہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا اور انہوں نے اللہ کی رضامندی کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔" (آل عمران:183-184)

اور اللہ بلند و برتر نے فرمایا: "اور بھروسا کر اس زندہ ذات پر جسے موت نہیں آئے گی۔" (الفرقان-58)

اور فرمایا: "اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔" (ابراہیم-11)

اور فرمایا: "(اے پیغمبر!) جب تو کسی کام کا پختہ ارادہ کرلے تو پھر اللہ پر بھروسا کر۔" (آل عمران-159)

اور فرمایا: "اور جو اللہ پر بھروسا رکھتا ہے تو وہ اسے کافی ہے۔" (الطلاق-3)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مومن تو وہی ہیں جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل (اس کی عظمت و جلالت اور خشیت سے) کانپ اٹھتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان میں اور اضافہ کردیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا کرتے ہیں۔" (الانفال-2)

توکل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھ پر امتیں پیش کی گئیں (یعنی دکھلائی گئیں) تو میں نے دیکھا کہ ایک نبی ہے، اس کے ساتھ چند آدمی ہیں۔ ایک اور نبی ہے، اس کے ساتھ صرف ایک دو آدمی ہی ہیں۔ ایک اور نبی ہے، اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں۔ اتنے میں اچانک ایک بڑا گروہ میرے سامنے ظاہر ہوگیا۔ میں نے گمان کیا کہ یہ میری امت ہے۔ لیکن مجھے بتلایا گیا کہ "یہ موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم (بنی اسرائیل) ہے۔ لیکن تو دوسرے کنارے کی طرف دیکھ!"

(میں نے اس طرف دیکھا) تو ایک بہت بڑا گروہ تھا۔ مجھ سے کہا گیا۔

"یہ تیری امت ہے اور ان کے ساتھ ستر ہزار ایسے آدمی ہیں جو جنت میں بغیر حساب اور عذاب کے داخل ہوں گے۔"

آپ (یہ بیان کرنے کے بعد اپنی مجلس سے) اٹھے اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ تو لوگوں نے ان لوگوں کے بارے میں بحث کرنی شروع کردی جو بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں جائیں گے (کہ یہ کون ہوں گے۔)

بعض نے کہا: شاید یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل کیا ہوگا۔"

بعض نے کہا: "شاید یہ وہ لوگ ہوں گے، جو اسلام میں پیدا ہوئے اور اللہ کے ساتھ انہوں نے کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔"

اس طرح انہوں نے (اپنے اپنے گمان کے مطابق) کئی چیزوں کا ذکر کیا۔

اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے پوچھا۔

"تم کس چیز میں بحث کررہے تھے؟"

انہوں نے آپ کو ساری بات بتلائی (جو آپ کی عدم موجودگی میں ہوئی تھی۔)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ خود جھاڑ پھونک کرتے ہیں نہ کسی اور سے کرواتے ہیں اور نہ بدشگونی لیتے ہیں اور صرف اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔"

(یہ سن کر) عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے ان میں سے کردے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تو ان

میں سے ہے۔"

پھر ایک اور آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔ "میرے لیے بھی دعا فرمائیں اللہ مجھے بھی ان میں سے کر دے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عکاشہ اس میں تجھ سے سبقت لے گیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے اللہ پر اعتماد اور توکل کی ترغیب اور اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کی فضیلت واضح ہوئی۔

2۔ مسنون دعاؤں کے ساتھ دم (جھاڑ پھونک) اور علاج معالجہ اگرچہ جائز ہے ' تاہم جو اللہ کے بھروسے پر ان سے بھی اجتناب کرتے ہیں ' نیز بدشگونی وغیرہ سے بھی بچتے ہیں ' حدیث میں ان کی فضیلت کا بیان ہے۔

3۔ امتوں کے یہ حالات آپ کو خواب میں یا کشف کے ذریعے سے دکھائے گئے یا معراج کے موقع پر مشاہدہ کرایا گیا۔

دین کا علم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو بھائی تھے ' ایک ان میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتا (اور آپ سے دین کا علم سیکھتا) اور دوسرا کاروبار کرتا اور کماتا۔ کاروباری بھائی نے اپنے بھائی کی شکایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی (کہ وہ کاروبار نہیں کرتا)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"(تمھیں کیا معلوم) شاید تمھیں روزی اس کی وجہ ہی سے ملتی ہو۔"

(اسے ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو امام مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اس طرح کسی کو وقف کر دینا یا کسی کا وقف ہو جانا جائز اور مستحب ہے۔ علوم دینیہ کے ایسے طلبا کو بوجھ نہیں تصور کرنا چاہیے ' اسی طرح ان کی اور علما کی امداد سے گریز نہیں کرنا چاہیے ' ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ رزق میں اضافہ فرما دیتا ہے۔

2۔ انسان کو بے وسیلہ لوگوں کی امداد سے رزق مہیا ہوتا ہے۔

3۔ اس میں ان لوگوں کے لیے خوش خبری ہے ' جو دینی مدارس ' طلبا اور علما کے ساتھ تعاون کرتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کام کریں۔ دور حاضر میں جبکہ دولت بہت بڑے فتنے کی صورت اختیار کر چکی ہے ' صاحب ثروت لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے دین کی بقا کی خاطر اہل علم کی ضرورتوں کا خیال رکھیں۔ المیہ یہ ہے کہ عموماً" دین کی تعلیم وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو مالی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور عملی میدان میں ایک طرف ان کے سامنے ان کی محنت ہوتی ہے جو انہوں نے دینی تعلیم حاصل کرنے میں کی ہوتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ دین کی خدمت کریں اور دوسری طرف معاشی پریشانیاں بدستور ان کے دامن گیر رہتی ہیں اور مساجد و مدارس کے جن ذمہ داران کے رحم و کرم پر وہ ہوتے ہیں انہیں ان کی ضرورتوں کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا۔ عالی شان عمارتیں بنانے اور دیگر کام کرنے کے لیے لاکھوں روپے صرف کر دیے جاتے ہیں لیکن افراد پر پیسہ خرچ کرنا شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے ' اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ مٹی پر پیسہ لگانے کے بجائے افراد پر خرچ کیا جائے تاکہ خاطر خواہ فوائد حاصل ہوں۔

نہ جانے کیا ہوا ہے سال بھر میں
دیا روشن کہ مدھم ہوگیا ہے
ہمیں معلوم ہے اتنا کہ ایک سال
ہماری عمر سے کم ہوگیا ہے

وقت ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔ خوش کن خوابوں اور امیدوں کے چراغ روشن کیے ہم نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

قارئین کو نیا سال مبارک۔

نئے سال کی آمد پر حسب روایت قارئین سے سروے کیا ہے۔

وہ تمام خیالات' اعمال جن میں صداقت ہے' حسن ہے' خوبی ہے' زندگی کی حقیقت ہیں اور جو زندگی کی اس حقیقت کو جان لیتے ہیں' وہ خود کو جان لیتے ہیں۔

انسان کے اندر کی سچائی ہی اس کی خوب صورتی ہے۔ کوئی انسان کس چیز سے خوش ہوتا ہے' اس کی پسند ناپسند اس کی اصل فطرت کو بیان کرتی ہے۔ انسان کی شخصیت کی تہیں کھلتی ہی اس وقت ہیں جب وقت کا دھارا اس کے مطابق نہ ہو' بہت کم لوگ خود کو جان پاتے ہیں۔ ہمارا پہلا سوال اسی حوالے سے تھا کہ آپ خود کو کتنا جانتی ہیں۔

☆ مصنفین جو کردار تخلیق کرتی ہیں وہ اسی دنیا کے ہوتے ہیں۔ بہت سے کردار اتنے مضبوط' اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ وہ ہماری شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم ان جیسا بننے کی خواہش کرتے ہیں۔ دوسرا سوال اسی حوالے سے تھا۔ سوالات یہ ہیں۔

(1) کہتے ہیں۔

خدا شناس کہاں وہ جو خود شناس نہ ہو

آپ خود کو کتنا جانتی ہیں۔ اپنے بارے میں لکھیں۔

(2) کیا کوئی تحریر پڑھتے ہوئے آپ کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ آپ اس کہانی کے کسی کردار جیسی ہوتیں۔

کیہہ جاناں میں کون

ادارہ

مہناز یوسف... کراچی

1۔ میں کسی سے حسد نہیں کرتی۔ کسی سے مقابلہ نہیں کرتی۔ کسی کے پاس بے حد قیمتی کپڑے' جیولری ہے۔ بے حد خوب صورت گھر ہے یا پھر ان کے بچے بے حد مہنگے اسکول میں پڑھتے ہیں تو میری کبھی خواہش نہیں ہوتی کہ میرے پاس بھی یہ سب ہو۔ میں ہمیشہ اپنے سے کم تر کو دیکھ کر اپنے حال پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ زندگی میں اچھے برے دنوں سے صبر سیکھا ہے۔ برداشت سیکھی ہے۔ ملنسار ہوں۔ مہمان نواز ہوں۔ اب آتی ہوں اپنی خامیوں کی جانب جب غصہ آتا ہے تو بس مجھے اپنا غصہ کنٹرول کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ تو جناب یہ میں ہوں یعنی مہ ناز یوسف خود میری نظر میں۔ آپ کہیں گی کہ خوبیاں "اتنی ی ی ی ی" زیادہ اور خامیاں اتنی چنی منی۔ تو بھئی مجھ سے میرے بارے میں پوچھیں گی تو یہ ہی

ہو گا۔ اگر نعیم (میرے شوہر) سے پوچھتے تو الٹ ہوتا۔ یعنی خامیاں (اتنی ی ی ی ی" زیادہ اور خوبیاں اتنی تھوڑی سی چنی منی۔ ہاہاہاہا) یہ مذاق ہے 'سچ نہ سمجھا جائے۔ ویسے نعیم اکثر کہتے ہیں۔ "شادی سے پہلے تم نے جن بچوں کو اسکول میں پڑھایا ہے' ان بچوں کا بے چاروں کا مستقبل خراب ہو گیا ہو گا۔"

2۔ جب پندرہ سولہ سال کی تھی اور کہانیاں پڑھتی تھی تب ضرور ایسی خواہشیں دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ میں اس ہیروئن جتنی خوب صورت ہوتی یا اتنا پیار کرنے والا ہیرو مجھے بھی مل جائے۔ مگر اب زندگی میں ٹھہراؤ آچکا ہے۔ کم عمری کا دور گزر چکا ہے۔ اب زندگی کی حقیقتیں ہی کہانیوں میں دیکھتی ہوں۔ اور کہانیوں سے سبق سیکھتی ہوں۔

کوثر خالد...... جڑانوالہ

خداشناس کہاں وہ جو خودشناس نہ ہو۔

1۔ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے۔ پورے 54 سال کے ہو گئے ہیں۔ اگر اس عمر میں بھی خود کو پورا نہ جانیں تو حیرت ہے۔ نہ صرف اپنی ہر اچھائی برائی سے واقف ہیں۔ بلکہ مقابل کو بھی جان لیتے ہیں کہ کتنے پانی میں ہے۔ استخارے کے بغیر ہی استخارہ کر لیتے ہیں حتیٰ کہ چور بھی ڈھونڈ لیے اور چیزیں بھی برآمد کروالیں مگر۔ پنج وقتہ نماز...... شادی کے بعد نہ ہونے کے برابر رہی اور ہم اب تک یہی کہہ رہے ہیں۔

شرمندہ ہوں سر کو کیسے جھکاؤں

بے شک جاگتی آنکھوں خانہ کعبہ کا دیدار کروایا گیا جس دن گھر میں سسرالیوں کی ننگی انسانی تصویریں تمام عمر کی جنگ کے بعد اتار کر ضائع کر دیں اور ان کی جگہ خانہ کعبہ اور گنبد خضریٰ سے گھر کو سجالیا۔ (کڑھائی سے بھی روضہ انور بنایا ہے۔)

جان سکتا لیکن پھر میں جتنا خود کو جانتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں بہت جذباتی ہوں۔ اپنی زندگی کے فیصلے دل سے کرتی ہوں۔ میں دوسروں کی بڑی سے بڑی غلطی بھی بہت جلدی معاف کر دیتی ہوں۔ یہی امید کرتی ہوں کہ وہ بھی میری غلطیوں کو بھلا دیں مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا میں دوسروں سے امید بہت زیادہ باندھتی ہوں حالانکہ امید صرف اللہ سے باندھنی چاہیے۔ وہی ہماری امیدیں اور خواہشیں پوری کرتا ہے انسان کسی کی امید اور خواہش پوری نہیں کر سکتے۔

2۔ ہاں ایک کردار ہے۔ جس کو پڑھتے ہوئے میں نے اس جیسا ہونے کی خواہش کی اور وہ کردار ہے۔ نمل کی زمر کا' میری خواہش ہے کہ کاش میں بھی زمر جیسی مضبوط' سمجھ دار لڑکی بن جاؤں۔

راحیلہ عالم...... کراچی

میں بہت سادہ لوح اور مخلص ہوں۔ جھوٹ اور بناوٹ سے سخت نفرت کرتی ہوں۔ اور اتنی عمر ہو جانے کے باوجود الحمدللہ ہوشیاری چالاکی اور بناوٹ کے جراثیم میرے اندر نہیں پائے جاتے۔ اللہ نے مجھے اپنے پرائے تمام کے دکھ میں تڑپ اٹھنے والا دل عطا فرمایا ہے۔ کچھ لوگوں کے رویوں پر دل بہت دکھتا ہے مگر معاف بھی کر دیتی ہوں۔ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم پر کہ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اس ماہ کا مکمل ناول مصباح نوشین کا میرے ہاتھ پہ کوئی چاند رکھ" کی "منشال" میرے جیسی ہی تو ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو میں بھی یہی کرتی جو اس نے کیا۔

مسرت امین..... میاں چنوں

1۔ میں کسی سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتی۔ چاہ کر بھی نہیں۔ پوری کوشش ہوتی ہے زیادتی نہ کروں کسی کے ساتھ۔ لیکن میری ضد بہت پکی ہوتی ہے۔ جب میں ڈٹ جاؤں کسی بات پر تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پیچھے ہٹ جاؤں۔ موت کا خوف ہر وقت ذہن پر سوار رہتا ہے لگتا ہے ابھی کچھ ہو جائے گا۔ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کا مجھ میں پورا حوصلہ ہے۔ کبھی کسی کے سامنے روئی نہیں۔ شاید میں اتنی مضبوط ہوں نہیں جتنا بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ دل چاہتا ہے اپنے دکھ کسی سے بانٹ لوں۔ مگر ایسا کر نہیں پاتی۔ ایک ان دیکھا خول میری ذات پر چڑھ چکا ہے جو مشکل ہی اترے گا کبھی۔ میں لوگوں سے زیادہ گھلتی ملتی نہیں اور تقریبات وغیرہ میں جانا بھی مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ کسی کا دکھ دیکھ کے اپنے اندر توڑ پھوڑ محسوس ہونے لگتی ہے۔

2۔ سچ پوچھیں مجھے ایسی کوئی خواہش کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے لگتا ہے میں جو ہوں مجھے وہی ہونا چاہیے تھا۔ میرا کردار میری اپنی کہانی میں بہت فٹ ہے۔ ہاں اگر سوال یہ ہو تا کہ مجھے کسی کردار میں اپنی جھلک نظر آئی تو وہ "ستارہ شام" کی ماوی' مجھے لگی تھی کچھ کچھ اپنے جیسی۔

ثمرو احمد بٹ.....پتوکی

اپنی آشنائی' شناسائی تو بس اتنی ہے کہ رنگوں' پھولوں'

انسان بہت پیچیدہ ہے بس اتنا عرض ہے۔ "کی جاناں میں کون؟ جب بھلے شاہ کو پتا نہ لگا تو ہماری بساط کیا۔ ایک ہی شخص مختلف لوگوں کو مختلف لگتا ہے۔ آخر کیوں؟ یہ فیصلہ تو حشر پہ موقوف ہے۔ بس اللہ سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ آخر میں اتنا عرض ہے کہ عام لوگوں کو عام لگتے ہیں۔ خاص لوگوں کو خاص... باقی آپ 2012 سے مجھے پڑھ رہے ہیں۔ آپ ہی بتائیے میں کیسی لگی؟

2۔ "حوض کوثر" سے بڑھ کر کیا ہوگی؟ خوشی صرف حمد و نعت پہ منحصر ہے یا اللہ کی عبادت میں یا اللہ سے کلام میں..... لہٰذا ہم ہر پل خوش رہتے ہیں۔ لڑائی کے دوران بھی... اس لیے کہ لڑائی جائز کرتے ہیں اگر ناجائز ہو تو بلڈ پریشر تیز ضرور ہو گا۔ اور الحمدللہ ہم بیماری تو اللہ سے مانگ کر لیتے ہیں تاکہ بیمار ہونے پر غرور نہ آجائے۔

3۔ جی وہ کہانی تو آچکی۔ صائمہ اکرم کی دیمک زدہ محبت کی جمیلہ۔ سمجھ لیں کہ میں جمیلہ ہی ہوں۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے جی۔

عائشہ انصاری

1۔ میں عائشہ کو کتنا جانتی ہوں۔ شاید اتنا جتنا کسی گھر کے درو دیوار اپنے مکین کو جانتے ہیں یا شاید اتنا جتنا آوارہ' شوخ اور کھلنڈری سی تتلیاں' رنگ رنگ پھولوں کو۔ ہاں شاید اتنا ہی۔

اگر مجھ سے کہا جائے خود کو چند لفظوں میں بیان کرو تو میں کہوں گی۔ سنجیدہ' کم گو' رحم دل' بے چین' متجسس اور کسی حد تک غائب دماغ بھی۔ میں ایک عام گھریلو سی لڑکی ہوں۔ جس کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور بساط بھر خواب گھر کی چار دیواری میں ہی کد کڑے لگاتے پھرتے ہیں۔

اپنے نصیب پر قانع' اپنی قسمت سے راضی اور اپنے حال سے خوش میں ایک مطمئن سی لڑکی ہوں۔ جس کے شوق کا محور کتابیں' ڈائجسٹ' رسالے قلم اور ایک کورا کاغذ ہیں۔

میں عائشہ انصاری لفظوں کے ہجوم میں تنہا کھڑی..... ایک کوشش مسلسل اور متواتر..... کامیابی جس کی زندگی کا ٹارگٹ ہے اور امید جس کی فطرت کا حصہ۔

2۔ گزرے سال کی میٹھی سی یاد جو مجھے خوش کن تصور سے نوازتی ہے وہ میری انگیجمنٹ کا پیارا سا دن ہے۔

اور بھی ہیں جنہیں سوچنے کے لیے دماغ پر دینا پڑے گا زور۔ جس میں ہے درد اور وہ بھی بہت تیز۔ (ہاہاہا)۔

2۔ میں "جنت کے پتے" کی حیا سلیمان کی طرح حق پر ڈٹ جانے والی قابل اور ذہین ترین لڑکی بننا چاہوں گی اور مصحف کی محمل ابراہیم جیسی بھی جو اپنی زندگی کی رہنمائی ایک ایسی کتاب سے لیتی تھی۔ جس کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے "مصنف" (اللہ تعالیٰ) نے لیا ہوا ہے (سبحان اللہ)

ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

1۔ مجھے گمان ہے کہ میں اپنے بارے میں کم' دوسرے میرے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ خیر آپ نے پوچھا ہے تو اپنی ذات کو کھوجنے لگی ہوں۔ میرے مزاج میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے' بھوک کے وقت جو کھانے کی چیز دستیاب ہو نعمت عظمیٰ سمجھ کر کھاتی ہوں۔ سب کے لیے اچھا سوچتی ہوں' جھوٹ کبھی نہیں بولنا چاہتی۔ ہر ایک پر بھروسہ کرلینا جو بعد میں خسارے کا باعث بنتا ہے۔

میرے منہ پر کوئی باتیں سنا رہا ہو تو اس کو ٹوک نہیں سکتی۔ اسی ذی نفس سے دوبارہ واسطہ پڑ جائے اور اگر وہ بات کرے تو سارے گلے شکوے بھلا کر خوش دلی سے ملتی ہوں۔

راز کی حفاظت امانت کی طرح کرتی ہوں۔ چغل خوری بالکل پسند نہیں۔ دوسروں کی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی سعی کرتی ہوں تاکہ سوہنا اللہ میرے عیب ڈھک دے۔

میرے ہاتھ میں ذائقہ بھی ہے۔ گھر والوں کو میرا کھانا لذیذ لگتا ہے۔

"جنت کے پتے" پڑھ کر بلاناغہ تلاوت قرآن کی عادت ڈالی۔ شکریہ نمرہ احمد! کبھی ملبوسات کے ڈھیر اکٹھے نہیں کیے۔ اس بات پر میری شہزادی ثمرہ (بیٹی) فرماتی ہیں۔ "میری ماما تو بابا درویش ہیں۔" میرے شوہر نامدار مزے سے بدھئی (بدھو) کہہ دیتے ہیں۔ آگے سے میرا جواب سن کر دھیمے دھیمے مسکاتے ہیں۔ "شکر کریں مجھ جیسی مل گئی اگر چالا کو ماسی مل جاتی تو نجانے کیسے کیسے ناچ نچاتی۔"

میرے خیال سے بندے بشر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہ دنیا سرائے ہے کچھ دیر کا ٹھکانہ۔ بقول شاعر کے۔

دنیا تو ایک برف کی سل سے سوا نہ تھی
پہنچی ذرا جو آنچ تو دنیا تمام شد

2۔ بہت سی تحریریں پڑھتے ہوئے من میں یہ خواہش جاگی کہ ہم ایسے ہوتے۔ آپ حیران ضرور ہوں گے کہ مجھے نعیمہ ناز اور آسیہ رزاقی کی فہم و ادراک رکھنے والی دادیوں نانیوں کے کردار بہت بھاتے ہیں (حالانکہ میں ابھی نانی' دادی کے عہدے سے تو کافی فاصلے پر ہوں) "بہار کے سنگ" آسیہ رزاقی کی مومنہ میں اپنی جھلک محسوس کی۔ ویسی ہمدردی' نیک دلی' بے شک بعد میں وہ نیکی گلے ہی

کیوں نہ پڑ جائے۔ "چھپا کے چھپئ" (فرزانہ کھرل) کی عدن کی طرح خوددار ہوں۔ بشریٰ سعید کی "سفال گر" کی اماں حکیم بیگم گاؤں والی (یہی نام تھا شاید) میرا جی چاہتا ہے میں مستقبل میں ان جیسی ہو جاؤں۔ ویسی ہی ہنرمند، سلیقہ شعار، سچی کھری باتیں کرنے والی گھپ اندھیرے میں امید کا دیا روشن کرنے والی۔

مدیحہ عارف۔۔۔ سانگلہ ہل

اس بار کا سروے انتہائی دلچسپ رہا۔ سوال تینوں ہی لاجواب تھے اور بس۔

1۔ خوش فہمی اور خود شناسی میں بس یہ ذرا سا فرق ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ پہلی بات کا مجھ میں شائبہ تک نہیں ہاں۔ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہے۔ اپنی ذات کے حوالے سے میری پہلی نظر خود کی خامیوں کی طرف ہی جاتی ہے اور خامیوں میں۔۔۔ سب سے بڑی خامی غصہ اور وہ بھی بے حد، بے حساب، صد شکر نکلتا کسی پر نہیں بس اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے اور پھر خود بہ خود ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ زیادہ غصہ آیا۔ ہو تو خاموش ہو جاتی ہوں بلکہ کمرہ نشین کہنا بجا ہوگا۔ اپنی مرضی کرتی ہوں، کسی کی نہیں سنتی۔ بڑی اماں کی مان لیتی ہوں۔ بھئی، انہیں خوش رکھنا میری سب سے بڑی خوبی ہے۔ اب آتے ہیں صفات کی طرف تو جناب کالج لائف میں سب کلاس فیلوز کی مشترکہ رائے دوستانہ مزاج اور سب کی ہمہ وقت مدد کرنے کو تیار رہتی ہو چاہے اس کے لیے مجھے آؤٹ آف وے ہی کیوں نہ جانا پڑے میں کر جاتی تھی۔ پہلی ملاقات میں کبھی گھل مل نہیں جاتی، ریزرو رہتی ہوں۔ دل کی بات دل میں ہی رکھتی ہوں، میں کسی پر جلد اعتبار نہیں کر لیتی۔ اپنی باتیں شیئر کرنے کی عادت نہیں۔ میں اپنی ذات میں مگن بس خود ہی کی کمپنی انجوائے کرنے والی بندی ہوں۔ تنہائی میں بھی بہت سے خوب صورت خیال انگلی تھامے رنگین راہوں پر لے جاتے ہیں جہاں تتلیوں سے

خوش رنگ احساس اور کچھ میٹھے میٹھے خواب آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے ملتے ہیں۔ کسی کا دکھ درد دیکھا نہیں جاتا، اور ہمت اتنی ہے کہ اب تک زندگی نے بہت سے غم دیے مگر چپ چاپ برداشت کرتے ہوئے پھر سے زندگی کی دوڑ میں شامل رہی۔ بہت کم بولتی ہوں اور سوچ کر بولتی ہوں کہ پہلی بار ملنے والا مغرور کہہ کر اپنی راہ ہو لیتا ہے۔ پر مجھے چنداں پروا نہیں۔

2۔ ہماری مصنفاؤں نے ایسے بہت سے کردار تخلیق کیے ہیں جو حقیقی وجود رکھتے ہوں تو بے شک اپنے منفرد انداز سے بہت سے دلوں پر راج کرتے جیسے کہ اب بھی لفظوں کی دنیا میں رہتے ہوئے ۔ کرتے ہیں۔

آنسہ بیلا "اک موسم دل کی بستی کا" یہ کردار بہت متاثر کن ہے۔ زندگی اور اس کی مشکلات سے ہمت سے مقابلہ کرتی بیلا بہت اچھی لگی۔ کہیں نہ کہیں دل میں اس کے جیسی ہونے کی خواہش رہی، فرسودہ روایات کے بدلاؤ کے لیے پہلا قدم اٹھاتی ہوئی، دکھوں کا سامنا کرتی، بنا آنسو بہاتی بہت زبردست کردار رہا، کچھ کچھ تو لگا کہ میں ایسی ہی ہوں اور کچھ ایسا ہونے کی خواہش رہی۔

طلعت ثنا۔۔۔ سیال شریف

1۔ اپنے آپ کو بیان کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے اگر تعریف کرو تو اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور برائی مجھے تو

دوسروں کی نہیں کرنی آتی۔ اپنی کیا کروں۔ بہرحال جو خود کو سمجھ سکی ہوں' وہ بیان کردیتی ہوں پھر یہ نہ کہنا بولتی بہت ہے۔ تو سنئے۔

جب ملو گے پاؤ گے ہمیں مخلص
ہرچند کہ اخلاص کا دعوا نہیں کرتے

ویسے خوبیاں و خامیاں تو دوسرے بہتر بتا سکتے ہیں۔ کس مشکل میں ڈالا ہے آپ نے' کوئی بھلا اپنی بھی تعریفیں کرتا اچھا لگتا ہے۔ ویسے میں بہت سادہ دل' سادہ طبیعت ہر ایک سے جلد گھلنے ملنے والی ہنس مکھ۔ غرور نام کو نہیں۔ ہر حال میں اپنے رب کا شکرادا کرنے والی۔ حساس طبیعت اتنی کہ ناول' کہانی پڑھ کر اور ڈراما دیکھ کر کردار کے ساتھ رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ گڈ لکنگ تو پہلے کسی دور میں تھی' اب تو مٹاپے نے مت ماری ہوئی ہے (دوستوں کہو تو کم کرنے کے بارے میں بتاؤ) (نوٹ اپنی زندگی کی تصویر آپ خود نہیں بناتے "آپ کا اخلاق" آپ کی محبتیں بناتی ہیں)

3۔ جی بالکل خواتین ڈائجسٹ میں سلسلے وار چھپنے والا ناول "نمل" جو کہ نمرہ احمد نے لکھا ہے' اس میں مجھے زمر کا کردار بہت پسند ہے۔ اس کے کردار کی مضبوطی بہت پسند ہے۔ اس کا اعتماد اتنے زخم کھانے کے بعد بھی اس کے اعتماد میں کمی نہیں آئی۔ اس کی خودداری بہت پسند ہے۔ اندر سے وہی روایتی نرم دل' حساس اور ڈرپوک بھی لیکن باہر سے بہت مضبوط' جس سے بات کرنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑے۔ اپنی فیملی سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی۔ ہر لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ تمام قارئین کو نیا سال مبارک۔

حمیرا شریف...... عارف والا

1۔ کہتے ہیں کہ "انسان کو جتنا زیادہ اپنے بارے میں معلوم ہوگا۔ اتنا کم لوگ اسے بے وقوف بنا سکیں گے۔" صفحہ تو کم ہے' میں صفحات بھر سکتی ہوں اپنے بارے میں۔ میں دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتی۔ خاموش طبع ہوں۔ پوری کوشش کرتی ہوں جھگڑا نہ کروں۔ دوسرے کو ہمیشہ مخلصانہ مشورہ دیتی ہوں۔ ہمدرد ہوں۔ لوگوں پہ اعتبار جلدی کرلیتی ہوں' شرمیلی ہوں' تقریبات کی شوقین ہوں' پر صرف تیار ہونے تک' جانے کی نہیں ہاہاہا۔ صبر اور برداشت رکھتی ہوں' راز دفن کرلیتی ہوں سینے میں'

کتابیں پڑھنے اور گانے سننے کی شوقین ہوں۔ ہاں کپڑے نئے ڈیزائن کے سلائی کرنے کا بھی شوق ہے۔ چاند کو گھنٹوں دیکھنے کی دلدادہ۔ اتنا کافی ہے یا..... ہاں یاد آیا دوستی نبھانے میں ست ہوں۔ فطرتاً" بھی سست ہوں پر صرف کام شروع کرنے تک۔ اگر کام شروع کردوں تو چست ہوں پھر۔ تھوڑی شاپنگ کرنے کی بھی شوقین ہوں اور ناولز چاٹنا تو بس.....

2۔ ہائے! ظالم سوال ہے۔ مار دیا اس سوال نے ہزاروں کہانیاں شعاع اور خواتین میں پڑھی ہیں پر ایسا کم سوچا "سمیرا احمد" کا ناول "پیر کامل" "پڑھ کر دل چاہا میں" سالار سکندر ہوتی ایسی قسمت..... "سمیرا حمید" کا ناول "یارم" پڑھ کر دل چاہا میں "کارل" ہوتی ایسا شرارتی (مجھے شرارت کرنا نہیں آتی) ہر وہ کردار جو چلبلا ہو اچھا لگتا ہے۔ "دیمک زدہ محبت" جو "صائمہ اکرم" کا تھا اس میں "عائشہ" جیسی ہوتی۔ بس اس کے علاوہ پڑھے' مزہ آیا ناولز کا مگر اس جیسا بننے کا دل نہیں چاہا۔

ارم کمال..... فیصل آباد

1۔ اپنے آپ کو جاننا پیاز کی پرتوں جیسا ہے۔ ایک عجیب سا پزل ہے۔ ہم ساری عمر دوسروں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن اپنے ساتھ وقت نہیں گزارتے۔ مجھے اپنے بارے میں جاننے کا موقع ہمیشہ ایمرجنسی میں ملا ہے مثلاً "جب جب میاں صاحب گرج اور برس رہے ہوتے ہیں تو میں زبان پر چپ کا تالا ڈال لیتی ہوں۔ اسی طرح جب بھی گھر کو لاک کرکے کہیں جارہے ہوں اور اچانک مہمان آٹپکیں تو دل میں انہیں کتنا ہی برا بھلا کہوں لیکن لبوں پر دلنشین مسکراہٹ سے ان کا استقبال کروں گی۔ صبیحہ کہتی ہے کہ یہ ڈپلومیسی ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ جہاں مقابلے کی فضا آجائے وہاں میں پیچھے ہٹ جاتی ہوں۔ ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھتی ہوں۔ ہر مشکل گھڑی میں سوچتی ہوں کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ بندوں سے کیا چاہتا ہے۔ بہت صبر والی ہے (یہ میری پیاری امی جان کا کہنا ہے) کو آپریٹو ہو (یہ میرے میاں جانی کا کہنا ہے) کچھ کچھ کنجوس ہیں (یہ میرے بچوں کا کہنا ہے) بر یلینٹ ہو (یہ میری ٹیچرز کہتی تھیں) کافی بدھو ہو (یہ میری بیسٹ فرینڈ دردانہ کا کہنا ہے)

2۔ بہت سی تحاریر ایسی ہیں جن کو پڑھ کر دل بے ساختہ

چاہا کہ کاش اس تحریر کی ہیروئن میں ہوتی تو یہ کرتی وہ کرتی۔ نگہت سیما کی تحریر "زمین کے آنسو" ایک شاہکار تحریر تھی۔ اس کا کردار اریب فاطمہ اگر مجھ میں اریب فاطمہ جیسے اوصاف پیدا ہو جائیں تو کیا ہی بات ہے۔ آسیہ رزاقی کی ایک تحریر "صحیح فیصلہ" کی کردار صاعقہ "میرا موسٹ فیورٹ کردار ہے۔" "میرے خواب ریزہ ریزہ کی زینت اگر میں ہوتی تو اسے بھٹکنے سے بچالیتی۔ اگر ثمرہ بخاری کی تحریر "ہم سے ہے زمانہ" کی ہیروئن میں ہوتی تو کتنی مزے مزے کی شرارتیں کر کے آپ سب کو خوب ہنساتی' ہے نا!

حرا قریشی..... بلال کالونی' ملتان

1۔ ہائے کیا فرط طرب ہے! جس لمحے کا شدت سے انتظار تھا۔ وہ میسر آگیا' اور بروقت آگیا پیاری صائمہ کے توسط کہ انہوں نے "شہرزاد" کی پوسٹ لگا کر خوش خبری سنائی اور سال نو کے سوالات کا پرچا ہمیں بروقت مل گیا ورنہ ہا کر تو عزیزی شعاع چار یا پانچ تاریخ کو دے کر جاتا۔ سچ لگ رہا ہے' ہزاروں بہار کی خوشیاں میرے دامن میں آگری ہیں۔

دل میں شامل کسی صحیفے کی طرح
سوچتے رہتے ہیں اسے وظیفے کی طرح

مدت سے یہ خواہش رہی کہ کچھ اپنی ذات پر بھی رقم کروں پر کیا کریں یار! دل بھی وعدہ ایفا نہ کرسکا۔

آج عزیزی شعاع نے پھر اسے اس دل گوش بر صدا کو پیدا کر ڈالا ہے۔ سو اب عالم بے داری میں ہماری ذات کچھ ایسے ہم سے ہمکلام ہے۔

عظیم قائد کے مقولے "کام" کام اور کام کو ترجیح دینے کے علاوہ تحریری فعل کو فوقیت دیتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں کسی قدیم سوانح نگار کے ہاتھ سے لکھا وہ مسودہ ہوں جہاں حروف ابجد کا گراں بہا ذخیرہ بکھرا ہوا ہے۔ ایک ایسی تخلیق کار جو روز مرہ کے کام کرتے بھی فہم و ادراک کے سفر پر گامزن رہتی ہے اور اسی تگ و تاز میں اس کے صبح و شام تمام ہو جاتے ہیں۔ اپنے والدین کا وہ محنت کش بچہ جو روٹی پکاتے' ہنڈیا بناتے' صفائی ستھرائی کرتے بس کہانیاں بنتا رہتا ہے۔ اختتام کرتا ہے اور پھر جیسے ہی رات ہوتی ہے لمبی تان کر تھکا ٹوٹا سو جاتا ہے۔ ہاہاہا! ایک تعلیمی ادارے کا وہ استاد جو علمی و اخلاقی دونوں زیوروں سے متعلم کو شناسا کرنے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ ایک ایسا آرٹسٹ ذہن بچہ جو بھی مصور پاکستان بن کر اپنے تخیل کا بوریا بستر اٹھا کر آفتاب و ماہتاب تک لے جانا چاہتا ہے اور گاہے دل کی بزم میں ستاروں کی دنیا آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ ذرا رکیے گوش دل وا کیجیے اور حرا کو سورج کی وہ ضیا سمجھیے جو اپنی ضو پھیلا کر کائنات میں موجود حرا ایک ایسی ننھی بچہ ہے کہ کوئی مسکرا کر بس دیکھ لے۔ یہ دل دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مسکرا کر تم نے دیکھا' دل تمہارا ہو گیا.....! اس بچے کا مزاج نفیس بھی ہے' حسین بھی' مگر جب غصیلہ ہو جائے تو گویا حلاوت کی ساری خوشبو نچوڑ دیتا ہے۔ بس پیار کا بھوکا ہے۔ خلوص کا دعوے دار ہے۔ محبت کا امین ہے۔ مٹھاس' خوشبو کا دلدادہ ہے۔ فطرت کا دیوانہ ہے۔ ادب کے میدان میں ابھرتا اک درخشاں ستارہ ہے۔

2۔ مجھے تو لگتا ہے مزید خیالات کی جستجو کو زندہ پیکر میں ڈھالنے کے لیے صانع ازل نے حرا کو زمیں پر اتارا ہے۔ بہر کیف اگر خواہش کا عکس وا کروں تو عمیرہ احمد کی تحریر پیر کامل کا کردار جو لازوال' بے مثال' باکمال ہے "امامہ سالار" کا روپ چاہیں گے۔ نمرہ احمد کی تحریر "جنت کے پتے" کی حیا سلیمان مگر شرعی پردہ کرنے کے بعد والا روپ اپنائیں گے۔ اب چونکہ عزیزی شعاع کے حلقہ محبت میں حرا' کا نام بھی کب سے آگیا ہے تو امید ہے جلد ہی یہ رقم طراز یعنی لکھنے والا کوئی اچھا جدا یا نئی بات کی صورت شعاع کے اوراق کے سینے پر لاکر جوش سے ابھرے گا اور سال نو یہ نوید دے گا لو حرا! ایک اور تمہارا خواب پورا ہوا۔

نوال افضل گھمن..... کراچی

1۔ خاک نے کیا کمال رکھنا ہے جی۔ رہ گئی بات ذاتی اوصاف کی تو جناب سب سے بڑی بات' غلط بات غلط حرکت برداشت ہی نہیں ہونی چاہیے۔ باتھ روم کا جوتا ہی کیوں نہ ادھر ادھر ہو جائے..... بہت زیادہ بولڈ اتنے بولڈ کہ جامن کے درخت پر چڑھنا ہو تو بھی نمبر اول..... اکیلے گوادر پورٹ کا سفر کرلیا' کیسا ہے..... رت کو دو یا تین بجے اٹھ کر قبرستان جا کر دعائے مغفرت کرنا ہی کیوں نہ ہو..... جناب پلیز ہماری دماغی حالت پر شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ بولنا تو ہماری ذات کا حصہ ہے۔

بندھن

نازیہ علی ہمراہ عدنان علی

شاہین رشید

بندھن کے لیے اس بار ہمارا انتخاب سوشل ورکر ماڈل اور اداکارہ نازیہ علی ہیں۔ آپ نے انہیں متعدد کمرشلز میں دیکھا ہوگا۔ نازیہ بنیادی طور پر ایک رائٹر ہیں' کہانی نگار اور مضمون نگار و شاعرہ اور کراچی کے معروف اخبارات میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے اور ہمدرد نونہال میں بچوں کے لیے بھی انہوں نے کافی لکھا... شادی کے بندھن کو ماشاء اللہ سے آٹھ سال ہوگئے ہیں اور دو بیٹے ہیں ان کے' ماشاء اللہ سے... بندھن کیسے بندھا؟ یہ آپ پڑھیے۔

"جی نازیہ! کیسی ہیں آپ؟"

"الحمدللہ۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"والد کا تعلق لکھنؤ سے تھا اور والدہ کا تعلق دہلی سے تھا' اردو اسپیکنگ ہیں ہم لوگ' اور میرے سسرال کا تعلق بھی لکھنؤ سے ہے... میری ایک بڑی بہن ہے اور میں ہوں اور بہت منت مرادوں سے ہوئی۔ اپنی بڑی بہن سے آٹھ سال چھوٹی ہوں... میرے والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ بڑی بہن کی شادی ہوچکی ہے۔"

"اپنی فیلڈ کے بارے میں بتائیں کہ کب سے ہیں اس فیلڈ میں' پھر بندھن پہ آتے ہیں؟"

"سب ہی آرٹسٹ کہتے ہیں کہ ہمیں بچپن سے ہی

اداکاری کا شوق تھا۔ تو شوق ہونے اور اس شوق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بڑا فرق ہوتا ہے تو میں نے بہت محنت کی، مگر اس کے باوجود مجھے امید نہیں تھی کہ میں اس فیلڈ میں آجاؤں گی۔ اس لیے بچپن سے سن رہے تھے کہ اس فیلڈ میں آنے کے لیے پرچی کی ضرورت ہوتی ہے، یا کسی کی سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میرا لک ہے کہ مجھے کسی پرچی کی ضرورت نہیں پڑی، جب چھوٹی تھی تو کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا اور میری لکھی ہوئی کہانیاں "ہمدرد نونہال" میں شائع ہوتی تھیں اور شاعری بھی کرتی تھی.... یہ میرے اسکول کے زمانے کی بات ہے۔ پھر تھوڑی بڑی ہوئی تو میں نے اپنی تحریریں "قومی اخبار" میں بھیجیں جو شائع ہوگئیں.... پھر "ریاست اخبار" میں اور "سہارا گروپ آف نیوز پیپر" اور دیگر اخبارات میں مضامین لکھتی تھی.... بس میڈیا سے میں نے شروعات کیں اور یوں جب ذرائع ابلاغ سے تعلقات بڑھے تو مجھے "جنگ سنڈے میگزین" کے لیے آفر آئی کہ میں شوٹ کرواؤں اور جب وہ پرنٹ ہوا تو نہ صرف مجھے بہت اچھا لگا بلکہ دیکھنے والوں کو بھی اچھا لگا اور مجھے آفرز آنی شروع ہوگئیں۔ مجھے اس فیلڈ میں آنے کا جنون تو تھا ہی، اس شوٹ نے مجھ میں حوصلہ پیدا کر دیا اور آفرز سے انکار نہیں کیا۔ شادی سے پہلے زیادہ کام نہیں کیا لیکن شادی کے بعد بھرپور طریقے سے کام کیا۔ کیونکہ شوہر کی طرف سے بہت سپورٹ تھی مجھے۔ اگرچہ میرا بیٹا بہت چھوٹا تھا مگر شوہر کی سپورٹ کی وجہ سے نہ صرف میں نے کمرشلز بہت کیے بلکہ ڈرامے بھی کیے۔ زیادہ تر "سٹ کام" کیے اور سب سے زیادہ "بلبلے" میں پٹھان لڑکی کا کردار بہت مشہور ہوا.... میں نے سارے اچھے پروجیکٹس میں کام کیا اور مجھے کمرشلز بھی بہت مشہور برانڈز کے ملے۔ اور اب مزید کام بھی کر رہی ہوں جو کہ "ہم" اور "ہم ستارے" کے لیے ہوگا۔ ان کی شوٹس جاری ہیں۔ تعلیم میں سوشیالوجی ماسٹرز ہوں، بیالوجی میں بی ایس سی ہوں۔"

"گڈ، یہ بتائیں کہ شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے۔ بچے کتنے ہیں اور نام کیا ہیں؟"

"شادی کو آٹھ سال ہوگئے ہیں۔ دو بیٹے ہیں ماشاء اللہ سے، بڑا بیٹا پانچ سال کا ہے۔ اس کا نام اذان علی ہے اور چھوٹا بیٹا ابھی دو ماہ کا ہے اور اس کا نام عاصم علی ہے۔"

"عدنان صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور لو ہے یا ارینج؟ عدنان صاحب کی کس بات نے متاثر کیا؟"

"عدنان کی فیملی اور ہماری فیملی کی فرینڈشپ تھی اور ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا لگا بھی رہتا تھا اور میں انہیں بھائی ہی سمجھتی تھی مگر شاید عدنان مجھے پسند کرتے تھے... اور میں سمجھتی ہوں کہ جنہیں سچی محبت ہوتی ہے، وہ پھر لڑکی سے بات نہیں کرتے بلکہ ان کے والدین سے کرتے ہیں تو میرے والد کا تو انتقال ہوچکا تھا، البتہ والدہ حیات تھیں تو عدنان نے میری والدہ سے

بات کی، اور پھر فیملی سے مشورہ کیا، میری ماں نے مجھ سے بات کی اور میرے لیے بہت مشکل تھا فیصلہ کرنا، مگرامی کے سمجھانے پر میں نے بھی رضامندی ظاہر کردی۔ رشتہ طے ہوگیا اور کچھ عرصہ کے بعد والدہ کا بھی انتقال ہوگیا تو میرے ماموں اور سب بڑوں نے مل کر ہماری شادی کی۔ میری ماں نے کہا تھا کہ تم میرے فیصلے پر ہمیشہ خوش رہو گی اور واقعی میں بہت خوش ہوں، عدنان میری پہلی اور آخری محبت ہیں اور شاید میں بھی عدنان کی پہلی اور آخری محبت ہوں۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور کیا شادی دھوم دھام سے ہوئی؟"

"منگنی تو نہیں ہوئی تھی۔ بس جس طرح بات پکی ہوتی ہے، ہماری بھی ہوگئی تھی۔ کم عمر تھی میں کافی مگر والدین کے انتقال کی وجہ سے جلدی شادی ہوگئی یوں سمجھیے کہ بات پکی ہونے کے بعد دو سال کے دوران ہی شادی ہوگئی۔ اور شادی کے بعد میرے شوہر نے مجھے اتنا خود اعتماد بنا دیا کہ میں بہ آسانی اس فیلڈ میں پرفارم کرنے لگی، ورنہ سچ میں میں تو بہت شرمیلی لڑکی تھی مگر کام کا جنون بہت تھا۔

جہاں تک دھوم دھام کی بات ہے تو میری بارات حیدر آباد سے آئی تھی لیکن چونکہ عدنان کی جاب یہاں کراچی میں تھی اور میں بھی یہیں رہتی تھی تو رہنا تو ہمیں یہیں تھا۔ ولیمہ ہمارا حیدر آباد میں ہوا تھا اور میں وہاں تقریباً" ایک ہفتہ رہی تھی کیونکہ ساری رسمیں ہوئی تھیں تو کھیر پکوائی کی بھی رسم ہوگئی تھی۔ دھوم دھام سے اس طرح نہیں ہوئی کہ یہ اپنے گھر میں رسمیں کر رہے تھے اور ہم اپنے گھر میں ایک ساتھ رسمیں نہیں ہوئیں۔"

"عجیب سا لگا ہوگا؟ اور شاپنگ سسرال کے ساتھ کی؟"

"اصل میں بات یہ تھی کہ بڑی بہن تو مہمانوں میں لگی ہوئی تھیں اور میں نے اپنی ساری ذمہ داری خود اٹھائی کہ کیا کرتی۔ بیوٹی پارلر بھی خود ہی گئی۔ اور شاپنگ کی بات ـــــ تو میری ساس پوچھ لیتی تھیں کہ ہم بازار آئے ہوئے ہیں، تمہیں کون سا کلر پسند ہے۔ البتہ بارات اور ولیمے کے لیے میری ساس نے میرے شوہر سے کہہ دیا تھا کہ آپ اپنی پسند کی شاپنگ کرادو۔ تو ہم دونوں ساتھ چلے جاتے تھے اور میری ہی پسند سے ڈریس بھی بنے اور جیولری بھی۔"

"لڑکیوں کے ساتھ ان کی دوست ہوتی ہیں تو آپ کے ساتھ کیوں کوئی نہیں تھا؟"

"بس میری ایک دوست تھی جو شادی کے دن میرے ساتھ گئی تھی پارلر، ورنہ ساری بھاگ دوڑ میں نے خود ہی کی۔ دوستوں کو بھی اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ وہ ہمارے ہی ساتھ لگی رہیں۔ ایک کزن تھی وہ بھی بعد میں آئی تو ساری ذمہ داری اپنی شادی کی مجھ پر ہی تھی۔ بہت جلدی جلدی سارے کام ہوگئے۔ البتہ ولیمہ دھوم دھام سے ہوا۔ درمیان میں ایک فنکشن بھی ہوا اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ جب شادی ہوئی تو اتنی عقل بھی نہیں تھی۔۔۔ اور ذمہ داریاں بھی بہت تھیں۔"

"نکاح اور رخصتی کے وقت کیا تاثرات تھے؟"

"نکاح اور رخصتی کے وقت اپنے والدین کی بہت یاد آرہی تھی اور نکاح کے وقت جب میں اسٹیج پہ بیٹھی تو میری آنکھیں اپنے والدین کو تلاش کر رہی تھیں، اب بھی وہ منظر یاد کرتی ہوں تو مجھے رونا آجاتا ہے۔ جب مجھ سے دستخط کروائے جارہے تھے تو میرے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ کیونکہ بابل کا آنگنا تو تھا ہی نہیں اور لڑکیاں کیا کیا خواب سجاتی ہیں کہ شادی ہوگی تو ماما بابا کے ساتھ مل کر شاپنگ کروں گی اور رخصتی کے وقت گانا لگے گا کہ "بابا کی رانی ہوں" تو بابا ماما کے گلے لگ کر رخصت ہوں گی۔ تو یہ سب کچھ نہیں تھا اور میں بہت زیادہ افسردہ تھی۔ والدین کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم دونوں بہنیں کبھی کسی کے آنگنے میں ہوتے تھے تو کبھی کسی اور کے آنگنے میں۔۔۔ بس شکر کہ اللہ نے ہمیں اپنے اپنے گھر کا کر دیا اور اب شوہر کا ہی رشتہ ہے

جو ہمیں تحفظ دیتا ہے۔ جب میں سولہ سال کی تھی تو شادی ہو گئی اور جب میں اٹھارہ سال کی ہوئی تو میرا بیٹا ہو گیا۔ اپنی تعلیم بھی میں نے شادی کے بعد ہی مکمل کی۔"

"لڑکیوں کی شادی جلدی ہونی چاہیے یا تھوڑی دیر میں؟"

"جلدی یا دیر کی بات نہیں ہوتی۔ بس اللہ تعالیٰ سب لڑکیوں کے نصیب اچھے کرے مجھے شروع شروع میں غصہ بھی آتا تھا کہ میری اتنی جلدی شادی کیوں ہو گئی کہ میں اپنی لائف کو انجوائے نہیں کر سکی، لیکن اب میں جب اپنی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے کسی بات کا افسوس نہیں ہوتا کیونکہ میں سوچتی ہوں کہ میری ایک فیملی تھی والدین کے ساتھ تو وہ ختم ہو گئی لیکن جب میرا دوسرا بیٹا ہوا تو مجھے ایسا لگا کہ اللہ نے دو قیمتی چیزیں لے کر مجھے دو قیمتی چیزیں دے بھی دی ہیں اور میں بہت خوش ہوں اپنی ازدواجی زندگی میں۔"

"نکاح نامہ پڑھا تھا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے خاندان میں نکاح سے پہلے ہر بات ڈسکس ہوتی تھی کہ کیا کرنا ہے کچھ چیزیں دباؤ ڈال کر بھی لکھوائی جاتی تھیں۔ نکاح نامہ لڑکی کو بٹھا کر لکھوایا جاتا تھا، مگر مجھے ایسا کچھ حق نہیں ملا کہ میرے والدین حیات نہیں تھے، حق مہر بھی کچھ زیادہ نہیں تھا اور میں نے بھی کچھ ڈیمانڈ نہیں کی .... سب کچھ میرے بڑوں نے فائنل کر دیا۔ مگر میں پھر بھی مطمئن تھی، ایسا نہیں تھا کہ میں نے آنکھ بند کر کے دستخط کر دیے تھے۔ ڈسکس ہوا تھا مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا اور ہنی مون کہاں منایا؟"

"منہ دکھائی میں عدنان کی طرف سے کافی گفٹ تھے۔ لیکن جو اس رات اسپیشل گفٹ ہوتا ہے اس میں گولڈ چین اور لاکٹ تھا جو کہ میں نے ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے.... اور عدنان کی طرف سے جتنے بھی گفٹ ملے۔ سب میں نے بہت احتیاط کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔"

"گھر کے ماحول میں اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟"

"میکے اور سسرال کے ماحول میں کوئی خاص فرق نہیں پایا اور جب میں بیاہ کر آئی تو میری ایک نند کی شادی ہو چکی تھی اور ایک کی ہونی تھی۔ سب کا میرے ساتھ بہت اچھا سلوک تھا اور مجھے بہت فخر ہوا کہ مجھے اتنا اچھا سسرال ملا ہے اور جس طرح ہماری فیملی پڑھی لکھی ہے اس طرح میرے سسرال کی فیملی بھی بہت پڑھی لکھی ہے۔ میرے والدین نے اپنی بیٹیوں کو شہزادیوں کی طرح رکھا اور تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اسی طرح میرے سسرال میں بھی بیٹے ہونے کے باوجود بیٹیوں کی بہت قدر ہے اور بہت اہمیت دی جاتی ہے۔"

"جوائنٹ فیملی سسٹم ملا؟"

"نہیں جی نہ ملا اور نہ ہی ہے۔ شادی کے بعد ایک ہفتہ سسرال حیدر آباد میں رہی اور پھر کراچی آ گئی، جہاں پہلے سے ہمارا گھر سیٹ تھا اور میرے سسرال کے جتنے بھی لوگ ہیں، وہ بھی علیحدہ ہی رہتے ہیں جوائنٹ فیملی اچھا سسٹم ہے مگر اب ماحول بہت بدل چکا ہے اور اس سلسلے میں میری ساس اور میری سوچ

تقریباً" ایک جیسی ہے کہ ہم محبتوں کے ساتھ رہتے ہیں لیکن پھر علیحدہ ہونے کے لیے ہم لڑ جھگڑ کر نکلتے ہیں تو دلوں میں نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم دور رہیں لیکن پیار محبت سے رہیں۔"

"لڑکیوں کو شادی کے بعد بھی کمانا چاہیے اور سسرال میں آپ کے کام پر کسی نے اعتراض کیا؟"

"لڑکیوں کے جب رشتے طے ہو رہے ہوتے ہیں اور لڑکی کما رہی ہوتی ہے تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا مگر بعد میں اعتراض کیا جاتا ہے۔ مگر میرے سسرال کی طرف سے اور میرے شوہر کی طرف سے نہ پہلے پابندی تھی کوئی اور نہ اب ہے اور مجھے کوئی ڈر خوف نہیں ہوتا کہ گھر آنے میں دیر ہو گی تو ڈانٹ پڑے گی۔ میں سب کام اپنی خوشی سے کرتی ہوں' اور چونکہ میں کم عمری سے کما رہی ہوں تو مجھے کمانا اچھا لگتا ہے اور اب وہ زمانہ بھی نہیں رہا کہ شوہر کی کمائی پر ہی انحصار کیا جائے اور سچ میں نہ پہلے اور نہ اب مجھے دوسروں پر بوجھ بننا اچھا بھی نہیں لگتا۔ بے شک شوہر کی کمائی پر بیوی کا حق ہوتا ہے اور عدنان میرے سارے حقوق پورے کرتے ہیں مگر مجھے پھر بھی خود کمانا اچھا لگتا ہے اور پھر میں گھر کی ساری ذمہ داریاں پوری کر رہی ہوں تو فارغ وقت میں گھر بیٹھ جانا مجھے خود بھی اچھا نہیں لگے گا اور جس طرح ڈراموں میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو خوشگوار گھریلو لائف کو ڈسٹرب کرتے ہیں۔ اسی طرح خاندان میں بھی جو دور پار کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں بہت حسد ہوتا ہے کہ ان کی اتنی اچھی بہو ہے اور یہ کما رہی ہے اور خوش ہے اپنے گھر میں' اپنے بچوں کے لیے اپنے لیے اور میاں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے ایک لڑکی کماتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ آج کے دور میں اخراجات بہت ہیں۔ ہاں اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو اپنی کمائی کی نذر نہ کرے۔"

"شادی کے بعد شوہر کو کیسا پایا؟"

"بہت اچھا... اور عدنان کو میں کئی باتوں میں اپنے والد کی طرح محسوس کرتی ہوں۔ ان کی بہت سی عادتیں میرے والد سے ملتی جلتی ہیں۔ میرے والد ہم بیٹیوں کے بہت لاڈ اٹھایا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں چائے بنا کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح عدنان بھی بہت سپورٹ کرتے ہیں اور خوش ہو کر جب مجھے چائے بنا کر دیتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے لاڈ اٹھا رہے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہماری فیملی میں کنجوسی نہیں تھی تو عدنان کا ہاتھ بھی بہت کھلا ہے اور کنجوسی بالکل نہیں ہے۔"

"روایتی مرد کی طرح ہیں عدنان کہ سارے کام بیوی ہی کرے؟ اور بچوں کو بھی سنبھالے۔"

"نہیں' عدنان کی کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتی کہ سارے کام بیوی ہی کرے اور اگر مرد نہ بھی کہے تو بیوی کو سارے کام کرنے چاہئیں۔ البتہ کھانے کے معاملے میں ان کا دل چاہتا ہے کہ میں پکاؤں' خاص طور پر انہیں روٹی میرے ہاتھ کی پکی ہوئی ہی پسند ہے۔ تو جب یہ کوئی فرمائش کرتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے اور جہاں تک بچوں کی تربیت کی بات ہے تو اس میں بھی ان کی سوچ پڑھی لکھی ہے۔ وہ بچوں کی تربیت میں برابر کے حصے دار ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ بچے سنبھالنا صرف عورت کی ذمہ داری ہے۔ ہم دونوں مل کر ہی بچوں کو سنبھالتے ہیں۔ کسی تیسرے کے ہاتھوں میں بچوں کو نہیں دیتے۔"

"طلاقیں کیوں ہوتی ہیں۔ شادیاں کیوں ٹوٹ جاتی ہیں؟ اور آپ مزاج کی کیسی ہیں؟"

"میں خود بہت جذباتی لڑکی ہوں۔ غصے کی تیز ہوں۔ گھر سے باہر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید میں ٹھنڈے مزاج کی ہوں تو ایسا نہیں ہے۔ میرا غصہ بہت خطرناک ہوتا ہے اور منگنی کے وقت میری امی نے عدنان سے ایک بات کہی تھی کہ نازیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہماری لاڈلی ہے مگر اس میں ایک برائی ہے کہ اس کا غصہ بہت تیز ہے۔ بس اس بات کو درگزر کر دینا... شاید امی کی بات کا ہی اثر ہے کہ کبھی میں غصے میں کچھ کہہ دوں تو کہتے ہیں کہ مجھے پتا ہے تم اس وقت غصے میں ہو۔ جہاں تک طلاق یا شادی ٹوٹنے کی بات ہے تو اس معاملے میں بیوی اور شوہر دونوں ہی ذمہ دار ہوتے

ہیں۔ اگر میاں بیوی ایک دوسرے پر اعتماد کریں، بھروسا کریں تو کوئی ان کے ریلیشن کو ختم نہیں کر سکتا۔ بہت سے لوگ حسد کی وجہ سے مس انڈر اسٹینڈنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شیطان کا کام انجام دیتے ہیں لیکن اگر میاں بیوی ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ بھروسا کرتے ہیں تو کوئی اس تعلق کو توڑ نہیں سکتا۔"

"اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے تو؟"

"اس بات پر کیوں اسلام یاد آجاتا ہے۔ کبھی احکامات پر عمل کرنے کی توفیق کیوں نہیں ہوتی لوگوں کو.... اور میں تو اپنے میاں کے لیے شراکت برداشت نہیں کر سکتی' کہتے ہیں نا کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں تو میں بھی یہی کہوں گی اور مجھے اپنے شوہر پر مکمل اعتماد ہے وہ ایسا نہیں کریں گے اور نہ ہی انہوں نے کبھی ایسی کوئی مثال دی ہے۔"

عدنان علی سے

"جی عدنان صاحب! آپ بتائیے کہ جب پہلی بار آپ نے نازیہ کو دیکھا تو کیا تاثرات تھے؟"

"جب پہلی بار نازیہ کو دیکھا تو ایسا لگا کہ آج میری تلاش مکمل ہو گئی ہے اور مجھے جس لڑکی کی تلاش تھی وہ نازیہ ہی ہے۔ پھر میں نے اپنے گھر والوں کو رشتہ لینے ان کے گھر بھیجا اور یوں بات آگے بڑھی۔"

"شادی سے پہلے یقیناً" ملاقات ہوتی ہوگی' تو شادی کے بعد یہ چینج ہوئیں یا آپ؟"

"شادی سے پہلے ملاقاتیں نہیں ہوتی تھیں۔ البتہ فون پر بات ہوتی تھی اور نازیہ شادی کے بعد زیادہ اچھی ہو گئی ہے۔ پہلے سے زیادہ خیال رکھتی ہے اور اتنی مصروفیات کے باوجود میرا اور بچوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اور میں بدلا ہوں یا نہیں' یہ تو آپ کو نازیہ ہی بتا سکتی ہیں۔"

"نازیہ آپ کو بجی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں؟ اور گھر آکر کیا خواہش ہوتی ہے کہ خاموشی ہو یا تھوڑا ہلا گلا؟"

"موڈ پر منحصر ہے کبھی ہلا گلا اچھا لگتا ہے تو کبھی خاموشی.... البتہ نازیہ کے لیے میری خواہش ہوتی ہے کہ یہ بجی سنوری رہیں۔ اچھی ڈریسنگ ہو اور مسکراتی ہوئی ملے۔"

"آپ کو ان کا کام کرنا پسند ہے اور کیا بیوی کو کام کرنا چاہیے؟"

"بیوی کو کیا ہر لڑکی کو کام کرنا چاہیے اگر اس میں کچھ ٹیلنٹ ہے یا وہ اعلا تعلیم یافتہ ہے تو ضرور کام کرے اور نازیہ پر کوئی پریشر نہیں ہے' وہ اپنی مرضی کی مالک ہے اور اچھی بات ہے اگر وہ کام کرتی ہے اور کرنا بھی چاہیے ہر لڑکی کو۔"

"یہ سوال میں نے نازیہ سے بھی پوچھا ہے اور آپ سے بھی پوچھ رہی ہوں کہ شادی کیوں ٹوٹتی ہے؟"

"اس لیے کہ یا تو میاں بیوی کمپرومائز نہیں کر پاتے یا ایک دوسرے پر ٹرسٹ نہیں کرتے' اگر تھوڑا سا تحمل سے کام لے دونوں میں سے کوئی ایک تو پھر یہ نوبت نہ آئے۔ اگر ایک غصے میں ہے تو دوسرا خاموش رہے تو پھر نہ جھگڑا بڑھتا ہے نہ طلاق تک نوبت آتی ہے۔"

"سسرال میں سب سے زیادہ اچھا رشتہ کون سا لگا؟"

"سسرال میں سب سے زیادہ اچھا رشتہ ساس کا لگا' وہ بہت پیار کرتی تھیں' ان کے میں بہت قریب تھا۔ بہت یاد آتی ہیں مجھے.... اور نازیہ کے والد سے تو میری زیادہ ملاقاتیں نہیں تھیں۔"

"نازیہ کی کوئی اچھی بات؟"

"نازیہ کی سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے تو یہ فیس ٹو فیس کہہ دیتی ہے۔ جھوٹ نہیں بولتی۔ بری عادت تو کوئی نہیں سوائے اس کے کہ جو دل میں آتا ہے بول دیتی ہے۔ جو کبھی کبھی اس کے لیے نقصان دہ بھی ہوتا ہے۔ البتہ غصے کی تھوڑی تیز ہے۔ بچوں کا بہت خیال رکھتی ہے اور بہت زیادہ پیار کرتی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے ان میاں بیوی سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

س۔ج۔پ

س : شادی کب ہوئی؟

ج : یاد نہیں کب ہوئی۔ آئی تھنک دو ہزار دو میں ہوئی۔

س : شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟

ج : شادی سے پہلے کے مشاغل تھے ' پڑھنا' لکھنا' اسکول جانا اور سہیلیوں سے پیاری باتیں کرنا۔ گڑیا' گڈوں کی شادی کروانا۔ لڈو کھیلنا' چھلانگیں مارنا' دودھ لانا' امی ابا کو تنگ کرنا' فرمائشیں پوری کروانا اور بہن بھائیوں پر خوب رعب دبدبہ جمانا۔ سہیلیوں کے گھروں میں آنا جانا۔ پڑوسیوں کے ساتھ لڑنا جھگڑنا' ٹوٹ پڑ جانا' اور لوگوں پر الزام لگانا۔ دوسرے کے نام بگاڑنا' جیسے اپنے سارے کزنز کے اس ٹائم بگاڑ دیے تھے۔

خیر میرے بھی لوگوں نے مختلف قسم کے نام رکھے تھے اور ہاں گانا گانے کا بے حد شوق تھا۔ دل کرتا تھا کہ لتا منگیشکر بن جاؤں اور میں مذاق اور مزاج کی بہت زیادہ تیز تھی۔ ایک کی جگہ دس سناتی۔

س : رشتے میں مرضی؟

ج : رشتے میں مرضی میری ہی چلی تھی۔ جس گھر سے میں دودھ لاتی تھی۔ ان کے گھر سات بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی اور تین بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے ایک بیٹے کو میں پسند آ گئی۔ میں تیرہ سال کی تھی۔ اس ٹائم تو پردہ نہیں کرتی تھی۔ کلاس سیونتھ میں پڑھتی تھی۔ وہ بانسری بجاتا رہتا تھا۔ میری سہیلی اس کی بانسری کی دیوانی تھی۔ وہ اس وقت اٹھائیس سال کا ہو گا۔ میری سہیلی نے مجھے اس کی طرف مائل کیا اور مجھے بری طرح پھنسا دیا۔ اگرچہ رشتہ میری پسند سے ہوا۔ مگر یہ محبت نہیں تھی۔ صرف پسندیدگی تھی۔

رشتے پر نہ میری امی راضی تھیں نہ ابا۔ مگر دادی کو میں نے قائل کیا اور دادی نے ہاں کر دی۔ کیونکہ دادی کو ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے بھگا کر نہ لے جائے۔ رشتہ طے کرتے وقت امی نے کہا تھا کہ رخصتی چار سال بعد ہو گی۔

س : جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟

ج : اتنا کچھ خاص تصور نہ ۔۔۔ تھا بس یہی کہ مجھے گھمائے گا' پھرائے گا۔ اسکول جانے دے گا اور سہیلیوں کے گھر جانے پر قطعاً" منع نہیں کرے گا۔ مجھے اپنی خالاؤں' رشتہ داروں کے ہاں آنے جانے دے گا اور کزنز سے ملنا ملانا پڑے گا تو کچھ نہیں کہے گا۔ اور میری ہر بات مانے گا۔ جو کہوں گی وہ کرے گا میرے لیے بروقت فیصلہ لے گا اور اگر ساس سے لڑنا ہو گا تو میری سائیڈ لے گا۔ جو میں کہوں گی وہ اس کے لیے پتھر پر لکیر ہو گا اور ہر وقت مجھے چاہے گا' سراہے گا' میری تعریفیں کرے گا اور میرے ساتھ بالکل بھی جھگڑا نہیں کرے گا' اگر ان کے بہن بھائی میرے ساتھ لڑیں گے تو میں ان کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گی۔

س : منگنی کتنا عرصہ قائم رہی؟

ج : منگنی جب دھوم دھام سے ہوئی تو امی نے چار سال کی بات کی تھی۔ تب میں سیونتھ کا امتحان پاس کر کے آٹھویں میں آ گئی تھی۔ اور ٹھیک ایک سال بعد ساس صاحبہ نے وہ طوفان بدتمیزی مچائی کہ شادی چودہ' پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی۔ تب شادی سے پہلے آٹھویں کے چند پرچے مجھ سے رہ گئے اور میں پیا دیس سدھاری۔ 2001ء میں منگنی اور 2002ء میں شادی ہو گئی۔

س : شادی کے لیے قربانی؟

ج : سب سے بڑی قربانی تعلیم کی قربانی دی۔ کاش میں کبھی یہ تعلیم نہ چھوڑتی تو آج کیا سے کیا ہوتی۔ میں

نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑ لوں گی۔ مگر ناں جی ناں ' ایسا کسی نے ہونے نہ دیا۔ باقی

بہت سی قربانیاں بھی دیں۔ مگر وہ اتنی خاص نہیں تھیں۔ کیونکہ وہ تو ہر لڑکی کو دینی پڑتی ہیں۔ جیسے سہیلیاں ' ماں باپ کا گھر ' بہن بھائی ' کزنز ' جھگڑے ' کھیل کود ' رسی کا کھیل ' برتن ' گڑیا ' گڑیا کا گھر ' گھر کا فرنیچر اور ڈھیر سارے پرانے کپڑے۔ جو چھوٹی بہنوں پر احسان عظیم کرکے کہا آج سے یہ سب کچھ تمہارا ہوا اور ڈھیر سارے برتن اور میرے سارے ہنگامے اب تم لوگ کرو۔

س : رسموں کے لین دین پہ کوئی جھگڑا؟

ج : کوئی ایک ہو تو بتاؤں سینکڑوں جھگڑے ہوئے۔ سب سے زیادہ میری ماں نے ڈالے۔ زیور پہ ' میرے نام زمین لکھنے کو کہا ' جس گھر میں میرے شوہر کا حصہ تھا۔ وہ میرے نام لکھ دیا۔ سب چیزیں سسرال والوں پہ ڈالیں۔ صرف کپڑے جوتے اور الماری ' برتن ' مجھے جہیز میں بنا کر دیے۔ میری ساس بھی کم جھگڑالو فسادن نہ تھی۔ اس نے کہا۔

"جب میں اس گھر میں آئی تھی تو میرے نام کسی نے جائیداد نہیں لکھی تھی۔ تو تیرے نام کیسے لکھوں۔" مگر اللہ بخشے میرے سسر کو اس نے فوراً میری ماں کی بات مان لی اور اس کا مان رکھا اور کھانے پر بہت زیادہ پھڈے ہوئے۔

س : شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کہا تھا؟

ج : سبحان اللہ ' ماشاء اللہ چاند کا ٹکڑا ' بہت پیاری ' بس تعریفیں ' اپنی محبت کا یقین۔ بہت سی پرسنل باتیں وغیرہ ..... اگر اپنی تعریفیں لکھنے لگوں تو صفحے کالے نیلے پڑ جائیں۔

س : شادی کے بعد شوہر کا رویہ کیسا تھا؟

ج : ہائے جی ' مجھے تو سب کے سامنے جان ہی کہتے تھے۔ اکیلے میں جان من ' شروع میں تو سب اچھا تھا۔ وہ میرے زیادہ تر کام اکیلے میں خود کرتے تھے ' پر یہ سب جٹھانیوں اور دیورانیوں اور ساس سے کہاں برداشت ہو سکتا تھا۔ شروع میں میرے لیے کھانے پکائے۔ کیونکہ میں بہت کم عمر تھی۔ مجھے کھانا پکانا ' چائے بنانا بالکل بھی نہیں آتا تھا۔ میرے شوہر پڑھے

لکھے نہ تھے ' مگر وہ غضب کی پینٹنگ کرتے تھے ' میرا اور اپنا نام کمرے کی مختلف جگہوں پر لکھا تھا اور اکثر میرے لیے پھول پھل وغیرہ لاتے تھے ' ساس مجھ سے جھاڑو وغیرہ لگوا دیتیں ' جو مجھے بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ میرے شوہر کو اکثر ٹیلی فون پر ایک لڑکی کال کرتی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے انجان لڑکی سے باتیں کرنا بند کر دیں۔ پھر میں نے ٹیلی فون ہی کٹوا دیا۔ اس کے علاوہ مجھ پر بے انتہا پابندیاں لگ گئیں۔ کزنز ' رشتے داروں پر ملنے سے صاف پابندی ' اسکول میں تعلیمی سلسلہ جوڑنا چاہا۔ شوہر نے صاف کہہ دیا۔ کہ شادی صرف اسی وجہ سے جلدی کروادی۔ تاکہ ... یہ سلسلہ ختم ہو اور تم گھر میں رہو اور یہاں سے نہ ختم ہونے والے جھگڑے شروع ہو گئے۔ ساس ' میری دیورانیاں سب میرے خلاف ہو گئیں۔ دیور بھی ساتھ مل گئے ' مگر پہلے تو میں برداشت کرتی رہی۔ مگر میں بھی بچپن سے مزاج کی تیز تھی۔ سب سے پہلے ان کے نام بگاڑ دیے۔ پھر رفتہ رفتہ ' ان کے روبرو آ گئی۔ اور ایک کی جگہ میں دس سنانے لگی۔ پانی پر جھگڑے کیے ' کھانے پر ' روٹیوں پر ' افسوس صد افسوس ' شوہر نے اس وقت ساتھ نہ دیا۔ ورنہ ان سب کو وہ سبق دیتی کہ اگلی پچھلی نسلیں یاد کرتیں۔ مرغیوں کے انڈوں پر جھگڑے کیے۔ پہلے اس وقت منہ زبانی تو تکار تھی۔ وہاں گیس کی سہولت نہ تھی۔ میں آگ جلا نہیں سکتی تھی۔ تندور پر روٹیاں لگا نہیں سکتی تھی۔

سو پہلے ساتھ تھے ' پھر شوہر سے الگ ہونے کو کہا۔ مگر وہ نہیں مان رہا تھا۔ مثال دیتا تھا کہ اتفاق میں برکت ہے۔ میں کہتی ... کہ "اتفاق ہو تو تب ناں" یہاں تو ہر کوئی بڑا بنا پھرتا ہے۔ اور جھگڑالو ' فساد اور تو تکار میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔

س : پہلے بچے کی پیدائش؟

ج : پہلے بچے کی پیدائش' ایک سال کے بعد ہوئی۔ جب میں امید سے ہوئی تو ساس دیورانیاں' نند سب مل گئے' کہنے لگے یہ ہمارے خاندان کا نام ہے کہ پہلا "پہلوٹی کا بچہ" لڑکا پیدا کرنا ہوگا' ورنہ تو منحوس' نحوست زدہ' سبز قدم' اور پتا نہیں کیا کیا کہلائے گی۔ شوہر نے بھی زور دیا کہ اگر لڑکا نہ ہوا تو نام مٹی مٹی ہو جائے گا۔

میں نے شروع میں اسٹریس تو بہت لیا۔ بعد میں پروا نہیں کی۔ ایک بار بچہ پیدا ہو جائے' تم سب کے دماغ سے میں یہ خناس نکال دوں گی۔ ہر کسی نے لڑکا جنما تھا۔ تو غرور ان کے دلوں میں پڑ گیا تھا۔ ویسے میں نے ریکارڈ توڑ ڈالا۔ چاند جیسی خوب صورت بیٹی پیدا کی۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ قصور سارا میرے کھاتے میں ڈالا۔ نہ کسی نے مبارک دی۔ نہ کسی نے مشکل وقت میں ساتھ دیا۔ بس الگ کر دیا۔ اپنے کمرے برآمدے تک محدود کر دیا اور پھر بیٹی کے بعد وہ لڑائیاں ہوئیں کہ اللہ امان میں رکھے۔

شوہر کو میرے روبرو کیا گیا۔ اب ہم دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے' تو تکار سے بات آگے بڑھ کر مار کٹائی تک پہنچ گئی۔ مرد کی بڑی بے غیرتی وہ جب کچھ نہ کر سکتا ہو تو بیوی پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ مجھے بہت مارا پیٹا اور میرے لیے اس نے سلنڈر لگوا دیا پھر گیس آ گئی۔ تو پہلے تو ہم بجلی کے بل پر لڑتے جھگڑتے تھے' پھر گیس کے بل پر لڑنے جھگڑنے ——— لگے۔ پھر میں امید سے ہوئی۔ شوہر کا رویہ بدلا' جھگڑے کم ہو گئے' ان دنوں میرا شوہر' کسی بات پر اپنے گھر والوں کے خلاف ہو گیا اور وہ سب مل گئے۔ اور وہ لڑائی جھگڑے فساد برپا ہو گئے کہ بتا نہیں سکتی۔ کوئی ان کی بہن کی شادی کا سلسلہ تھا۔ سب راضی تھے اور میرے شوہر نامدار راضی نہ تھے' سب کے خلاف اکیلے اور وہ سب جیت گئے' ان لڑائی جھگڑوں فساد میں میری دوسری بیٹی نے جنم لیا۔ پھر سب کی توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ میں ان کے جیسے ہی تھی۔ (جیسے کو تیسا) میکے آ گئی۔ کمرے کو تالا لگوا دیا اور شوہر بھی میرے ساتھ میکے میں رہنے لگے۔ پھر وہ لوگ معافیوں تلافیوں پر اتر آئے۔ پھر سے میں سسرال آ گئی۔ ہر روز یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائیاں جھگڑے ہو جاتے۔ پھر بیٹے بھی ہو گئے' مگر میں بری تھی' کبھی بھلی نہ بن سکی۔"

س : کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ج : کام تو آتا ہی نہیں تھا۔ اوپر سے بچوں کا جھنجھٹ' میں نے تو کچھ اور ہی خواب دیکھ رکھے تھے' کہ شادی کے بعد گھومنا پھرنا' ہوگا' ٹورز وغیرہ ہوں گے' دعوتیں اڑائی جائیں گی اور کام یہ ساس نند' کس مرض کی دوا ہیں۔ کام پہلے پہلے شوہر نے کیے پھر میں نے سنبھالے۔ **مثلاً** "آگ وہ جلاتا' قیمہ وہ پکاتا' پھر لڑائیوں جھگڑوں میں کام سیکھ لیے۔ مگر مجال ہے جو میری ایک بھی خواہش پوری کر دی ہو۔ نہ گھومنا ہوا' نہ دعوتیں ہوئیں۔ جو سلامی کے پیسے ملے تھے' وہ یہ کہہ کر ساس نے ہڑپ لیے۔ "اے' یہ میرے ہیں' دوسروں کے مجھ پہ بدلے ہیں اور یہ پیسے میں نے ہی دوسروں کو لوٹانے ہیں' تو کیا دوسروں کو دے گی۔"

س : سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج : اے لو جی! گل نہ پوچھو! بس سسرال والے تو ہر وقت لڑنے مرنے کو تیار رہتے تھے' بڑی دیورانی جب کسی سے بھی لڑتی۔ پھر اس پر شہزادہ (جن' روح) کا دورہ پڑ جاتا۔ میں تو ہمیشہ سب کے سامنے منہ پھاڑ کر کہتی۔ ڈھکوسلہ ڈرامے' اور ایکٹنگ کر رہی ہے۔" ساروں سے پہلے خوب لڑتی۔ پھر شہزادہ اس پر چڑھ جاتا۔ سب اس کے اردگرد جمع ہو جاتیں۔ منہ سے جھاگ نکلنا' کوئی ہاتھ پیر مالش کرتا۔ کوئی قرآنی آیات پڑھتا۔ زیادہ تر شہزادے اس پر میری وجہ سے ہی آئے ہیں۔ ایک تو شکل سے بھی بھیانک تھی۔ اوپر سے شہزادے کا دورہ پڑ جاتا۔ بل بتوڑی ناسا چوڑی کیا ڈراؤنی ہوگی۔ میرے شوہر کے بارے میں بھی اس نے مشہور کرا رکھا تھا کہ اس پر بھوتنی' جنی' چڑیل آتی ہیں۔ مگر میں نے کھل کر پورے خاندان کے سامنے برملا کہا۔" میرے ہوتے ہوئے کسی دوسری چڑیل کی کیا

مجال جو اس پر آجائے۔ یہ تمہارا شوہر بے غیرت ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے بھی تم پر شہزادہ آجاتا ہے۔" بس میں نے ہر وہ کام کیا جو سسرال والوں نے منع کیا۔ سوائے تعلیمی سلسلہ نہ جوڑ سکی۔ سسرال والوں سے توقعات پوری نہ ہوئیں۔ تو میں بھی بچپن سے مزاج کی تیز تھی۔ لڑائیوں، جھگڑوں، دنگوں، فساد میں آگے رہی۔ خود بھی شوہر سے کئی بار مار کھائی۔ مگر بخشا ان کو بھی نہیں، زبانی تو تکار تو اس گھر کا معمول کا حصہ تھا۔

س: سسرال والوں سے تعلقات؟

ج: سسرال والوں سے توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ پھر تعلقات کیسے خوش گوار رہ پائیں۔ جیسے پاکستان کے انڈیا کے ساتھ تعلقات ہیں۔ بس یہی سمجھ لیں کہ ایسے ہی ہیں۔ ہمیشہ تو تو میں میں، ساس نے کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ پھر بھی چند سال بعد میری چھوٹی بہن کا رشتہ دیور کے لیے مانگا۔ دادی نے سہولت سے کہا۔

"بھلا ایک پائینچے میں دو پاؤں سما سکتے ہیں؟" صاف انکار۔

اگر کبھی ساس کے ساتھ، کسی شادی، منگنی کے فنکشن میں جاتی تو جب عورتیں مجھے دیکھتیں تو اکثر میرے بارے میں پوچھتی رہتیں اور کئی بار، میرے لیے رشتے آئے۔ ساس تو ان عورتوں کو بڑی فخریہ کہتی، یہ میری بہو ہے۔ پھر شوہر کے کان بھرتی رہتی اور ہم میں خوب لڑائیاں جھگڑے ہوتے۔ کئی بار شوہر نے مجھے گندی گالیاں دیں اور خوب مارا۔ مگر میری زبان درازی کے آگے ان کی مار کچھ نہ تھی۔ سسر کی فوتگی کے بعد ساس نے سب کو اپنا اپنا حصہ دیا اور میں نے شوہر پر خوب زور ڈالا کہ بس اب اس چڑیا گھر میں گزارہ ناممکن ہے۔ ایک منٹ بھی نہیں۔

س: میکے اور سسرال کے کھانوں کے ذائقے میں فرق؟

ج: پتا نہیں، بس میکے میں امن ہوتا ہے۔ سسرال میں جھگڑے۔ البتہ میکے میں کافی نخرے کیے۔ کھانے پینے کے معاملے میں پسند کا سالن نہ پکا ہوتا۔ تو اکثر دیگچی اٹھا کر ایک دو بار پٹخ دی۔ پھر چھوٹی بھی تھی۔ سسرال میں کلیجی کھانی پڑی۔ (اوجھڑی) گردے، دماغ پائے یہ سب کھانے پڑے۔ جو میکے میں ہمیشہ ابو بازار سے لے آتے تھے۔ مگر میں گوشت کے سوائے کچھ بھی نہ کھاتی تھی اور مجھے سبزیاں بھی پسند نہ تھیں۔ ٹنڈے، کدو، دال، یہ سب مجھے کھانے پڑے۔ یہ سب دیکھ کر دل برا ہوتا۔ مگر میں پھر یہ سب کھانا سیکھ گئی اور اب تو الحمدللہ سب کچھ کھالیتی ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ دراصل ابو نے بچپن سے دودھ، فروٹس، ملک شیکس، خشک میوہ جات، بیکری آئٹم، قیمہ فرائی، انڈا، چکن، برگرز وغیرہ کی عادت ڈالی تھی۔ جو سسرال میں مجھے بہت مشکل پیش آئی اور ساگ سسرال میں دوسرے تیسرے روز پکتا۔ تو ایک مرتبہ ساگ کی بے شمار گڈیاں میرا سسر لے آیا تھا وہ سب میں نے ساس کی بھینس کو کھلا دی تھیں۔ رات کو اس پر خوب تماشا ہوا۔ میں بیچاری سمجھ نہ پائی کہ یہ پورے ٹبر کے لیے آیا ہے، میں سمجھی چارہ ہے۔

س: جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج: جوائنٹ فیملی سسٹم ناپسند ہے۔ کیونکہ اگر گھر میں زیادہ برتن وغیرہ ہوں تو آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ اسی طرح لوگ بھی زیادہ ہوں تو اتنے ہی زیادہ لڑائیاں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں اگر کسی ساس صاحبہ کا اکلوتا بیٹا ہو۔ تو پھر جوائنٹ فیملی سسٹم بہتر ہے۔ کیونکہ کچھ گزارہ ساس کو کرنا پڑے گا کچھ بہو کو پھر آپس میں نبھ جائے گی۔ میری ساس کے سات بیٹے تھے پھر ساتوں بہوویں، ان کے بچے پورا چڑیا گھر، ساس نے کھلوار کھا تھا۔ ساس بڑے فخر سے کہتی تھی۔

"میں نے یہ مدرسہ اسی طرح سنبھالنا ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ سب الگ ہوتے گئے اور بیچاری ساس اپنے ایک منجھلے بیٹے کے ساتھ رہ گئی۔ اب ساس اور اس کا خوب گزارہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ساس بہو میں انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔

س: شوہر سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج: شروع میں نئی شادی نئے لوگ کچھ خاص سمجھ

نہ آیا۔ پھر رفتہ رفتہ سب کا رویہ کھل کر سمجھنا شروع کیا۔ دو تین سال بعد لڑائیوں جھگڑوں میں الگ ہو گئی۔ مگر پھر اگلے 9 سال اسی کمرے میں رہی۔ شوہر سے بہت کہا اس گھر سے مجھے نکال کر کہیں جھونپڑے میں لے جاؤ مگر وہ نہیں مان رہا تھا۔ اس لیے ہمارے آپس کے تعلقات خطرناک حد تک خراب ہو گئے۔ پھر ان کے اپنے گھر والوں سے بھی اختلاف بڑھتے گئے۔ مگر وہ زمینوں جائیداد کے معاملے تھے۔ جب ہم نے الگ آشیانہ بنایا اور اس میں شفٹ کر گئے۔ تو شوہر نے مجھے بتایا 'میری نام لکھی زمین اپنے بڑے بھائی کو دینا چاہی میں نے وہاں خوب اسٹینڈ لیا۔ ہر ایک سے لڑی ہر ایک سے اپنے حق کے لیے تعلقات خراب کر لیے اور شوہر نے آخر میں ہتھیار ڈال دیے۔ کہ یہ زمین میری بیوی کی ہے میں کیسے دے سکتا ہوں۔

میں نے اپنے بچوں کو تعلیمی ماحول دینا چاہا اور بچوں کے لیے بھی ڈٹ کر کھڑی ہو گئی کیونکہ اس خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم دینا جائز نہیں تھا۔ میری بیٹی جب پانچویں میں آگئی تو شوہر نے کہا بس چار جماعتیں پڑھ کر اس نے بہت پڑھ لیا۔ میں نے نہ اس کی بات مانی' نہ ساس وغیرہ کی۔ خود پھر اسی بات پر مار کھائی۔ مگر اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ اب میری بڑی بیٹی کلاس 8th میں ہے اور وہ مختلف قسم کے کورسز بھی کر رہی ہے۔ انگلش لینگویج کورس بھی کر رہی ہے۔

اب تو دیوروں کی لڑکیاں بھی پڑھ رہی ہیں۔ دوسرے نمبر کے بڑے دیور نے اپنے سارے بچوں کو بھی تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا ہے مگر بہت سارے بچے بچیاں نہ پڑھ سکیں۔ کیونکہ ساس اور ان کی مائیں انہیں صرف مدرسہ بھیجتی رہیں — میری بیٹی' بھی مدرسہ جاتی رہی اور اس نے دوبار قرآن پاک کا ختم کیا۔ پھر جب ترجمہ تفسیر کے لیے اسے بٹھایا۔ تو کورسز کی وجہ سے فی الحال چھوڑ دیا۔ کیونکہ دو جگہ وہ ٹائم مینجمنٹ نہ کر سکی۔

س : کیا سسرال میں ماحول بہتر بنانے کی کوشش کی؟

ج : وہ سب لوگ تو آپس میں ہر وقت لڑتے رہتے تھے' چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں دنوں لڑتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کو طعنے تشنے دیتے رہتے تھے' میں نے ماحول کو کیا بہتر بنانا تھا۔ الٹا ان ہی کے ماحول میں رچ بس گئی۔ جو کچھ وہ میرے ساتھ کرتے رہے۔ الٹا میں بھی وہی سب کچھ کرنے لگی۔ چیخم پکار' تو تکار' بھاں بھاں' رونا' دھونا' شروع میں تو لگا' جیسے پاگل خانے میں آگئی ہوں۔ پھر میں بھی پاگل ہو گئی۔ ان کے جیسی ہو گئی۔ بات بات پر چیخم پکار کی عادت میں نے بھی اپنا لی۔ صرف سسرال کے لیے۔ اپنے بچوں سے ایک شفیق ماں کی طرح پیش آئی۔ ہمیشہ وقت پر انہیں ہوم ورک کرایا۔ انہیں اسکول بھیجا اور مدرسے بھیجا' انہیں اب بھی غلط صحیح کی تمیز سکھاتی رہتی ہوں۔ بس آخری فیصلہ یہی ہے کہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گی۔ اللہ پاک اس خواہش میں کامیابی عطا فرمائے۔

س : شادی شدہ بہنوں کے نام پیغام؟

ج : سسرال دراصل جو دکھتا ہے وہ ہوتا نہیں اور بہت کم خوش نصیب لڑکیاں ایسی ہوں گی جو سسرال میں من چاہی ہوں گی۔ میں نے بھی بہت سپنے دیکھے تھے' مگر سارے ٹوٹ گئے' خدا پر کامل یقین و اعتقاد رکھیں' پیروں فقیروں کے چکر میں ہرگز نہیں پڑیں اور بروقت فیصلے کا اسٹینڈ لیں۔ اگر آپ کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ تو اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اپنے حق کے لیے ضرور لڑیں اور اپنا حق نہ چھوڑیں۔

س : غیر شادی شدہ بہنوں کے نام پیغام؟

ج : یہی دن ہیں زندگی انجوائے کرنے کے۔ پھر تو بھاری ذمہ داریاں پڑ جاتی ہیں اور جنہوں نے تعلیم ادھوری چھوڑ رکھی ہے۔ وہ خدارا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ میرا تو یہی ماننا ہے۔ کہ تعلیم کے بنا انسان ادھورا ہے۔

مجھے کچھ کہنا ہے

شہرزاد... میرا پہلا طویل سلسلے وار ناول...!!!

جسے میں نے پورا ایک سال سردیوں کی طویل راتوں اور گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں بیٹھ کر سوچا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا پہلا سین میں نے دو سال پہلے لکھا اور پھر فائل طویل عرصے کے لیے بند کردی۔ میں نے آج تک جتنے ناول لکھے ان کا محرک کوئی نہ کوئی دل دکھاتا جملہ، سانس روکتا لہجہ، اپنی طرف متوجہ کرتا چہرہ یا کوئی تلخ منظر ہی بنا تھا۔

لیکن.....!!!

شہرزاد میرا ایک ایسا ناول ہے جسے لکھنے کی تحریک مجھے ملکۂ کوہسار "مری" شہر کے ایک خوب صورت گھر کو دیکھ کر ملی۔ مال روڈ سے واک کرتے ہوئے کشمیر پوائنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اس گھر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ مری کی بعض سڑکیں کافی بلندی پر ہیں اور اکثر گھر ڈھلوانی سڑک سے گزر کر نیچے ہموار میدانوں میں بنے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے سڑک سے گزرنے والے لوگوں کو کم از کم صحن یا لان کے مناظر دیکھنے کے لیے کسی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا..... میں بھی چلتے چلتے ایک دم رک کر اس کی چار دیواری پر اپنی کہنیاں جمائے اسے غور سے دیکھنے لگی۔

اچانک مرمیں ایک سودا سمایا اور میں اپنی ہی دھن میں کھلے گیٹ سے اس خالی گھر کے اندر داخل ہوگئی اور اس کے سرسبز لان کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں نے ایک کہانی بنی اور پھر اسے لفظوں کی مالا میں پرونے کا عہد بھی وہیں کیا اور اس کے بعد اس گھر کی تصویر کو محض اپنی یادداشت کے لیے سیل فون کے کیمرے میں محفوظ کرلیا۔

قارئین.....!!! میں نہیں جانتی، اس گھر کے مکین کون تھے۔ اس کا ماضی، حال یا مستقبل کیا تھا لیکن اینٹوں کی بنی اس عمارت میں بہت سی کہانیاں مجھے اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتی محسوس ہوئیں۔ یہ وہ کہانیاں تھیں جنہیں میرے ذہن نے خود تخلیق کیا۔ ان کا اس کے مکینوں سے کوئی لینا دینا نہیں۔

مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ کچی پکی مٹی کی بنی اینٹوں، گارے اور سیمنٹ سے بنی عمارتیں بھی بولتی ہیں۔ وہاں رہنے والوں کے دکھ اور غم ان پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور جب مکینوں کے دکھ بولتے ہیں تو یہ گھروں کے در و بام کو وقت سے پہلے بوسیدہ کردیتے ہیں اور وہاں رہنے والے لوگوں کی خوشیاں در و دیوار کو بھی ہمیشہ جوان اور ترو تازہ رکھتی ہیں۔

اس ناول میں ماضی کے ایک ٹریک کو چھوڑ کر باقی سارے ٹریک فرضی اور میرے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ان کی کسی بھی واقعے، منظر یا مشاہدے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔ اس کے لیے میں یا ادارہ قطعاً" ذمے دار نہیں۔

میں اس ناول کے ذریعے نہ تو اپنی قابلیت یا گوگل سے لی گئی معلومات کے ذریعے اپنے معصوم قارئین پر کوئی دھاک جمانا چاہوں گی اور نہ ہی میرا مقصد، اپنے کرداروں کا شاہانہ قسم کا لائف اسٹائل دکھا کے کسی کے خود ساختہ احساس کمتری کو پروان چڑھانا ہے۔ کہانیوں کے کردار، کسی بھی معاشی طبقے سے ہوسکتے ہیں۔ آپ ان کے رہن سہن پر غور و فکر کرنے کے بجائے، اس تحریر میں چھپے اصل مقصد کو کھوجنے کی کوشش کیجیے گا۔

آخر میں صرف اتنا کہنا ہے کہ شہرزاد میرا پسندیدہ کردار ہے اور مجھے یقین ہے اس ناول کے اینڈ تک یہ سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنالے گا اور اگر ایسا نہ ہوسکے تو میں پیشگی معذرت خواہ ہوں..... دعاؤں میں یاد رکھیے گا کیونکہ میرا دعاؤں پر یقین ہے۔

والسلام

صائمہ اکرم چوہدری

صائمہ اکرم چوہدری

شہرزاد

وہ شہرزاد تھی۔۔۔!!!
شہرِ ستم گر میں پلنے والی۔۔۔
زمستان کی سنہری دھوپ جیسی لڑکی۔۔۔!!!
جس کی دلکش آنکھوں پر جھیل سیف الملوک کا گماں ہوتا۔۔۔
وہ اس ادا سے چلتی کہ زمانے کی سانس رک جاتی۔۔۔
وہ نگاہ اٹھا کر دیکھتی تو قافلے راستہ بھول جاتے۔۔۔
وہ الف لیلہ کی کہانیوں کا طلسماتی کردار نہیں تھی۔۔۔
لیکن۔۔۔!!! وہ بولتی تو وقت کی گردشیں تھم سی جاتیں۔۔۔
وہ حقیقتوں کی تلخ دھوپ میں پل کر اپنی شناخت کے موسموں کی تلاش میں تھی۔۔۔

اس کے ارادے آہنی، نگاہیں پختہ....
وہ اک آتش کم رو تھی....
جس کی اسرار میں ڈوبی ہوئی خاموشی میں.... کئی لمحے سلگتے تھے....
اس کے سینے میں کئی راز پلتے تھے....!!!
وہ شہرزاد جس نے داستان ہزار میں کتنے ہی کرداروں کو زندگی بخشی، اپنے لفظوں سے....
وہ اپنی کہانی میں، خود کو ڈھونڈنے نکلی تو اجنبی راستوں کی مسافر بن گئی۔
وہ شہرزاد، اپنے ہی گھر کا رستہ بھول گئی....!!!

☼ ☼ ☼

اوائل دسمبر کی وہ خنک رات تھی۔ چاند بھی کہر میں ڈوبا ہوا اونگھ رہا تھا۔ کڑاکے کی سردی میں ہر ایک مخلوق اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکی بیٹھی تھی۔ ایسی گھورسے کی تاریکی میں ٹرین خیبر میل پوری رفتار سے ریل کی پٹڑیوں پر ایسے بھاگ رہی تھی، جیسے کوئی آسیب اس کے تعاقب میں ہو۔

اسی ٹرین کی بزنس کلاس کے ایک کیبن میں موجود دو نفوس کو تھکن، پریشانی اور خوف نے کسی اژدہے کی مانند اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ دونوں میاں بیوی کی سوجن زدہ، سرخ آنکھیں بے خوابی کی غماز تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے یوں بیٹھے تھے، جیسے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا بھی گناہ کبیرہ ہو۔

چھ افراد کے اس کیبن میں اس وقت صرف وہ دونوں تھے۔ تین مسافروں کی منزل پچھلا اسٹیشن تھی۔ ان کے

گاڑی سے اترنے کے بعد مرد نے سانس کھینچ کر افسردگی کے اس سحر سے نکلنے کی شعوری کوشش کی اور بوگی کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

کیبن میں موجود واحد کھڑکی کے پاس اسٹینڈ والا میز تھا جس پر ان کا تھرماس' پانی کی بوتل اور بچے کے دودھ کا سامان رکھا ہوا تھا۔ پاس ہی کھانے کا ٹفن تھا جسے ان دونوں میں سے کسی نے بھی کھول کر نہیں دیکھا تھا حالانکہ انہیں سفر کرتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ رات کے اس پہر اب شاید ہی کوئی نیا مسافر اس ڈبے میں داخل ہو۔ لڑکی نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہی آنکھیں بند کیں اور ایک سلگتا ہوا منظر اس کے دماغ کی سلیٹ پر ابھرا۔

"مارو' ختم کرو' اللہ کا عذاب نازل ہو ان مردود لوگوں پر' قرآن پاک کی بے حرمتی کی ہے انہوں نے۔۔۔" مسجد کے مائیک سے پورے گاؤں میں گونجنے والی مولوی صاحب کی اشتعال انگیز آواز نے معصوم لوگوں کے جسموں میں گویا کوئی بارود بھر دیا۔

"خداوند یسوع' رحم' رحم۔۔۔" بوڑھی عورت خوف زدہ آنکھوں سے بدلے کی آگ کے شعلوں میں جلتا ہوا اپنا گھر دیکھ کر بین کرنے لگی۔ اس کی آواز دل چیر دینے والی تھی لیکن وہاں موجود زمینی خدا اس کی ایک بات سننے کو تیار نہ تھے۔

"سب کو ماردیا' ختم کردیا ظالموں نے۔۔۔" دل دہلا دینے والی آواز میں صدیوں کا کرب شامل ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کے ذہن کی طنابیں چٹخنے لگیں ہوں۔ وہ لب بھینچ کر اپنے دل کو بکھرتا ہوا محسوس کرنے لگی۔

"خدیجہ۔۔۔!" اس کے شوہر کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

"ہوں۔۔۔" وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے بے اختیار اپنی نم آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا۔ وہ شخص نظریں چرا کر اس کے سامنے والی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا' ایسا لگتا تھا جیسے لڑکی کے آنسوؤں نے اس کی قوت گویائی سلب کرکے رکھ دی ہے۔

اس دراز قد مرد نے بھورے رنگ کی جینز پر کتھئی رنگ کی شرٹ کے ساتھ لیدر کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جب کہ اس کی جوان بیوی سیاہ رنگ کے عبایہ میں تھی۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر بنا ہوا تھا اور آنکھیں شدت گریہ کی وجہ سے سوج چکی تھیں۔

مرد کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ اس نے افسردہ نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو نیلے رنگ کے کمبل میں لپٹا ہوا ماں کی گود میں گہری اور پر سکون نیند سو رہا تھا۔

"محمد احمد سو گیا کیا۔" مرد نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا جو ہونٹ کچلتے ہوئے آنکھوں میں تنی دھند کی چادر کو ہٹانے میں کوشاں تھی۔

"ہاں۔۔۔" وہ بمشکل زور لگا کر بولی۔ لفظ اس کے تالو سے چمٹ گئے تھے۔

"تم بھی سو جاؤ۔" بے خوابی کے عطا کردہ بوجھل پن نے مرد کو نڈھال کر رکھا تھا لیکن اسے پھر بھی اپنی شریک سفر کی فکر تھی۔

"میں جاگ رہی ہوں' آپ برتھ پر جاکر تھوڑا ریسٹ کرلیں۔" وہ ہاتھ میں پکڑے فیڈر کی سطح کو ناخنوں سے کھرچتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔ اسے معلوم تھا کہ آج کی رات رت جگا اس کا مقدر ہے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً ہی اس کی بات سے متفق ہوا اور کمبل اٹھا کر برتھ پر جاکر لیٹ گیا۔ ایک گھنٹہ کروٹیں بدلنے کے بعد کیبن میں اس کے خراٹے گونجنے لگے تو اس کی بیوی کا دل ایک دفعہ پھر کرب کی اتھاہ گہرائیوں میں

ڈوبنے لگا۔

وہ کھڑکی کے شیشے سے پار تاریکی میں باہر کے مناظر کو کھوجنے لگی۔ ایسی ہی تیرگی نے اس کے مقدر کو بھی اپنے حصار میں لے رکھا تھا..... اسے پتا ہی نہ چلا کہ آنسوؤں کے پرحدت قطرے مسلسل اس کے گالوں پر لڑھک رہے تھے' آج ان پر اس کا کوئی زور نہیں چل رہا تھا۔

دل و دماغ میں ایک حشر برپا تھا۔ ہر طرف دل کو چیر دینے والی آہیں اور سسکیاں تھیں۔

وہ رات بھی اس کا دکھ سمجھ چکی تھی' تب ہی تو ایک محسوس کی جانے والی اداسی نم آلود ہواؤں کے ساتھ فضا میں بین کرنے لگی..... بے ہنگم سوچوں نے اس کے وجود کو حصار میں لے رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لامتناہی گردش کے کسی بھنور میں پھنس چکی ہے۔ اس وقت ٹرین کے اس کیبن میں بچے سمیت تین مسافر تھے اور چوتھا مسافر جسے صرف وہ لڑکی ہی دیکھ سکتی تھی' اس کا نام تھا اجل.....

ہاں اجل یعنی موت.....

جو پر پھیلائے ان تینوں میں سے کسی ایک کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کو بے تاب تھی۔

ٹرین کی رفتار میں ایک دم ہی کمی آگئی' ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ماہر رقاصہ تھک کر آہستہ آہستہ زمین پر گرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ اس لڑکی نے اپنی گود میں موجود ننھے فرشتے کو دیکھا' جسے کچھ دیر پہلے ہی اس نے اپنے شوہر سے نظر بچا کر کھانسی کا شربت پلایا تھا' جس کے زیر اثر وہ مزید کئی گھنٹے تک گہری نیند سو سکتا تھا۔

"آئی ایم سوری بیٹا۔" وہ اس کی پیشانی' آنکھوں' ہونٹوں اور رخساروں کو دیوانہ وار چوم کر آہستگی سے بولی۔ وہ نیند میں ہلکا سا کسمسایا۔

"تمہاری ماں کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔" بے بسی کے احساس کے زیر اثر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

گاڑی چلتے چلتے ایک جھٹکے سے رکی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ اس کے دماغ نے سیکنڈوں میں ایک فیصلہ کیا اور اس سوچ نے اس کے اندر توانائی کا ایک جہان بھر دیا۔

ریلوے اسٹیشن پر لگے زرد رنگ کے بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ وہ کسی بیوہ کی طرح اجڑا ہوا اسٹیشن تھا' جس پر اکا دکا گاڑیاں ہی رکتی ہوں گی لیکن شاید اس وقت دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کا کوئی کراس تھا' تب ہی ڈرائیور نے ٹرین یہاں روک دی تھی' اسی وجہ سے یہاں نہ تو کوئی مسافر موجود تھا اور نہ ہی کوئی نیچے اترا تھا۔

ریلوے اسٹیشن کی چھوٹی سی عمارت خاصی خستہ حال تھی اور اس کا فرش بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ کمروں کو زنگ آلود تالے لگے ہوئے تھے۔ جیسے انہیں کھولے ہوئے صدیاں گزر چکی ہوں۔

اس لڑکی کا دل ایسے ڈوب کر دھڑکا جیسے آخری بار دھڑکا ہو۔ اس نے کن اکھیوں سے اپنے شوہر کو دیکھا جو برتھ پر لیٹا ہوا تھا اور کمبل میں اس کے خراٹے بلند آواز میں گونج رہے تھے۔ اس نے بچے کو ایک ہاتھ سے نرمی سے اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں ٹوکری پکڑی جس میں بچے کی کا سارا سامان تھا۔

اس کے ہاتھوں کی لرزش اس کے اندرونی خلفشار کی عکاسی کر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ٹرین کے کمپارٹمنٹ کی گیلری میں آئی' اسے لگا جیسے ایک پل میں صدیوں کا سفر طے کر آئی ہے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ سب مسافر خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے' اس نے ٹوکری نیچے رکھ کر ٹرین کا بھاری بھرکم دروازہ زور لگا کر کھولا۔ بزنس کلاس کی وجہ سے اس بوگی میں مسافروں کی تعداد خاصی کم

تھی' اکثر کیبن خالی ہی تھے۔ سخت سردی میں پوری ٹرین کی کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ خوف زدہ انداز میں ٹرین سے نیچے اتری۔ یخ بستہ ٹھنڈی ہوا نے بدن کو چھوا تو اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس نے ہراساں چہرے کے ساتھ دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس کی نظر شیشم کے درخت کے نیچے رکھے سنگ مرمر کے بینچ پر پڑی۔ وہ سرعت سے اس جانب بڑھی اور چلتے چلتے رکی اور خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دور کہیں کوئی آوارہ کتا بھونکا تھا۔ اس کا دل کانپ اٹھا لیکن جلد ہی اس نے خود کو حوصلہ دیا۔ اسے ہر قیمت پر اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنا تھا۔

اس لڑکی کی عقابی نظریں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھیں۔ اچانک ہی اس کی نظر سنگ مرمر کے بینچ کے نیچے بنی ایک محفوظ جگہ پر پڑی' جہاں وہ اپنے جگر گوشے کو اس کہر جماتی سردی کی ٹھنڈک سے بچا سکتی تھی۔

اس نے جلدی سے بینچ کے نیچے جھانکا اور تھوڑا سا جھک کر ٹوکری کو بینچ کے نیچے گھسایا اور سلیپنگ بیگ میں لپٹے بچے کو احتیاط سے لٹاتے ہوئے اس کا دل ایک لمحے کو ڈگمگایا۔

"مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" وہ کسی جذباتی رو میں بہنے ہی لگی تھی کہ دماغ نے دل کو دھکا دے کر اوندھے منہ گرا دیا۔

اسی لمحے رات کے ہیبت ناک سناٹے میں ٹرین کی سیٹی کی آواز گونجی' اس کے اندر کرنٹ سا دوڑا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا کمبل بھی اس سلیپنگ بیگ کے اوپر ڈال دیا تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد گاڑی ہلکی سی رینگی' وہ لڑکی بھاگ کر دوبارہ ٹرین میں سوار ہوئی۔ وہ اب دروازے میں کھڑی انتہائی صدمے بھرے انداز سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے دور ہوتا دیکھ رہی تھی۔

اس کی رنگت خطرناک حد تک سفید پڑ گئی اور اس کا سارا وجود کانپنے لگا اور اسے لگا جیسے اس کی سانسیں حلق میں اٹک کر رہ گئی ہوں۔ ریل پوری قوت سے پٹڑیوں پر دوڑ رہی تھی۔ وہ ٹرین کے دروازے میں ایسے کھڑی تھی جیسے کسی نے وہاں کوئی سنگی مجسمہ نصب کر دیا ہو۔

جیسے جیسے ٹرین آگے بڑھ رہی تھی' اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل کسی اندھی کھائی میں ڈوب رہا ہو۔ سرد ہوا کے ٹھنڈے یخ جھونکے اس کے وجود سے ٹکرا رہے تھے لیکن وہ اس وقت موسم کی سختیوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

اسے دروازے میں کھڑے تقریباً" بیس منٹ ہو چکے تھے اور اس کے شوہر کو ابھی تک اس کی غیر موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت وہ اذیت کی انتہا پر تھی۔ بیس منٹ کے اندر ہی پچھتاووں کے چالیس ناگ اس کے وجود کے گرد لپیٹ چکے تھے۔

"یہ میں نے کیا کیا.....؟" اس کا سر چکرانے لگا۔

اس کے باپ کو میں کیا جواب دوں گی کہ اس کی اولاد کو میں کس ویرانے میں پھینک آئی۔" اندر سے اٹھنے والی اس خوف کی لہر نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر ایک غلط فیصلہ تو کر آئی تھی اور اب اس کے مضر اثرات اسے ساری زندگی بھگتنے تھے۔

اس گاڑی کی مخالف سمت سے دوسری پٹڑی پر ایک ٹرین کا انجن دور سے کسی عفریت کی مانند آرہا تھا۔ وہ اس وقت ہوش و حواس سے بیگانہ بس ایک ہی سوچ میں مگن تھی کہ اسے اپنے بچے کو اس ویران اسٹیشن سے اٹھا کر واپس لانا ہے۔

"مجھے زنجیر کھینچ کر گاڑی روکنی چاہیے۔" اس سوچ نے اس کے اندر توانائی کا ایک جہان بھر دیا' وہ جو دروازے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑے کھڑی تھی' تو اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑی' دماغ چکرایا' اس نے خود کو سنبھالنے کی

کوشش کی، لیکن مخالف سمت سے آتی طاقتور ہواؤں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور اس کا پاؤں پھسلا اور وہ چلتی گاڑی سے، بہت بے رحم انداز میں گری۔
"محمد احمد!" اس کے حلق سے چیخ نکلی، وہ مرنا نہیں چاہتی تھی لیکن مخالف سمت سے آتی ٹرین اس کے وجود کو روندتی چلی گئی۔
دور کہیں ویرانے میں اجل نے حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا اور اس لڑکی کا وجود پرخچوں کی صورت فضا میں بکھر گیا۔ موت اس معصوم لڑکی کو بہت ظالمانہ انداز میں اپنے پنجوں میں دبوچ کر لے جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میر ہاؤس" کے ہال کمرے میں لگے گھڑیال کا گجر بلند آواز میں بجا۔ ٹن کی آواز نے سناٹے کے تالاب میں لمحے بھر کو گرداب پیدا کیا اور پھر ایک بھید بھری خاموشی نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ طوفانی بارش رک چکی تھی لیکن درختوں کی ٹہنیوں سے الجھتی سائیں سائیں کی آواز عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔
رات کا پچھلا پہر تھا اور ماحول میں پر ہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ درشہوار نے زبردستی اپنی چچازاد بہن طوبیٰ کا یخ ٹھنڈا ہاتھ پکڑا اور بالائی منزل سے گولائی کے رخ میں آتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس وقت مری کی فضاؤں میں سرد رات تاریکی کا کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔
"درشہوار... پلیز..." طوبیٰ نے اس کا ہاتھ دبا کر التجا کی۔ وہ بادل نخواستہ اس کے ساتھ چل رہی تھی۔
"ہرگز نہیں..." درشہوار کے انداز میں عجیب سی سرکشی اور بلا کا اعتماد تھا۔
"مجھے ڈر لگ رہا ہے..." طوبیٰ کی آواز ہلکی سی کانپی۔
"کچھ نہیں ہوتا..." درشہوار نے لاپروائی سے جواب دیا۔ ویسے بھی وہ کچھ ٹھان لیتی تو اس پر عمل درآمد کرنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ میر ہاؤس کی سب سے ضدی لڑکی مشہور تھی۔
طوبیٰ دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے اس کے ساتھ گھر کے پچھلی طرف پر بنے کوریڈور کی طرف نکل آئی جہاں پچھلے لان کا دروازہ تھا۔ درشہوار نے چنیوٹی لکڑی کے بنے دروازے کے سنہری ہینڈل میں ہاتھ میں پکڑی چابی گھمائی اور تھوڑا سا زور لگانے سے زنگ آلود تالا ٹھک کر کے کھل گیا۔ دونوں نے گھبرا کر اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ لیے، لیکن خیریت رہی اس وقت میر ہاؤس کے مکین اپنے اپنے کمروں میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔
دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی باہر نکلیں، مری کی یخ ہوا کا ایک نم آلود جھونکا انہیں کپکپی میں مبتلا کر گیا۔ رات کا آسمان، بارش کے بعد اب ستاروں سے مزین تھا اور اجلی چاندنی کی روشنی میں ہر چیز بہت پراسرار اور کسی حد تک ہیبت ناک لگ رہی تھی۔
"درشہوار..." طوبیٰ کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔
"خبردار، واپسی کی بات مت کرنا۔" درشہوار کی آنکھوں میں محسوس کی جانے والی ناراضی در آئی۔
"لیکن..." طوبیٰ نے خوف زدہ نگاہوں سے میر ہاؤس کے لان سے پار کچھ فاصلے پر گہرائی میں موجود گھنے جنگل کو دیکھا۔ اگرچہ لان کی دیوار پر ایک اور باڑھ لگا کر اسے جنگلی جانوروں سے محفوظ بنانے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن طوبیٰ اور درشہوار نے اس کا بھی حل ڈھونڈ رکھا تھا۔
پائن، شاہ بلوط، شیشم، صنوبر اور چیڑ کے گھنے درختوں والا یہ جنگل دن کی روشنی میں ہی خاصا خوفناک لگتا تھا اور چاندنی رات میں تو اس پر عجیب دل دہلا دینے والا رنگ چھایا ہوا تھا۔

"طوبی جلدی چلو..." درشہوار نے ٹارچ کی روشنی میں اپنی چچازاد کزن کو اشارہ کیا۔
"یار' دفع کرو' واپس چلتے ہیں۔ میرا دل سخت گھبرا رہا ہے۔" طوبی نے خوف زدہ نگاہوں سے سامنے لگے شیشم کے درخت کو دیکھا جس کی ٹہنیوں کا سایہ زمین پر خوف ناک قسم کے نقش و نگار بنا رہا تھا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" درشہوار نے مڑ کر کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر ایک دم وہ ہو گیا' جس کی ان دونوں کو توقع ہی نہیں تھی۔ مری کی خاموش فضا میں گویا کسی نے صور پھونک دیا تھا۔
"دماغ ٹھیک ہے تم دونوں کا۔" میر ہاؤس کا پچھلا دروازہ کھلا اور شاہ میر کا غصے سے بھرپور چہرہ نمودار ہوا۔ آدھی رات کی خاموشی میں شاہ میر کی جھنجلائی ہوئی آواز نے ان دونوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔
طوبی کو مری کے سارے پہاڑ اپنے اوپر گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رنگ تو درشہوار کا بھی فق ہو گیا تھا' لیکن اس نے بڑی مہارت سے خود پر قابو پا لیا' ویسے بھی شاہ میر تو اس کا سگا بھائی تھا۔ اصل شامت تو طوبی کی آنے والی تھی' جو اس کی چچازاد ہونے کے علاوہ پکی حریف بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے عزت کروانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔
"اب کیا سکتہ ہو گیا ہے تم دونوں کو؟" ان دونوں کی خاموشی پر وہ کاٹ کر گویا ہوا۔
"درشہوار... میرو..." طوبی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔
"خبردار' کچھ بھی مت بتانا۔" درشہوار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تنبیہہ کی۔
"کیا بھنگ پی رکھی ہے تم دونوں نے؟ عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے؟ چلو اندر' جا کر بتاتا ہوں میں سب کو۔" شاہ میر کی دھمکی پر طوبی اور درشہوار کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ وہ دونوں ہراساں نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔
"اب کیا داجی کی مرسڈیز منگواؤں تم دونوں شہزادیوں کے لیے۔" شاہ میر انہیں اپنی جگہ کھڑے دیکھ کر سخت کوفت کا شکار ہوا۔
"آرہے ہیں بھائی۔" درشہوار نے تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کیا۔
"آئے دن ایڈونچر سوجھتے ہیں مہارانیوں کو..." وہ بالکل عورتوں کی طرح طعنے دیتا ہوا ان کے آگے چل رہا تھا اور طوبی اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے درشہوار کی باتوں میں آکر "مشن امپاسیبل" پر کام کرنے کی ہامی بھری تھی۔
میر ہاؤس' کشمیر پوائنٹ سے کچھ فاصلے پر ایک خوب صورت بنگلہ تھا۔ اس کی زمین میر حاکم علی کے آباؤاجداد کو انگریز حکومت نے اپنی خاص وفاداری کے انعام کے طور پر "تحفتا" دی تھی' جس پر حاکم علی کے والد میر مراد علی نے گھر تعمیر کرا لیا تھا۔
بہت سال بعد جب مراد علی کا انتقال ہوا تو ان کے چالیسویں والے دن اس بنگلے میں اچانک ہی آگ بھڑک اٹھی اور کئی ملازم زندہ جل مرے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے میر حاکم علی نے اسے گرا کر دوبارہ سے تعمیر کروایا اور اب وہاں میر حاکم کے دو بیٹوں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد تھا ـــــــ میر حاکم کی دو بیٹیاں بھی تھیں جن میں سے فوزیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے دو بچے نمیرہ اور ارسل اسی گھر میں پل کے جوان ہوئے تھے جب کہ دوسری بیٹی فائزہ اپنی فیملی کے ساتھ ملک سے باہر مقیم تھیں۔
حاکم علی کے بڑے بیٹے محتشم علی کے تین بیٹے وہاج' برہان' شاہ میر اور ایک بیٹی درشہوار تھی اور ان کی بیوی تاجدار بیگم ان کی فرسٹ کزن اور حاکم علی کی سگی بھتیجی تھیں۔

جب کہ محتشم سے چھوٹے خاقان علی نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ تھیں' طوبیٰ کی پیدائش پر کوئی پیچیدگی ہونے کی وجہ سے مزید اولاد نہیں ہو سکتی تھی اس لیے انہوں نے بیٹے کے لیے دوسری شادی ندرت بیگم سے کی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ان کی دوسری بیوی ندرت بیگم سے بھی ان کی کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

میر حاکم علی کی بڑی بیٹی فوزیہ اور اس کے شوہر کی اچانک فضائی حادثے میں موت کے بعد ان کے دونوں بچوں نمیرہ اور ارسل کو "میر ہاؤس" میں ندرت بیگم کی گود میں ڈال دیا گیا۔ ان کی پرورش انہوں نے ہی کی تھی۔

اس طرح اس گھر میں چار لڑکیاں اور چار لڑکے تھے جن میں سے وہاج بھائی اپنے داجی اور والد محتشم علی کے ساتھ سیاست میں اور برہان ڈاکٹریٹ کر کے قائداعظم یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر اور شاہ میر پاک آرمی میں کیپٹن رینک پر آج کل اپنی یونٹ کے ساتھ کھاریاں کینٹ میں تعینات تھا' جب کہ ارسل یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ برہان کا نکاح اس وقت اس کی چچازاد انابیہ سے کر دیا گیا تھا' جب وہ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ملک سے باہر جا رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"میر ہاؤس" کے ہال کمرے میں اس وقت ایک عدالت سجی ہوئی تھی۔ عدالت میں جج کے فرائض در شہوار اور شاہ میر کی والدہ تاجدار بیگم سر انجام دے رہی تھیں۔ جنہیں سب تائی امی کہتے تھے۔ وہ میر حاکم کی چہیتی بہو اور میر محتشم صاحب کی بیگم تھیں۔ میر ہاؤس میں زیادہ تر ان ہی کی حکمرانی چلتی تھی۔ ہال کمرے میں بہت قدیم اور قیمتی شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بیش قیمت فریموں میں جڑی میر حاکم علی کے خاندان کے آباؤ اجداد کی شاہانہ تصویروں سے جھلکتا غرور' اس گھر کے اکثر مکینوں کی آنکھوں میں بھی نظر آتا تھا۔ برٹش انڈیا کے دور کے فوجی یونیفارم میں حاکم علی کے بزرگوں کی کچھ تصاویر بھی موجود تھیں۔ ہال کمرے کے درمیان میں ایرانی قالین بچھا ہوا تھا اور ایک طرف شیشے کی بڑی سی ڈائننگ میز کے ارد گرد بارہ کرسیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ لاؤنج اور ڈائننگ روم' دونوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہال میں ایک طرف چنیوٹی لکڑی کا بنا ایک بڑا شاندار سا تخت رکھا ہوا تھا جس پر مخمل کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اسی تخت پر اس وقت تاجدار بیگم اپنی دونوں دیورانیوں شارقہ بیگم اور ندرت بیگم کے ساتھ موجود تھیں شارقہ بیگم کا انداز برہم اور ندرت بیگم کے انگ انگ سے بے چینی اور تجسس ٹپک رہا تھا۔

ایرانی قالین پر دو مجرم' در شہوار اور طوبیٰ کی شکل میں موجود تھے اور عینی گواہ کیپٹن شاہ میر اس وقت ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر آلتی پالتی مارے مزے سے ٹھنڈا ٹھار تربوز کھاتے ہوئے طوبیٰ کا سرخ چہرہ اپنی شوخ نظروں کے حصار میں لیے ہوا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ' کیا کرنے گئی تھیں وہاں آدھی رات کو؟" تاجدار بیگم نے سلگ کر اپنی صاحبزادی در شہوار کو دیکھا۔

"ذرا سوچیں امی' اگر میری آنکھ نہ کھلتی تو صبح ان کی لاشیں ہی ملتیں اس جنگل سے۔" شاہ میر کی شرارتی آنکھوں میں چمکتے جگنو اگر اس سے طوبیٰ کے ہاتھ آ لگتے تو وہ ان کی گردن مروڑ کر کسی گہری کھائی میں پھینک آتی۔

"اچھا ہے" آپ لوگوں کا جہیز کا خرچا بچ جاتا۔" ایسی صورت حال میں اتنا جذباتی اور بے باک جملہ اس گھر کی ایک ہی لڑکی کی طرف سے آسکتا تھا اور وہ تھی وہاج' برہان اور شاہ میر کی اکلوتی بہن در شہوار۔۔۔۔ اس کی بھوری آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اور شوخی کے ساتھ ساتھ بغاوت کے رنگ تاجدار بیگم کی راتوں کی نیند حرام کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ اس کا ہر معاملے میں بے دھڑک رویہ کسی دن گھر کے مردوں کو بری طرح کھٹکنے

لگے گا۔ ابھی تک تو وہ اپنے تین بھائیوں' باپ' چچا اور داجی سب کی ہی لاڈلی تھی اور اس چیز کا ناجائز فائدہ بھی اکثر اٹھاتی رہتی تھی۔

"اچھا!! تو ہمارا جہیز کا خرچا بچانے کے لیے خودکشی کرنے جارہی تھیں آپ' وہ بھی اپنی مشیر خاص طوبیٰ محتشم علی کے ساتھ۔" شاہ میر نے اپنا قہقہہ حلق میں دبایا کیوں کہ نقص امن کا اندیشہ تھا۔

"آپ تو چپ ہی رہیں' سارا فساد ہی آپ کا پھیلایا ہوا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں بھلا بڑے بھائی' اونہہ۔۔۔" درشہوار نے اپنے سے پانچ سال بڑے بھائی کی طبیعت صاف کی۔ اس کی اس بدتمیزی پر تاجدار بیگم نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ان کی دیورانی ندرت بیگم نے طنزیہ نگاہوں سے اپنی سوتن شارقہ بیگم کو دیکھا' جو اس وقت کھا جانے والی نگاہوں سے اپنی بیٹی طوبیٰ کو دیکھ رہی تھیں جو ہر معاملے میں درشہوار کی "کرائم پارٹنر" کہلاتی تھی۔ درشہوار اور طوبیٰ ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں' دونوں میں ہی بلا کی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ میر ہاؤس کی خواتین کو ان کی آئے دن کی شرارتوں نے سخت بے زار کر رکھا تھا۔

"ہائے ہائے بھابھی! دیکھیں ذرا درشہوار کو' اسے تو چھوٹے بڑے کسی کا بھی لحاظ نہیں۔" خاقان کی دوسری بیگم ندرت چچی نے فوراً ہی لبوں پر ہاتھ رکھ کر مصنوعی حیرانی کا اظہار کیا۔ ان کی اوور ایکٹنگ درشہوار کو سخت ناگوار گزری' لیکن یہ موقع اپنی زبان کے جوہر دکھانے کا نہیں تھا۔

"بہت زبان چلتی ہے تمہاری۔" تاجدار بیگم نے جھنجلا کر اپنے سامنے رکھا پان دان زور سے بند کیا۔

"اب بندہ اپنے حق کے لیے بولے بھی نا۔۔۔" اس دفعہ صاحبزادی کی آواز میں ذرا دم کم تھا۔

"یہ تقریر اپنے داجی اور باپ کے سامنے کرنا' مال روڈ پر پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیں گے۔" وہ تڑخ کر بولیں۔

"نہیں ہم اس کے لیے ایوبیہ بہتر جگہ ہے مال روڈ پر رش بہت ہوتا ہے۔" درشہوار کی زبان پھر پھسلی اور اپنی دونوں دیورانیوں کے سامنے اکلوتی بیٹی کی زبان درازی نے تاجدار بیگم کو سخت خفت میں مبتلا کیا۔

"دیکھو شاہ میر' کیسے پٹر پٹر جواب دے رہی ہے ماں کو' یہ طوبیٰ بھی تو ہے مجال ہے بچی نے پلٹ کر ایک لفظ بھی کہا ہو۔" تاجدار بیگم کا پارہ ہائی ہوا۔ شاہ میر مسکراتا ہوا جھٹ سے طوبیٰ کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔ طوبیٰ کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ اس فسادی کو مکھی بنا کر دیوار پر چپکا دے۔

"خیر' یہ بچی بھی کسی سے کم نہیں۔ یاد نہیں وہاج بھائی کے پالتو کتے کی ٹانگ زخمی کردی تھی اس نے پتھر مار کر۔" شاہ میر نے کچھ عرصے پہلے کا واقعہ ہنستے ہوئے یاد دلایا تو طوبیٰ نے بے اختیار اسے دل میں تین چار ناقابل اشاعت گالیوں سے نوازا۔

"ہاں تو پیٹ پر چودہ ٹیکے لگوانے سے اچھا ہے' بندہ اس کتے کے ساتھ ہی کتے والی کردے۔" درشہوار نے اپنی کزن کی بیسٹ فرینڈ ہونے کا حق ادا کیا۔

"درشہوار! زبان بند کرو اپنی۔۔۔" تاجدار بیگم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا۔

"توبہ توبہ بھابھی' میں تو اس وقت سے سوچے جارہی ہوں' اس جنگل میں تو کوئی دن کی روشنی میں بھی جانے کی ہمت نہیں کرتا' ان لڑکیوں کو بھلا سوجھی کیا' جو وہاں چل دیں منہ اٹھا کر۔۔۔؟" ندرت چچی نے اسٹار پلس کی کسی کٹنی ساس کی طرح ہاتھ مل کر سب کی توجہ ایک دفعہ پھر اسی جانب مبذول کروادی جہاں سے درشہوار اپنی ذہانت سے انہیں ہٹا چکی تھی۔

"اب منہ میں زبان نہیں ہے تم لوگوں کے' آخر ایسی کون سی مار پڑ گئی تھی؟" پان کے پتے پر چونا لگا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

شارقہ بیگم بھی کار خیر میں اپنا حصہ ڈالنے کو بول پڑیں۔ ویسے بھی جہاں ان کی سوکن ندرت بیگم اظہار خیال فرمادیتیں' وہاں ان کا بولنا بھی واجب ہوجاتا تھا۔

"آپ لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہیں چچی جان۔" در شہوار نے برا سا منہ بنایا۔

"دیکھیں لیں بھابھی...." ندرت چچی کا انداز سراسر آگ لگانے والا تھا۔

"اپنی اولاد تو ہے نہیں اور دوسروں کے بچوں کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔" در شہوار نے دل ہی دل میں ندرت چچی کو خراج تحسین پیش کیا' جب کہ طوبیٰ تو ہراساں نگاہوں سے اپنی والدہ شارقہ بیگم کے ماتھے پر پڑے بل گننے میں مصروف تھی۔

"آلینے دو ذرا تمہارے داجی کو' تمہاری تو اچھی ٹیوننگ کرواؤں گی۔" تاجدار بیگم نے اپنے سسر کا نام لے کر ڈراوا دیا۔

"بس فیصلہ ہوگیا' ایک دفعہ ان ہی کے ہاتھوں بے عزت کروالیجیے گا' ابھی تو سکون سے ناشتا کرنے دیں۔" در شہوار بے تکلفی سے شاہ میر کا ہاتھ پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل پر لے آئی اور مزے سے بھائی کے ساتھ مل کر تربوز کھانے لگی۔ در شہوار کی اس حرکت پر تاجدار بیگم کھسیا کر رہ گئیں۔

"بھئی میرا تو دماغ خراب کردیا ہے اس لڑکی نے' اس کا باپ ہی پوچھے گا اسے" انہوں نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف سے معاملے پر مٹی ڈالی اور بے زاری سے ملازمہ کو آوازیں دیتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئیں' ندرت بیگم سخت بے مزا ہوئیں۔

"در شہوار تو ہے ہی ازل سے لاپروا' کم از کم طوبیٰ! تمہیں ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔" ندرت بیگم نے اپنی سوتن کو تپانے کے لیے سارا ملبہ طوبیٰ پر ڈالا' جو کینہ توز نگاہوں سے در شہوار اور شاہ میر کی طرف دیکھ رہی تھی' اس حملے پر بوکھلا گئی۔

"خاقان صاحب کو پتا چلا تو بہت خفا ہوں گے۔" ان کی اگلی بات پر طوبیٰ سے زیادہ اس کی والدہ شارقہ بیگم کا رنگ فق ہوا۔

"آپ کے علاوہ اور کون بتائے گا انہیں' بارہ مسالے کی چٹ پٹی چاٹ بنا کر۔" در شہوار تربوز کھاتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تو شاہ میر کو ہنسی آگئی۔ طوبیٰ کو لگا جیسے دونوں بہن بھائی اس پر ہنس رہے ہیں' وہ دل ہی دل میں در شہوار سے سخت خفا ہوگئی۔

"تم چلو ذرا کمرے میں...." شارقہ بیگم کا لہجہ سخت اور آنکھوں سے ناراضی چھلک رہی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگی۔

اسے معلوم تھا در شہوار ہمیشہ کی طرح صابن سے تار کی طرح نکل جائے گی اور حسب سابق پھندہ طوبیٰ کی پتلی گردن میں ہی پھنسے گا کیوں کہ شارقہ بیگم' اپنی بیٹیوں کو کسی قسم کی رعایت دینے کے حق میں نہیں تھیں اور خاقان صاحب کی دوسری شادی کے بعد ان کا مزاج تو ویسے ہی عجیب سا ہوگیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتیں اور پھر بلند آواز میں رونے لگتیں۔ سو یہی ہوا' کمرے میں پہنچتے ہی ان کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

"کون سا خزانہ چھپا ہوا تھا اس جنگل میں' جس کی تلاش میں آدھی رات کو نکلی تھیں باہر۔" انہوں نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر ناراضی سے پوچھا۔ وہ شرمندہ سی سر جھکا کر دبک کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں موجود تابیہ نے اپنی الماری ٹھیک کرتے ہوئے گھبرا کر ماں کا مشتعل انداز دیکھا۔

"دیکھنا' وہ شاطر عورت کیسے بھڑکائے گی تمہارے باپ کو' وہ تو پہلے ہی چار چار دن حال نہیں پوچھتے ہمارا۔"

شارقہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گھما کر دو چار تھپڑ رسید کر دیتیں اسے۔

"ہزار دفعہ بتایا ہے، جٹھانی صاحبہ تو سسر کی ناک کا بال بنی رہتی ہیں اور در شہوار دادا کی چہیتی، ہمیں کون گھاس ڈالتا ہے اس گھر میں، جس دن غصہ آیا نا انہیں، ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کریں گے ہم تینوں ماں بیٹیوں کو۔" شارقہ بیگم اتنی جذباتی ہوئیں کہ آنسوؤں سے ان کا گلا رندھ گیا۔ طوبیٰ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔ انابیہ نے ایک ملامتی نگاہ چھوٹی بہن پر ڈالی اور وارڈ روب کا پٹ بند کر کے پریشانی سے ماں کی طرف بڑھی۔

"آپ کیوں ہلکان کر رہی ہیں خود کو، سمجھا دوں گی میں اسے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"کچھ عقل دے دو اسے، ورنہ کہہ دوں گی میں تمہارے باپ کو، کہیں رشتہ دیکھ کر رخصت کریں اسے، میری جان کی تو خلاصی ہو۔" وہ ٹھیک ٹھاک گرج برس کر کمرے سے نکلیں تو طوبیٰ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"سچ سچ بتاؤ، وہاں جانے کا مشورہ در شہوار نے دیا تھا نا....؟" انابیہ کے درست اندازے پر طوبیٰ رونا بھول گئی۔ ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے ناک کو رگڑا دیا۔ اس وقت دنیا جہاں کی معصومیت اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

"ہاں...." اس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

"اس کی بے وقوفیوں کے قصے تو پورے مری میں مشہور ہیں، تم کیوں آنکھیں بند کر کے چل پڑتی ہو اس کے پیچھے۔" انابیہ کو اس پر غصہ آیا۔ "اب شرافت سے بتاؤ، کیا کرنے گئی تھیں وہاں؟"

"برگد کے درخت پر منت کا دھاگہ باندھنے...." طوبیٰ نے ہلکا سا جھجک کر بتایا۔ ویسے بھی سگی بہن سے کیا پردہ تھا اس کا۔

"او میرے خدایا.... وہ سو سالہ پرانا آسیب زدہ درخت؟" انابیہ کی آنکھیں خوف سے پھٹنے کے قریب آگئیں۔

"تم لوگ آدھی رات کو وہاں جا رہی تھیں؟" اسے ابھی تک یقین نہیں آیا۔

"ہاں نا، در شہوار کہتی ہے، چاند کی چودھویں کو وہاں دھاگہ باندھنے سے دل کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔" طوبیٰ کا معصومانہ انداز اسے سلگا گیا۔

"شرم کرو، ایک مسلمان لڑکی ہو کر ایسا غلط عقیدہ؟ بھلا درختوں پر دھاگے ٹانکنے سے بھی دل کی مرادیں پوری ہوتی ہیں؟ ان کو پورا کرنے والی ذات تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ بہت افسوس ہوا، تم ایسی فضول چیزوں پر یقین کرتی ہو۔" انابیہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"مجھ سے تو در شہوار نے کہا تھا۔" اس نے گھبرا کر اپنی صفائی دی۔

"بائی داوے، کون سی دل کی مراد تھی وہ، جس نے تمہیں جان ہتھیلی پر رکھنے پر مجبور کر دیا اور تم اس بے وقوف کا ہاتھ پکڑ کر چل دیں۔" انابیہ نے محض اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھا۔

"پتا تو ہے، ایف ایس سی کا رزلٹ آنے والا ہے۔" اس نے نظریں چرا کر مزید کہا۔ "کیمسٹری کا پرچہ بھی تو بہت برا ہوا تھا۔" اس کے رنجیدہ لہجے پر انابیہ کو نا چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

"تم نے اور در شہوار نے پڑھا بھی کب تھا۔" انابیہ نے یاد دلایا۔ "یاد نہیں کیمسٹری کے پرچے سے ایک دن پہلے تو تم دونوں بندر پکڑنے کی مہم پر نکلی ہوئی تھیں پنڈی پوائنٹ پر۔" انابیہ کی یادداشت بہترین تھی اور اس دن کا قصہ تو اسے ازبر تھا، کیوں کہ ڈرائیور نے گھر آکر ان کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

"وہ تو شاہ میر کے ساتھ شرط لگی تھی ہماری۔" اس نے جھٹ سے صفائی پیش کی۔

"وہ کون سا کسی سے کم ہے، اس بندر والی بات کا جب تائی اماں کو پتا چلا تھا تو صاف مکر گیا کہ اس نے ایسی کوئی

شرط لگائی ہی نہیں۔" انابیہ نے اس کے پرانے زخم تازہ کیے۔
"وہ تو ہے ہی خبیث روح۔" طوبیٰ کو ایک دم ہی غصہ آگیا۔
"دونوں بہن بھائی ہی ایک نمبر کے فسادی اور سازشی ہیں' اب آج کا ہی واقعہ دیکھ لو' درشہوار کو کوئی کچھ نہیں کہے گا اور سارا نزلہ گرے گا تم پر' اس لیے بار بار سمجھاتی ہوں' ان دونوں بہن بھائیوں کی باتوں میں آنے کی ضرورت نہیں۔" انابیہ نے ایک دفعہ پھر اسے لمبا لیکچر دیا۔
"برہان بھائی تو ایسے نہیں ہیں۔" طوبیٰ کے منہ سے نکلنے والے اس بے ساختہ جملے پر وہ ایک دم شرم سے سرخ ہوئی۔ طوبیٰ نے دلچسپی سے بہن کے چہرے پر اترتی دھنک دیکھ کر شوخی سے آنکھیں مٹکائیں۔ "وہ بھی تو شاہ میر اور درشہوار کے ہی بھائی ہیں' لیکن کوئی فالتو بات نہیں کرتے۔"
"وہ تو خیر "فالتو" کیا "ضروری" بات بھی نہیں کرتے کیوں کہ انہیں اس گھر میں کوئی اپنے لیول کا لگتا ہی نہیں۔" انابیہ کو نکاح کے بعد برہان کا سرد رویہ بہت دکھی کرتا تھا۔ اس کا اظہار وہ اکثر اٹھتے بیٹھتے نادانستگی میں بھی کر جاتی۔
"تو پھر کیا خیال ہے' ایک دھاگہ ان کے لیے بھی باندھ آئیں' برگد کے درخت پر۔" طوبیٰ نے شرارتی انداز میں انابیہ کو چھیڑا۔
"فضول باتیں مت کرو طوبیٰ! میرے عقائد الحمدللہ بالکل ٹھیک ہیں' تم اپنا قبلہ درست کرو' ورنہ ندرت امی' بابا کو بھڑکاتی رہیں گی اور ہماری امی بے چاری کی شامت آتی رہے گی۔" انابیہ کی حساس طبیعت کو اپنی ماں کا دکھی ہونا گوارا نہیں تھا۔
"ہاں بابا کو بھی تو پوری دنیا میں نیک' شریف اور ستی ساوتری قسم کی مخلوق بس ندرت امی اور ان کی لے پالک اولاد' نمیرہ ہی لگتی ہے۔" طوبیٰ اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں ناک چڑھا کر بولی۔
"بہت بری بات ہے طوبیٰ' نمیرہ ہماری بھی تو سگی پھوپی کی بیٹی ہے۔" انابیہ نے اسے یاد دلایا۔
"کاش جس حادثے میں فوزیہ پھپھو اور ان کے شوہر کا انتقال ہوا' اس جہاز میں یہ کم بخت نمیو بھی ساتھ ہوتی۔" اس کے حسرت بھرے انداز پر انابیہ کو ہنسی آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ درشہوار اور طوبیٰ' دونوں کی نمیو سے بالکل نہیں بنتی تھی' اس کی بڑی وجہ اس کی لگائی بجھائی کی عادت تھی' اوپر سے وہ اپنے دونوں ماموں اور نانا کی بھی چہیتی تھی' یہ اور بات کہ درشہوار کے سامنے اکثر اس کا پتا بھی کٹ جاتا تھا۔
"ابھی تک پہنچی نہیں وہ "بی بی سی مری" چسکے لینے......" انابیہ نے حیرانی کا اظہار کیا ہی تھا کہ اسی لمحے ان کے کمرے کا دروازہ دھڑ کر کے کھلا اور نمیرہ کا پرجوش چہرہ سامنے دیکھ کر دونوں بہنوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔
"سنا ہے' بہت بے عزتی خراب ہوئی ہے آج "کچھ" لوگوں کی۔" نمیرہ نے چیونگم چباتے ہوئے طنزیہ انداز میں طوبیٰ کا خفت زدہ چہرہ دیکھا۔
"تم سے کس نے کہا......؟" وہ صاف مکر گئی اور فوراً "وظیفوں کی کتاب" کھول کر خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔
"شاہ میر بتا رہا تھا......" نمیرہ نے کن اکھیوں سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر چٹخارہ لیا۔
"ایک نمبر کا جھوٹا اور فسادی ہے وہ' اسے تو انڈیا کی سرحدوں پر چھوڑ آنا چاہیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔" وہ حسب عادت بھڑک اٹھی۔
"ہوں ہوں......" انابیہ نے ہلکا سا ہنکارا بھر کر اسے زبان بندی کا اشارہ کیا۔
"ویسے کرنے کیا گئی تھیں تم دونوں وہاں......؟" اس نے دائیں بائیں دیکھ کر رازداری سے پوچھا۔

"تمہارے لیے رنگ گورا کرنے والی جڑی بوٹیاں لینے۔۔۔" طوبیٰ کے بے ساختہ انداز پر نیمرہ اچھی خاصی جھینپ گئی۔ اسے گھر کی باقی لڑکیوں کے مقابلے میں اپنی گندمی رنگت کا بہت احساس تھا۔

"اچھا بکو مت۔۔۔۔" وہ ایک دم جھینپ گئی۔

"تمہارے سر کی قسم۔۔۔۔" طوبیٰ نے فوراً" ہی جھوٹی قسم کھالی۔ "خیر چھوڑو' امتحان میں کامیابی کا وظیفہ ملا ہے مجھے' کروگی؟" اس نے فوراً" ہی نیمرہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور وہی ہوا' اسے اپنے آنے کا مقصد بھول کر رزلٹ کی فکر پڑ گئی۔

"قسم سے جلدی بتاؤ' میرا تو کیمسٹری کے ساتھ ساتھ پاک اسٹڈیز کا پرچا بھی بہت بُرا ہوا تھا۔" وہ بے چینی سے اس کے بالکل پاس آکر بیٹھ گئی۔

"میں تو ابھی تک حیران ہوں' تم قائداعظم کے چودہ نکات کی بجائے اٹھارہ کیسے لکھ آئیں۔" طوبیٰ نے ہنس کر اس کا مذاق اڑایا۔ وہ' درشہوار اور نیمرہ' تینوں ہم جماعت تھیں' جب کہ انابیہ ان سے دو سال سینئر تھی۔

"مسئلہ چودہ نکات کا نہیں ان زائد چار نکات کا تھا' جو مجھے پتا ہی نہیں چل رہے تھے کہ میرے کون سے ہیں اور قائداعظم کے کون سے؟" نیمرہ کے خجالت بھرے انداز پر دونوں بہنوں کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

"اچھا' اچھا' اب تم دونوں مذاق مت اُڑاؤ اور وظیفہ بتاؤ جلدی سے' آج ہی شروع کرتی ہوں۔" وہ منہ بنا کر گویا ہوئی۔

"رہنے دو' مشکل ہے' تم نہیں کرسکوگی۔"

طوبیٰ کے چیلنج دلاتے انداز پر نیمرہ پرجوش ہوئی۔ "کیوں نہیں کرسکوں گی' تم بتاؤ تو سہی۔"

"درود شریف کی روزانہ پانچ سو دفعہ تسبیح' کرلوگی ایک ہی جگہ بیٹھ کر۔۔۔۔" طوبیٰ نے بے پروائی سے بتاتے ہوئے کتاب بند کی۔

"پانچ سو تسبیح۔۔۔۔ روزانہ۔۔۔۔؟" نیمرہ کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور اس نے بوکھلا کر اپنی کزن کی شکل دیکھی۔

"میں نے کہا تھا نا' تم نہیں کرسکوگی۔" ایک کمینگی سے بھرپور مسکراہٹ طوبیٰ کے چہرے پر ابھری۔ اس نے بھی نیمرہ کی نفسیات پر پی ایچ ڈی کر رکھی تھی اور وہی ہوا جس کا اسے یقین تھا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں' ابھی جاکر شروع کرتی ہوں میں۔" وہ پرعزم انداز کے ساتھ اٹھی اور سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی طوبیٰ نے ایک آنکھ دبا کر انابیہ کی طرف شوخی سے اشارہ کیا۔ جو اس کی شرارت سمجھ چکی تھی۔

"اب تم بھی یہی وظیفہ کروگی کیا۔۔۔۔؟" انابیہ اس کا استری شدہ سوٹ الماری میں لٹکاتے ہوئے شرارت سے بولی۔

"جی نہیں' اپنے لیے تو کوئی آسان سا ڈھونڈوں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے ایک دفعہ پھر کتاب پر جھک گئی اور انابیہ کو اس کی بات پر نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

☼ ☼ ☼

رومیصہ ٹی وی لاؤنج میں رکھے کاؤچ پر افسردہ انداز میں لیٹی' ایکوریم میں گولڈ فش کو تیرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں ایکوریم کی لال پیلی روشنیوں پر تھیں اور دماغ کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ گولڈن فش پرسکون ماحول میں قلابازیاں کھا رہی تھی اور کچھ ایسی ہی اکھاڑ پچھاڑ رومی کے دماغ میں جاری تھی۔ اس کے ماتھے کی ابھری

ہوئی رنگت اس کی اندرونی خلفشار کی عکاسی کررہی تھی۔ ایک بے چارگی آمیز کرب اس کی نیلگوں آنکھوں سے صاف چھلک رہا تھا۔ یہ اسلام آباد کے ایف سیون سیکٹر میں واقع ایک اسٹائلش سے بنگلے کا اندرونی منظر تھا۔ اس کی سجاوٹ منفرد، دلکش اور دوسروں کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرانے والی تھی۔ لاؤنج کی ایک دیوار شیشے کی تھی، جس سے لان میں بنائی گئی مصنوعی آبشار، سوئمنگ پول اور بے تکلفی سے گھومتا ہوا مور ہروقت نظر آتا تھا۔ اس بنگلے کے سیکنڈ فلور پر رومیصہ کی ماما ٹینا بیگم کا مشہور معروف بیوٹی سیلون "اور جم تھا" جس کا راستہ پچھلے لان کی جانب تھا، ساری آمدورفت وہیں سے ہوتی تھی۔ فیشن انڈسٹری میں ٹینا بیگم کا نام کسی تعارف کی محتاج نہیں تھا۔ ان کے بیوٹی سیلونز کی ایک چین "ٹیناز" کے نام سے مختلف شہروں میں موجود تھی اور حال میں انہوں نے ایک ڈیزائنر لان بھی مارکیٹ میں متعارف کرواکر دھوم مچادی تھی۔

رومیصہ نے سائیڈ میز پر رکھے فیشن میگزین کو۔ ایک دفعہ پھر مجروح نگاہوں سے دیکھا، اس کے ایک سلسلے شوبز مسالا میں ٹینا بیگم اور مشہور و معروف بیورو کریٹ سیف الرحمٰن کے تازہ ترین اسکینڈل کو بڑا نمایاں کیا گیا تھا اور تجزیہ نگار کا کہنا تھا ٹینا بیگم عنقریب اپنے تیسرے شوہر ہارون رضا سے جان چھڑا کر سیف الرحمٰن سے چوتھی شادی کرنے کے چکر میں ہیں۔ اس خبر نے رومیصہ کی روح تک کو زخمی کردیا تھا۔ پانچ فٹ سات انچ قد کے ساتھ ٹینا بیگم ماڈلز والی جسامت رکھتی تھیں، چھیالیس سال کی عمر میں بھی ایک چلتی پھرتی قیامت تھیں۔ فیشن میگزین میں ان کی کچھ تصاویر کو بڑے نمایاں انداز میں شائع کیا تھا جس میں ٹینا بیگم کے بغیر آستین کے بلاؤز اور شفون کی ساڑھی میں جسم نمایاں تھا۔

پہلے شوہر سے ٹینا بیگم کی دو بیٹیاں، شیری اور رومی تھیں اور اس کے بعد انہوں نے ______ کوئی اور بچہ پیدا کرنے کی غلطی نہیں کی۔ ان کی بڑی بیٹی شیری او لیولز کے بعد لاء کی ڈگری لینے ملک سے باہر چلی گئی تھی اور چھوٹی رومیصہ عرف رومی ان کے ساتھ تھی۔ جس کے ساتھ ان کے تعلقات سخت کشیدہ رہتے تھے۔ اس کا اندازہ شیری کو پاکستان سے آنے والی فون کالز سے ہوتا رہتا تھا۔

ٹینا بیگم، رومیصہ کو بھی اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیجنا چاہتی تھیں مگر رومی پاکستان چھوڑنے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھی۔ رات اسی بات پر پھر ماں بیٹی کے درمیان سخت جھگڑا ہوا، جس کے نتیجے میں رومی نے ان کا فرانس سے لایا گیا قیمتی ڈنر سیٹ توڑ دیا اور انہوں نے غصے میں رومی سے گاڑی کی چابی چھین لی۔ اس کے بعد جو ہنگامہ ہوا، وہ بنگلے میں موجود نوکروں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا اور توبہ توبہ کی۔

اس وقت رومی انتہائی مضطرب انداز میں کاؤچ پر لیٹی مختلف زہریلی سوچوں سے نبرد آزما تھی۔ اس کے اندر گویا غصے کی آگ دہک رہی تھی۔ ٹینا بیگم کے آئے دن کے اسکینڈلز اور منفی شہرت نے اس کے مزاج پر عجیب سا اثر ڈالا تھا۔ ایک دن پہلے بھی اس کا اپنی کالج فرینڈز کے ساتھ اسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا جو اس کی ماں کے نئے اسکینڈل پر مزے سے سرعام بحث کررہی تھیں۔

پچھلے کچھ دنوں سے اس خبر نے اس کا سارا سکون درہم برہم کررکھا تھا اور اسی وجہ سے وہ ٹینا بیگم سے لڑنے کے بہانے ڈھونڈتی، آئے دن کی اس خانہ جنگی سے گھر کے ملازم تک بے زار ہوچکے تھے۔

بالآخر رومی نے کچھ سوچ کر اپنی بڑی بہن سے صاف صاف بات کرلینے کا ارادہ کرہی لیا۔ اسکائپ پر کی جانے والی یہ کال شیری نے تیسری گھنٹی پر ریسیور کرلی۔ وہ اس وقت نیلگوں پانیوں کے شہر وینس میں اپنی کچھ فرینڈز کے ساتھ لندن سے چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھی اور اس وقت سان مارکو چوک میں چہل قدمی کررہی تھی۔

"کہاں ہو تم......؟" رومی کا لہجہ سپاٹ اور قدرے بے رخی لیے ہوئے تھا۔

وہ اپنے سے چار سال بڑی بہن کو یوں مخاطب کرتی جیسے وہ اس سے آٹھ سال چھوٹی ہو۔ دونوں میں بے تکلفی نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید اس کی وجہ دونوں کے درمیان موجود ہزاروں میل کا فاصلہ تھا یا پھر شیری کی محتاط پسندی اور کچھ خود ساختہ اصول تھے۔

وہ شروع ہی سے کم گو' لیے دیے رہنے والی مضبوط اعصاب کی حامل اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ جب کہ رومی اس کے بالکل برعکس تمیل جول کی شوقین منہ پھٹ اور جلد آپے سے باہر ہو جانے والی تھی۔

"وینس میں ہوں میں آج کل......" شیری نے مختصر جواب دیا۔

"کیا تم پاکستان آسکتی ہو؟" رومی کی اس غیر متوقع بات پر وہ ایک دم گھبرا گئی۔

"کیوں کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو ناں؟" شیری فکر مند ہوئی۔ اس کے لہجے میں چھپی محبت اور پریشانی کو محسوس کر کے رومی کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں کچھ بھی تھا وہ اس کی سگی بہن تھی۔ دونوں کا خون کا رشتہ تھا۔

"رومی، کچھ تو بولو' سب کچھ ٹھیک ہے ناں؟" وہ اپنی فرینڈز کے گروپ سے تھوڑا علیحدہ ہوئی۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں۔" رومی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"کیا ہوا؟ ماما تو ٹھیک ہیں نا؟" وہ بوکھلا گئی۔

"ان کو کیا ہونا ہے' دوسروں کی زندگیاں حرام کر کے زیادہ خوش رہتی ہیں۔" رومیصہ کا لہجہ بھیگا ہوا' لیکن شکایتوں سے لبریز تھا۔ شیری کو کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔

"تمہارا ماما کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے؟" اس نے ہزاروں میل کے فاصلے پر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"تم اس بات کو چھوڑو' واپس آسکتی ہو تو آجاؤ' ورنہ......" اس نے ایک افسردہ سانس کھینچتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔

"ورنہ کیا.....؟" شیری کو اس کا انداز غیر معمولی محسوس ہوا۔

"میں "سوسائیڈ" (خودکشی) کرلوں گی۔" رومی کے دوٹوک انداز پر وہ دم بخود رہ گئی اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔

دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی تھی لیکن شیری کا سارا سکون درہم برہم ہو گیا۔ وہ ایک دم ہی شہر رومان "وینس" کے حسن سے بے زار ہو گئی اور اسے اب ہر حال میں اپنا تفریحی دورہ ملتوی کر کے پہلی فلائٹ سے پاکستان پہنچنا تھا۔ وہ فیصلہ جو وہ کافی عرصے سے نہیں کر پا رہی تھی' رومی کی ایک کال نے کروا دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

بلیو جینز پر سفید رنگ کا ٹاپ پہنے' کندھے پر اپنا لیپ ٹاپ بیگ لٹکائے' دوسرے ہاتھ سے اٹیچی کو گھسیٹتی ہوئی وہ بے نظیر بھٹو انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے باہر نکلی ہی تھی کہ گھنگھور گھٹائیں موتی نما بارش کے قطروں کے ساتھ چھم چھم برسنے لگیں۔

اس نے ایک لمبا سانس لے کر اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو کو اپنے اندر سمیٹا' اور دل کے آخری کونے تک سکون اور اطمینان پھیلتا چلا گیا..... وہ پورے آٹھ سال بعد لندن سے بار ایٹ لاء کی ڈگری کے ساتھ واپس لوٹی تھی۔

"کیسے ہو احمد بخش.....؟" پارکنگ میں کھڑی سیاہ ہنڈا سوک کی طرف بڑھتی ہوئی' وہ اپنائیت سے بولی۔

"بالکل ٹھیک ہوں بی بی جی!" احمد بخش کو یقین نہیں آرہا تھا کہ شیری بی بی کو ابھی تک اس کا نام یاد تھا۔

پنڈی ایئرپورٹ سے اسلام آباد ایف سیون سیکٹر تک کے درمیانی فاصلے میں وہ ٹینا بیگم کے متوقع شدید ردعمل

کے بارے میں سوچتی رہی اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ گاڑی جیسے ہی "ٹینا ہاؤس" کے پورچ میں داخل ہوئی' نام کی غصے سے چنگھاڑتی ہوئی آواز نے اس کا استقبال کیا' حسب معمول رومی کے ساتھ بلند آواز میں ان کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ وہ دونوں ہی غصے میں اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو جاتی تھیں اور ان کی یہ عادت شیری کو سخت ناپسند تھی۔

اس نے خفت زدہ انداز سے ڈرائیور کی طرف دیکھا' جو بے پروائی سے کان لپیٹے اس کا سامان اتار رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ شاید ایسی آوازیں اس کے معمول کا حصہ بن چکی تھیں۔ وہ مرے مرے قدموں سے اندر کی جانب بڑھی۔

"تمہیں کچھ احساس ہے' ماں کس طرح اپنی ہڈیاں گھسا گھسا کر تم دونوں بہنوں کی پرورش کر رہی ہے۔" ٹینا بیگم کی مشتعل آواز لاؤنج کے کھلے دروازے سے ہوتی ہوئی شیری کی سماعت سے ٹکرائی اور اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔

"بیٹیاں ہیں آپ کی' فرض بنتا ہے آپ کا۔" رومی نے انتہائی بدتمیزی سے جواب دیا۔

"یہ فرض تو تمہارے باپ کا تھا' جو تمہاری پیدائش پر تین حرف طلاق کے بھیج کر چلتا بنا۔" وہ تڑخ کر بولیں۔

"تو بتا دیں ان کا نام و پتا' جا کر گریبان سے پکڑ لیتی ہوں انہیں بھی۔" رومی کا لب و لہجہ شیری کے لیے اچھنبے کا باعث بنا۔ وہ تو بچپن میں انتہائی شرمیلی اور دھیمے مزاج کی تھی۔

"ہاں' وہ خبیث تو جیسے پکڑنے ہی دے گا اپنا گریبان۔" وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوئیں۔

"تو آپ کو ایسے خبیث انسان سے شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔" رومی کے بدلحاظ لہجے نے انہیں مزید اشتعال دلایا۔

"اب تم مجھے بتاؤ گی' مجھے کس سے شادی کرنی چاہیے تھی اور کس سے نہیں۔" وہ پھر سے بھڑک اٹھیں۔

"نہیں' یہ فرض تو نانو کا بنتا تھا' جو انہوں نے بالکل بھی اچھے طریقے سے سرانجام نہیں دیا۔" رومی کے تلخ جملے پر باہر کھڑی شیری کا جو حال ہوا تھا سو ہوا تھا' اس سے دگنی بری حالت ٹینا بیگم کی ہوئی۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں اپنی ماں سے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔" انہوں نے صدمے بھرے انداز سے اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو دیکھا جو اس وقت لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے پاس رکھے کاؤچ پر بے تکلفی سے نیم دراز چیونگم چبا رہی تھی۔

شیری نے ہلکا سا جھجک کر دروازہ کھولا۔ ٹینا بیگم گلابی رنگ کی نائٹی میں بالوں کو رول لگائے انتہائی غیر مناسب حلیے میں لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ ایک تو وہ انتہا کی حسین تھیں اور اوپر سے باقاعدگی سے جم اور ایکسرسائز نے ان کے جسم کو انتہائی مناسب رکھا ہوا تھا۔ وہ کہیں سے بھی دو جوان بیٹیوں کی ماں نہیں لگتی تھیں۔

"السلام علیکم......" شیری کی خفت زدہ آواز پر ٹینا بیگم پلٹیں اور ان کے ہاتھ میں موجود کارڈلیس چھوٹ کر قالین پر جا گرا۔ وہ منہ کھولے حیرت زدہ نظروں سے اپنی بڑی بیٹی کو دیکھ رہی تھیں جو بغیر بتائے پاکستان آ چکی تھی جبکہ رومی کا چہرہ سپاٹ تھا' وہ بڑے سکون سے چیونگم چبا رہی تھی جیسے یہی کام سب سے زیادہ اہم ہو۔

"مبارک ہو' کورم پورا ہو گیا۔ آپ کی بڑی صاحبزادی بھی پہنچ گئیں۔ ویلکم شیری......" رومی نے ماں کو چڑانے کے لیے زوردار تالی بجائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی اور مسکرا کر اپنی ماں کا ہراساں چہرہ ایسے دیکھنے لگی۔ جیسے سرکس کا کوئی دلچسپ شو شروع ہونے والا ہو۔

"شیری تم' یہاں کیسے......؟" ٹینا بیگم بوکھلا کر بولیں۔

"آئی ایم سوری مام' آپ کو اور رومی کو بہت مس کر رہی تھی میں۔" شیری نے خفت زدہ انداز میں ایسے کہا جیسے

وہ لندن سے نہیں راولپنڈی سے اٹھ کر اسلام آباد آگئی ہو۔

"تو بے وقوف لڑکی بتایا کیوں نہیں۔۔۔؟" ان کے لہجے میں جھلاہٹ پیدا ہوئی ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں اس کی آمد پر قطعاً" کوئی خوشی نہ ہوئی ہو' الٹا وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

"میں نے رومی کو بتایا تھا رات۔" اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے اپنی صفائی دی۔ رومی کا نام سنتے ہی ٹینا بیگم جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔ انہوں نے دانستہ اس بات پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ ایک اور عالمی جنگ کا آغاز ہو جاتا اور ان کے اعصاب تو آج ویسے ہی تھکے ہوئے تھے۔

"اٹس او کے۔۔۔ کتنے دن کے لیے آئی ہو؟" ان کے اگلے سوال پر وہ سٹپٹا گئی اور گھبرا کر رومی کی طرف دیکھا۔

"یہ انوسٹی گیشن بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ اپنے ہی گھر میں آئی ہے وہ۔ آپ کا تو بس نہیں چل رہا' ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ واپس بھجوادیں۔" وہ اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں گویا ہوئی۔ ٹینا بیگم نے جھنجلا کر اسے دیکھا' جس نے انتہائی بدتمیزی سے ببل کا ایک اور غبارہ بنا کر فضا میں پھوڑا تھا۔

"بی ہیو یور سیلف۔۔۔" وہ ایک دم چڑ گئیں' جبکہ رومی نے استہزائیہ انداز سے ان کی جانب دیکھا۔

"اب پتا چل گیا نا' ڈرائیور کہاں گیا تھا۔ خوامخواہ سے لیکچر جھاڑ رہی تھیں پچھلے ایک گھنٹے سے۔" وہ ایک ہوش ربا انگڑائی لے کر کاؤچ سے اٹھی اور شیری سے ملے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ شیری کو ایک دم دھچکا سا پہنچا۔

"اس وقت سے فضول بحث کیے جا رہی ہے اسٹوپڈ اور ایک دفعہ بھی یہ نہیں بتایا کہ ڈرائیور تمہیں لینے گیا ہے۔" انہوں نے بھی شکایتوں کی پوٹلی کھولی۔

"اٹس او کے مام' پلیز ریلیکس۔" وہ زبردستی ان کے گلے لگی' جبکہ دوسری طرف ہنوز سرد مہری تھی۔

"اب آہی گئی ہو تو تھوڑا ریسٹ کرو' آئی ایم گیٹنگ لیٹ' مجھے ریڈی ہونا ہے۔" انہوں نے کھڑے کھڑے اپنے بالوں سے رول اتارے۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"اپنے آفس۔۔۔" انہوں نے عجلت بھرے انداز سے وال کلاک کی طرف دیکھ کر شیری کو شرمندہ کر دیا۔

"جانا ضروری ہے کیا؟" اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔ اس کی امید بھری نگاہیں ماں کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جو اس وقت خاصی بے چینی کا شکار لگ رہی تھیں۔

"یس' آف کورس بیٹا' بحریہ والی برانچ میں ورکز کا کوئی ایشو چل رہا ہے۔ تم سے رات ڈنر پہ تفصیلی بات ہوگی۔" وہ رسمی سے انداز میں اس کا دایاں گال ہلکا سا سہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

ان کے لاؤنج سے نکلتے ہی شیری کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا۔ بہت سالوں بعد بھی وہ اپنی ضرورت سے زیادہ حساسیت کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بھیگی پلکوں کے ساتھ کھڑکیوں کے سلائیڈز کھولے۔ ٹینا ہاؤس کا آسٹریلین گھاس والا باغیچہ اس کے سامنے تھا۔ رومی کو باغبانی کا بے حد شوق تھا اور وہ اکثر مالی کے سر پر سوار رہتی تھی۔

شیری تھکے تھکے انداز میں کاؤچ پر آکر لیٹ گئی۔ پاس رکھی میز پر ایک فریم میں رومی اور شیری کی اپنی ماں کے ساتھ تصویر تھی' جو پچھلے سال ان دونوں کی لندن آمد کے موقعے پر بنائی گئی تھی۔ وہ فریم اٹھا کر غور سے دیکھنے لگی۔ رومیصہ' صورت کے اعتبار سے اور عادتاً" بالکل اپنی ماں ٹینا بیگم کا پرتو تھی۔ ان ہی کی طرح دراز قد' شہابی رنگت اور براؤن سلکی بالوں کے ساتھ نیلگوں آنکھیں۔ جو بھی ایک دفعہ دیکھ لیتا تو ضرور پلٹ کر دیکھتا۔ ان دونوں کے برعکس شیری کی آنکھوں کا رنگ ہلکا سنہری تھا جن پر کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا گمان ہوتا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کی

طرح بہت خوب صورت نہیں لیکن جاذب نظر خدوخال کی حامل تھی۔ رنگت سفید' اور بال سنہری مائل بھورے تھے' جو اکثر اسٹیپ کٹنگ صورت میں اس کے کندھوں پر بکھرے رہتے۔ اس کی سحرانگیز شخصیت میں ایک محسوس کی جانے والی بے نیازی اور وقار تھا۔

شیری میں اپنی نانی ماہ پارہ بیگم کی طرح ایک وقار تھا اور اس کا نام بھی انہوں نے رکھا تھا۔ وہ علی گڑھ کی پڑھی ہوئی ایک مہذب اور نفیس خاتون تھیں۔ جبکہ رومیصہ کا نام ٹینا بیگم نے خود لڑجھگڑ کر رکھا تھا لیکن دونوں کی پرورش بچپن میں نانی کی گود میں ہی ہوئی تھی اور ان کے مرنے کے بعد ٹینا بیگم کو احساس ہوا کہ دونوں بیٹیوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور یہ ماہ پارہ بیگم کا ہی حوصلہ تھا جو رومی جیسی ضدی لڑکی کو سنبھالے رکھتی تھیں۔
وہ کاؤچ پر ٹیکتی قدرے فاصلے پر رکھے ایکوریم میں گولڈ فش کو تیرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اچانک اس کے بالکل پاس رکھے کارڈلیس فون کی گھنٹی بجی اور اس نے بادل نخواستہ کال اٹینڈ کی' اس کا دل اس وقت اس قدر بوجھل تھا کہ وہ کسی سے بھی بات کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔
"ہیلو..." انتہائی بے زار لہجے میں وہ گویا ہوئی۔
"شہرزاد..." ریسیور کے اندر سے نکلنے والی سرگوشی سن کر وہ ایک دم نرم گداز کاؤچ سے ایسے اچھلی' جیسے زوردار کرنٹ لگا ہو۔ اسے پورے بنگلے کی چھت اپنے سر پر گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"ویلکم بیک۔" مردانہ گمبھیر __________ آواز نے اس کا سارا سکون تہس نہس کر دیا۔
"آپ کون؟" اس کی آواز ہلکی سی لڑکھڑائی۔
"پوری دنیا میں صرف ایک ہی تو ہوں' جو تمہیں شیری نہیں' تمہارے اصل نام "شہرزاد" سے پکارتا تھا' بھول گئیں کیا۔" اس کی سحر پھونکتی آواز سن کر شیری کا ریسیور پر جما ہاتھ ہلکا سا کانپ اٹھا۔
"آپ ہیں کون؟" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دانستہ بے نیاز لہجے میں پوچھا۔ جیسے اسے بالکل نہ جانتی ہو۔
"تمہارا ہم زاد..." اس کا لہجہ دل چرانے والوں جیسا تھا' شہرزاد سن ہو گئی۔
"اچھا کیا' تم واپس آگئیں' انسان کب تک اپنی بنیادوں سے دور بھاگ سکتا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے ایسے تبصرہ کیا جیسے دونوں کے درمیان ___ گہرے مراسم رہے ہوں۔
"کون ہیں آپ؟" اس نے اس دفعہ اپنا لہجہ دانستہ سخت کیا۔
"بتایا ناں' تمہارا ہم زاد..." وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔ وہ اس کو دیکھے بغیر بھی سمجھ سکتی تھی کہ اس کے لبوں پر کوئی شرارتی مسکراہٹ ہو گی۔
"کس نے بتایا آپ کو میرے آنے کا؟" وہ ہلکی سی جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی۔
"میرے دل نے..." وہ شرارت سے قہقہہ لگا کر ہنسا اور شہرزاد کو خوف زدہ کر گیا۔ اسی آواز سے ڈر کر تو وہ یہاں سے بھاگی تھی۔

شہرزاد نے گھبرا کر کال کاٹ دی اور بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے لگ رہا تھا۔ جیسے دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا' اس نے پورے آٹھ سال کے بعد یہ آواز سنی تھی۔ وہ آج بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کون تھا۔ جو اس سے محبت نہیں عشق کا دعوا کرتا تھا۔ جس کے معنی خیز جملے' چین چراتا لہجہ اور وقت بے وقت رانگ نمبرز سے آنے والی کالز نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ تب ہی ٹینا بیگم کے ایک دفعہ کہنے پر ہی وہ لندن آنے کے لیے تیار ہو گئی تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس سحر انگیز آواز کا جادو اس پر نہ چل جائے۔ لیکن لندن آنے کے صرف آٹھ دن بعد ہی شہرزاد کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ بھی اس ان دیکھے' انجان شخص کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے' جو اس کا ہم زاد ہونے کا دعوا کرتا تھا' مگر اس کے پاس اس سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آنے والے دنوں میں وہ اپنی

پڑھائی میں مگن ہو گئی تھی لیکن نوعمری کی اس محبت کی کسک کبھی نہ کبھی اسے بے چین ضرور کرتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پاکستان آنے کے بعد وہ سب سے پہلی کال اسی شخص کی اٹینڈ کرے گی جس سے خوف زدہ ہو کر وہ یہاں سے بھاگی تھی۔

گہرے سبز رنگ کے قد آور، گھنے اور شاداب درختوں میں گھری ملکہ کوہسار "مری" کا جوبن آج کل عروج پر تھا۔ جی پی او چوک کی پچھلی طرف اوپر کی طرف جاتی سڑک جو کشمیر پوائنٹ سے جا ملتی تھی، اسی سڑک پر دو ڈھائی کینال پر بنا "میر ہاؤس" آنے جانے والوں کی توجہ کا مرکز بنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سڑک پر لگے سیاہ رنگ کے گیٹ سے گھر کی طرف جاتی سڑک ڈھلوان کی صورت میں خاصی نیچے جاتی تھی لان چونکہ سڑک سے چند فٹ اور گھر کی عمارت اس سے بھی کافی زیادہ نیچے تھی۔ اس لیے سڑک سے گزرنے والے گھر کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کے اوپر لگی گرل سے ٹکڑیوں کی صورت میں بنے تین چار وسیع و عریض لان، صحن اور گھر کا پورچ بڑے آرام سے دیکھ سکتے تھے۔ گھر کے باہر کے صحن میں سرخ رنگ کے ٹائلز لگے ہوئے تھے اور دو تین سیڑھیوں کے بعد برآمدہ تھا، جس میں در و دروازے کھلتے تھے، ایک دروازہ اندر کی طرف جانے والے کوریڈور میں اور دوسرا ڈرائنگ روم کی طرف جاتا تھا۔ سڑک پر بہت زیادہ آمدورفت ہونے کی وجہ سے اس گھر کی خواتین سامنے کا حصہ کم اور گھر کی پچھلی طرف موجود لان زیادہ استعمال کرتی تھیں، جہاں در شہوار نے ایک درخت پر جھولا بھی ڈال رکھا تھا۔

میر ہاؤس کے دائیں جانب چھوٹے چھوٹے دو سرونٹ کوارٹرز بھی بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک چوکیدار اور اس کے خاندان کے لیے تھا۔ وہ لوگ میر فیملی کے خاندانی ملازم تھے۔

"آج ماہدولت اپنی تین عدد کنیزوں کے ہمراہ سامنے والے لان میں شام کی چائے پئیں گے۔" در شہوار نے کچن سے چائے کی ٹرے لاتے ہوئے شاہانہ انداز میں اعلان کیا تو کنیزوں کا تازہ تازہ خطاب ملنے والی تینوں لڑکیاں تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔ وہ سب اس وقت نچلے پورشن کے لاؤنج میں موجود تھیں اور ان کی مائیں دوپہر کی نیند پوری کر کے ابھی بیدار نہیں ہوئی تھیں۔

"کیا کہا تم نے....؟" انابیہ کو اپنی سماعت پر شک ہوا۔

"ماہدولت آج چائے سامنے والے لان میں بیٹھ کر پئیں گے۔" اس نے ایک دفعہ پھر شاہانہ انداز میں اپنے فرضی کالر اٹھائے۔

"وجہ؟" نمیرہ نے شیشے کے بھاری بھر کم ایش ٹرے سے اخروٹ توڑ کر منہ میں ڈالا اور بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"بہت دن ہو گئے، نئے شادی شدہ جوڑوں کی چھچھوری حرکتیں نہیں دیکھیں مال روڈ پر" آج ماہدولت کا فل ٹائم "بھونڈی" پروگرام ہے اور عوام الناس کو دعوت عام ہے۔" در شہوار نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔

"تمہیں پتا ہے نا سڑک سے ہمارے گھر کا پورا لان نظر آتا ہے۔" انابیہ نے اسے یاد دلایا۔

"اسی لیے تو ہم وہاں تشریف کا ٹوکرا رکھیں گے، تاکہ ہر "رنگین" اور "سنگین" منظر اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھ سکیں۔" در شہوار نے شرارتی انداز میں آنکھیں مٹکائیں۔

"مجھے تو معاف ہی رکھو، ہر دفعہ مجھے پھنسوا کر خود نکل جاتی ہو۔" طوبیٰ نے کشن سر کے نیچے رکھا اور بے تکلفی سے کارپٹ پر لیٹ گئی۔

"جو ڈر گیا وہ مر گیا۔" در شہوار نے اس کو غیرت دلانے کی کوشش کی۔

"سمجھو میں تو مر ہی گئی۔" طوبیٰ نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر ایک کشن آنکھوں پر بھی رکھ لیا۔

"طوبیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے، دا جی اور تایا ابا کا کچھ پتا نہیں، اگر آ گئے تو بھری جوانی میں مرحوم کر دیں گے ہمیں۔" انابیہ نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔ ویسے بھی وہ ان سب کے مقابلے میں تھوڑی سمجھ دار اور محتاط طبیعت کی حامل تھی۔

"وہ ویک اینڈ کے درمیان میں کبھی نہیں آتے۔" درشہوار کی بھی واجی کے شب و روز پر کی گئی ریسرچ مکمل تھی۔

"وہ تو شاہ میر بھی گھوڑے گدھے بیچ کر سوتا تھا' یاد نہیں کل رات کیسے آنکھ کھل گئی تھی اس کی۔" طوبیٰ نے فوراً "کشن منہ سے اٹھا کر درشہوار کو یاد دلایا۔ جنگل کے ناکام مشن پر جو عزت افزائی ہوئی تھی' اس کے زخم بھرنے میں ابھی کئی دن اور لگنے تھے۔

"تو ٹھیک ہے پیاری بہنو! میں یہ فرنچ فرائز' نگٹس اور پکوڑے اکیلے ہی بیٹھ کر کھا لیتی ہوں۔" درشہوار کی بات پر ان تینوں کو ایک دم سکتہ ہوا' جو لان میں جا کر ہی ٹوٹا تھا۔

درشہوار بڑے مزے سے سڑک کے بالکل ساتھ والے لان میں بیٹھی' چائے پیتے ہوئے وہاں سے گزرنے والے لوگوں پر دلچسپ کمنٹس پاس کر رہی تھی' جس پر نا چاہتے ہوئے بھی ان تینوں کو بار بار ہنسی آ رہی تھی۔

"شرط لگا لو' یہ سبز رنگ کے طوطیا سوٹ والی باجی کی شادی' بڑی ہی مشکلوں سے ہوئی ہے۔" لان کی تین فٹ اونچی دیوار پر لگی گرل سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" طوبیٰ نے ڈھیر سارے نگٹس اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ تو شکر ہے درشہوار کی نظریں اس جوڑے پر جمی ہوئی تھیں جو اس وقت ان کے گھر کی دیوار کی گرل سے ٹیک لگائے بڑے رومانٹک انداز میں تصویریں بنوا رہا تھا۔

"جتنے اوچھے انداز سے یہ جڑ جڑ کر اپنے زرافے کی گردن والے میاں کے گلے میں بانہیں ڈال کر فوٹو بنوا رہی ہے' اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔" درشہوار نے بڑے ماہرانہ انداز سے تجزیہ کر کے اپنی کزنز کی طرف دیکھا جو دعوت شیراز اڑانے میں مصروف تھیں۔

"ہائے اللہ' میرے نگٹس کہاں گئے؟" درشہوار کو خالی پلیٹ دیکھ کر اچھا خاصا دھچکا لگا۔

"تمہارے پیٹ میں۔" طوبیٰ نے شرارت سے اپنی پلیٹ اس کے سامنے لہرائی۔

"اللہ کرے مر جاؤ تم لوگ ساری کی ساری' تمہارے دانتوں میں کیڑا لگے۔" وہ غصے سے کھڑی ہوئی۔

"تمہیں کس نے کہا تھا بیٹھ کر مخلوق خدا کا مذاق اڑاؤ۔" انابیہ نے سب سے بڑی کزن ہونے کا فائدہ اٹھا کر اسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

"شرافت سے میری پلیٹ واپس کرو۔" درشہوار خطرناک ارادوں کے ساتھ طوبیٰ کی طرف بڑھی' جو اس کے عزائم بھانپ کر فوراً" دوسری طرف بھاگی اور درشہوار نے اس کا تعاقب کیا۔ طوبیٰ کو جلد ہی احساس ہوا کہ وہ عجلت میں غلط سمت میں مڑ گئی ہے۔ ان کے لان کی دیوار ساتھ والے گھر کے لان کی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اور چھوٹی سی منڈیر کو کوئی بھی بچہ پھلانگ کر بہ آسانی دوسرے گھر میں جا سکتا تھا۔ طوبیٰ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اس خالی گھر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

اس گھر کا لان "میر ہاؤس" کے بالکل برابر میں تھا اور جہاں سے سیڑھیاں نیچے گھر کی طرف جاتی تھیں۔ یہ گھر بھی خاصی ڈھلوان پر میر ہاؤس کے بالکل برابر میں بنا ہوا تھا اور پچھلے ایک ماہ سے خالی تھا۔

"میں تمہیں کہہ رہی ہوں' شرافت سے واپس کر دو میرے نگٹس....." درشہوار نے دیوار کود کر منہ پر ہاتھ پھیر کر دھمکی دی۔

"نہیں دیتی' جو کرنا ہے کر لو۔" طوبیٰ نے جواباً اسے منہ چڑایا اور ایک ساتھ دو نگٹس منہ میں ڈال لیے۔

"تمہاری تو ایسی کی تیسی۔" درشہوار اس کے پیچھے سیڑھیوں کی طرف بھاگی تو طوبیٰ نے سیڑھیوں سے آگے لمبی ساری روش کی طرف دوڑ لگائی اور جیسے ہی وہ گھر کے پاس پہنچیں۔ اندر کا دروازہ کھلا' سیاہ جینز پر سرمئی رنگ کی ٹی

شرٹ پہنے گھریلو سے حلیے میں محمد ہادی باہر نکلا۔ دراز قد' صاف رنگت کے ساتھ شہد رنگ آنکھوں والا یہ نوجوان اچھا خاصا ہینڈسم تھا۔

در شہوار اور طوبیٰ' دونوں کو ہی حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب کہ دوسری طرف اوپر گرل سے جھانکتی نمیرہ اور انابیہ گھبرا کر مزید گرل پر جھک کر نیچے دیکھنے لگیں' وہ در شہوار اور طوبیٰ کی بے عزتی کا منظر براہ راست دیکھنا چاہتی تھیں۔

"جی فرمایئے۔" ناگواری کا ایک ہلکا سا تاثر محمد ہادی کی آنکھوں میں ابھرا۔ وہ انہیں کوئی سیاح سمجھا تھا جو اکثر تصویریں بنانے کے چکر میں اکثر ہی کھلے گیٹ سے نیچے جاتی سیڑھیوں کا پرکشش منظر دیکھ کر نیچے آجاتے تھے۔

"وہ... یہ... ہم لوگ پڑوس سے آئے ہیں۔" طوبیٰ نے بوکھلا کر اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"فرمایئے' کیسے آنا ہوا؟" محمد ہادی کے لہجے میں چھلکتی بے رخی پر دونوں ہی سٹپٹا گئیں۔

"یہ نگٹس' میری امی نے بھجوائے ہیں...." طوبیٰ نے گڑبڑا کر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ہادی کی طرف بڑھائی۔

"یہ..." اس نے سخت حیرانی سے پلیٹ میں رکھے چار پانچ چھوٹے نگٹس کو دیکھا۔

"جی... جی..." طوبیٰ ڈھٹائی سے مسکرا دی۔

"تھینکس۔" اس نے سنجیدگی سے پلیٹ پکڑی' در شہوار کا دل بیٹھ گیا۔

"ٹھہریئے' ابھی خالی کر کے لا دیتا ہوں آپ کو۔" وہ سنجیدگی سے پلیٹ اٹھا کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

"اللہ کرے مر جاؤ تم۔" در شہوار نے غصے سے طوبیٰ کو بددعا دی۔

"ویسے بندہ شاندار ہے۔" طوبیٰ نے شرارت سے ایک آنکھ دبائی۔ محمد ہادی دو ہی منٹ بعد واپس آگیا۔

"تھینک یو سسٹر...." اس نے خالی پلیٹ طوبیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو سسٹر کے الفاظ پر طوبیٰ کے چہرے پر پھیلنے والے تاثرات دیکھ کر در شہوار نے بمشکل اپنی ہنسی کو حلق میں ہی دبایا۔

"کم بخت رف اینڈ ٹف حلیے میں بھی کسی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا۔" در شہوار نے دل ہی دل میں سوچا۔

"اب میں جاؤں؟" اس کی بات پر وہ دونوں گڑبڑا گئیں۔

"ایک منٹ پلیز' یہ بتایئے گا کہ یہ گھر تو پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا' آپ کب آئے؟" در شہوار کی بات پر وہ ہلکا سا الجھا۔

"تین دن پہلے" اس نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

"تو کیا اب یہیں رہیں گے آپ؟" طوبیٰ نے خاصے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

"ظاہر ہے' میرا گھر ہے تو یہیں رہوں گا۔" محمد ہادی نے بے زاری سے اپنے سامنے کھڑی دونوں لڑکیوں کو دیکھا جن کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی اور ہادی کو ایسی شوخ و چنچل لڑکیوں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔

"میرا یہ مطلب تھا' کیا آپ یہاں سیر و سیاحت کے لیے آئے ہیں۔" طوبیٰ نے کسی ٹی وی اینکر کی طرح پوچھا۔

"نہیں' پوسٹنگ ہوئی ہے میری۔" محمد ہادی نے اس دفعہ ذرا روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"کس ڈیپارٹمنٹ میں؟" در شہوار کی زبان پھسلی۔

"فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ میں۔" اس نے بادل نخواستہ جواب دیا' جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ اب جان چھوڑو۔ دوسری طرف خلاف توقع میرہاؤس میں واجی کی لینڈ کروزر اندر داخل ہو چکی تھی۔ جو کسی ضروری میٹنگ کے سلسلے میں اپنے پی اے کے ساتھ اچانک ہی وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے گھر میں داخل ہوتے ہی خاصی ناگواری کے ساتھ نمیرہ اور انابیہ کو دوسرے گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھا۔ پورچ چونکہ نیچے تھا' اس لیے انہیں سر اٹھا کر اوپر دیکھنے میں ذرا دقت ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ پورچ میں کھڑے بلند آواز میں دھاڑے اور انا بیہ اور نمیرہ کی روح فنا ہو گئی۔

"مارے گئے۔" انا بیہ کا رنگ فق ہو گیا۔ جب کہ نمیرہ نے بوکھلاہٹ میں ہاتھ میں پکڑا پکوڑا کھینچ کر در شہوار کے سر کا نشانہ لے کر مارا جو ایک دم ٹھک کر کے در شہوار کی گردن سے ٹکرایا۔

"کیا مصیبت ہے؟" در شہوار ایک دم اچھلی اور سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ جب کہ محمد ہادی نے بھی اس حرکت پر ناگواری سے کھڑے کھڑے پہلو بدلا اور در شہوار کی نظروں کے تعاقب میں اوپر دیکھا' جہاں نمیرہ اور انا بیہ دیوار پر لگی گرل پر جھکی ہوئی تھیں۔

"بھاگو... داجی آ گئے۔" نمیرہ کی آواز نے گویا مری کی فضاؤں میں صور پھونک دیا۔

"اوہ نو۔" در شہوار اور طوبیٰ دونوں کو چار سو بیس والٹ کا جھٹکا لگا۔

"اب کیا کریں؟" طوبیٰ نے ہراساں نگاہوں سے اپنی تایا زاد کو دیکھا۔ ایسی صورت حال میں در شہوار کی عقل خاصی تیزی سے کام کرنے لگتی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور طوبیٰ کا ہاتھ پکڑا اور محمد ہادی کے گھر کے پچھواڑے کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ارے رے یہ کہاں جا رہی ہیں آپ؟" وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ جب کہ وہ دونوں دیکھتے ہی دیکھتے چیتے کی سی رفتار سے بھاگتی ہوئی اس کے گھر کے پچھلے لان کی طرف گئیں اور دونوں نے چھلانگ لگا کر مشترکہ چھوٹی دیوار عبور کی اور چھلاوے کی طرح غائب ہو گئیں۔ جب کہ وہ اپنی جگہ پر ہکا بکا رہ گیا۔

✲ ✲ ✲

مری کے سرسبز پہاڑوں پر جھومتے بادلوں کو ایک دم ہی جوش آیا اور بارش کی بوندیں چھتوں پر جلترنگ بجانے لگیں۔ محمد ہادی کا ملازم گل خان ٹرے میں کافی کے دو بڑے کپ اور سینڈوچ رکھے لاؤنج میں داخل ہوا۔ جہاں وہ اپنے بے تکلف دوست سعد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

محمد ہادی کا تعلق امیر کبیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس نے ایم ایس سی فاریسٹری پاکستان فاریسٹ انسٹی ٹیوٹ پشاور سے اور ایم ایس کی ڈگری یو کے کی ایک مشہور یونیورسٹی سے کر کے کمیشن کا امتحان پاس کیا اور اس کی پہلی تعیناتی مری میں ہوئی تھی جہاں اس کا بیسٹ فرینڈ سعد پہلے سے تعینات تھا۔

"بس تم اپنا بوریا بستر اٹھاؤ' اور شفٹ ہو جاؤ یہاں' میں اتنے بڑے گھر میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔" ہادی کی بات پر وہ مسکرایا۔

"ویسے انکل نے گھر تو زبردست بنا رکھا ہے' اور ہے بھی مین روڈ پر۔" سعد نے توصیفی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

"ہاں پچھلے کئی سالوں سے تو رینٹ پر تھا اور اب پاپا نے میرے لیے خالی کروایا ہے اسے۔" وہ لاپروائی سے فلور کشن پر بیٹھ گیا۔

"بہت لکی ہو یار' ادھر میں ایک گندے سے ایک کمرے کے فلیٹ میں سڑ رہا ہوں۔"

"تو گدھے اسی لیے کہہ رہا ہوں' آ جاؤ یہاں' تین بیڈ رومز بالکل خالی ہیں۔" محمد ہادی نے اسے کھلے دل سے آفر کی۔

"شادی کیوں نہیں کر لیتے تم' آنٹی کی بھی خواہش پوری ہو جائے گی۔" سعد تھوڑے سے توقف کے بعد گویا ہوا۔

"ڈفر انسان ہیں تمہیں شفٹ ہونے کا کہہ رہا ہوں اور تم الٹے مشورے دے رہے ہو مجھے۔" وہ ہلکا سا چڑ گیا۔

"یار! اس مہینے کا کرایہ پورا دے چکا ہوں فلیٹ کا۔" سعد نے اپنی مجبوری بتائی۔

"تو کیا ہوا' کسی غریب کا بھلا بھی ہو جانے دیا کرو' میں بتا رہا ہوں' آجاؤ ورنہ میں اپنی پوسٹنگ کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگا ہوں۔" محمد ہادی نے اس دفعہ اسے براہ راست دھمکی دی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

"اچھا اچھا ویک اینڈ پر اٹھا کر لاؤں گا اپنا جہیز' ابھی تو آفس سے آنے کی بعد ہمت ہی نہیں ہوتی' اوپر سے ڈی ایف او اتنا اکھڑ مزاج ہے' اسے صبح و شام آفس وزٹ کرنے اور نئے نئے کام کام کرنے کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔" سعد نے ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ بجلی چلی گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ویسے بھی پہاڑوں پر سورج جلد غروب ہو جاتا تھا۔

"لو' پھر لائٹ چلی گئی۔" کافی پیتے ہوئے محمد ہادی ایک دم بے زار ہوا۔

"گل خان' پلیز جنریٹر چلاؤ۔" اس کی آواز پر گل خان بھاگتا ہوا کچن سے نکلا۔

"جی صاحب جی!" گل خان ادھیڑ عمر مرد تھا اور بہت سالوں سے اس گھر کی چوکیداری اور دوسرے کاموں پر مامور تھا۔

"لیکن اس سے پہلے یہ کھڑکیاں بند کرو۔ بارش کی بوچھاڑ ڈائریکٹ اندر آرہی ہے۔" ہادی کو بارش سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔

"جی صاحب۔" گل خان نے لپک کر حکم کی تعمیل کی۔

"زہر لگتی ہے مجھے جنریٹر کی آواز' پتا نہیں یہاں کے لوگ کیسے رہ لیتے ہیں ایسے موسم کے ساتھ' جب دیکھو بارش' جب دیکھو سرد ہوائیں۔" محمد ہادی کو مری کا موسم بالکل پسند نہیں تھا۔

"تو یار یو پی ایس لگوا لو نا' پرابلم کیا ہے۔" سعد نے شرارت سے ایک اخروٹ اس کی طرف اچھالا۔

"ہاں' کوئی پکا بندوبست ہی کرنا پڑے گا اس فضول جگہ پر رہنے کے لیے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ابھی تو میرے جگر کو یہاں آئے صرف تین دن ہوئے ہیں' کیسے گزارا ہو گا تمہارا۔" سعد نے شوخ لہجے میں چھیڑا۔

"سوچ رہا ہوں پاپا سے کہہ کر واقعی پوسٹنگ کروا لوں ادھر سے اپنی۔" اس کی بات پر سعد کو کرنٹ لگا۔

"خبردار ایسا سوچا بھی تو اٹھا کر پھینک دیں گے تمہیں کسی اور ریجن میں۔" سعد نے اسے ڈرایا۔

"کم از کم یہاں سے تو اچھا ہو گا۔" وہ بے زاری سے ایک تسلسل سے برستی مینہ کی بوندوں کو دیکھنے لگا۔

"تم نے ابھی دیکھے کہاں ہیں یہاں کے دلکش نظارے' میں ایسے ہی تو نہیں ٹکا ہوا یہاں۔" سعد ایک آنکھ میچ کر شرارت سے ہنسا۔

"سخت الرجک ہوں میں ان چیزوں سے' مجھ پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔" ہادی نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"پتا ہے مجھے' اسی لیے تو ڈپارٹمنٹ میں اررو گنٹ مین کا ٹائٹل ملا تھا تمہیں۔" سعد قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اسے وہ منظر یاد آگیا جب الوداعی تقریب میں وہ اپنا ٹائٹل لینے اسٹیج پر گیا اور بغیر تھینکس کہے واپس لوٹ آیا تھا۔

"ساری فضول اور بیہودہ باتیں چن چن کر یاد ہیں تمہیں' یہ بتاؤ' ساتھ والے بنگلے میں کون رہتا ہے؟" ہادی کو ایک دم وہ اول جلول لڑکیاں یاد آئیں تو یوں ہی پوچھ بیٹھا۔

"دائیں یا بائیں؟" سعد نے شرارتی لہجے میں پوچھا اور اسی وقت لائٹ آگئی۔

"رائٹ سائیڈ پر؟" اس نے دانستہ اپنے لہجے کو انجان بنایا۔

”ادھر تو کبھی بھول کر بھی نہ دیکھنا' پتھر کے ہو جاؤ گے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔
”کیوں؟ آسیب بستا ہے وہاں یا جن بھوت رہتے ہیں وہاں۔“ ہادی نے منہ بنا کر اس کی طرف دیکھا۔
”ایسا ہی سمجھو' میر حاکم علی کے دو بیٹے اور ان کا خاندان آباد ہے یہاں۔“ اس نے سنجیدگی سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
”وہ جو ایم این اے میر محتشم کے والد ہیں اور جنوبی پنجاب کی سیٹ پر الیکشن لڑتے ہیں۔“ محمد ہادی نے حیرانی سے پوچھا۔
”ہاں ہاں وہی.....“ سعد نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کی آواز کم کی۔
”تو یہاں سے لڑیں نا الیکشن' وہاں کی سیٹ پر کیوں قبضہ جما رکھا ہے۔“ ہادی کو ویسے ہی سیاست سے شدید نفرت تھی اور حاکم علی کے خاندان کی کرپشن کے قصے بھی آئے دن سننے کو ملتے تھے۔
”یہاں سے حاکم صاحب اپنے پوتے وہاج کو لڑائیں گے اس دفعہ الیکشن۔“ سعد نے سنجیدگی سے مزید بتایا۔
”اور تمہیں پتا ہے' بہاولپور اور ملتان میں بے اندازہ زمینیں ہیں ان کی۔“
”جانتا ہوں سب کی سب ان کے آباؤ اجداد کو انگریزوں کی غلامی اور چمچہ گیری کرنے پر ملی تھیں اور وہی جائیداد وراثت میں چلی آرہی ہے ان کے پاس۔“ ہادی کے پاس بھی اچھی خاصی معلومات تھیں۔
”لیکن بیٹا جی' کمیشن کا ایگزام پاس کر کے اور فارسٹ آفیسر بن کر یہ مت سمجھ لینا کہ تم پنگا لے سکتے ہو اس خاندان سے۔“ سعد نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
”کیا مطلب.؟“ ہادی نے الجھ کر اپنے بیسٹ فرینڈ کا چہرہ دیکھا۔
”مری میں بھی ٹمبر مافیا کے پیچھے محتشم صاحب کے چھوٹے بھائی خاقان صاحب کا نام لیا جاتا ہے' لیکن آج تک کوئی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔“ سعد نے اس دفعہ ذرا کھل کر بتایا کیوں کہ بات اب ان کے اپنے ڈپارٹمنٹ کی تھی۔
”اس سے پہلے کوئی میرے جیسا آفیسر پوسٹڈ بھی نہیں ہوا ہو گا یہاں۔“ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔
”میری تین سالہ سروس میں کئی آئے اور کئی گئے یہاں سے۔“ سعد نے بھی اس کی غلط فہمی دور کرنے میں دیر نہیں لگائی۔
”چلو دیکھتے ہیں' کس میں ہے کتنا دم۔“ محمد ہادی نے اٹھ کر کھڑکیوں کے بھاری پردے آگے کیے تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا' اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ محمد ہادی ایک دفعہ جو ٹھان لیتا تھا' اس سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

☆ ☆ ☆

”ہم چاروں ہی بہت غلط گھرانے میں پیدا ہوئی ہیں۔“ درشہوار نے دنیا جہاں کا غم اپنے لہجے میں سموتے ہوئے انتہائی مشکل سے رنجیدہ شکل بنا کر اپنی تینوں کزنز کو دیکھا۔ اس وقت وہ سب داجی سے جھاڑ کھانے کے بعد اپنا غم غلط کرنے کے لیے ٹی وی لاؤنج میں موجود تھیں' جو اوپر والے پورشن میں تھا۔
اس تعزیتی اجلاس کا انعقاد درشہوار نے ہنگامی بنیادوں پر کیا تھا اور ویسے بھی ہر شرارت اور الٹے کام میں وہ سب کی لیڈر ہوتی تھی اس لیے وقتاً ”فوقتاً“ دلجوئی کا اہم فریضہ بھی اسے ہی سرانجام دینا پڑتا تھا۔
اس وقت انابیہ صوفے پر نیم دراز اور نمیرہ نے کرسی سنبھال رکھی تھی جب کہ درشہوار اور طوبیٰ دونوں غم سے نڈھال فلور کشن پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں خاندانی ملازمہ رشیدہ کی سولہ سالہ بیٹی صندل بھی موجود تھی' جس کا اہم کام کھانے پینے کی اشیا کی ترسیل نچلے پورشن سے اوپر والے پورشن میں کرنا اور میر

ہاؤس کی چاروں باجیوں کی دلچسپ گفتگو سننا تھا۔
"آئے ہائے بڑے نصیب ہمارے۔" در شہوار نے انگڑائی لیتے ہوئے ملازمہ صندل کو دیکھا جو مسکرا رہی تھی' اسے ایک دم تپ چڑھ گئی۔
"تمہارے بڑے دانت نکل رہے ہیں صندل صاحبہ' خیر تو ہے؟" اس نے طنزیہ نگاہوں سے صندل کو دیکھا جو اس کا ہی پرانا سوٹ پہنے اسی پر ہنس رہی تھی اور اس بات نے در شہوار کے تن بدن میں آگ لگادی تھی۔
"ارے نئیں نئیں بی بی جی' میں تو بس آپ کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔" اس نے بوکھلا کر اپنے دانت چھپانے کی کوشش کی۔
"تو ہم کون سا کسی خزانے کا راز بتارہے ہیں ایک دوسرے کو۔" طوبیٰ نے برا سا منہ بنا کر ناک سے مکھی اڑائی۔
"جاؤ اپنے ابا سے کہو گیٹ پر جیسے ہی پزاہٹ سے ڈلیوری آئے تو وہیں سے نقارہ نہیں بجانا' بلکہ صندل شہزادی کو بلانا ہے۔" در شہوار کی بات پر سب کزنز کے کان کھڑے ہوگئے۔ صندل کے والد اس گھر کی چوکیداری کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔
"مجھے کیا کرنا ہوگا ابا کے پاس جاکر؟" صندل کے ہونق انداز پر وہ جھنجلا گئی۔
"تمہارا کام ہے کتھک ڈانس کرنا' وہ بھی پزا سر پر رکھ کر۔" در شہوار کے چڑنے پر وہ تینوں بے ساختہ ہنس پڑیں۔
"لیکن' مجھے تو وہ نہیں آتا۔" صندل کی سادگی میں پریشانی کا عنصر نمایاں ہوا۔
"زیادہ اوور ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں' جاؤ اور پزا کی پے منٹ کرکے اوپر لاؤ' سمجھیں۔" دُرِ شہوار نے منہ بنا کر اپنا پرس اٹھایا۔
"آدھے پیسے میں ہرگز نہیں دوں گی۔" انابیہ نے فوراً لقمہ دیا۔
"اور میری طرف سے بھی انکار ہی سمجھو۔" نمیرہ کا موڈ شام والے واقعے کے بعد خاصا بگڑا ہوا تھا۔
"اور میرا تو تمہیں پتا ہی ہے آج کل ہاتھ کتنا تنگ ہے۔" طوبیٰ نے اپنے لہجے میں دنیا جہاں کا درد سمویا۔
"عوام تسلی رکھے' اس ڈلیوری کا بوجھ ہم غریب عوام پر نہیں ڈالیں گے' بلکہ شاہی خزانے سے ادا کیا جائے گا۔" در شہوار نے شاہانہ انداز سے کہتے ہوئے اپنے والٹ کی زپ بڑی ادا سے کھولی اور ہزار کا کڑکتا ہوا نوٹ باہر نکالا اور اپنے سر سے وارنے ہی لگی تھی کہ صندل ایک دفعہ پھر کفن پھاڑ کر حیران لہجے میں بولتی ہوئی ان سب کے چھکے چھڑا گئی۔
"لیکن بی بی جی' یہاں کس کی "ڈلیوری" ہورہی ہے' آپ میں سے تو کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔" ان پڑھ' سیدھی سادی صندل کی بات پر نمیرہ کے حلق سے ایک چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ برآمد ہوا۔ طوبیٰ اور انابیہ بھی ہنس پڑیں جب کہ در شہوار کا منہ سرخ ہوگیا۔
"کم بخت صندل! چار جماعتیں پڑھ لیتی تو کم از کم ہم چار حسیناؤں کی زندگی تو آسان ہوجاتی۔ اب مزید بونگی مارنے سے بہتر ہے گیٹ پر جاؤ اور سنو چھاتا ساتھ لے لینا' بارش ہورہی ہے' تمہاری تو خیر ہے پر ہمارا پزا نہ بھیگ جائے کہیں۔" در شہوار نے اسے جھاڑتے ہوئے باہر کی طرف جانے کا اشارہ کیا جسے سنتے ہوئے اس کا منہ بن گیا۔
"بی بی جی' بڑے ہال سے چلی جاؤں' جلدی پہنچ جاؤں گی۔" صندل کو رات کے وقت پچھلے لان سے لمبا چکر کاٹ کر آگے جاتے ہوئے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔
"وہاں تمہارے کچھ لگتے برہان لالہ بیٹھے ہیں۔ پزا دیکھ کر تمہیں جلدی پہنچادیں گے اور وہ بھی اوپر۔"

درشہوار نے کھا جانے والی نگاہوں سے چوکیدار بہادر علی کی بزدل بیٹی کو دیکھا جس کا سارا خاندان سرونٹ کوارٹر میں مقیم تھا۔
"اچھا اچھا بی بی جی' جاتی ہوں۔" صندل بادل نخواستہ پچھلے کوریڈور کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
"ہاں تو بہنو! میں کیا کہہ رہی تھی کہ ہم چاروں ہی غلط گھرانے میں پیدا ہوگئے ہیں۔" درشہوار نے تعزیتی اجلاس دوبارہ شروع کیا۔ اوپر والے پورشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شاہ میر نے اپنی بہن کا یہ دکھی جملہ سن کر بمشکل اپنے قہقہے کو دبایا۔
"اگر تم "چار" کے بجائے "دو" لڑکیاں کرلو تو بات ذرا زیادہ واضح ہوجائے گی۔" شاہ میر کی اچانک انٹری پر وہ چاروں ہڑبڑا کر اٹھیں اور اپنے اپنے دوپٹے ڈھونڈنے لگیں جو دائیں بائیں لڑھکتے پھر رہے تھے۔
"آپ اپنے اس بیان پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔" درشہوار نے ہاتھ کا مائیک بنا کر شاہ میر کے آگے کیا۔
"بیا آپی کو تو تم نکال دو اس فہرست سے' وہ بے چاری تم لوگوں کا ساتھ دینے کے چکر میں ماری جاتی ہیں اور جہاں تک بات نمیرہ کی ہے تو وہ اس گھر میں پیدا نہیں ہوئی اور پیچھے رہ گئیں تم اور طوبیٰ تو تم دونوں کو تو اصل میں پیدا ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔" شاہ میر کی بات پر وہ دونوں تڑپ اٹھیں۔
"بھائی! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ اس گھر سے کب تشریف لے جارہے ہیں؟" درشہوار کا طنز سمجھ کر وہ مسکرا دیا۔
"خیریت؟ کھاریاں سے کچھ منگوانا تھا کیا؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔
"جی ہاں امیلفی... اور وہ بھی آپ کے ہونٹوں پر لگانے کے لیے۔" طوبیٰ نے جل کر کہا اور شاہ میر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
وہ اس گھر کا واحد مرد تھا' جس کا رویہ سب خواتین سے بڑا دوستانہ اور شرارتی تھا۔ ورنہ وہاج بھائی کے ماتھے کے بل اور برہان کی سردمہری کبھی کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بات پر تبصرہ کرتا' دروازہ دھڑ کر کے کھلا اور صندل حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔
"ہائے ہائے بی بی جی' غضب ہوگیا..." صندل کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔
"جب بھی آنا' کسی منحوس خبر کے ساتھ ہی آنا۔" نمیرہ نے بے زاری سے ناک چڑھائی۔
"فرمایئے' کون سی نیوز بریک کرنی ہے آپ نے۔" طوبیٰ نے طنزیہ انداز سے صندل کو دیکھا جو شاہ میر کو سامنے دیکھ کر بری طرح گڑبڑا گئی تھی۔
"وہ بی بی جی' آپ کا پزا۔" وہ ہلکا سا ہکلائی۔
"وہ پزا..." شاہ میر نے "وہ" کو لمبا کیا۔
"ہاں ہاں وہی۔" چاروں یک زبان گویا ہوئیں۔
"وہ تو برہان بھائی کے کولیگس کھا گئے' کیا تم لوگوں نے منگوایا تھا؟" شاہ میر کی بات پر ان چاروں کو کرنٹ لگا۔
"اوہ نو۔" ان سب کی امیدوں پر اوس پڑگئی۔ انہوں نے صدمے بھرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا' جیسے ان کی کوئی کمپنی نئی نئی دیوالیہ ہوئی ہو۔
"لیکن صاحب جی..." صندل کچھ تذبذب کا شکار ہوئی۔
"کہا نا' وہ برہان بھائی کے مہمانوں کے آگے رکھ دیا تھا' چلو صندل! اب کھسکو یہاں سے۔" شاہ میر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں صندل کو کوئی بات سمجھانے کی کوشش کی جو طوبیٰ کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔
"صندل! جھوٹ بولنے والا سیدھا جہنم میں جاتا ہے۔" طوبیٰ نے اسے ڈراوا دے کر سچ اگلوانے کی کوشش

کی۔

"اور بی بی صندل' یہ بھی یاد رکھنا' ایسا سچ جس سے شر پھیلنے کا اندیشہ ہو' اللہ کے ہاں اس کی بھی معافی نہیں' پورے سو سال جہنم کا عذاب بھگتو گی۔" شاہ میر کی بات پر صندل بے چاری کا رنگ فق ہو گیا۔

"جی مجھے نہیں پتا' مجھے تو ابا نے یہی کہا تھا۔" وہ بھی صاف مکر گئی۔

"ویسے ہیں تو برہان بھائی میرے ہی سگے بھائی' لیکن کی انہوں نے گھٹیا حرکت ہے۔" در شہوار جل کر بولی۔

"اچھا بابا بس کرو' ذرا سی چیز کے پیچھے اپنے بھائی کو ایسے کہو گی کیا۔" انابیہ کے بے اختیار بولنے پر شاہ میر شرارت سے کھنکھارا اور وہ ایک دم جھینپ گئی جب کہ باقی سب کو بھی ہنسی آگئی۔ انابیہ نکاح کے بعد برہان کی طرف داری کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

"چلو بھئی صندل' اگر ماگرم چائے بنا کر لاؤ سب باجیوں کے لیے' میں ان کے لیے فرائی فش کا آرڈر کرتا ہوں' آخر کو ان کا غم غلط کرنے میں مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے۔" شاہ میر ریموٹ اٹھا کر وہیں جم کر بیٹھ گیا۔

"میرے لیے چکن کارن سوپ کا بھی آرڈر دے دیں۔" در شہوار نے فوراً" اپنی فرمائش نوٹ کروائی۔

"اور میرے لیے فرنچ فرائز کا۔" طوبیٰ کی بھی زبان پھسلی۔

"میرا قیمے والا نان کھانے کو دل کر رہا ہے۔" نمیرہ نے بھی شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"ایسا کرو' تم سب لوگ آج "خیالی پلاؤ" ہی کھالو' میں چلتا ہوں۔" شاہ میر منہ بنا کر ایک دم کھڑا ہوا۔

"اف وہ بھائی' اتنی بھی کنجوسی اچھی نہیں' فوراً" جائیں اور خود لے کر آئیں۔" در شہوار نے لاڈ سے اپنے بھائی کا بازو پکڑا تو شاہ میر کو نہ چاہتے ہوئے بھی بات ماننا ہی پڑی۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو' جا کر چائے کا پانی رکھو۔" انابیہ نے صندل کو گھورا تو وہ بوکھلا کر باہر نکلی۔

"صندل' صندل' کہاں مر گئی ہو۔" اپنی اماں کی پاٹ دار آواز سن کر وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور سامنے سے آتے وہاج صاحب سے بری طرح ٹکرائی جو بڑی تیزی سے اوپر والے پورشن کی طرف آرہے تھے۔

"سنبھل کر۔" انہوں نے ایک دم ہی اسے بازوؤں سے پکڑ کر گرنے سے بچایا اور اس طرح نامحسوس انداز سے اپنے ساتھ لگایا کہ صندل نے خوف زدہ ہو کر سیڑھیوں پر لگی گرل کو تھام لیا۔ صندل کو گھر کے مردوں میں وہاج صاحب کی نظروں سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ ان کا دیکھنے کا انداز بہت عجیب تھا' ایسے لگتا جیسے آنکھوں میں کوئی ایکسرے مشین فٹ کروا رکھی ہے۔ وہ ان کی آمد پر چھپتی پھرتی تھی' لیکن آج شاید اس کے ستارے گردش میں تھے۔

"کسی دن کوئی بچانے والا نہ ہوا تو ہاتھ پیر تڑوا لو گی لڑکی۔" ان کا لہجہ معنی خیز اور بے باک نگاہیں محسوس کر کے صندل کا چڑیا جیسا دل ایک دم سہم گیا۔

"ارے وہاج بیٹا تم؟ فارحہ کو کیوں نہیں لائے ساتھ۔" تاجدار بیگم ہاتھ میں ایک شاپر اٹھائے اسٹور سے نکلیں تو صندل کی جان میں جان آئی' وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر کچن کی طرف بھاگی۔

"آپ کی بہو صاحبہ آج کل میکے گئی ہوئی ہیں اور ویسے بھی میں تو چند ہی گھنٹوں کے لیے آیا تھا کسی کام سے۔" وہاج کو اس موقعے پر ان کی آمد ناگوار گزری تھی' لیکن انہیں زبردستی مسکرا کر جواب دیا۔

"کچھ دن کے لیے چھوڑ جاؤ نا اسے' بچیاں بہت یاد کرتی ہیں۔" انہوں نے محبت بھرے لہجے میں فرمائش کی۔

وہ تاجدار بیگم کی سگی بھتیجی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی بہو بھی تھی۔ انتہائی سلجھی ہوئی اور محبت کرنے والی لڑکی' جو شادی کے چار سال بعد بھی اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔ وہ وہاج کے ساتھ اسلام آباد والے بنگلے "نور محل" میں رہتی تھی جہاں حاکم علی اور میر محتشم کے ساتھ خاقان صاحب اکثر ہی پائے جاتے۔

"جی جی بھجوادوں گا' لیکن آپ کو پتا ہے نا' نور محل میں بھی کسی خاتون کا ہونا بہت ضروری ہے۔" انہوں نے بادل نخواستہ حامی بھری۔

"ہاں ہاں سب پتا ہے مجھے' اب تو الیکشن کا جھنجھٹ بھی شروع ہونے والا ہے۔" وہ ۔۔۔ بے زار ہوئیں۔ جب کہ وہاج سر ہلاتے ہوئے اوپر والے پورشن کی طرف بڑھ گئے' لیکن وہ دل ہی دل میں تہیہ کر چکے تھے کہ فارحہ کے اکیلے پن کا بہانہ بنا کر صندل کو ہر صورت یہاں سے نور محل منتقل کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

آج پھر اسلام آباد کے ایف سیون سیکٹر میں واقع "ٹینا ہاؤس" میں ناشتے کی ٹیبل پر ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ ٹینا بیگم ابھی ابھی جاگنگ کر کے واپس لوٹی تھیں۔ تنگ سے ٹراؤزر میں بغیر آستینوں کی قمیص کے ساتھ انہوں نے اپنے اسٹیپ کٹنگ بالوں کی اونچی سے پونی بنا رکھی تھی' یوگا' جم اور ایکسرسائز کی وجہ سے ان کی فٹنس قابل رشک تھی۔ رومیصہ نے ناک چڑھا کر ماں کے حلیے کو دیکھا اور بے زاری سے سر جھٹک کر ہاتھ میں پکڑا سلائس کترنے لگی۔ وہ آج کسی گہری سوچ میں مگن تھی۔

"شیری' کیا پروگرام ہے تمہارا؟" انہیں دو دن بعد شہزاد سے بات کرنے کا ٹائم مل ہی گیا تھا۔

"کیا مطلب؟" اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔

"واپسی کی ٹکٹ کب کی کنفرم کرواؤں تمہاری؟" انہوں نے تھرماس سے شوگر فری چائے اپنے کپ میں انڈیلی۔ رومی نے چونک کر بہن کی طرف دیکھا' جو تذبذب کا شکار لگ رہی تھی۔

"سوچ رہی ہوں' یہیں پریکٹس اسٹارٹ کر دوں' میرا تو واپس جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔" شہزاد کی اطلاع پر ٹینا بیگم کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے' تم بار ایٹ لاء کی ڈگری لے کر یہاں پریکٹس کرو گی؟ پاکستان میں؟" ٹینا بیگم کی آنکھوں میں ناگواری در آئی اور ان کی خوب صورت پیشانی پر ایک شکن ابھری۔

"نام' حرج ہی کیا ہے؟" اس نے سلائس پر جیم لگاتے ہوئے خود کو لاپرواہ ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔ وہ لمحہ آچکا تھا' جس کا اسے خوف تھا۔ اسے معلوم تھا ٹینا بیگم کو اپنی بیٹیوں کا پاکستان میں رہنا سخت ناپسند تھا۔ اس بات کے پیچھے کیا منطق تھی' یہ بات ان کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے آنکھ کھولنے کے بعد دو ہی رشتے دیکھے تھے' ایک نانو کا اور دوسرا ماں کا۔ ان کے باپ کے متعلق بات کرنا ٹینا بیگم کو سخت ناپسند تھا اور شہزاد نے اس معاملے میں کبھی کھوج لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی' لیکن رومیصہ اکثر و بیشتر ماں کی اس دکھتی رگ پر ضرور ہاتھ رکھتی۔

"تمہیں اندازہ ہے' تمہاری اس مہنگی تعلیم پر کتنا پیسہ خرچ ہوا ہے میرا؟" ٹینا بیگم کے لہجے میں نخوت در آئی اور وہ کروفر سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ شہزاد نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"تو کیا اب آپ ہم سے حساب کتاب لیں گی اپنی پرورش کرنے کا۔" رومی کے لبوں پر زہر آلود تبسم ابھرا۔

"تم چپ رہو' ہزار دفعہ کہا ہے میرے معاملات میں مت بولا کرو۔" وہ تلملا کر رومی کی طرف متوجہ ہوئیں' جس کا چہرہ ماں کی اس بات پر ایک دم سرخ ہوا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا سلائس بدتمیزی سے ٹیبل پر پٹخا۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔" وہ بھڑک کر کھڑی ہوئی۔

"اگر آپ کو اپنے معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں تو فار گاڈ سیک ہم دونوں بہنوں کو بھی چھوڑ دیں ہمارے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُم مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

حال پر اور جاکر ایک اور شوہر ڈھونڈیں چوتھی شادی کے لیے۔" رومی بولی نہیں متنفر لہجے میں پھنکاری تھی۔
ٹینا بیگم کا دماغ لمحے بھر کو چکرا سا گیا۔ ان کا چہرہ فق ہوا جب کہ رومی پاؤں پٹختی ہوئی ڈائننگ روم سے نکل گئی۔
شہرزاد نے خوف زدہ نظروں سے ماں کا ہراساں چہرہ دیکھا۔ انہوں نے اپنی کرسی کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔
"آئی ایم سوری مام۔" شہرزاد لپک کر ان کے پاس آئی اور نرمی سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔
"تم نے دیکھا یہ مجھے کیا کہہ کر گئی ہے۔" وہ صدمے بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔
"مام پلیز ڈونٹ ٹیک ٹینشن میں سمجھاؤں گی اسے۔" وہ یوں شرمندہ تھی جیسے بدتمیزی رومی نے نہیں خود اس نے کی ہو۔
"اتنا تو علم تھا مجھے کہ یہ نفرت کرتی ہے مجھ سے لیکن اس حد تک کرتی ہوگی یہ اندازہ نہیں تھا۔" وہ میز کا سہارا لے کر بمشکل اٹھیں اور مرے مرے قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل گئیں۔ جب کہ شہرزاد کو اب گھٹنوں بیٹھ کر اس بات پر کڑھنا تھا۔ وہ حیران تھی کہ رومی نے اسے پاکستان تو بلوا لیا تھا لیکن ابھی تک وہ بات نہیں کی جس کی وجہ سے وہ ڈپریس تھی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ اپنی دوستوں کے ساتھ نکل جاتی اور رات گئے ہی لوٹتی تھی۔
"مجھے رومیصہ سے کھل کر بات کرنی چاہیے۔" وہ یہ سوچ کر اس کے بیڈ روم میں پہنچ گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے شاک لگا۔ رومی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہاں بھوت ناچ کر گئے ہوں۔ ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔
اس کی ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ کرچیوں کی صورت میں براؤن کارپٹ پر بکھرا ہوا تھا اور پاس ہی سنگ مرمر کا گلدان ٹوٹا ہوا تھا۔ یقیناً" شیشہ توڑنے کے لیے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ بستر کی چادر آدھی زمین پر اور اسٹڈی میز کی کرسی اوندھی پڑی تھی۔ دیوار پر لگی پینٹنگ کا بھی حشر نشر کر دیا گیا تھا۔
"او مائی گاڈ!!" شہرزاد کو اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔
وہ نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی اس کی اسٹڈی ٹیبل کے قریب پہنچی تو ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا۔ رومی نے بچپن کی بے شمار تصویروں کا تیاپانچہ کر دیا تھا۔ ان تصویروں میں جہاں جہاں مام ان کے ساتھ کھڑی تھیں انہیں قینچی سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا تھا۔ ہر طرف تصویروں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کاٹنے والے نے اپنا سارا غصہ اور نفرت بے دردی سے ان پر اتارنے کی کوشش کی ہو۔
ایک درمیانی سائز کی تصویر اسے کارپٹ پر گری ہوئی ملی اس تصویر میں شہرزاد اور رومیصہ کے درمیان میں کھڑی ٹینا بیگم کے چہرے پر اس نے سیاہ رنگ کے مارکر سے کالک بھر دی تھی۔ وہ سیاہی مایوسی کے رنگ میں ڈھل کر شہرزاد کو اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رومیصہ کی شخصیت کا یہ منفی رخ تو آج اس کے سامنے آیا تھا اور اسے پہلی ہی دفعہ اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ مام کو ناپسند ہی نہیں کرتی بلکہ ان سے بے تحاشا نفرت کرتی ہے۔ اس سوچ نے شہرزاد — کا رہا سہا سکون بھی غارت کر دیا۔ مام کی کچھ باتیں اسے بھی ناگوار گزرتی تھیں لیکن وہ شخصی آزادی کی قائل تھی۔ اس لیے اس نے ان کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی یہی وجہ تھی کہ اس کے ٹینا بیگم کے ساتھ تعلقات نسبتاً" بہتر تھے۔
"ہمیں رومی کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے۔" وہ اس کے بیڈ روم سے نکل کر سیدھی لاؤنج میں ٹینا بیگم کے پاس پہنچی۔ جو چہرے پر کھیرے کا ماسک لگائے کاؤچ پر لیٹی ہوئی تھیں اس کی بات پر وہ ہلکی سی بے چین ہوئیں اور اپنا چہرہ دھو کر کے واپس آئیں تو شہرزاد وہیں کھڑی تھی۔
"ایک دفعہ لے کر گئی تھی میں اسے ایک سائیکاٹرسٹ کے پاس۔" وہ بڑی نزاکت سے تولیے سے اپنا چہرہ صاف

کررہی تھیں۔

"پھر کیا کہا انہوں نے...؟" شہرزاد حیران ہوئی۔

"نیکسٹ سیشن پر بلایا تھا، لیکن اس نے جانے سے صاف انکار کردیا۔" انہوں نے تولیہ لاپروائی سے صوفے پر اچھالا۔

"آپ کو زبردستی لے کر جانا تھا۔" شہرزاد اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

"یہ بھی کیا تھا۔" ٹینا بیگم طنزیہ انداز میں مسکرائیں۔

"تو؟" اس نے بھنویں اچکا کر تعجب کا اظہار کیا۔

"اس نے اپنی کلائی کی رگ کاٹ کر سوسائیڈ (خودکشی) کرنے کی ناکام کوشش کرڈالی۔" وہ استہزائیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"واٹ؟" شہرزاد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ سخت حیرت اور بے یقینی سے ٹینا بیگم کا افسردہ چہرہ دیکھنے لگی، پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ وہ اتنی بھی جوان نہیں لگتیں، بڑھاپا تیزی سے اپنے قدم ان کی جانب بڑھا رہا تھا اور رومیصہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی ٹینشن تھی۔

"کیوں کررہی ہے وہ ایسا؟" شہرزاد نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

"مجھے لگتا ہے کہ کوئی اسے میرے خلاف بھڑکاتا ہے۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔

"لیکن کون؟" وہ تشویش میں مبتلا ہوئی۔

"ایک خوب صورت، کانفیڈنٹ اور کامیاب ورکنگ وومن کے ایک سو ایک دشمن ہوسکتے ہیں۔" انہوں نے ملازمہ کے ہاتھ سے تازہ اورنج جوس پکڑتے ہوئے شہرزاد کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"لیکن اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہونا چاہیے مام، وہ خود کو بری طرح spoil (تباہ) کررہی ہے۔" وہ اچھی خاصی پریشان تھی۔

"ہاں میں سوچ رہی ہوں اس کا کوئی روحانی علاج کرواؤں اور تم کل میرے ساتھ چلوگی۔" ان کی بات پر شہرزاد نے سوالیہ نگاہ سے ان کی جانب دیکھا۔

"پیر مراد علی شاہ کے مزار پر۔" ان کی اگلی بات نے شہرزاد کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ سخت حیرت اور بے یقینی سے مام کی طرف دیکھنے لگی۔ تنگ جینز کے ساتھ بغیر آستینوں کی قمیص پہنے اپنی بیٹی کے علاج کے لیے کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس جانے کے بجائے مزار پر جانے کی بات کرکے وہ اپنی لندن پلٹ بیٹی کو اپنی بھی ذہنی حالت کے بارے میں مشکوک کرچکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

صبح آٹھ بجے کا وقت تھا، طوبیٰ اور درشہوار گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھیں، ویسے بھی ان دونوں کا ایف ایس سی کا رزلٹ کچھ ہی دنوں میں متوقع تھا اور اسی وجہ سے تاجدار بیگم بھی آج کل ان پر روک ٹوک نہیں کررہی تھیں۔ ورنہ تائی امی کو لڑکیوں کا دیر تک سوئے رہنا سخت ناپسند تھا۔ انابیہ نے سستی سے کمرے کے پردے ہٹائے، سامنے مری کے پہاڑوں پر ایک چمکتی ہوئی صبح طلوع ہوچکی تھی۔ ساری رات بارش برسنے کے بعد موسم اب تھوڑا کھل چکا تھا۔

انابیہ اور طوبیٰ کے بیڈروم کی کھڑکیاں سامنے والے لان کی طرف کھلتی تھیں۔ اس وقت وہ سب کی نظروں

سے چھپ کر برہان کو یونیورسٹی جاتے ہوئے دیکھا کرتی تھی' بی اے کے رزلٹ کے بعد اس کا ارادہ بھی اسی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا تھا۔ جہاں برہان اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔
برہان نے داجی اور محتشم علی کی سخت مخالفت کے باوجود یہ ملازمت جاری رکھی تھی۔ وہ مزاجاً" اس گھر کے مردوں سے تھوڑا مختلف تھے۔ اسی وجہ سے انابیہ بہت سال پہلے ہی خود کو ان کی محبت میں گرفتار ہونے سے نہیں روک پائی جب کہ اس معاملے میں برہان نے کبھی بھی اس کی پذیرائی نہیں کی تھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا' وہ اپنا لیپ ٹاپ بیگ اٹھائے پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بلیک جینز پر انہوں نے ایک اسٹائلش اور اسمارٹ سی جیکٹ پہن رکھی تھی اور آنکھوں پر ان کا مخصوص سلور کلر کا چشمہ تھا۔
انہیں پورچ میں بڑھتے دیکھ ایک دم اس کے ذہن میں خیال آیا اور وہ دبے قدموں سیڑھیاں اتر کر ہال کمرے میں پہنچ گئی۔ چھوٹے سے کوریڈور کے اختتام پر ان کا بیڈ روم تھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے دھڑکتے دل سے ان کے کمرے میں داخل ہوئی' سرمئی اور سفید رنگ کے امتزاج کے ساتھ کمرے کی آرائش میں نفاست کا عنصر غالب تھا۔ جیسمین اسپرے کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے تایا زاد برہان شروع ہی سے اچھے لگتے تھے' لیکن نکاح کے بعد تو اس کے دل میں چھپا محبت کا ننھا پودا ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا جسے برہان نے کبھی اپنی توجہ یا چاہت کا پانی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بے اختیار چلتی ہوئی ان کی اسٹڈی ٹیبل کے پاس آکر رک گئی۔ جہاں ان کے مضمون کی کتابیں ایک ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف ایک خوب صورت قلم ہولڈر تھا۔ اس نے پین نکال کر سامنے رکھی نوٹ بک کھولی اور مسکرا کر اپنا اور ان کا نام لکھنے لگی۔
اچانک اس کی نظر سائیڈ میز پر رکھی ان کی کانووکیشن کی تصویر پر پڑی' کیمرے کی آنکھ میں محفوظ بے ساختہ مسکراہٹ نے ان کی اس تصویر کی دلکشی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ وہ شیشے کے نفیس سے فریم میں مقید تھی۔ انابیہ نے بڑی محبت سے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس فریم کا شیشہ صاف کیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ برہان کسی کام سے اپنے کمرے میں واپس لوٹ آئے ہیں اور اب ناگواری سے انابیہ کو دیکھ رہے تھے۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ان کا ناراض لہجہ انابیہ کی سماعت سے ٹکرایا اور وہ جو اس اچانک چھاپے کے لیے تیار نہیں تھی' اس آواز پر اچھلی اور اس کے ہاتھ سے فریم پھسلا اور فرش پر کرچیوں کی صورت میں بکھرتا چلا گیا۔ برہان نے ناگواری سے پہلے زمین پر پھیلی کرچیوں کو اور پھر اپنی کزن کو دیکھا جس کا چہرہ فق ہو گیا تھا اور وہ خوف زدہ انداز میں اپنے لبوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے کھڑی تھی۔ برہان کی غیر متوقع آمد نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔
"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ بے زاری سے گویا ہوئے۔
"وہ میں' انگلش کی ڈکشنری لینے آئی تھی۔" انابیہ نے بوکھلا کر بہانہ بنایا۔
"نہیں ہے میرے پاس' جاؤ یہاں سے' اور اس بے وقوف صندل کو بھیجو' یہ کچرا سمیٹے یہاں سے۔" انہوں نے سائیڈ میز پر رکھا اپنا فولڈر اٹھایا' جسے لینے کے لیے ہی وہ آئے تھے۔
انابیہ گھبرا کر ان کے کمرے سے نکلی اور باہر قدم رکھتے ہی اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ سامنے داجی سفید کلف لگی شلوار قمیص میں کشمیری چادر کندھے پر رکھے اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے سخت ناگواری سے اسے برہان کے کمرے سے نکلتا دیکھ چکے تھے۔ آج انابیہ کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا۔ وہی قسمت جس پر اسے کچھ دیر پہلے رشک آرہا تھا۔
"تم برہان کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں؟" ان کے کرخت لہجے نے انابیہ کی ٹانگوں کی جان نکال دی۔
داجی کے غصے سے تو پورا جہان کانپتا تھا اور گھر کی خواتین میں سوائے تاجدار بیگم کے کوئی بھی ان سے بات

کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا اور ویسے بھی وہ خاندان کی خواتین کو زیادہ لفٹ کروانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا زیادہ وقت' اسلام آباد اور ملتان میں گزرتا تھا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں' کیا کر رہی تھیں تم؟" بڑھاپے میں بھی ان کی آواز کی گرج اچھے اچھوں کا دل دہلا دیتی تھی' انابیہ دکھ اور صدمے سے رو دینے کو تھی۔ برہان کے بھی مقدر کی خرابی' وہ بھی اسی لمحے اپنا فولڈر اٹھائے عجلت بھرے انداز میں کمرے سے نکلے اور سامنے داجی کی شکی نگاہوں سے نکلتے شعلوں نے انہیں سٹپٹا کر رکھ دیا۔

"میر برہان محتشم' مانا کہ نکاح ہو چکا ہے تمہارا' لیکن شریف گھرانوں کی کچھ روایات اور طور طریقے بھی ہوتے ہیں۔" ان کا سفاک لہجہ' برہان کو اپنی ہی نظروں میں گرا گیا۔ ضبط کی کوشش میں ان کا چہرہ لال ہوا لیکن انہوں نے اپنے لب سی لیے۔ وہ جانتے تھے داجی اپنے سامنے کسی کو صفائی کا موقع ذرا کم ہی دیتے تھے اور برہان سے تو باہر جا کر پڑھنے اور سیاست میں نہ آنے کی وجہ سے پہلے ہی خفا رہتے تھے۔ ان کے اس سرد رویے کی بنا پر برہان بھی ان سے دور دور ہی رہتے تھے۔

"جو کچھ فرنگیوں کے ملک سے سیکھ کر آئے ہو' یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں' سمجھے' جاؤ دونوں یہاں سے۔" الفاظ کا یہ چابک ان کے اعصاب پر کسی بلڈوزر کی طرح گرا۔ داجی کا یہ انداز سراسر تضحیک آمیز تھا۔ ذلت کے گہرے احساس کے ساتھ برہان تقریباً" اڑتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔ اس کا دھواں دھواں چہرہ انابیہ کو خلش میں مبتلا کر گیا۔ وہ کرب سے لب بھینچ کر رہ گئی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے۔ وہ بمشکل ٹانگیں گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی تو طوبیٰ کو وہاں نہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ واش روم میں جا کر وہ اب کھل کر رو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ماما کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" اتنا بچی تو آپ اس وقت نہیں ہوئیں جب میں یوکے گیا تھا۔" ہادی نے بوکھلا کر کمبل ہٹایا اور ذرا محتاط انداز میں ماں کو دلاسا دینے کی کوشش کی' جو اس وقت اسلام آباد میں موجود اپنے گھر میں رو رو کر ایک چھوٹا سا ڈیم بنا چکی تھیں۔ صبح صبح آنے والی ان کی کال نے ہادی کی نیند بھک کر کے اڑا دی تھی۔

"ہاں تو اس وقت تو درمیان میں سات سمندر حائل تھے' اب تو ایک گھنٹے سے بھی کم کا سفر ہے' لیکن تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ آکر بوڑھی ماں سے مل جاؤ۔" وہ رونا بھول کر اس کی کلاس لینے لگیں تو ہادی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بوڑھے ہوں آپ کے دشمن' آپ تو اچھی خاصی انرجیٹک اور ینگ وومن ہیں۔" اس نے ماں کو بہلانے کی کوشش کی۔

"بس بس رہنے دو۔ زیادہ مسکہ بازی کرنے کی ضرورت نہیں' اپنے باپ کی طرح۔" ان کی جھاڑ سن کر ہادی کی طبیعت ایک دم صاف ہو گئی۔

"باپ بیچارے کا تو خوامخواہ سے نام بدنام کر رکھا ہے لوگوں نے۔" عبداللہ صاحب کی بھی کمرے میں انٹری ہو چکی تھی۔ ان کی آواز ریسیور میں سے ہادی کی سماعت تک پہنچی تو وہ مسکرا دیا' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب کون سی جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے۔

"دنیا میں دو ہی تو معصوم اور بھولے بھالے بندے ہیں' ایک آپ اور آپ کا بیٹا۔" عالیہ بیگم طنزیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"بھئی اب تم کسی اور کا غصہ مجھ پر تو نہ نکالنے کی کوشش کرو۔" عبداللہ صاحب گھبرا گئے۔

"سارا کیا دھرا آپ کا ہے' اللہ نے تیرہ سال بعد اولاد دی' اسے بھی اٹھا کر پہلے باہر بھیج دیا پڑھنے کو' اور اب نوکری پر ٹنگا دیا اتنی دور۔ آگ لگے اس کروڑوں کی جائیداد کو' جس کے ہوتے ہوئے ماں بیٹے کے درمیان اتنی دوری ہو۔" عالیہ بیگم ایک دم پھٹ پڑیں۔

"توبہ توبہ' آج تو سرحدوں پر سخت کشیدگی ہے' بیٹا جی پہلی فرصت میں سیز فائر کروانے پہنچیں یہاں۔" عبداللہ صاحب نے بیوی کے ہاتھ سے سیل فون پکڑا اور اسپیکر آن کر کے ہادی کو مخاطب کیا۔

"جی جی پاپا..... اس ویک اینڈ پر آتا ہوں۔" وہ خود بھی ماں کے جذباتی انداز پر بوکھلا گیا۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس طوطے کی طرح تھا' جس میں اس کی ماں کی جان قید تھی۔

"یقین مانو بیٹا! صبح و شام نمناں بہائے جاتے ہیں' مکیش اور رفیع کے گانے سنے جاتے ہیں' ایسا کوئی دکھی قسم کا ماحول بنا ہوا ہے گھر کا' سارے ملازم' چرند پرند ہر کوئی صبح و شام روتا دکھائی دیتا ہے....." عبداللہ صاحب کا شرارتی لہجہ عالیہ بیگم کو مزید تپا گیا۔

"سن رہے ہو اپنے باپ کی باتیں' ایک ماں کی محبت کا ایسا مذاق اُڑاتے ہیں۔" عالیہ بیگم — غصّہ سے گویا ہوئیں۔

"کیا ہو گیا ہے ماما' اتنا تو پیار کرتے ہیں پاپا آپ سے' ایک منٹ بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے' ورنہ کتنا کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ آکر رہیں یہاں مری میں۔" اسے ہمیشہ کی طرح ثالث کا کردار نبھانا پڑا۔

"بس بیٹا' تم دنیا کے واحد شخص ہو جو میرے جذبات سمجھ سکتے ہو' کچھ اپنی ماں کو بھی سمجھا دیا کرو۔" عبداللہ صاحب ابھی بھی غیر سنجیدہ تھے۔

"بابا' آپ بھی ذرا کم تنگ کیا کریں ماما کو۔" ہادی نے مسکرا کر سعد کو اندر آنے کا اشارہ کیا' جو کافی کے دو بڑے مگ اٹھائے دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ کل ہی اس کے گھر میں شفٹ ہوا تھا اور آج تھکن کی وجہ سے دونوں ہی نے آفس سے چھٹی کرلی تھی۔ سعد نے ٹرے ایک طرف رکھ کر بیڈ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو سامنے میر ہاؤس کے پچھلے لان کا منظر بالکل صاف تھا۔ ہادی کا بیڈ روم فرسٹ فلور پر تھا اور کمرے کے دو اطراف میں کھڑکیاں تھیں جن میں سے دو پچھلے لان کی سائیڈ پر اور دو میر ہاؤس کی گیلری کی جانب کھلتی تھیں۔

میر ہاؤس کے پچھلے لان میں اس وقت در شہوار اور طوبی نے خوب طوفان برپا کر رکھا تھا۔ درخت کے مضبوط تنے سے باندھے گئے جھولے پر بیٹھی در شہوار کی بلند آواز میں کی جانے والی شاعری سعد کو بغیر کسی دقت کے سنائی دے رہی تھی۔

فصل گل آئی' کھلے باغ میں خوشبو کے علم
دل کے ساحل پر ترے نام کا تارہ چمکا

"دو منٹ کے اندر نیچے اتر جاؤ جھولے سے' ورنہ دن میں تارے دکھاؤں گی تمہیں۔" طوبی نے منہ پر ہاتھ پھیر کر در شہوار کو دھمکی دی تو سعد کو ہنسی آگئی۔ اسے ہنستا دیکھ کر ہادی بھی اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا' وہ بابا سے بات کر کے فون بند کر چکا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری جھلکی۔

"بڑی مزے کی اور زندہ دل لڑکیاں ہیں یار!" سعد سامنے کا منظر دیکھ کر کھل کر مسکرایا' کیونکہ طوبی نے ہاتھ میں پکڑا کشمیری سیب کھینچ کر در شہوار کی کمر پر دے مارا تھا اور وہ تڑپ کر جھولے سے اتری اور جوابی حملہ کرنے کے لیے دائیں بائیں — کوئی ہتھیار ڈھونڈنے لگی۔

"بری بات ہے یار' اپنے لان میں وہ جو مرضی کریں۔" محمد ہادی کو سعد کی تانک جھانک ایک آنکھ نہیں بھائی'

ویسے بھی وہ میچور، سلجھا ہوا اور اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔

"بے فکر رہو، فوجیں اپنی حدود سے نکل کر ہماری حدود میں داخل ہو چکی ہیں۔" سعد کے شوخ لہجے پر اس نے بے زاری سے نیچے جھانکا۔ درشہوار بڑی مہارت سے درمیانی باڑ پھلانگ کر اس کے لان میں لگے خوبانی کے درخت پر چھلاوے کی طرح چڑھی اور اب وہاں سے پکی ہوئی خوبانیاں توڑ توڑ کر طوبیٰ پر حملے کرنے لگی۔

"بہت ہی ڈھیٹ اور بدتمیز لڑکی ہے، اس کا تو میں دماغ درست کرتا ہوں۔" ہادی کا دماغ گھوما۔ وہ میزائل کی طرح اڑتا ہوا اپنے پچھلے لان میں پہنچا تب تک درشہوار اس کے آدھے درخت پر تباہی پھیر چکی تھی۔

محمد ہادی کو سامنے دیکھ کر طوبیٰ، جو خوبانیاں اپنی جھولی میں ڈال رہی تھی، ہرنی کی طرح فراٹے بھرتی اندر کی جانب دوڑ گئی، جبکہ درشہوار درخت پر ٹنگی کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا کان کھجانے لگی۔ یہ اس کا مخصوص اسٹائل تھا جو رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اپناتی تھی۔

"محترمہ، ذرا نیچے اتریں شرافت سے۔" محمد ہادی کے دھمکی آمیز لہجے پر وہ ڈرتے ڈرتے چھلانگ مار کر نیچے اتری اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دھڑام سے لان میں سجدہ ریز ہو گئی۔

"ارے رے، چوٹ تو نہیں لگی آپ کو....." سعد جو ہادی کو منع کرنے کے لیے اس کے پیچھے وہاں پہنچا تھا، سامنے کا منظر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ درشہوار خجالت بھرے انداز میں بمشکل اٹھی اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگی جس پر مٹی اور گھاس کے تنکے چپک گئے تھے جبکہ اس کی کمر علیحدہ دہائی دے رہی تھی، جس پر زمین پر پڑے کسی پتھر کی نوک ٹھک سے چبھی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہو رہی تھی یہاں؟" ہادی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک آدھ تھپڑ جڑ دیتا۔

"کچھ نہیں، خوبانیاں توڑ رہے تھے۔" اس کی بے نیازی ہادی کا دل جلا گئی جبکہ سعد کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑی۔

"کیوں، یہ میر حاکم علی کے باپ کی جاگیر ہے؟ جہاں جب چاہے منہ اٹھا کر چلی آتی ہیں آپ۔" ہادی کا تلخ لہجہ سن کر درشہوار اور سعد کا دماغ بھک کر کے اڑا جبکہ وہ مزید کہہ رہا تھا۔ "آئندہ ایسا کیا تو میں ڈائریکٹ ان ہی کے پاس جاؤں گا کہ اپنی زبان میں سمجھالیں اپنے گھر کی خواتین کو۔" محمد ہادی کا دھمکی آمیز انداز درشہوار کے تن بدن میں آگ لگا گیا، وہ کہاں عادی تھی اس قسم کے لہجے کی۔ تذلیل کا گہرا احساس خنجر کی طرح اس کے وجود کو کاٹنے لگا۔

"اچھا تو یہ کس کی جاگیر ہے، ذرا روشنی ڈالنا پسند کریں گے آپ۔" آگے بھی درشہوار تھی، آسانی سے ہار نہ ماننے والی۔

"جس کی بھی ہو، آپ کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے اور برائے مہربانی اپنی آمدورفت اپنی سائیڈ تک ہی محدود رکھیں۔" خوبانیوں کا حشر نشر دیکھ کر ہادی کا خون کھول اٹھا تھا۔

"ایسا کریں، اپنی حدود کے اندر برقی رو دوڑا دیں، کیونکہ اس کے علاوہ تو کوئی اور چیز درشہوار کو یہاں آنے سے روک نہیں سکتی۔" دو قدم آگے بڑھ کر ہادی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ پاس کھڑے سعد کے تو چھکے چھڑا گئی، البتہ محمد ہادی ایک دم تلملا اٹھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، درشہوار نے انگلی اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"اور جہاں تک بات میر حاکم علی کو بتانے کی ہے تو یہ شوق بھی پورا کر لیں، لیکن اس سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیجیے گا کہ مری کے کس قبرستان میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے۔" درشہوار کی بھوری آنکھوں میں غصہ اور تراشیدہ ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔

"دھمکی دے رہی ہیں آپ مجھے اس شخص کے نام کی، جس کی اوقات پورا پاکستان جانتا ہے۔" اس نے ایک

دم مشتعل انداز میں بے اختیار ہی درشہوار کا بازو پکڑا جو وہاں سے جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ اس کی مضبوط انگلیاں، درشہوار کو اپنے نرم بازو میں کسی گرم سلاخ کی مانند گھستی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر سفاکی تھی کہ ایک لمحے کو درشہوار بھی گڑبڑا گئی۔

"کیا ہو گیا ہادی، چھوڑو ان کا بازو......" سعد نے بوکھلا کر مشتعل ہوتے ہادی کو اپنی طرف کھینچا۔ جس کی آنکھوں سے اس وقت ـــــ شعلے نکل رہے تھے جیسے سامنے والے کو زندہ جلا کر بھسم کرنے کا ارادہ ہو۔

درشہوار نے جھٹکے سے اپنا بازو اس سے چھڑایا اور متنفر انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے سکون سے اپنے لان کی طرف چل دی' اس کے اندر ایک حشر برپا تھا لیکن وہ اپنے اندر ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ کو باہر کی دنیا کے لوگوں پر ذرا کم ہی ظاہر کرتی تھی' یہ اسے اپنی ذات کی سب سے بڑی توہین محسوس ہوتی تھی' لیکن اس وقت تو دا جی کے بارے میں کہے ہوئے جملے نے اسے سلگا کر رکھ دیا تھا۔

"مسٹر ہادی..... آپ کو اندازہ نہیں ہے' کس طوفان کو دعوت دے چکے ہیں آپ۔" واش روم میں آدھا گھنٹہ اپنی کلائی ٹھنڈے پانی کے نل کے نیچے رکھنے پر بھی وہ اپنے اندر بدلے کی آگ کو کم نہیں کر سکی۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ سڑیل' کہیں خوبانیوں کے پیسے تو نہیں مانگ لیے۔" وہ جیسے ہی واش روم سے باہر نکلی' طوبی بڑے مزے سے اس کے بیڈ پر بیٹھی' وہی خوبانیاں ـــــ کھا رہی تھی۔ پاس ہی درشہوار کا لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں......" درشہوار نے بے زاری سے ہاتھ میں پکڑا تولیہ اسٹینڈ پر پھینکا اور کمرے میں آتی ہوئی دھوپ کو کم کرنے کے لیے جیسے ہی پردے کی طرف ہاتھ بڑھایا' اسے جھٹکا لگا۔

درشہوار کے کمرے کی بائیں دیوار کے عین سامنے محمد ہادی کے کمرے کی دائیں سائیڈ والی دو کھڑکیاں تھیں اور درمیانی فاصلہ صرف چند فٹ کا تھا۔ ان دونوں کمروں کے درمیان میں چھوٹی سی گیلری اور چند فٹ کی مشترکہ دیوار تھی جو خاصی نیچی تھی۔

ہادی کے کمرے کی شیشے کی دونوں کھڑکیاں اس وقت بند تھیں لیکن پردے ہٹے ہونے کی اور لائٹ جلنے کی وجہ سے اندر کا منظر بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے سامنے کھڑے ملازم کے اوپر برس رہا تھا' ان دونوں کے چہروں کے تاثرات سے درشہوار کو اندازہ ہوا کہ دونوں کے درمیان کوئی خوشگوار گفتگو نہیں ہو رہی تھی' گرج برس کر وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

درشہوار کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ دوڑی' وہ تیزی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر نکلی اور عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر ڈرائنگ روم کی میز پر رکھا سنگ مرمر کا بھاری ایش ٹرے اٹھا کر لے آئی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں' کیوں شرلاک ہومز کی طرح پورے گھر میں گھوم رہی ہو؟ یہ ایش ٹرے کا کیا کرنا ہے کہیں خود نخواستہ اسموکنگ تو نہیں شروع کر دی۔"

لیپ ٹاپ پر اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولے طوبیٰ نے نظریں اٹھا کر حیرت سے درشہوار کا خفا چہرہ دیکھا۔

"طبیعت سیٹ ہے تمہاری.....؟" اس کی معنی خیز خاموشی طوبیٰ کے لیے الجھن کا باعث بنی' وہ جانتی تھی کہ درشہوار کے لیے خاموش بیٹھنا دنیا کا مشکل ترین کام تھا' جو وہ مشکل ہی سے سرانجام دیتی تھی۔

"میری طبیعت تو ٹھیک ہے' لیکن کسی اور کی سیٹ کرنے لگی ہوں۔" درشہوار نے غصے سے اپنی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اسے کھولا اور پوری قوت سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایش ٹرے گھما کر ہادی کی کھڑکی پر دے مارا۔ فضا میں شیشہ ٹوٹنے کی بلند آواز گونجی' اور طوبیٰ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا.....؟" وہ اچھل کر بیڈ سے اتری اور متاسفانہ انداز میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ سامنے

محمد ہادی کا کمرہ اس وقت خالی تھا لیکن شیشہ ٹوٹنے کی آواز یقیناً" نیچے موجود مکینوں تک بھی گئی ہوگی۔ طوبیٰ نے بوکھلا کر پردے برابر کیے اور در شہوار کا بازو پکڑ کر زبردستی اسے بیڈ پر بٹھایا۔ جس کا چہرہ سرخ اور آنکھوں میں خفگی کا ایک جہان آباد تھا۔

"یہ کیا بے ہودہ حرکت کی تم نے......؟" طوبیٰ نے غصے سے اس کا کندھا ہلایا۔

"ابھی تو آغاز ہے' بڑا دردناک انجام ہوگا۔" در شہوار کے ماتھے کی پھڑکتی رگ اس کے اندرونی خلفشار کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رینگتی انتقامی مسکراہٹ دیکھ کر طوبیٰ الجھ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر مزید غور و فکر کرتی' کمرے میں اچانک ایک دھماکہ ہوا اور دونوں کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ در شہوار کی کھڑکی کا شیشہ بھی شہید ہو چکا تھا۔ اسٹیل کا ایک بھاری سا گلدان اڑتا ہوا کارپٹ پر آگرا۔ دونوں خوفزدہ انداز میں اچھل کر پیچھے ہٹیں' اور حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے سنہری رنگ کے اس قدیم گلدان کو دیکھنے لگیں' جو حجم میں چھوٹا لیکن وزن میں کسی طور بھی تین چار کلو سے کم نہیں تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" طوبیٰ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ "اس کا کیا مطلب ہے......؟"

"اس کا مطلب ہے حریف' خاندانی اور ٹکر کا ہے' اور مقابلہ تو ایسے ہی لوگوں کے ساتھ جچتا ہے۔" در شہوار کے لبوں کا ایک معنی خیز مسکراہٹ نے احاطہ کیا اور طوبیٰ یوں تشویش سے اسے دیکھنے لگی جیسے اس کی خرابیٔ دماغ کا یقین آگیا ہو۔

☆ ☆ ☆

آستانہ مراد علی شریف پر آج آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مزار کے احاطے میں لگے کیکر کے درخت پر منت کے رنگ برنگے کپڑوں کی ٹلیاں اٹک رہی تھیں اور ایک دو ٹہنیوں پر تو بے اولاد عورتوں نے چھوٹے چھوٹے پنگوڑے لٹکا رکھے تھے۔ مری کے اس گاؤں میں واقع اس مزار پر موجود خواتین میں تعلیم اور شعور کی کمی اور عقیدت کی فراوانی تھی۔ اسی مزار کے صحن میں بنے چبوترے پر شیشم کے درخت کا گھنا سایہ تھا اور میلی سی دری پر بیٹھے سائیں بابا کا سر وقفے وقفے سے جھولتا رہتا۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی ڈھیروں مالائیں اور سبز رنگ کا چوغہ جو جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔

"مام کو پتا نہیں کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔" شہزاد نے کوفت بھرے انداز میں ٹینا بیگم کی طرف دیکھ کر سوچا' جو مزار کے احاطے میں رکھے لکڑی کے باکس میں اچھی خاصی رقم ڈالنے میں مصروف تھیں۔

خواتین کا ایک گروپ سائیں بابا کے اردگرد گھیرا ڈالے بیٹھا اپنے لیے دعا کرانے کی التجائیں کرنے میں مصروف تھا۔ شہزاد کو یہاں آکر عجیب سا احساس ہوا' وہ ٹینا بیگم کے ایک دفعہ کہنے پر ہی ان کے ساتھ چلی آئی تھی' لیکن اس قسم کی صورت حال کا اندازہ نہیں تھا اسے۔

"حق مولا......" سائیں بابا کو ایک دم جوش آیا اور وہ بلند آواز میں نعرہ لگا کر مزار کے احاطے میں گول گول چکر کاٹنے لگا۔ جب کہ مزار میں موجود مریدنیاں عقیدت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں سائیں بابا۔" ایک خاتون کا جملہ شہزاد کی سماعت تک میں پہنچا اور اس نے ناگواری سے کھڑے کھڑے پہلو بدلا۔

"مام پلیز چلیں......" شہزاد کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔

"مسز بخاری بتا رہی تھیں' بڑی متبرک جگہ ہے۔ یہاں سے کوئی نامراد نہیں جاتا۔" ٹینا بیگم جو پسینے سے شرابور تھیں' مڑ کر بولیں۔ اچھے خاصے سرد موسم میں بھی کچھ دیر دھوپ میں کھڑے رہنے کی وجہ سے دونوں کو

پسینہ آگیا تھا۔

"مرادیں پوری کرنے والی ذات اوپر ہے' آپ لوگ خواہ مخواہ اسے زمین پر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ اپنے خیالات کا اظہار ذرا بلند آواز میں کر گئی' اتنے سال ملک سے باہر رہنے کے باوجود اس کے عقائد خاصے پختہ تھے۔

سائیں بابا جو وجد کے عالم میں گول گول چکر کاٹ رہے تھے' ان کو کرنٹ سا لگا اور ان کے متحرک قدموں کی گردش ایک لمحے کو رکی' اور وہ بڑی سرعت سے شہرزاد کے عین سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

یہ سارا کھیل اوپر والے کا ہی ہے پتر' ہم تو اس کے ہاتھ کی بنائی وہ کٹھ پتلیاں ہیں جنہیں وہ آسمانوں پر بیٹھ کر انگلی کے اشارے سے چلاتا ہے۔ خود کو اس کے اشاروں پر چلنا سکھا' ورنہ دنیا تیری ڈگڈگی بجا دے گی۔" وہ اس کے پاس آکر پر اسرار انداز میں گویا ہوا' بدبو کا ایک بھبھکا شہرزاد کی ناک سے ٹکرایا اور وہ بے اختیار پیچھے ہٹی۔

"منہ کی بدبو سے نہیں اندر کی غلاظت سے ڈر' جو قبر میں بچھوؤں کو اپنی طرف راغب کرتی ہے۔" سائیں بابا نے پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا زمین پر مارا اور اللہ ہو کا نعرہ لگاتے ہوئے ایک دفعہ پھر عالم وجد میں رقص کرنے لگا۔

شہرزاد کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا' وہ اڑتی ہوئی اپنی گاڑی تک پہنچی اور جھٹ سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ابھی بھی بے ربط تھیں۔

"او مائی گاڈ' بہت رش تھا آج۔" ٹینا بیگم بھی اس کے پیچھے ہی گاڑی تک پہنچ گئیں۔ انہوں نے بڑی مشکل سے لی ہوئی چادر لاپروائی سے اتار کر سیٹ پر پھینکی اور منرل واٹر کی بوتل کھول کر پانی پینے لگیں۔

"کون سی دعا کرنے آئی تھیں آپ؟" شہرزاد نے ہلکی سی ناگواری سے اپنا بیگ کھول کر سن گلاسز نکالے۔

"رومی کی مینٹل کنڈیشن میں بہتری کی۔" انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

"واٹ؟" شہرزاد کو جھٹکا لگا اور وہ مڑ کر مام کا چہرہ حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"مجھے یقین ہے' اس کا دل میری طرف پلٹ آئے گا' ماں ہوں میں اس کی' دل دکھتا ہے میرا اس کی حالت دیکھ کر۔" ٹینا بیگم کی آواز بھرا گئی۔

"آپ کو اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے۔" شہرزاد نے محتاط انداز میں مشورہ دیا۔

"وہ نہیں نہیں جائے گی میرے ساتھ۔" ان کی صاف گوئی میں دل دکھاتی رنجیدگی شامل تھی۔

"اوکے میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔" شہرزاد نے مام کو دلاسا دینے کے لیے نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑا' لیکن انہوں نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ دونوں جیسے ہی گھر پہنچیں تو ایک اعصاب شکن مرحلہ ان کا منتظر تھا۔ گیٹ سے پورچ کی طرف جانے والی روش پر دو بڑے سرخ رنگ کے گملے ٹوٹے ہوئے پڑے تھے اور مالی منہ بناتے ہوئے سارا کچرا سمیٹ رہا تھا۔

"یہ کس نے توڑے ہیں......؟" ٹینا بیگم اپنی گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے مالی پر برسیں۔

"ہارون صاحب نے......" مالی نے ہلکا سا جھجک کر جواب دیا۔

"اس باسٹرڈ کا دماغ خراب ہے کیا' آج پھر کچھ چڑھا آیا ہوگا احمق انسان۔" ٹینا بیگم سلگ کر بولیں جبکہ شہرزاد ایک متاسفانہ سانس بھر کر رہ گئی۔ اس کی مام کے اس شوہر کے ساتھ ایک سرسری سی ملاقات ہوئی تھی لندن میں اور وہ اسے پہلی ہی نظر میں اچھے نہیں لگے تھے۔

"اللہ نے بھی چن چن کر نمونے لکھ دیے ہیں میری قسمت میں۔" ان کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ بے زار انداز سے پاؤں پٹختی ہوئی وہ اندر کی جانب بڑھیں اور شہرزاد کو بھی مجبوراً ان کی پیروی کرنی پڑی۔ ٹینا بیگم نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا' ہارون رضا مشتعل انداز میں ان کی جانب لپکے' وہ شہرزاد کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ ویسے بھی ٹینا بیگم کی موجودگی میں ان کا سارا دھیان ان ہی کی طرف رہتا تھا۔

"بلاؤ اپنی اس گندی اولاد کو' جس نے پورے شہر میں بے غیرتی اور بے حیائی کی ایک داستان رقم کر دی ہے۔" ہارون رضا نے ہاتھ میں پکڑا پیپسی کاٹن بیگ بڑے غصے سے دروازے کی طرف اچھالا جو شہرزاد کے عین قدموں میں آن گرا۔

"کس کو' رومیصہ کو......؟" ٹینا بیگم کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ ابھی تو انہیں مزار پر چڑھاوا چڑھائے ہوئے دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔

"ظاہر ہے' وہی تو ہے' جس نے تمہارا سکون برباد کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔" وہ بے زاری سے گویا ہوئے۔

"کیا کیا ہے اس نے......؟" ٹینا بیگم کی آواز قدرے مدھم ہوئی۔

"دیکھو ذرا' اپنی ولگر (بے حیا) بیٹی کا کارنامہ۔" ہارون رضا شہرزاد کی موجودگی سے بے خبر اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹیب پر تیزی سے انگلیاں چلانے لگے۔ شہرزاد کو اپنی بہن کے لیے ہارون کا جملہ اور لہجہ سخت برا لگا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

"کچھ پتا بھی تو چلے' کیا دکھانا چاہ رہے ہیں آپ......؟" ٹینا بیگم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا۔

"وہ دکھاؤں گا' جسے دیکھ کر ہوش اڑ جائیں گے تمہارے اور اگلے کئی سال تک تم دنیا والوں سے منہ چھپاتی پھرو گی۔" ہارون رضا کے تنفر لہجے میں کچھ تھا جو شہرزاد کا دل بھی دہلا گیا۔ وہ بھی چند قدم آگے بڑھ گئی۔ ٹینا بیگم کی نظر ٹیب پر کھلے فیس بک کے پیج پر پڑی اور ان کا دماغ بھک کر کے اڑ گیا' وہ لبوں پر ہاتھ رکھ کر خوفزدہ انداز میں ایسے پیچھے ہٹیں جیسے کوئی بہت بڑا عفریت دیکھ لیا ہو۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شازیہ الطاف ہاشمی

ناہید کی شادی ہوئے دو سرا ہفتہ شروع تھا اس کی ہنسی رکنے میں نہیں آرہی تھی۔ عامر جیسا محبت کرنے والا شوہر ملا تھا اور ان کے خیالات بھی آپس میں کتنے ملتے تھے۔ وہ اس کی مسکراہٹ پر حقیقت میں قربان ہوا جاتا تھا۔ سچ ہے محبت کا بھی کبھی کوئی نعم البدل ہوا ہے۔ بھی محبت محبت ہی ہے اس کے آگے سب چھوٹا پڑ جاتا ہے اور وہ تو آئی بھی سگی خالہ کے گھر تھی۔

خالہ جو ماں ہوتی ہے اور خالہ کی بیٹیاں شمنا' وحیدہ' یاسمین' نازیہ سب اس کے بچپن کی گواہ تھیں۔ محبت سے بال سنوارے تھے۔ چپ کروایا تھا۔ ماتھا چوما تھا۔ وہ تو محبت بھرے آشیانے میں آبسی تھی۔ وہ ذرا سا روتی تو ساری خالہ زاد بہنیں چپ کرانے میں ہلکان ہو جاتیں۔ جب تک وہ ہنس نہ دیتی مسلسل اسے پچکارتی جاتیں' امی اسے کبھی کبھار مار بھی لیتیں' مگر خالہ اور خالہ کی بیٹیاں محبتوں کا مرکز تھیں۔ اسے بھولے سے بھی گرم ہوا تک نہ لگنے دیتیں۔

وہ یہاں آکر بہت خوش تھی اور عامر کی محبتیں پاکر اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی' وہ حقیقتاً" تتلی کی طرح اڑتی پھرتی ہنس کر روٹیاں سسر کو دیتی جاتی اور چھوٹے موٹے کام بھی بخوشی کرلیتی۔ اپنا گھر تھا اور اپنے گھر میں کیسے تکلفات۔

فیروز چاچو کو بھی وہ کوئی کم پیاری نہیں تھی۔ وہ سب کی پیاری تھی۔ دن پر لگا کر اڑ رہے تھے یوں بھی اچھا وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے۔ روز ہی کسی نہ کسی کے ہاں دعوت ہوتی' وہ نئے کپڑے پہن کر خوب خوشبو لگا کر عامر کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھتی اور یہ جا وہ جا۔ مہینے بعد — دعوتیں بھگتا کر وہ گھر سنبھالنے کا

بھی سوچ رہی تھی۔
سعیدہ خالہ کا اسے پتا تھا' وہ اسے کبھی بھی کام کا نہیں کہتیں' وہ دل ہی دل میں گھر سنبھالنے کے لیے منصوبہ بندی کرتی تھی۔ خالہ کی بیٹیاں اپنے گھر بار میں الجھی تھیں۔ اس کے جتنے تو ان کے بچے تھے۔ وہ چاروں پندرہ دن رہ کر رخصت ہوئیں۔
اب گھر میں خالہ' خالو وہ اور عامر بس۔

آج عامر اسے اپنے دوست اظہار کے گھر لے جانے والا تھا۔ وہ فیروزی رنگ کا سوٹ پہنے' سر پر کڑھائی والا دوپٹا لیے تیار تھی۔ ہنسی اس کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔ حسب معمول وہ دونوں باہر نکلنے کو تیار تھے۔ وہ خالہ سے پوچھنے بھی نہیں جاتی تھی۔ بس عامر اور وہ نکل جاتے اور انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ وہ تو ناہید کو خوش دیکھ ہی رہی تھیں نا۔ اس کا سنہرا پراندہ کمر سے نیچے جھول رہا تھا۔ قدم سرشاریوں کے گواہ تھے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر خالہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں۔
"اپنے سسر کے لیے روٹی پکا دے ناہید! آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور عامر تو آکے میرے پیر دبا دے۔"
آج اس نے پہلی بار نوٹ کیا تھا کہ خالہ کے چہرے سے مسکراہٹ رخصت ہوئے مہینہ ہو گیا تھا۔ وہ تو اسی دن سے ہنسنا بھول گئی تھیں جب سے وہ اس گھر میں بہو بن کر آئی تھی۔ ان کے گال صرف ناہید نے چومے تھے' ان کے گلے میں ناہید لٹکی تھی۔ انہوں نے تو سہارا دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اپنی مستی خوشی میں اس نے کچھ بھی نہیں سمجھا نہ ان کی خاموشی نوٹ کی نہ چہرے کے تاثرات۔ اس کی تیاری دھری کی دھری رہ گئی اور عامر "جی امی" کہہ کر ان کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ناہید کی شکایتی نظروں کو نظرانداز کر دیا تھا۔
کمرے میں آکر اس نے چوڑیوں اور لمبے پراندے سے نجات حاصل کی۔ یہ پراندہ عامر کی آنکھوں میں محبت کے جتنے چراغ روشن کرتا تھا۔ وہ سب بجھ چکے تھے' صرف دھواں باقی تھا' ہراس باقی تھا' دکھ اور آنسو بچے تھے اور کچھ نہیں بچا سب راکھ ہوا۔ مسئلہ روٹی پکا کر دینے کا نہیں تھا' وہ سو بار پکاتی۔ اپنا گھر تھا سب اپنے تھے مگر لہجے اور انداز بدل گئے تھے۔ کیوں کیا غلطی تھی۔ کیا کھوٹ تھا اس کے دل میں' وہ تو صاف دل اور محبتوں کو دل میں بسائے بیٹھی تھی اور خالہ اسے یقین نہیں آیا تھا۔ فریج میں خالو کی پسندیدہ کھیر کا پیالہ بھرا رکھا تھا ہاٹ پاٹ میں روٹی بھی موجود تھی۔ سالن زرینہ (ملازمہ) پکا کر گئی تھی وہ کہہ بھی نہ سکی اور چپ بھی نہ رہ سکی۔ گرم آنسو اس کے پورے چہرے کو ڈھانپ گئے تھے۔
وہ خالہ کو منانا چاہتی تھی' مگر ان کے احساسات بدل چکے تھے۔ وہ اسے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتیں۔
عامر رات کو اسے منا لیتا۔ وہ مان جاتی اور دن میں پھر نظرانداز کرتا اس سے دور دور رہتا۔ خالہ سرد نگاہوں سے تکتی رہتیں۔ وہ نخلستان سے یک دم صحرا برد ہو گئی تھی۔ روز موٹر سائیکل خالہ کے کمرے کے سامنے رکتی وہیں باتوں کا دور چلتا گپ شپ ہوتی۔ خالہ دانستہ طور پر اسے اور عامر کو دور کر رہی تھیں۔
وہ منتظر ہی رہتی کہ پہلے کی طرح چہکے' باتیں کرے لاڈ اٹھوائے' مگر ایک سرد خاموشی اسے کچھ بھی کہنے اور کرنے سے روک لیتی۔ وہ کمرے میں چائے دینے جاتی تو یک دم خاموشی چھا جاتی۔ صرف اس کی سانسوں کی آواز سنائی دیتی۔ وہ چند لمحے بیٹھی رہتی' رسمی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے رہتی' شاید ابھی سب مسکرائیں گے اور کہیں گے۔ "مذاق ہے" مگر وہاں مذاق واقعی نہیں ہو رہا تھا۔ سب سچ اور حقیقت پر مبنی تھا' تلخ سچ چاروں سمت پھن پھیلائے اسے ڈسنے کو تیار تھا۔ اکیلی کتنی دیر بیٹھی منتظر رہتی' آخر کار تھک کر اٹھ جاتی پھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی گفتگو شروع ہو جاتی' جسے سننے کی اس نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صبح سے شام کام اور کام اور صرف کام۔

زرینہ اب صرف برتن دھوتی تھی یا پھر اس نئی نویلی دلہن کے دکھڑے سننے کو بے تاب رہتی۔ اسے کچھ کہنے پر اکساتی مگر وہ خاموش رہتی تھی۔ جب اپنے دل کے قریب والوں نے دل کا یہ حشر کیا تھا تو یہ غیر ملازمہ کیسے کیسے نہ اس کی عزت کا جنازہ نکالتی۔ خالہ اب فالج کے مریض کی طرح تھیں' نہ ہل سکتی تھیں نہ اٹھ سکتی تھیں۔ مگر پورے گھر پر ان کا قبضہ سا تھا کہتی نہیں تھیں مگر نظر آتا تھا۔

اس ڈیڑھ مہینے میں ناہید نے ہر طرح سے خالہ کو منانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے دل میں جگہ بنانے کی ناکام کوششوں میں مصروف رہی تھی مگر عامر اور خالہ نے اسے گھاس نہیں ڈالی' عامر اس سے کسی آسیب جیسا برتاؤ کرتا تھا جیسے اس کے پاس بیٹھنے سے وہ نافرمان ہو جائے گا۔ گندی باتیں سیکھے گا۔ سب وارفتی و محبت ہوا ہوئی تھی۔ پہلے جیسے محبت خواب کی طرح تھی اور تیر کی طرح لگتی تھی۔ پتا نہیں اسے کس جرم کی سزا مل رہی تھی۔

آج چاروں بہنوں کی میکے آمد متوقع تھی اس کے ذمے بہت سے کھانے تھے۔ قورمہ' بریانی' اچار گوشت' دم کا قیمہ' شامی کباب' پکوڑے' رائتہ' روٹیاں' انار دانے کی چٹنی اور یخنی والا پلاؤ۔

اماں کی فہرست بڑھتی جا رہی تھی یہ دوپہر کا کھانا کم اور شاہی ضیافت زیادہ لگ رہی تھی۔

بہرحال اسے سب کرنا تھا اور کھانے پکانے میں صبح سے الجھی ہوئی تھی۔ زرینہ چھٹی پہ تھی۔ تندور گرم جیسے کچن میں وہ تن تنہا موجود تھی۔ کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا اور خالہ نے دھنیے کے پتے تک علیحدہ نہ کیے تھے۔ کتنے سارے چولہوں پر چڑھے پکوان بھاپ اڑاتے منتظر تھے۔ خیر سب ہو گیا تھا اور اس نے کر لیا تھا پھر نہا کر تیار ہوئی تھی۔ تیار کیا بس کپڑے تبدیل کیے تھے اور نہائی تھی۔

شمینا باجی کے بھاگ کر گلے لگی' وہ بے تحاشا روئے جا رہی تھی اس کی ہچکیاں آہستہ آہستہ سسکیوں میں بدل رہی تھیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے جب شمینا باجی سے علیحدہ ہوئی تو ان کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا اور نہ لبوں پر تسلی کے الفاظ۔ وہ لب بھینچے چپ تھیں اور اسے دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

"کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ دیے ہم نے جو یوں ڈراما کر رہی ہو۔"

باقی بہنوں کا رویہ بھی لیا دیا تھا۔ سب عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کھانا بھی اس اکیلی نے چن دیا تھا پھر برتن اکٹھے کر کے کچن میں آ گئی تھی۔ برتن دھو دھو کر اس کے ہاتھ اور کندھے دکھ رہے تھے۔ شاید اسے بخار بھی تھا۔ اس کی آنکھیں اور جسم تپ رہا تھا۔ بہنیں' جواب نندیں تھیں انہوں نے بات تک نہیں کی شام کی چائے دے کر سب کو خالہ کے کمرے میں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آ کر گر سی گئی تھی۔

اسے دوائی کی ضرورت تھی مگر عامر سے کہنے کی صورت میں خالہ اسے جن نظروں سے دیکھتیں' اس سے بہتر بخار میں تپنا ہی تھا۔ محفل گرم تھی اے سی کی ٹھنڈک فرحت بخش سا سکون پھیلا رہی تھی اور وہ اپنے اور عامر کے مشترکہ کمرے میں بے سدھ پڑی تھی۔ جب گھبراہٹ ہوئی تو وہ بجھے بجھے تھکے جسم کو مشکل سے گھسیٹ کر خالہ کے کمرے تک آئی۔

"اچھا ہے اماں ابھی سے سنبھال لیا اس کو' نہیں تو برباد کر دینا تھا اس کمینی نے۔"

"میں نے تو پہلے ہی اماں کو خبردار کیا تھا کہ بچ کے رہنا اس پراندے والی سے نا۔"

"اماں بس کوئی رعایت نہیں دینی۔ کس کے رکھنا اسے' سارے گھر کا کام لینا۔ قابو میں رکھنا۔"

یہ چاروں بہنوں کی رائے تھی اور درمیان میں لقمے دیتا عامر بہنوں کی ہدایات غور سے سن رہا تھا۔

"ارے رو کیسے رہی تھی بدبخت جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ ابھی سے اتنے ڈرامے کرتی ہے۔ پتا نہیں بعد میں کیا کرے گی۔ اماں یہ تو بڑی چالاک نکلی۔" یہ یاسمین آپی کی رائے تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور بے اختیار دل رو پڑا تھا۔

سچ ہے۔ "سسرال سسرال ہوتا ہے خالہ جی کا گھر نہیں۔"

عزہ خالد
یادگاریں

وہ پردہ تھامے کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔ ماضی میں گزرے خوشگوار لمحے اس کے سامنے فلم کی طرح چل رہے تھے۔ وہ ہاتھ مسلتے ہوئے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔

"اگر دادو کو پتا چلا تو ڈانٹیں گی.... اس سے پہلے کہ کوئی انہیں بتائے میں خود بتا دیتی ہوں۔" اس نے ٹہلتے ہوئے خود کلامی کی اور پھر کمرے میں جھانکا تھا۔

دادو بڑے غور سے ساس بہو سیریل دیکھ رہی تھیں۔ وہ باقاعدگی سے یہ ساس بہو سیریل دیکھتی تھیں۔ یہ ساس بہو ڈرامے ان کے لیے کھانے پینے کی طرح ضروری تھے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی اور ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ دادو کی ساری توجہ ٹی وی پر تھی۔

"دادو...."

"ہم...." وہ ٹی وی سے نظر ہٹائے بغیر بولیں اس ہم کے جواب میں اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"دادو' یہ ڈرامے آپ کو مجھ سے زیادہ عزیز ہیں۔" یہ شکوہ وہ تقریباً" ہر روز ہی کرتی تھی۔

"کہو.... کیا کہنا ہے۔" وہ اب اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ اس شکوے کی وہ بھی عادی ہو گئی تھیں شاید.... تب ہی لاڈ پیار جتانے کے بجائے اس کا مدعا جاننا چاہا تھا تاکہ وہ کام کی بات کرے اور انہیں ڈراما دیکھنے دے۔

"وہ...."

"جلدی کہو.... ڈراما نکلا جا رہا ہے۔" وہ اس کی خاموشی پر بری طرح جھنجلائی تھیں اس نے ایک خفگی بھری نظران پر ڈالتے ہوئے بات شروع کی تھی۔

"وہ.... جو پچھلی گلی میں محمود صاحب ہیں نا.... ان کا چھوٹا بیٹا اویس ہے نا.... آج میں نے اسے مارا ہے؛

"ک.... کیا؟" وہ چلائیں۔ "مگر کیوں؟"

"میں کالج سے آ رہی تھی' راستے میں کھڑا تھا۔ موبائل نمبر مانگ رہا تھا۔" مسکین سی صورت بناتے ہوئے بتایا تھا۔

"ہائیں.... تم سے نمبر کا کہا اس نے؟" دادو نے آنکھیں ماتھے پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں.... گا کر مانگ رہا تھا۔ میں وہاں سے گزر رہی تھی۔ وہ گا رہا تھا۔

"واٹ از موبائل نمبر....

واٹ از یور اسٹائل نمبر۔" اس نے گنگنا کر بتایا۔

"پھر؟"

"پھر میں نے جوتا اتارا اور نشانہ لیا' وہ بھاگنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ جوتا اس کی کمر پر لگا اور میں نے پھرتی دکھاتے ہوئے دوسری جوتی بھی اتاری اور نشانہ لیا اور بھاگ کر پہلی جوتی اٹھائی پھر نشانہ لیا۔ بس یونہی لگ

بھگ چار پانچ نشانے لگے اور وہ اپنے گھر بھاگ لیا۔"
دادو سوچ میں پڑ گئیں شاید وہ تصور کی آنکھ سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔
"میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا نا؟" بڑی معصومیت سے پوچھا گیا تھا۔
"نہیں اچھا بلکہ بہت اچھا کیا۔" ابھی وہ خوش ہو رہی تھی کہ دادو اگلا جملہ اس کی سماعت میں رس گھولنے لگا۔
"شاباش یوں ہی آئے دن کسی کو مار آیا کرو لوگ میرے پاس شکایتیں لے کر آتے رہیں گے کہ یہ سکھایا ہے پوتی کو' یہ تربیت ہے کہ آئے دن مار دھاڑ۔" دادو نے پہلا جملہ اتنی سنجیدگی سے ادا کیا تھا کہ وہ سمجھ نہ پائی۔
"تم ..... یونہی میرا نام روشن کرتی رہو۔ کتنا سمجھایا تھا کہ عثمان کو لڑکی ذات ہے اتنا سر پر مت چڑھاؤ۔ اب اتنی ہتھ چھٹ لڑکی سے کون شادی کرے گا بھلا۔"
"کوئی نہ کرے بھلے' کون سا مری جا رہی ہوں' مجھے بھی نہیں کرنی شادی وادی۔" اس نے چڑتے ہوئے کہا تھا۔
"تو کیا کنوار کوٹھا چنواؤ گی؟ ساری عمر یوں ہی بچوں کی طرح لڑتے جھگڑتے شکایتیں لاتے گزار دو گی۔ بیس سال کی ہو گئی ہو۔ اس عمر میں لڑکیاں تمیز سے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھ کر گھرداری کرتی اچھی لگتی ہیں۔ یہ اپنی پونم کو ہی دیکھ لو' کیسی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ کیسے بھرے سسرال میں سب کا دل جیت رہی ہے۔"
"کون پونم؟" وجیہہ نے یادداشت کھنگالی۔ مگر دور پار کہیں کوئی اپنی پونم نہ دکھائی دی۔
"ارے وہی "سسرال میرا گھر" میں جو ہے کتنی سمجھ دار بچی ہے' کتنی ساس اور جھگڑالو نندوں کو کیسے قابو کیا ہوا ہے۔"
وجیہہ نے سر تھام لیا تھا یہ جاننے کے بعد کہ اپنی پونم۔ ساس بہو سیریل کی ہیروئین ہے۔

"عثمان کو کتنا سمجھایا تھا میں نے مگر اس نے میری ایک نہ سنی' اب یہ سب مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے پتا نہیں میری کتنے دن کی زندگی ہے۔ بی بی اب باپ نہیں رہا چھوڑ دو لڑکوں کی طرح مار کٹائی۔" دادو پھر سے شروع ہو چکی تھیں۔
وہ خاموشی سے سر جھکائے سن رہی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ اچھا ہے جتنا ڈانٹنا ہیں ابھی ڈانٹ لیں۔ شام تک محمود صاحب کی زوجہ شکایت لے کر آئیں گی تو ان کے سامنے ڈانٹ کھانے سے بچ جاؤں گی۔
اویس کا قصہ کچھ یوں تھا کہ وہ روز محلے کی آتی جاتی لڑکیوں کو چھیڑتا تھا' جو اس کی نظروں میں بری طرح کھٹک رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ آج جب وہ گانا گا رہا تھا تو وجیہہ سامنے سے گزر رہی تھی۔ وجیہہ نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جوتی اتاری تھی۔ اچانک اس ڈیرون حملے کو دیکھ کر اویس نے جائے پناہ ڈھونڈنی چاہی تھی مگر خوش قسمتی سے وجیہہ کا نشانہ درست تھا۔
وہ دل ہی دل میں اپنے کارنامے پر خود کو شاباش دے رہی تھی۔
"وجیہہ!" اپنی روم میٹ کے پکارنے پر وہ حال میں لوٹی تھی۔
"ہاں۔" دادو کی یاد میں آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتے ہوئے اس نے صفیہ کو دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جان گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔
"تم نے ابھی تک پیسے واپس نہیں کیے۔" اس کے شکوے پر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ "مجھے اشد ضرورت ہے۔ ویسے بھی تم نے پندرہ دن میں واپس کرنے کا کہا تھا۔" اس نے یاد دلایا وہ مزید شرمندہ ہوئی۔ کیا کہتی؟ مزید پندرہ دن کا کہہ دیتی مگر یہاں تو پندرہ سال تک کہیں سے پیسے آتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہاسٹل کے اخراجات' وہ کئی لوگوں کی مقروض تھی۔
"صفیہ میں..... کوشش کروں گی کہ تمہارے پیسے

واپس....."

"کوشش نہیں، پلیز.... مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر میرے پیسے چاہئیں۔" اس نے پرانی شناسائی کا لحاظ کیے بغیر کہا تھا اور وہاں سے چلی گئی تھی (برے وقت میں انسان کا کوئی نہیں ہوتا) وجیہہ لب کچلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کیا کروں....؟" کچھ دیر پریشانیاں اور غم بھلانے کو اپنے خوشگوار اور بے فکرے۔ ماضی میں کھوئی تو ظالم دنیا کو یہ بھی گوارا نہیں، کیا کروں؟ کیسے ان سب کے پیسے واپس کروں؟" وہ اٹھ کر پریشانی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

"ایسا کرتی ہوں کسی رات چپکے سے اپنا سامان لے کر یہاں سے نکل جاتی ہوں۔" اپنے خیال پر اسے ہنسی آئی۔ یونہی لوگوں سے قرض لے کر بھاگتی رہوں گی، وہاں دادو، ابا کو طعنہ دیں گی "دیکھ لے بیٹی کے کام وہاں دنیا میں لوگوں کو چونا لگا رہی ہے میں تو پہلے ہی کہتی تھی 'لڑکی ذات ہے اتنا سر مت چڑھاؤ'۔" اس نے دادو کی نقل اتاری اور خود ہی قہقہہ لگایا تھا۔

"ہائے دادو! آپ اتنی جلدی کیوں چلی گئیں؟ آپ کے جانے کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ آپ تو ٹھنڈی چھایا تھیں۔ آپ کے جانے کے بعد خوشیوں نے بھی مجھ سے ایسے منہ موڑ لیا ہے جیسے ان پرانی دوستوں نے جنہیں یہ خدشہ تھا کہ میں ان سے پیسے ادھار نہ مانگ لوں۔" کافی دیر ٹہلنے کے بعد وہ تھک کر صوفے پر ڈھے گئی تھی۔

"تمہارے پاس بس دو ہی راستے ہیں وجیہہ عثمان۔" وہ خود سے مخاطب ہوئی تھی۔

یا تو خود کشی کر لو.... یا پھر بھی خود کشی ہی کر لو۔ کیونکہ اور کوئی راستہ جو نہیں ہے۔" وہ انگلی سے سر مسلتے ہوئے دوسرا کوئی راستہ سوچ رہی تھی۔ ہاں ایک اور راستہ ہے شادی کر لوں۔

مگر کون کرے گا مجھ سے شادی؟ رشتے داروں اور جاننے والوں میں تو کوئی یہ رسک لینے سے رہا۔ دادو ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ یوں لوگوں کو ماروں گی تو ہتھ چھٹ مشہور ہو جاؤں گی.... دادو کاش! آپ کی بات مان لی ہوتی مگر اب پچھتائے کیا ہوت۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" فرزین کی آواز پر وہ چونکی تھی۔

"سوچ رہی ہوں بینک لوٹ لوں۔" فرزین اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"تو دیر کس بات کی ہے؟"

وجیہہ نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہنس لو، اچھی طرح ہنس لو۔" اس نے جلتے کڑھتے ہوئے کہا تھا۔

"بس ایک مرتبہ حالات ٹھیک ہونے دو پھر دیکھنا ایک ایک کے دانت توڑوں گی۔ ہونہہ مطلبی دنیا۔"

"میں تم پر نہیں تمہاری بات پر ہنس رہی ہوں۔ اس مشکل وقت میں بھی تمہارا سینس آف ہیومر غضب کا ہے۔" فرزین نے وضاحت کی تھی۔

"ہنہ" آئی بڑی تعریف کرنے والی۔ پانچ سو روپے ادھار تو دے نہیں سکتی۔" اس نے جلے دل سے سوچا تھا۔

"کتنا سمجھایا تھا میں نے تمہیں جاب کرتے ہوئے بہت سارا صبر اور برداشت چاہیے ہوتا ہے، مصلحت کے پیش نظر بہت کچھ سننا پڑتا ہے۔"

"مگر مجھے بچپن سے یہی سکھایا گیا ہے کہ غلط بات نہ سنو اور نہ برداشت کرو۔"

"تو پھر انجام دیکھ لیا نا تم نے، اگر تم مصلحت سے کام لیتیں تو تمہاری جاب نہ جاتی۔ تمہارے غصے کی

وجہ سے منیجر نے تمہیں جاب سے نکال دیا۔ کئی دن کی بھاگ دوڑ کے بعد دوبارہ جاب ملی تو اگلے دن ہی وہاں سے بھی چھٹی ہو گئی کیونکہ وہاں سینئر اسٹاف میں اس منیجر کا کوئی رشتے دار تھا جس نے تمہاری شکایت کر دی تھی۔ تم نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اگر ایک ماہ بھی اس آفس میں ٹک کر کام کر لیتیں تو۔" وہ رکی "اس منیجر نے تمہاری پورے مہینے کی محنت بھی ہتھیالی۔ دو دن بھی صبر کر لیتیں تو تمہیں تمہاری سیلری مل جاتی۔ اب ان چھوٹے موٹے پرائیوٹ اسکولز میں جاب کر بھی لوگی تو کیا دیں گی تمہیں زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار... اس میں کیا ہو گا۔ لوگوں کے قرضے واپس کرو گی یا ہاسٹل کا بل... زندگی یوں جذباتی ہو کر نہیں گزاری جاتی... ایک بندے سے بگاڑنے کے بعد انجام دیکھ لیا۔" اس کا یوں بار بار منیجر کا حوالہ دینے پر وہ چڑ گئی تھی۔

"یہ دنیا اس منیجر یا اس کے پھپھا کی نہیں ہے۔ جس کی ہے وہ مجھے اس برے وقت میں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ اس نے مجھ سے رزق کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ مجھے بھوکا نہیں مارے گا۔ اتنے دنوں سے میرے پاس پیسے نہیں ہیں مگر وہ کہیں نہ کہیں سے سبب بنا دیتا ہے۔ آگے بھی کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔ میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئی ابھی اور ویسے بھی میرے ابا نے مجھے سکھایا ہے کہ حالات کیسے بھی ہوں' زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا چاہیے اور میں جیوں گی۔" اس کا انداز اس کا لہجہ ایک لمحے کے لیے فرزین چونکی تھی اور کسی حد تک متاثر بھی ہوئی تھی۔

"وہ منیجر نے پیغام بھیجا ہے کہ اگر تم اس سے معافی مانگ لو تو وہ تمہیں دوبارہ جاب پر رکھ لے گا۔" فرزین کام کی بات کی طرف آئی تھی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں دوبارہ نہیں جاؤں گی۔ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔"

"لوگوں سے قرض لے کر تمہاری پرواز میں ذرا کوتاہی نہیں آتی۔" اس نے مسکراتے ہوئے طنز کیا تھا۔ "یہ بڑی بڑی کتابی باتیں صرف سننے اور بولنے میں اچھی لگتی ہیں... حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ان کا۔" کاٹ دار لہجہ' وجیہہ کا دل چاہا تھا اس کا منہ نوچ لے۔

"میں نے پیسے ادھار لیے ہیں کوئی چوری نہیں کی وقت آنے پر واپس کر دوں گی۔ تم زیادہ اس منیجر کی چمچی مت بنو۔" آخری جملے پر فرزین سنبھلی تھی۔

"مجھے تو صرف تمہیں میسج دینا تھا' باقی تمہاری مرضی۔" فرزین کندھے اچکاتے ہوئے وہاں سے چل دی تھی۔

"ہنہ منیجر کی چمچی..."

✲ ✲ ✲

وہ کسی چیز کی تلاش میں بیگ کی ساری جیبیں کھنگال رہی تھی۔ تب ہی ایک مڑا تڑا کارڈ کر جھولی میں گرا تھا۔

"عماد انصاری" کا نام پڑھتے ہی فوراً" وہ ملاقات اسے یاد آئی۔

"آپ ڈرامے میں کام کریں گی؟" وہ کتنا حیران ہوئی تھی۔ ایک شخص اچانک اس کے سامنے آیا تھا اور آتے ہی آفر کر دی تھی۔

"نو تھینکیس۔" اس نے فوراً" انکار کر دیا تھا۔ سامنے والے کو تھوڑی مایوسی ہوئی تھی۔

"یہ میرا کارڈ' جب بھی آپ کا موڈ بنے' فوراً" مجھ سے رابطہ کیجئے گا۔"

اسکول' کالج اور زندگی میں تو اس نے کئی ڈرامے کیے تھے مگر اسکرین پر آنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے وہ کارڈ موڑ توڑ کر بیگ کی کسی جیب میں ڈال دیا تھا مگر آج اس کارڈ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

وہ کارڈ اس وقت اسے امید کی آخری کرن لگا تھا۔

"عماد انصاری صاحب کہاں ملیں گے؟" عماد انصاری سے فون پر بات کی تھی تو اس نے اپنے آفس

بلایا تھا۔ اب یہاں آتو گئی تھی مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کس طرف جائے۔ تب ہی سامنے سے آتے شخص سے پوچھا تھا۔ اس نے پہلے تو اس کا سرتاپا جائزہ لیا اور پھر دائیں طرف بنے کیبن کی طرف اشارہ کردیا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اس نے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانک کر اجازت طلب کی۔

"یس"

"السلام علیکم میں وجیہہ عثمان ہوں' ہماری فون پر بات ہوئی تھی۔"

"جی جی' مجھے یاد ہے۔" عماد انصاری نے بات کاٹتے ہوئے اسے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے دائیں طرف رکھی کرسی پر بیٹھے شخص کو دیکھا۔ وہ مشہور و معروف اداکار سمیر جہاں زیب تھا۔ جس کی نظر اس کے چہرے پر ہی تھی۔ اسے لگا اس کے یوں چونکنے پر وہ محظوظ ہوا ہے۔

"سمیر! یہ ہے وہ جس کے بارے میں' میں نے تمہیں بتایا تھا۔ انہیں پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے لگا تھا کہ فریال کا کردار ان ہی کے لیے بنا ہے۔ میں جب اسکرپٹ پڑھتا ہوں' ان کا چہرہ ہی میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے.... یہی وجہ ہے کہ کسی دوسری ہیروئن کے لیے میرا دل نہیں مان رہا۔" سمیر جہاں زیب کی ایکسرے کرتی نظریں۔ عماد انصاری نے -- چائے کا آرڈر دیا تھا جبکہ وجیہہ صبر کے گھونٹ پی رہی تھی۔

"دیکھنے میں تو ٹھیک ہے پر ایکٹنگ بھی آتی ہے کہ نہیں۔" اس کا انداز وجیہہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

آپ سے تو اچھی ہی کرلیتی ہوں.... بیس پچیس سال سے ڈراما انڈسٹری پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ ہر دوسرے ڈرامے میں ہیرو.... اللہ اللہ کرنے کی عمر میں سر پر خضاب لگا کر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ.... ہنہ۔

"وجیہہ آپ کو بہت محنت کرنا پڑے گی.... کیوں کہ آپ ڈراما انڈسٹری کے صف اول کے ہیرو کے ساتھ ہیروئن آئیں گی اور ایسا گولڈن چانس بہت کم لوگوں کو ملتا ہے کہ پہلا ڈراما ہی اتنی بڑی کاسٹ کے ساتھ لوگ خواب دیکھتے ہیں ہمارے ساتھ کام کرنے کے۔" وجیہہ خاموشی سے اس کی وہ باتیں سن رہی تھی جن میں اسے ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ایک پیپر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"یہ ایک سچویشن آپ کو دی گئی ہے۔ یہ ڈائیلاگز بول کر دکھائیں۔" وجیہہ نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی اور پھر عماد انصاری کے ایکشن کہتے ہی شروع ہوگئی تھی۔

عماد انصاری اور سمیر جہاں زیب کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ دونوں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

"بہت خوب..." عماد نے تالی بجا کر اسے سراہا تھا جبکہ سمیر جہاں زیب بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی مجبوری دیکھتے ہوئے عماد انصاری نے اسے پیشگی رقم ادا کردی تھی۔ وہ خوش تھی۔

"آج جاتے ہی سب کی طبیعت صاف کروں گی۔" کنٹریکٹ پر سائن کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"دادو.... آپ ہوتیں تو پتا نہیں کیا رد عمل ہوتا آپ کا.... مگر آپ ہوتیں تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔" وہ کچھ پوچھنے کے لیے عماد انصاری کے آفس کی طرف آئی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے آتی آواز سن کر اس کے قدم تھم گئے تھے۔ سمیر جہاں زیب مصنف کو کہانی میں ردوبدل کرنے کا کہہ رہا تھا۔

"یہ سینز ایڈ کرنے کے بعد اسکرپٹ مزید جان دار ہوجائے گا۔" سمیر جہاں زیب نے کہا تھا۔

"ویسے میرا خیال ہے اس کی ضرورت تو نہیں تھی مگر۔" مصنف کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ سمیر اس ڈرامے کا ہیرو ہی نہیں بلکہ پروڈیوسر بھی تھا۔ وہ اپنے ڈراموں میں مرکزی کردار خود ہی ادا کرتا تھا۔ سمیر اسے سین نمبر چودہ دوبارہ لکھنے کا کہہ رہا تھا۔ اس کی ہدایات سن کر وجیہہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے سمیر جہاں زیب کے کچھ

ڈرامے گھوم گئے جس میں وہ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ رومانٹک سین کرتا نظر آتا تھا اسی لیے اس نے ڈرامے کی کہانی بڑے غور سے سنی تھی۔ عماد انصاری ان دونوں کی گفتگو دلچسپی سے سن رہا تھا۔ بیچ میں ایک آدھ چٹکلہ وہ بھی چھوڑ دیتا۔

"تو یہ ہے آپ لوگوں کا اصل چہرہ۔" عماد انصاری گھبرا گیا۔ وجیہہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

"اپنی عمر دیکھیے سمیر جہانزیب صاحب! اللہ اللہ کرنے کی عمر ہے اور آپ ہیروئن کے ساتھ رومانٹک سین لکھوا رہے ہیں۔"

"وجیہہ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" عماد انصاری اپنی کرسی سے اٹھا تھا اور بات سنبھالنی چاہی تھی مگر تب تک سمیر جہانزیب بھڑک اٹھا تھا۔

"یو... (گالی دی تھی) تم ہو کیا چیز؟ تمہیں جانتا کون ہے؟ دو ٹکے کی لڑکی ہمارا احسان مانو کہ تمہیں ڈائریکٹ ہیروئن کا رول دے دیا۔ تم جیسی مڈل کلاس سوچ کو عزت راس نہیں۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو بڈھے کھوسٹ۔ بالوں پر خضاب لگا لینے سے تم جوان نہیں بن جاؤ گے۔ لعنت بھیجتی ہوں میں تم پر۔"

سمیر غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم جانتی نہیں ہو تم کس سے بات کر رہی ہو۔ تم پوری انڈسٹری میں کہیں کام نہیں کر سکو گی۔ ہیروئن تو دور ایکسٹرا کا رول بھی نہیں دے گا تمہیں کوئی۔" وہاں کئی لوگ اکٹھا ہو گئے تھے اور دلچسپی سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اپنا موبائل نکالا تھا اور چپکے سے وڈیو بنا رہا تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری انڈسٹری اگر یہی کام کرنا ہوتا تو کہیں اور چلی جاتی تم جیسے لوگ جھوٹے سچے انٹرویو دے کر لوگوں کو متاثر کرتے ہیں اور ان کا رول ماڈل بنتے ہیں ان کا اصل چہرہ اتنا بھیانک ہوتا ہے، شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"اتنی نیک پارسا تھیں تو گھر پر بیٹھتیں، یہاں کیا کر رہی ہو۔ خالی پیلی ایٹی ٹیوڈ سے کچھ نہیں ہوتا بی بی.... نام بنانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ تم ہو کیا چیز تمہارے جیسی لڑکیاں صبح و شام کام مانگنے کے لیے ہمارے پیر پڑتی ہیں۔" وہ حقارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری بہت بڑی بھول ہے کہ تم نے مجھے ان تھرڈ کلاس لڑکیوں جیسا سمجھا، لعنت ہو تم پر اور تمہارے پیسوں پر۔" اس نے بیگ کی زپ کھولی تھی اور کیش سمیر جہانزیب کے منہ پر مارا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا تھا اور غصے میں وجیہہ کی طرف بڑھا۔ عماد اور دوسرے لوگوں نے اسے پکڑ کر روک لیا تھا۔

"ڈرتی نہیں ہوں میں تم سے۔ تم جیسوں لوگوں کو میں صبح و شام جوتے مارتی ہوں۔"

"کوئی ایسی بیوقوف ڈھونڈ لینا جو تمہارے ساتھ ہیروئن آنے کے لیے تڑپ رہی ہو اور اس کاٹھ کے الو کو تم جو سین لکھنے کو دو وہ کرنے پر راضی ہو جائے۔" وجیہہ کا اشارہ رائٹر کی طرف تھا۔ وہ سٹپٹایا تھا۔

"یو۔" سمیر جہانزیب غصے سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

"ہنہ، جا رہی ہوں یہاں سے چھچھورے بڈھے۔" اس نے جلتی پر تیل ڈال کر واپسی کی راہ لی تھی۔ پیچھے سمیر کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کہاں سے اٹھا کر لے آئے تھے اس مڈل کلاس، ال مینرڈ لڑکی کو۔"

"کول ڈاؤن سمیر۔" عماد اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ سب جائیں یہاں سے پلیز۔" عماد نے وہاں جمع لوگوں کو جانے کا کہا اور دروازہ بند کر کے پانی کا گلاس سمیر کی طرف بڑھایا تھا جو اس نے دیوار میں دے مارا تھا۔ عماد طویل سانس خارج کرتے ہوئے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔

"ہنہ.... چھچھورے لوگ، اچھی بھلی کہانی کو اپنے مقصد کے لیے تبدیل کر رہا تھا.... پاگل سمجھا ہوا ہے مجھے۔" وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے تیزی سے

سیڑھیاں اتر رہی تھی۔
"ایکسکیوزمی..." کوئی اس کے پیچھے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔
"کیا ہے؟" اس نے لٹھ مار انداز میں پوچھا تھا۔ اس کاٹ کھانے والے انداز پر اس نے دونوں ہاتھ ایسے ہوا میں بلند کیے جیسے معذرت خواہ ہو۔
"آئی ایم سوری! آپ مجھے غلط مت سمجھیں۔ میں تو آپ کا فین ہوگیا ہوں بیس پچیس سال سے۔ جس نے لوگوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا' آج آپ نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ ریئلی سپرب۔"
"آپ کی تعریفیں ختم ہوگئیں تو میں جاؤں..." چڑتے ہوئے کہا تو وہ سٹپٹایا۔
"آپ شاید مائنڈ کرگئی ہیں' پوری انڈسٹری ایسی نہیں ہے... یہاں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ بس آپ غلطی سے غلط بندے سے ٹکرا گئیں۔"
"یہاں اچھے لوگ ہوں یا برے... مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔" وجیہہ نے بیزاری سے کہا تھا۔
"آپ ترکش ڈرامے میں ڈبنگ کر..."
"سوری... میرا اب ایسا کوئی موڈ نہیں۔"
"آپ اچھی طرح سوچ لیجئے یقین کیجئے میں ایسا ویسا بندہ نہیں ہے۔ آپ کو اسکرین پر بھی نہیں آنا پڑے گا کام بہت آسان ہے۔"
"آپ ایسے ویسے' کیسے بھی بندے ہوں' مجھے نمٹنا آتا ہے۔"
وہ ہنسا "اس میں تو کوئی شک نہیں' چشم دید گواہ ہوں میں۔"
"اور لڑکیوں کو اتنا ہی مضبوط ہونا چاہیے میں بہت متاثر ہوا آپ سے۔"
"یہ میرا کارڈ ہے۔ میرے نام حاشر معیز ہے' میں ایک پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ آپ کل تک اچھی طرح سوچ کر مجھے جواب دے دیجئے گا۔" حاشر نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"جس کردار کے لیے آپ کو کہہ رہا ہوں۔ وہ زیادہ لمبا نہیں ہے کم ہی سین ہیں۔"

"او کے.... پر میں ایڈوانس لوں گی۔" وجیہہ نے دوٹوک بات کی تھی۔ حاشر نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئی۔ وجیہہ راضی ہو گئی تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے 'مسکراتے ہوئے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ مائی گاڈ! ہاہاہا کیا لڑکی ہے یار۔" سرمد نے ویڈیو دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔

"سمیر جہانزیب کو دن میں تارے دکھا دیے۔ اگر یہ ویڈیو نیٹ پر اپ لوڈ کر دی نا تو سمیر جیتے جی مر جائے گا۔ اس کی عزت کا فالودہ بن جائے گا۔" سرمد نے ہنستے ہوئے اسے مشورہ دیا تھا۔

"نہیں یار 'میرا ایسا کوئی موڈ نہیں ہے یہ تو میں نے تمہیں دکھانے کے لیے بنائی تھی۔"

"بہت اچھا کیا اور تم بتا رہے تھے کہ تم نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی تھی۔" سرمد نے شربت کا گلاس اٹھاتے ہوئے حاشر سے پوچھا تھا۔

"ہاں 'شکر ہے وہ مان گئی.... پتا ہے میں نے سویرا سے بات کی تھی اور اس نے مجھے ڈیٹیل بھی دے دی تھیں مگر اسے دیکھنے کے بعد میرا دل چاہا کہ وہ میرے ساتھ کام کرے 'میں اس سے دوبارہ ملوں۔" سرمد نے بڑے غور سے اسے دیکھا تھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا مگر وہ سنجیدہ تھا۔

"او بھائی مخلصانہ مشورہ دوں گا آپ کو.... کہ یا تو اس دل کو سمجھا لیجیے یا پھر اس پر فاتحہ پڑھ لیجیے۔ اس وڈیو کو دیکھنے کے بعد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس سے اظہار محبت کے بعد تمہارا کیا حال ہو گا 'سمیر کا حال دیکھ لیا نا۔" سرمد نے اسے خبردار کیا تھا۔

"میں سمیر کی طرح فلرٹی نہیں ہوں۔"

"پر یہ بات اسے تو نہیں پتا نا 'وہ تیرا بھی وہی حال کرے گی جو سمیر کا کیا۔ دیکھا نہیں 'کیسے کیسے القابات سے نوازا ہے۔ "چھچھورے بڈھے" تک کہہ دیا۔" سرمد نے دانت نکالے تھے۔

☆ ☆ ☆

وجیہہ نے سب کے پیسے لوٹا دیے تھے۔ کتنے دنوں بعد سکون کا سانس لیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے سر سے بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ واقعی اللہ مسبب الاسباب ہے۔ ایک در بند کرتا ہے تو سو در کھولتا ہے اگر اس وقت میں مصلحت مصلحت کا بہانہ کر کے چپ ہو جاتی تو ابھی اس چھچھورے بڈھے کے ساتھ کوئی رومانٹک سین کر رہی ہوتی اور پھر یونہی مصلحت اور مجبوری کا سوچ کر پتا نہیں کیا کچھ کرنا پڑتا۔ وہ اپنے بستر پر دراز خود سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے کروٹ لی تو دیکھا صفیہ فون پر مصروف تھی۔

یہ اتنی رات کو کس سے بات کر رہی ہے 'خیر جس سے بھی کرے مجھے کیا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔ ویسے آج اندازہ ہو گیا ہے دنیا مطلب کی ہے 'لوگ تب تک ہی آپ سے مسکرا کر باتیں کرتے ہیں جب تک آپ کے پاس پیسے ہوں آج کیسے سب بچھی بچھی جا رہی ہیں.... ہنہ دوغلی مطلبی دنیا۔

"تم جاگ رہی ہو؟" صوفیہ نے فون سرہانے رکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں...."

"تمہیں پتا ہے فرزین کی انگیجمنٹ ہو گئی ہے۔"

"اچھا کب؟" اسے حیرت ہوئی تھی اسے تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔

"تمہیں نہیں پتا 'کل اس نے اسی خوشی میں سب کو آئس کریم بھی کھلائی تھی۔ شاید تم کہیں گئی ہوئی تھیں۔"

"ہاں میں نہیں ہوں گی اس وقت...."

"تمہیں پتا ہے اس کی منگنی کس سے ہوئی ہے۔" صوفیہ نے نیوز اینکر کی طرح تجسس پھیلایا تھا۔

"کس سے؟"
"آفاق صاحب سے۔"
"کیا؟" اسے حیرت سے جھٹکا لگا تھا۔
"فرزین نے منیجر صاحب سے منگنی کرلی۔"
"فرزین بی بی کو کوئی ڈھنگ کا بندہ نہیں ملا تھا۔"
"کیا کمی ہے ان میں۔ شادی کے لیے مرد کی عمر نہیں سیلری دیکھی جاتی ہے۔" وجیہہ صوفیہ کی نادر خیالات سن کر اش اش کر اٹھی۔

٭ ٭ ٭

"بہت شکریہ۔" حاشر نے مشکور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"شکریہ تو مجھے کہنا چاہیے آپ نے میری اتنی مدد کی۔" آج وجیہہ کا کام ختم ہوگیا تھا وہ تہہ دل سے حاشر کی ممنون تھی۔ اسے جب کوئی مشکل ہوتی وہ فوراً حل کردیتا۔
"آپ کے ساتھ کام کرکے بہت اچھا لگا۔ آپ نے بہت تعاون کیا۔"
"سچ....." اپنی تعریفوں پر وہ پھولا نہیں سمایا تھا۔ اس کے اس انداز پر وجیہہ کو حیرت ہوئی تھی۔
"میرا مطلب ہے آپ تعریف کررہی ہیں تو یقین نہیں آرہا میں آپ کو جس واقعہ کی وجہ سے جانتا ہوں وہ ایسا ہے کہ آپ کا مسکرا کر بات کرنا بھی غنیمت ہے۔" حاشر نے وضاحت کی تھی۔
"مجھے تب تک غصہ نہیں آتا جب تک کوئی غلط بات نہ کرے۔ بلاوجہ کبھی کسی نے غلط بات کردی تو پھر میں جوتا اتارنے میں دیر نہیں کرتی' یہ بھی نہیں دیکھتی کہ سامنے کون ہے۔" وجیہہ نے اپنے کالج کے دو چار قصے بھی سنا دیے تھے۔ حاشر بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔
"وہ تینوں آگے آگے تھے اور میں ان کے پیچھے' ڈر کر ایسا بھاگے کہ دوبارہ کبھی میرے راستے میں نظر نہیں آئے۔ گھر آکر ابا کو بتایا تو وہ بہت ہنسے جبکہ دادو کی نصیحتیں ختم نہ ہوتی تھیں..... دادو یہ چاہتی تھیں میں بھی عام لڑکیوں کی طرح بن جاؤں جبکہ ابا نے کبھی ان کی حمایت نہ کی وہ مجھے عام ڈری سہمی لڑکی نہیں بنانا چاہتے تھے' جو زندگی میں قدم قدم پر سہارے ڈھونڈے۔ شاید وہ جانتے تھے کہ زندگی مجھے ٹف ٹائم دینے والی ہے' مجھے حالات سے اکیلے لڑنا آنا چاہیے اور میرا تو کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔" بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ ابا کے ذکر پر.....
آج پہلی مرتبہ کام سے ہٹ کر اتنی طویل گفتگو ہوئی تھی' حاشر اور وجیہہ کی۔

٭ ٭ ٭

وہ عمارت سے نکلی اور کسی ٹیکسی رکشے کی تلاش میں نظر دوڑائی اور پھر پیدل ہی چل پڑی اس امید پر کہ راستے میں کوئی رکشہ ٹیکسی مل جائے گا۔
بیگ کندھے پر ٹکائے وہ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی چند قدم چلنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کررہا ہے اس نے مڑ کر دیکھا تو اس سے پندرہ بیس قدم فاصلے پر چلتے شخص نے اسے اپنی جانب دیکھتا پاکر دائیں بائیں دیکھنا شروع کردیا تھا۔
وہ پھر سے چلنے لگی مگر اس کی چھٹی حس مسلسل خطرے کی گھنٹی بجارہی تھی۔ سڑک پر اکا دکا ہی گاڑیاں تھیں وہ چوکنا ہوگئی تھی۔ اس شخص سے تھوڑی دور سست روی سے چلتی وین' وین چلانے والے شخص کے نظر سامنے سڑک پر کم اور فٹ پاتھ پر چلتے شخص پر زیادہ تھی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا وہ اس کے حکم پر کام کررہا ہے۔
وجیہہ چل تو رہی تھی مگر اس کی توجہ پیچھے چلتے اس شخص کی طرف تھی جو بڑی تیزی سے اس کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ گھٹا چکا تھا۔
اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ قریب ہوتی سنائی دی تھی۔ بمشکل دو قدم کا فاصلہ تھا اس سے پہلے کہ وہ شخص اس کی طرف مزید بڑھتا' وجیہہ نے بڑی تیزی سے ہائی ہیل سینڈل اتاری اور اس پر حملہ کردیا' وہ اس

کے لیے تیار نہیں تھا اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔
وہ بری طرح پٹ رہا تھا اور خود کو بچانے میں ناکام تھا۔
وین ڈرائیور اس کا یہ حال دیکھ کر بڑی تیزی سے وہاں سے گزر گیا تھا۔
"ارے مجھے تو لے جاؤ...." اس نے وین کو جاتے دیکھ کر دہائی دی تھی۔ سڑک کی دوسری طرف دکانوں میں کام کرتے لوگ یہ منظر دیکھ کر دوڑے چلے آئے تھے اور اس نیک کام میں وجیہہ کا ہاتھ بٹایا تھا۔
"باجی آپ ہٹ جائیں اسے تو ہم سیدھا کرتے ہیں۔" ایک دکاندار نے بڑے جوش سے کہا تھا اور پھر سب اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ساتھ ہی اعلا پائے کی گالیوں سے بھی نواز رہے تھے۔
"شرم نہیں آئی گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟"
"تم لوگوں نے ہی شریف عورتوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔"
"میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو اپنے راستے پر جا رہا تھا۔ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔" اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظ بولتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی۔
"جانتے ہیں تجھ جیسے شریفوں کو، راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں۔"
"میں نے نہیں چھیڑا۔" وہ خود کو بچاتے ہوئے چلایا تھا۔
"ایک منٹ.... ایک منٹ" وجیہہ کی آواز پر سب لوگ تھم گئے تھے۔
"بتاؤ.... کیوں پیچھا کر رہے تھے میرا؟" وجیہہ نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ارد گرد لوگ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔
"میں پیچھا نہیں کر رہا تھا۔" اس نے اپنا یقین دلانے کے خاطر مگرمچھ کے آنسو بہائے مگر دوسری طرف وجیہہ تھی جس پر اس کے آنسوؤں کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔
"یہ ایسے نہیں مانے گا میں پولیس کو بلاتی ہوں۔ یہ تھانے کی ہوا کھا کر مانے گا۔"
پولیس کا نام سن کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔
"میرا کوئی قصور نہیں.... مجھے معاف کر دو باجی! مجھے تو پیسے دیے تھے آپ کو اغوا کرنے کے۔" وہ پٹ پٹ کر ادھ موا ہوا ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔
"ا.... اغوا۔" وجیہہ تو اسے چور اچکا سمجھ رہی تھی مگر یہاں تو کہانی ہی الگ تھی۔
"اغوا کس نے پیسے دیے تھے؟"
"یہ نہیں پتا بس کال آئی تھی پھر آپ کی تصویر اور پیسے۔" وہ روتے ہوئے بتا رہا تھا۔
وجیہہ نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔
"مجھے اغوا، پر کون۔" وہ اس ہجوم سے باہر نکلی اس کے قدم پھر اسی راستے پر چلنے لگے جہاں سے وہ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟" حاشر کو اسے واپس آتے دیکھ کر جتنی حیرت ہوئی اس سے زیادہ اس کی بات سن کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔
"پر کون، کس نے کروایا یہ؟"
"میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں نے زندگی میں بڑے پنگے لیے ہیں مگر ان میں سے کون ہو سکتا ہے ایسا۔" اس نے دماغ پر زور ڈالا تھا اور یادداشت کھنگال ڈالی تھی۔ اچانک ایک چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔
"سمجھ میں آ گیا میری۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔
"ہو نہ ہو یہ سمیر جہانزیب نے کروایا ہے۔" حاشر چونکا تھا۔
"ہاں.... وہ ہے تو اتنا ہی گرا ہوا انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کافی پرانی بات ہے اس کا ایک اسکینڈل بھی سامنے آیا تھا۔ کسی لڑکی کو شادی کا جھانسا دے کر...."

حاشر کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نظر وجیہہ پر تھی جو اس کی بات سننے کے بجائے بیگ کھولے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اس نے بیگ سے فون نکالا تھا اور کسی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ حاشر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

"عماد انصاری بات کر رہے ہو؟" ایک لمحے کو رکی تھی، جواب سننے اور پھر شروع ہو چکی تھی۔

"وجیہہ عثمان بات کر رہی ہوں۔ کہاں ہے وہ تمہارا باس؟ اسے کہنا کہ اس نے وجیہہ عثمان کو بہت ہلکا لے لیا ہے۔ وہ جتنا گرا ہوا ہے اس سے اسی حرکت کی امید تھی مجھے کڈنیپ کرنے کے لیے بندے بھیجے تھے اس نے میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں جو ڈر جاؤں گی یا سہم جاؤں گی۔ میں اس کا جینا حرام کردوں گی۔ اس کے خلاف ایف آئی آر کٹواؤں گی اور پریس کانفرنس کر کے لوگوں کو اس کا اصل چہرہ دکھاؤں گی۔ وہ سمجھتا کیا ہے خود کو؟ اس نے بہت غلط بندی سے پنگا لیا ہے۔"

حاشر بڑے غور سے اس کے غصے سے سرخ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ دوسری طرف کیا حال ہوگا۔ ایف آئی آر تو ٹھیک تھی مگر پریس کانفرنس کا سن کر تو سمیر کا دم ہی نکل گیا ہوگا۔ سمیر جیسے لوگ خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا صحافیوں سے ڈرتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں اندازہ ہے تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ بہت بری طرح اس نے اس آدمی کو مارا ہے اور اب تمہاری عزت کی دھجیاں اڑا دے گی۔ بہت غلط کیا تم نے۔" عماد تاسف سے سر ہلاتا کہہ رہا تھا۔ اس نے سمیر سے پوچھا نہیں تھا کہ اس نے یہ سب کیا ہے کہ نہیں کیونکہ وہ سمیر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ ہر صورت لیتا تھا۔

سمیر جہانزیب کی نظریں ٹیبل پر ٹکی ہوئی تھیں اور وہ سوچ میں گم تھا۔

"کوئی حل نکالو یار۔۔۔ نہیں تو وہ لڑکی ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑے گی۔ ہماری محنت خاک میں مل جائے گی۔" عماد نے اسے سنگین نتائج بتائے تھے۔

"میری مانو تو اس سے معافی مانگ لو۔" اسے یوں خاموش دیکھ کر عماد نے خود ہی اس مسئلے کا حل بتایا تھا۔ سمیر جہانزیب نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔

"میں اس سے معافی مانگوں ہمیں جس نے سالوں محنت کر کے انڈسٹری میں اپنا مقام بنایا ہے وہ اس دو ٹکے کی لڑکی سے معافی مانگے۔" اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

"اس مسئلے کا بس یہی حل ہے ورنہ ہماری محنت۔۔۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔ تم نے دیکھا تھا نا اس دن کیا کچھ کہا تھا اس نے، آج بھی لوگوں کی مضحکہ خیز نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے، میں اس سے اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

"بدلے کو چھوڑو فی الحال اس مصیبت سے نکلنے کا سوچو ورنہ کل اخبار میں سرخی لگی ہوگی کہ مشہور اداکار اور ہدایت کار سمیر جہانزیب نے ایک لڑکی کو اغوا کروانے کی کوشش کی۔ لڑکی نے اس کے ڈرامے میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جانتے نہیں ہو ان صحافیوں کو رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں اور یہاں تو پہاڑ پہلے ہی موجود ہے۔ ہر کوئی اپنی مرضی کی کہانی گھڑے گا ایسے ایسے الزامات لگیں گے جو تم نے کبھی سوچے بھی نہیں ہوں گے۔" عماد کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی انگلی سے ماتھا مسل رہا تھا وہ بھلے ظاہر نہ بھی کرتا مگر۔ اندر ہی اندر اس "دو ٹکے کی لڑکی" سے خوفزدہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ وجیہہ کو ہاسٹل ڈراپ کرنے کے بعد سہد کے آفس آگیا تھا۔

"بہت ہی گھٹیا آدمی ہے یہ سمیر تو۔" حاشر نے

اسے وجیہہ کے اغوا والی بات بتائی تھی تو سرمد کو حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔

"دل تو چاہ رہا ہے سمیر کو ایسا سبق سکھاؤں کہ ساری زندگی یاد رکھے۔" حاشر نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

"یاد تو وہ رکھے گا ہی' وجیہہ کی کال سے پریشان تو ہوا ہو گا۔ ویسے ایک بات ہے ایسی باہمت نڈر بہادر لڑکی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔" سرمد متاثر تو پہلے ہی تھا وجیہہ سے۔

"ایسے ہی تو تیرے بھائی کا دل نہیں آیا اس پر۔"

"تو ایسا کر انشورنس کروالے اپنی' جو حال آج اس نے اغوا کرنے والے کا کیا ہے نا' سوچ کر بھی ہنسی آتی ہے۔ تیرا کیا بنے گا؟" سرمد ہنسا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں اس سے اپنے دل کی بات کہہ دوں۔" حاشر سنجیدگی سے بولا تھا۔

"دیر کس بات کی ہے آج ہی اظہار محبت کر لے میں کسی اچھے سے اسپتال میں تیرے لیے پہلے سے بندوبست کر کے رکھوں گا۔" حاشر بے ساختہ ہنسا تھا پہلے جملے کے بعد اسے امید نہیں تھی کہ وہ یہ سب کہے گا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنا مسئلہ تم سے ڈسکس کیا ہے مگر کسی غلط فہمی میں مبتلا مت ہو۔" سرمد نے مخلصانہ مشورے سے نوازا تھا۔

"بہتر ہے دل کو سمجھالے۔"

"بے سود ہے اسے سمجھانا
دل کا کب دماغ ہوتا ہے''

"واہ واہ... شاعری بھی کرنے لگے... یعنی پکے عاشق بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سمیر نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اسے جانتا ہوں۔" عماد انصاری اس کے سامنے بیٹھا سمیر کی صفائی دے رہا تھا۔ ابھی وہ اپنے کمرے میں تھی جب اسے کسی نے بتایا کہ اس سے ملنے کوئی آیا ہے۔ عماد کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکی تھی۔ عماد سمیر کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ وجیہہ بے دلی اور بے زاری سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"عماد صاحب! ٹھیک ہے مجھے یقین آگیا کہ سمیر جہانزیب کبھی ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ بہت نیک اور شریف آدمی ہے۔" وجیہہ نے چبا چبا کر الفاظ ادا کیے تھے۔ عماد نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا اس نے اتنی جلدی اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔

"اب آپ اتنا بھاگتے دوڑتے یہاں آئے ہیں... بلکہ بھیجے گئے ہیں تو یقیناً" سمیر صاحب کا اس سب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وجیہہ کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

"جو ہو گیا وہ میں معاف کرتی ہوں مگر سمیر سے کہیے گا آئندہ اگر ایسی حرکت کی تو نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔" وجیہہ کی بات سن کر اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ بہت دیر بعد کچھ بولنے کے قابل ہوا تھا۔

"میں ایک سیریل کے لیے آپ کو کاسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ ہیروئن ایک مذہبی لڑکی ہوگی۔ آپ کو زیادہ مسئلہ۔" عماد نے جلدی سے اس کردار کی تفصیل بیان کی تھی۔

"سوری' میرا اب ڈراموں میں کام کرنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔"

"آپ سوچ کر..."

"سوچ کر بھی یہی جواب ہو گا میرا۔" وجیہہ نے دو ٹوک جواب دیا تھا۔ عماد نے مایوسی سے اسے دیکھا اور واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔" حاشر نے بہت سوچنے کے بعد اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"ہاں کہیے؟" وجیہہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ حاشر کچھ دیر خاموشی سے جملے

ترتیب دیتا رہا تھا۔

وہ حاشر کے ساتھ نئے پروجیکٹ پر کام کرنے جا رہی تھی۔ کل حاشر کی کال آئی تو اس نے اسے آفس بلایا تھا۔

"وہ..." وجیہہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی ایسی کیا بات تھی جو وہ یوں ہچکچا رہا تھا۔

"میری بات کا پلیز غلط مطلب مت لینا۔ میں سنجیدہ ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں۔" وجیہہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ یہ کیوں کہہ رہا ہے۔

"میں... وہ مجھ سے شادی کرو گی؟"

"جی...!!" وجیہہ حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس لمحے حاشر کو اپنے دل کی رفتار کم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

ایک لمحے کو اسے لگا تھا وہ غصے میں اس کے آفس کا سارا سامان توڑ دے گی' اس کا سر پھوڑے گی اور کنٹریکٹ پر چار حرف بھیج کر وہاں سے چلی جائے گی۔

کچھ دیر گزری تھی' وہ خاموش تھی۔ اس کی نظریں ٹیبل پر تھیں۔ حاشر اس کے جواب کا بے چینی سے منتظر تھا۔

"میں سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ بیگ کندھے سے ٹکاتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔

"اوکے۔" حاشر نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

یہ بھی شکر ہے کہ وجیہہ کو غصہ نہیں آیا ورنہ اس کے ردعمل کا سوچ سوچ کر وہ تھوڑا خوفزدہ تھا۔

"یعنی اس کا جواب ہاں میں بھی ہو سکتا ہے۔" دل خوش فہم خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ اس نے اپنا موبائل اٹھا کر سرمد کو کال کی تھی۔

"میں نے وجیہہ کو پرپوز کر دیا ہے۔"

"سر پر کتنے ٹانکے آئے پھر...؟"

"اس نے سوچ کر جواب دینے کا کہا ہے۔" حاشر نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا؟" سرمد کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

"پھر تو پیشگی مبارک باد... تمہاری نیا پار لگتی ہوئی نظر آ رہی ہے مجھے۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر..." حاشر نے خوشی سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" وہ ملازم کو کافی کا کہہ کر پلٹا ہی تھا جب وجیہہ کے سوال پر اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کسی کو پرپوز کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی خوبی جس کی وجہ سے۔" وجیہہ نے اپنا سوال واضح کیا تھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور مجھے لگا کہ اظہار محبت سے بہتر ہے ڈائریکٹ پرپوز کر دیا جائے کیونکہ کب کہاں آپ کا دماغ کلٹی ہو جائے کچھ پتا نہیں۔" آخری جملے پر وہ مسکرایا تھا اور خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی تھی۔

وجیہہ کے تاثرات دیکھ کر وہ پھر سے سنجیدہ ہوا اور بات جاری رکھی۔

"تمہاری صاف گوئی ہمت اور بہادری نے مجھے بہت متاثر کیا... میرا خیال ہے ہر لڑکی کو تمہاری طرح مضبوط ہونا چاہیے۔ اسے وقت اور حالات سے لڑنا آنا چاہیے۔ اس کا کردار اتنا مضبوط ہو کہ کوئی بھی اس کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ پہلی ملاقات میں میں صرف متاثر ہوا تھا کہ تم نے کیسے سمیر جہانزیب جیسے شخص کو سبق سکھایا حالانکہ تمہیں پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور تم ایڈوانس لے چکی تھیں... مگر تم نے پیسے اس کے منہ پر دے مارے' میں بہت متاثر ہوا تھا تم سے' تمہارے ساتھ کام کر کے اور کئی خوبیاں پتا چلیں..."

"مثلاً؟"

"مثلاً" کہ تم صرف زبانی کلامی ہی اٹیک نہیں کرتیں' ضرورت پڑنے پر جوتے کو ہتھیار بھی بنا لیتی ہو

اور کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نمٹنا جانتی ہو بس ان ہی تمام خوبیوں کی وجہ سے۔"

"یہ آپ کے نزدیک خوبیاں ہیں؟" وجیہہ نے حاشر کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں مستقبل میں اگر تمہیں کسی کو جھاڑنا ہو تو بلا جھجک مجھے فون کر سکتی ہو۔ میں تمہاری مدد کے لیے پہنچ جاؤں گا۔" حاشر کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ جسے چاہا جائے وہ آپ زندگی میں شامل ہو جائے۔ کم از کم حاشر کے نزدیک خوشی کی یہی تعریف تھی مسکراہٹ نے اس کے چہرے پہ مستقل ڈیرہ جما لیا تھا وہ وجیہہ کا ہاتھ تھامے اسٹیج کی طرف جا رہا تھا۔

وجیہہ کی طرف سے ہاں ہوتے ہی اس نے اگلے جمعہ کی حسین شام میں چند قریبی احباب مدعو کر کے نکاح کر لیا تھا۔

ولیمہ کا فنکشن کافی بڑے پیمانے پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس کے دوست احباب اور انڈسٹری کے لوگوں نے محفل کو چار چاند لگا دیے تھے۔

"السلام علیکم بھابھی۔" سرمد نے بڑی خوش اخلاقی سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔"

"یہ سرمد ہے میرا دوست اور بھائی۔" حاشر نے بڑی محبت سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ وہ نکاح کی تقریب میں بھی شریک تھا مگر تعارف نہ ہو سکا تھا۔

"بھابھی! میں تو آپ کا بہت بڑا فین ہوں۔"

"میرے فین؟" وجیہہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

"آپ کی سچائی اور صاف گوئی نے اتنا متاثر کیا تھا کہ پوچھیں مت۔" وہ وجیہہ کی تعریفوں میں رطب اللسان یہ بھی نہیں دیکھ پایا تھا کہ حاشر نفی میں سر ہلا رہا ہے۔

"سمیر کو دن میں تارے دکھا دیے اور وہ جو آپ نے جاتے جاتے رک کر "چھچھورا بڈھا" کہا تھا۔ اس جملے نے تو سمجھیں محفل ہی لوٹ لی تھی۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آپ وہاں تھے؟"

"نہیں حاشر کے فون میں ویڈیو دیکھی تھی۔" اس نے بڑی سادگی اور معصومیت سے پوری تفصیل بتائی تھی۔ سو وجیہہ نے خشمگیں نظروں سے حاشر کو دیکھا تھا۔

ٹھیک کہتے ہیں نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ حاشر نے بیچارگی سے سوچا تھا۔ سرمد بات کر کے جا چکا تھا وجیہہ اسے گھور رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، حاشر نے دونوں کان پکڑتے ہوئے سوری کہہ دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں میں نے غیر اخلاقی حرکت کی مگر وہ سین اتنا زبردست تھا کہ میں خود کو روک نہیں پایا ویڈیو بنانے سے 'وہ یادگار رہے گی۔" حاشر ابھی اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ فوٹو گرافر نے فوراً" وہ یادگار پوز کیمرے میں محفوظ کر لیا تھا۔ لائٹ پڑنے پر دونوں نے چونک کر دیکھا تھا۔

"وہ ویڈیو یادگار ہو نہ ہو یہ تصور ضرور یادگار ہے۔" وجیہہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ حاشر بھی ہنس دیا تھا۔

☼

ثوبیہ جبیں گل

سوچنے کی بات

گھر رشتوں کے خلوص سے بنتے ہیں۔ مکینوں سے مکان بنتا ہے ورنہ تو کیا رکھا ہے ایک اینٹ سیمنٹ سے جڑے مکان میں۔ اس نے گھر میں آئے ہوئے ننھیالی رشتہ داروں کو دیکھا اور افسوس سے آہ بھر کر رہ گئی۔ ان میں سے ہر ایک کے چہرے پہ ایک ہی رنگ تھا۔ جلن، غصہ، تکلیف..... بے بنیاد باتیں، بے وجود فکرات..... وہ پھپھو اماں کو ان کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر خود اپنے کمرے میں آگئی.....

آخر یہ اپنے کیوں سکون نہیں لینے دیتے۔ کیوں ہماری خوشیوں میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ رشتہ

داروں کا ہونا نہ ہونا دونوں ہی عذاب۔ وہ بہت اصول پسند لڑکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ پھپھو کے ساتھ بھائی کے لیے ایک لڑکی دیکھنے کی غرض سے گئی تھی اور پھر خوش قسمتی سے وہ گھرانہ اسے پسند آیا اور وہ اوکے کر آئی۔ متوسط طبقے کے لوگ تھے اور لڑکی بھی پڑھی لکھی خوب صورت تھی۔ ددھیال کی طرف سے ایک واحد پھپھی تھی اور باپ پچھلے سال ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ ماں کو تو عرصہ ہوا 'دنیا چھوڑے۔۔۔ ہاں البتہ ننھیالی رشتہ دار ٹھوک کے حساب سے اپنا وجود رکھتے تھے۔ بہن کے بعد تو کسی نے جھانک کر بھی نہ دیکھا کہ آیا اس کی اولاد کس حال میں ہے۔ البتہ جب شادی کے قابل ہو گئے تو سب کو رشتہ داری یاد آ گئی۔ لیکن تب تک دونوں بہن بھائی کے دلوں میں ان کے نام نہاد پیار کی گرہ لگ چکی تھی اور وہ ان سب مفاد پرستوں سے واقف ہو گئے تھے۔ جب ہی اس نے کسی کو بتانا مناسب نہ سمجھا لیکن جب شادی کی تاریخ رکھی تو سب کو بلانا پڑ گیا اور آج۔۔۔

جس ہنگامے سے وہ بچنا چاہ رہی تھی 'وہی ہو کر رہا۔ ظاہر سی بات تھی سب کی بیٹیاں جوان جہان تھیں اور سب نے رافع پر نظریں گاڑ رکھی تھیں۔ خوب صورت 'لمبا چوڑا 'خوش شکل رافع اپنی پرکشش سی جاب کے ساتھ سب کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔

منیبہ نے ریک سے ایک تصویر نکال کر دیکھی معصوم سی عروج ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ وہ مسکرا دی۔ وہ نخریلی ہو 'پھوہڑ ہو' یا نازک مزاج اب تو وہ اس کے بھائی کا نصیب تھی۔ لوگوں کی باتوں میں آ کر کیوں ناحق کسی کو سزا ملے؟ جلنے والے سو جان سے جلیں۔

رافع ایک ہی بھائی تھا اور وہ بھی اس سے بڑا سو سارے ارمان جی بھر کے پورے کرنے تھے۔ وہ شادی کی ساری تیاری مکمل کر چکی تھی۔ بس بری بنانا رہ گئی تھی اور کچھ گفٹ وغیرہ اور یہ کام بھی آج اختتام کو پہنچا تھا۔ دونوں بہن بھائی شاپنگ بیگ لادے پھندے گھر پہنچے تو شام کے سائے زمین پر اپنے پر پھیلا چکے تھے۔

منیبہ تھک کر صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔ رافع نے فریج سے کولڈ ڈرنک نکالی اور اب وہ اسے گلاسوں میں انڈیل رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ شاپنگ پر تبصرہ بھی کرتا جا رہا تھا۔

"براؤن 'اسکائی بلیو' سلور 'اف کتنے رف کلر لیے ہیں تم نے منیبہ!" اس کی نظر اب پڑی تھی "یہ تو ذرا بھی اچھے نہیں لگیں گے۔"

منیبہ نے چونک کر اسے دیکھا جو تنقیدی نگاہوں سے ایک ایک کپڑے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز پر وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کتنی خوش قسمت ہے نا آنے والی۔۔۔ میرا بھائی ابھی سے اس کے کپڑوں کے لیے حساس ہو رہا ہے۔"

اس نے میٹھا سا طنز تو کیا رافع ہنس پڑا۔

"ہاں بڑی خوش قسمت! تصویر تک تو تم نے اس کی میرے پاس رہنے نہیں دی اور اب نمبر تو دے دیتیں۔ میں تھوڑی انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ کر لیتا۔" وہ بڑے نارمل لہجے میں کہہ رہا تھا جبکہ منیبہ کو گویا کرنٹ لگ گیا۔

"کیا کہا آپ نے؟" نمبر دوں میں آپ کو عروج کا۔۔۔! "اس نے "میں" کو لمبا کر کے انگشت شہادت اپنے سینے پر ٹھونکی۔ رافع نے آخری گھونٹ بھر کر گلاس سائیڈ پر رکھ دیا اور سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"منی فضول روایات کی پاسداری مت کرو۔ اب سیونٹیز کا دور نہیں رہا جس میں لڑکیاں اپنے ہی شوہروں سے مہینوں شرما شرما کر ادھ موئی ہوئی جاتی تھیں 'اب فاسٹ میڈیا کا دور ہے۔ بچہ بچہ اتنا شارپ ہے کہ جسے ہم بے حیائی سمجھتے ہیں وہ اسے فن سمجھے گا۔ اور جسے ہم گناہ کہیں گے وہ اس کے لیے ایڈونچر ہو گا۔ اور فون پہ بات کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔" آخر میں وہ خفگی سے بولا۔ منیبہ مارے حیرت کے گنگ ہو کر رہ گئی۔ اور پھر جلدی جلدی سارا سامان سمیٹ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"جن روایات کو آپ فضول کہہ رہے ہیں بھائی 'وہ ہماری اقدار ہیں اور اقوام اقدار سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہر

رشتہ عزت مانگتا ہے بھائی! لیکن حدود کے تعین کے ساتھ اور اگر یہ حدود ذرا سی بھی پار کرلی جائیں تو ان کا تقدس پامال ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ انہیں میرے اصول سمجھ لیں اور میں اپنے اصولوں پہ ہرگز سمجھوتا نہیں کرسکتی۔" وہ ایک لمبی چوڑی تقریر کرکے سارے شاپنگ بیگ اٹھا کر کمرے میں غروب ہوگئی۔ رافع کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

"شکر ہے اللہ نے ایک ہی بہن دی ہے۔" وہ بے ساختہ اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ کہنے کو وہ چھوٹی بہن تھی لیکن اس کی تو پوری دادی اماں تھی۔

✡ ✡ ✡

پھر آخر وہ دن بھی آگیا جب اس کے راج دلارے بھیا بڑے ارمانوں سے دلہن کو بیاہ لائے۔ بھابی کو دیکھ کر منیبہ بہت سرشار تھی۔ عروج کا رویہ شروع دن سے بہت اچھا تھا اور اپنی من پسند بھابی لاکر منیبہ بھی بہت خوش تھی۔ کچھ عرصے ان کے ساتھ رہنے کے بعد وہ رافع کے ساتھ چلی گئی۔ کمپنی کی جانب سے اسے ایک آراستہ فلیٹ مل گیا تھا۔ کچھ دن شور ہنگامے کے بعد اب زندگی واپس اپنی ڈگر پر آگئی تھی۔ وہ بھی کتابی کیڑا تھی، تندہی سے پڑھائی میں جت گئی۔ پھر اس کا گریجویشن بھی مکمل ہوگیا اور اس نے ماسٹرز میں داخلہ لے لیا۔ پھپھو اب بہت بیمار رہنے لگی تھیں۔ بھائی کو

ہی گئی۔ ادھوری پڑھائی سے ناتا جوڑا اور غم غلط کرنے میں لگ گئی۔ صبح کالج، دوپہر میں اکیڈمی۔ شام میں واپسی، اس کی مصروفیات کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ نام نہاد رشتوں کی حقیقتوں نے کب اس پہ کھلنا شروع کیا اسے علم ہی نہ ہوسکا۔ بھابی کے رشتہ دار نہ جانے کہاں کہاں سے روز آنے لگے۔ وہ کمرہ بند کرکے پڑھنے کی کوشش کرتی تو بھی بلند ہوتی آوازوں اور قہقہوں کی گونج اس کے چار قدم کے فاصلے پر بنے کمرے تک بہ آسانی اور بخوبی سنائی دیتی۔ عروج اکثر دو کپ چائے بناتی اور وہ جب لینے آتی تو عروج کافی افسوس سے کہتی۔

"سوری منیبہ، مجھے نہیں پتا تھا کہ تم بھی ہوگی۔۔۔۔ میں اور بنا دیتی ہوں۔" وہ تابعداری دکھاتی، اور منیبہ اٹس اوکے کہہ کر لوٹ آتی۔ وہ اس سب معلوم اور نامعلوم کے چکر سے واقف تھی اور کوئی اس کی وجہ سے کتنا خوش تھا۔ اس کا بھی علم تھا اسے۔ وہ بظاہر کتنی ہی خوش اخلاقی سے اس سے پیش آتی لیکن منیبہ اتنی بھی ناداں نہیں تھی۔ مٹھاس کا زہر تمام زہروں پر بھاری ہوتا ہے۔ رافع اس کے لیے رشتے ڈھونڈنے کی مہم میں لگا ہوا تھا۔

بس۔۔۔۔! اتنی ہی اس کی اہمیت تھی۔ بنا اس سے پوچھے پہلی بار رافع اس کے لیے اپنی مرضی کررہا تھا۔ بھائیوں پہ بہنوں کا بس اتنا ہی حق ہوتا ہے کہ شادی ہوئی اور سارے جذبے ختم۔ وہ خود کو دیکھنے کے لیے

وہ زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن زندگی کے بعد موت بھی ایک حقیقت ہے۔ پھپھو کی بیماری تو قدرت کا بہانہ تھی ایک دن آنا "فانا" چٹ پٹ ہوگئیں اور اسے قدرت کے اس ستم پہ احتجاج کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ بھری دنیا میں اکیلا تو ہر کسی کو ہونا پڑتا ہے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ اکیلا ہونا موت سے پہلے ہو یا موت کے بعد۔

آبائی گھر تھا سو اس نے بیچنے سے منع کردیا۔ پس اسے کرائے پر چڑھا دینے کے بعد رافع اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ کچھ عرصے تک غم منا کر آخر وہ سنبھل

آنے والے بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھتی اور سوچتی جاتی۔ رشتے والے آتے اور انہیں وہ پسند بھی آجاتی۔ ہاں کرکے کچھ دنوں بعد انکار ہوجاتا۔

زندگی کتنی مشکل ہوتی ہے عورت کے لیے۔ وہ ساری زندگی سفر کرتی ہے۔ ایک سائبان کے لیے، ایک چھت کے لیے، وہ زمانے کی تپتی دھوپ جھیلتی ہے۔ باپ، بھائی، شوہر، بیٹا۔۔۔۔ اللہ کے بنائے ہوئے مقدس رشتے، لیکن لوگ ان رشتوں کے تقدس کو کیوں پامال کردیتے ہیں۔ وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ عورت کے معاملے میں اللہ سے ڈرنے کا حکم ہے۔

✲ ✲ ✲

وہ سلام کرتی ہوئی اعتماد سے ان کے درمیان آکر بیٹھ گئی۔ مہمان خاتون بہت مشفق انداز میں اس کے سلام کا جواب دے کر اب اس سے چھوٹے چھوٹے سوالات کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے دو مرد حضرات میں سے ایک ان کا شوہر تھا۔ خاتون اپنے مہذب انداز' نفیس لباس اور بات چیت کی ملائمت سے متاثر کیے دے رہی تھی۔ باقی کے رشتوں کی طرح انہیں بھی منیبہ بہت پسند آئی تھی اور ایک بار پھر یہاں اس کی بات پکی ہوگئی۔ اس نے خوش و خرم بھائی کے چہرے پہ ایک نظر ڈالی' بھائی بے شک باپ کا نعم البدل ہوتے ہیں لیکن دنیاوی رشتے' ان بھائیوں کو پرایا کر دیتے ہیں' اس نے نہایت آزردگی سے اپنی نم آنکھیں جھپکیں۔

یہ تین ماہ میں چوتھا رشتہ تھا جو پکا ہونے جا رہا تھا۔ لیکن کچھ دن بعد پھر ٹوٹ جاتا۔ کیوں؟ اس کی وجہ جاننے سے وہ قاصر تھی۔ وہ ٹوٹ جاتی' پھر جڑتی' پچھلا گھاؤ بھرا نہیں ہوتا کہ اگلا گھاؤ نیم جان کر دیتا۔ وہ اس سب سے اتنی دلبرداشتہ ہو چکی تھی مگر بس نہیں چلتا تھا۔ لیکن جانتی تھی کہ غم زندگی تو خود ہی جھیلنا پڑتا ہے' اس میں کوئی حصہ دار نہیں بنتا جس شدت سے رافع اس کی شادی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا' اس بات سے اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی اور خود کو اس نے بھائی بھابی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

"بس میں اب اور انتظار نہیں کروں گا۔ جلد ہی منیبہ کی شادی کروں گا' اس سے پہلے کہ پھر کوئی بدشگونی ہو۔" رافع خدشات کے تحت بول رہا تھا۔ عروج گم صم سی کچن کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔ منیبہ کے کچن کی طرف آتے قدم واپس مڑ گئے۔

"رافع" اس کی زندگی میں ایک واحد محبت کا رشتہ تھا۔ یہ وہ بھائی تھا جو اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اس کی پسند و ناپسند کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کے چہرے سے ہی اس کے اندر کے موسم کھوج لیتا تھا۔ بقول اس کے وہ اس سے پانچ سال چھوٹی اس کی دادی اماں تھی..... اور اب سب کچھ یوں پس پشت چلا گیا گویا کبھی کچھ ہوا ہی نہیں' صبح و شام منیبہ منیبہ کی تکرار کرنے والا بھائی اب چھ چھ دن تک منیبہ کو بھلائے رکھتا تھا۔ اور اس کے لیے دل میں کچھ رہا بھی تو صرف اسے اس کے گھر کا کرنے کی فکر..... انسان کے دل میں ماں باپ' بہن بھائی اور اولاد' بیوی کی محبت کے الگ الگ خانے ہوتے ہیں۔ بھائی سدا خوش رہے۔ وہ بھی تو یہی چاہتی تھی لیکن رافع کیوں اتنا تنگ دل نکلا کہ اس نے اپنی بہن کی محبت کا خانہ سکیڑ کر مٹر کے دانے برابر رکھ دیا' صرف ایک پرائی عورت کے آجانے سے۔

"کیا آپ کو حساب سے ڈر لگتا ہے بھائی! کاش آپ میری حق تلفی نہ کرتے..... آپ نے تو مجھے بھلا ہی ڈالا۔" وہ اپنی اور بھائی کی تصویر سے مخاطب تھی۔

✲ ✲ ✲

بدلتے موسم زود رنج کر دیتے ہیں اور طویل انتظار بے زار کر دیتا ہے۔ بھائی تو اس سے پوچھنا ہی بھول گیا کہ اسے کیا پسند ہے؟ کیا اس کی شادی کردوں.....؟ کبھی پوچھ پوچھ کر تھکتا نہیں تھا اور اب وہ دن گنتی رہتی کہ آخری بار رافع نے کب اس کی خیریت طلب کی تھی۔ زندگی کے نشیب و فراز گہرے ہوں تو ان میں نصیب کی روشنی ضرور ہونی چاہیے تاکہ ہم ٹھوکر نہ کھا سکیں۔ رافع کب کا کمرے میں سونے جا چکا تھا۔ اور عروج چپ چاپ گم صم کچن کی سلیب پکڑے کھڑی تھی۔ اور کافی حد تک غائب دماغ تھی۔

"کیا قسمت تھی اس لڑکی کی جو اس کے شوہر کی لاڈلی بہن تھی۔ قسمت کی امیر۔ جتنے بھی رشتے اس کے لیے آئے وہ سب اعلا خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ شکل و صورت' تعلیم و تہذیب میں بہترین لیکن.....!" آخر میں عروج بڑی طمانیت سے مسکرائی۔ وہ آئے ضرور تھے اور انہوں نے چوکھٹ

بھی پکڑی تھی۔۔۔ اور بنا کسی عذر کے چھوڑ کر بھی چلے گئے۔ یہ کام اس نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ پہلے آنے والے لوگوں کو منیبہ ازحد بھائی تھی لیکن دوسری بار کی آمد میں ہی عروج نے ان کا پتا صاف کر دیا۔ جھٹ پٹ انکار ہو گیا۔ رافع دنوں پریشان رہا۔ بسم اللہ ہی غلط ہو گئی تھی۔

دوسری بار کے لوگوں کو اس نے مہارت سے باتوں ہی باتوں میں منیبہ کی نادیدہ بیماریاں بتا کر انہیں اپنے گھر اپنی بہنوں کے لیے روانہ کر دیا اور تیسری بار اس نے منیبہ سے ہمدردی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

"آنٹی! منیبہ تو میری بہن جیسی ہے۔ اس کا دکھ ہی ہماری زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے۔ اب دیکھیں اس کی دو منگنیاں بلاوجہ ٹوٹ گئیں۔ نہ جانے کون الٹی سیدھی خبریں پہنچاتا ہے لوگوں کو۔ جبکہ ہم پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ لڑکی کو تھوڑی ڈسٹ الرجی ہے وہ تو بس ایک دفعہ میڈیسن لینے سے ہی ختم ہو جاتی ہے' لیکن نہیں جی' پہلے ہامی بھر لیتے ہیں اور پھر انکار کر دیتے ہیں۔۔۔ نہ جانے کیسے لوگ ہیں۔" وہ آنکھوں میں مصنوعی آنسو بھر کر بولتی۔

ان لوگوں کا بھی وہاں وہ آخری دن تھا۔ انہیں کیا ضرورت تھی ایک بیمار اور الرجی کی مریضہ سے رشتہ جوڑنے کی۔ رہ گئی بات عروج کی ہوشیاری کی تو وہ یہ صلاحیت جب دکھاتی تھی جب کہانی کے دونوں کردار منظر عام سے غائب ہوتے تھے۔۔۔ یا پھر سیل فون زندہ باد اتفاق سے لوگ بھی بہت مہذب ہوتے کہ بنا کوئی عذر بتائے نرمی سے انکار کر دیتے کہ پوچھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن اس بار وہ پھنس گئی تھی۔

اس کے لیے آنے والا یہ پہلا رشتہ تھا۔ جنہوں نے اسے انگوٹھی پہنائی تھی اور لوگ حیثیت میں پہلوں سے بھی بڑھ کر تھے۔ دوسری بات رافع کے جاننے والے تھے اور رافع نے انہیں پہلے ہی تین رشتوں کے بارے میں بتا دیا تھا اور انہیں کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔ یہاں عروج بے بس ہوئی تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ اس کے اندر کی حاسد عورت ہمہ وقت تڑپتی کیوں رہتی تھی۔

* * *

تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے آخر۔۔۔؟

رافع اتنی زور سے چلایا تھا کہ منیبہ سہم کر اسے دیکھنے لگی۔ "کیا یہ رافع تھا۔۔۔؟ کاش کوئی اسے یقین دلا دے۔"

"تم چاہتی ہو یہ رشتہ بھی پلٹ جائے اور تم ہمارے سینوں پہ مونگ دلنے کے لیے ساری عمر ادھر بیٹھی رہو۔" بس تھپڑ مارنے کی کسر رہ گئی تھی۔ وہ اتنی ہراساں ہوئی کہ پھٹی آنکھوں سے دیکھتی' منہ پر ہاتھ رکھتی اندر بھاگ گئی اور کمرہ مقفل کر لیا۔ رافع آوازیں دیتا رہ گیا۔

بات اتنی سی ہوئی تھی کہ اس کے منگیتر زاہد کا فون آیا تھا۔ وہ منیبہ سے بات کرنے کا خواہش مند تھا۔ اور عروج جانتی تھی کہ منیبہ مر کر بھی بات نہیں کرے گی۔ تب ہی اس کے پاس موبائل لے آئی۔

"زاہد بات کرنا چاہ رہا ہے۔" منیبہ نے اجنبی نظروں سے عروج کو دیکھا اور مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔

"آپ جانتی ہیں میں غیر مردوں سے بات نہیں کرتی۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئی لیکن اس کی یہ بات اگلی طرف ضرور پہنچ گئی تھی۔ نتیجہ۔۔۔ انکار۔۔۔ عروج بڑے شاطرانہ انداز میں مسکرائی۔ اس بار تو اسے کچھ کرنا ہی نہیں پڑا۔ رافع پہلی بار اس پر برسا تھا۔ منیبہ ساری رات رو رو کر خدا سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتی رہی۔

وہ اتنی پکی مومن تو نہ تھی لیکن اچھائی برائی میں بہت سہولت سے تمیز کر سکتی تھی۔ پھپھو نے اس کی تربیت ہی ایسی کی تھی کہ نامحرم اور محرم کا فرق اس سے بہتر کوئی جان ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک نظر دیکھ لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن مستقل طور پر موبائل پر بات کرنا' ہوٹلنگ کرنا سب بے ہودگی ہی تو ہے۔ بھائی کی باتوں نے اس کے دل پہ ایسے نشتر لگائے تھے کہ اس نے خاموشی سے گھر چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ ہاسٹل میں آرام سے رہ سکتی تھی۔ اس کی ڈگریاں اتنی

شاندار تھیں کہ اسے کہیں بھی آسانی سے جاب مل جاتی۔۔۔ نہ جانے کتنی ایسی لڑکیاں تھیں جو اپنی زندگی کی گاڑی اپنے طور پر گھسیٹ رہی تھیں۔ ہاں لیکن اب وہ اس گھر میں مزید نہیں رہ سکتی تھی۔ صبح تک اس کا ارادہ مصمم تھا لیکن اس سے پہلے ہی اللہ نے اس کی راہ کے کانٹے چن لیے۔

☆ ☆ ☆

جس نادیدہ رکاوٹ سے وہ پریشان تھی وہ سامنے آئی بھی تو کس ہستی کی صورت میں؟ "عروج بھابی!!"

جسے اس نے بڑی بہن کا درجہ دیا ہوا تھا۔ جس پر وہ آنکھیں بند کرکے اعتماد کرتی تھی۔ جس کے لیے وہ اپنے تمام رشتہ داروں کی زبانیں بند کرواچکی تھی۔ وہی اپنے ہاتھوں سے اس کی زندگی میں بے سکونی کے گڑھے کھود رہی تھی۔ اس نے نہایت دکھ اور افسوس سے بالکونی میں کھڑی عروج کو دیکھا جو فراٹے سے جھوٹ بولتے ہوئے اس کی ذات کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ اسے تو علم ہی نہیں تھا کہ "وہ اتنی بد کردار تھی۔" وہ خاموشی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

"خدا اس وقت تک کسی کی آنکھیں نہیں کھولتا جب تک وہ خود ہوش میں آنے کی کوشش نہ کرے۔" صدمے کے زائل ہونے کے کافی دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا۔

"میرا بھی قصور تھا بھابی کہ میں نے آپ پر اندھا اعتماد کیا۔ ہر جگہ سے اندھی ہوگئی۔ میں اپنے اصولوں کی پوجا کرتی رہی اور لوگوں کے رویوں کو پرکھنا چھوڑ دیا۔ پتا نہیں بدنصیب کون ہے؟

آپ۔۔۔؟ جو محبتوں کو بوجھ سمجھتی ہیں یا پھر میں۔۔۔؟ جس پر اللہ مہربانی کرتے نہیں تھکتا۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں خود کلامی کر رہی تھی۔

اس کی کانچ سی آنکھیں پگھل پگھل کر پانی بن رہی تھیں۔ دل کا ٹوٹنا یوں ہی آنکھوں کو درد دیا کرتا ہے۔ منیبہ نے بڑے ضبط سے اپنے آنسو پونچھے اور موبائل نکال کر اپنے منگیتر کا نمبر ملایا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور جسم بھی ہولے ہولے کانپنے لگا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے ایسا کام کرنا جو ہماری فطرت کے منافی ہو۔ وہ جو اصولوں سے انحراف کو موت سمجھتی تھی آج اسی موت کو گلے سے لگالیا۔ وہ معافی مانگ رہی تھی۔ اپنے ناکردہ گناہ کی اور مٹی ہو رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا آپ کو برا لگا۔۔۔۔ مجھے غیر مردوں سے بات کرنا معیوب لگتا ہے۔۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔" وہ بھیگی آواز میں بات کر رہی تھی۔۔۔۔ اس کی آواز کا سحر تھا یا بھیگی ہوئی آواز کا درد۔۔۔۔ مقابل تو جکڑ کر رہ گیا اور جیسے جادو سا ہو گیا۔

"اٹس او کے منیبہ۔۔۔۔ میں آپ کی خواہش کا احترام کروں گا۔ مجھے غلط فہمی ہوئی اس کے لیے آپ بھی معاف کر دیجئے گا۔" وہ نہایت مہذب انداز میں معافی مانگ رہا تھا۔ منیبہ تمام خدشات سے آزاد ہو کر طمانیت سے مسکرائی۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ منیبہ کے سسرال والے آئے اور معذرت کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی پکی کر گئے۔ رافع تو جیسے حیرت سے گنگ رہ گیا لیکن منیبہ کا اترا ہوا چہرہ اور نم آنکھیں دیکھ کر وہ شرمندگی سے نظریں چرا کر رہ گیا۔ کب سے وہ اسے بھلائے بیٹھا تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا اس نے اپنے فرائض بھلا رکھے تھے۔ آج وہ فکروں سے کچھ آزاد ہوا تو خود غرضی کے بوجھ تلے دبے ضمیر نے کچوکا لگایا۔

آج اسے حقیقت کا کچھ کچھ ادراک ہو رہا تھا، جس طرح زاہد کے گھر والوں نے عروج کی باتوں کے باعث ہونے والی بدگمانی کا ذکر کیا تھا۔ رافع پہلی بار ٹھٹک کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کسی کو بھی بیٹھے بٹھائے الہام نہیں ہوا کرتا۔

ہمارے معاشرے میں نہ جانے ایسے کتنے لوگ ہیں جو گھروں کو توڑنے میں سارا زور لگا دیتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ جس بدگمانی کی آندھی میں دوسروں کے گھروں کو توڑنے پہ مائل کرتے ہیں یہ آندھی ان کے اپنے گھر کو بھی مسمار کر سکتی ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ ضرور سوچنی چاہیے۔

☆

نایاب جیلانی

بیہ ' عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا ' عنایہ نزع کے عالم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموشی اور صبر جیت گیا اور میری فرماں برداری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر بستا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے "فاتح" سے عشق تھا ' بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے گئی۔

دیا کا کمرہ خاص تہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ' ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں.... ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "انہیں پڑھ لینا۔ تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔"

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاتح کو بھی فون کر کے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاتح نے سرد لہجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرد مہری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشہدی ایک بزنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی ' رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔ افسون مشہدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ کی آئل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تب ہی ایئرپورٹ پر افسون پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے

روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع افراہیم نہ مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔
مدید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور "دوست" کو بھی لے آنا۔ حریر کا یہ دوست پائلٹ ہے۔ وہ انتہائی وجیہہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بددماغ اور غصیلا بھی ہے۔ اناویہ بہت حسین ' دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو روبا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ اناویہ نے اس کو ناراضی سے منع کردیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود روبا ہے۔
روبا جب اناویہ کے گھر گئی تو اس نے انادیا کے تایا زاد افراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روبا کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔
فوزان مشہدی کے آئل پلانٹ پر کام ہو رہا تھا۔ فوزان مشہدی اپنے ایک ایک ورکر سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک ورکر کام کر رہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ ورکر بہت غیر ذمہ دار اور لاپروا تھا۔ یہ لڑکا رافع افراہیم تھا۔ فوزان مشہدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر ظہران سے فرار ہو رہا ہے تو فوزان مشہدی کو غصہ آگیا اور اس نے خروج لگوا کر اسے جیل بھجوا دیا۔
افسون مشہدی کی اپنی سوتیلی ماں آبگینے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیر اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسون کا اپنا سگا بھائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔
رافع افراہیم کے جیل جانے سے افسون بہت پریشان تھی۔ وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی' جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہو گیا۔
حریر اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ ڈین بیگ پہنچا تو مدید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مدید نے اپنی منگنی میں شرکت کے لیے بلایا ہے۔ یہ سن کر اس کا پائلٹ دوست سیخ پا ہو گیا تھا۔ وہ مدید کی منگنی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا' لیکن یدنے اسے زبردستی روک لیا۔
مدید نے زندگی میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ امید' اس کی خالہ زاد تھی جس سے اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مدید کی لاٹری نکلی تھی۔
افسون نے پہلی بار جب رافع افراہیم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسون اسے دل دے بیٹھی' وہ اس کی منت سماجت کرکے اسے اپنی کمپنی میں لے آئی۔ رافع افراہیم ماضی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسون کی محبت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسوں نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے' لیکن اس کا کمزور دل یہ برداشت نہ کرسکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسون یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی' لیکن وہ بچ گیا تھا۔
فوزان' مشہدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسون کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کرا چکے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا دھتکارا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔
عنایہ اور دیا کی موت پر سب رشتے دار شکوک کا شکار ہو رہے تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے بیہ پر شک کیا کہ اس نے پیسے کی خاطر سوتیلی بہن اور بھانجی کو زہر دے دیا۔
دیا کا پورا نام انادیہ تھا۔ روبا جب انادیہ کے لیے رشتہ لے کر گئی تو وہاں انادیہ کے چچا کے بیٹے افراہیم نے اسے دیکھ کر پسند کیا اور رشتہ بھجوا دیا۔ انادیہ کو شدید غصہ آیا۔ اور حسد محسوس ہوا کیوں کہ افراہیم نے اس کے لیے تو صاف انکار کردیا تھا۔ انادیہ کا رویہ سوتیلی ماں کے ساتھ دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ فرزانہ ماں بننے والی تھی۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔
انادیہ نے افراہیم کے گھر سے آئی' اس کی منگنی کی مٹھائی بھی چھت پر پھینک دی تھی۔ اس نے ناجو کے ذریعے اماں دیوانی سے جادو کرایا۔ کاشف اس پر بری طرح ریجھ گیا۔

انادیہ کا بھائی ناصر ایک لڑکی کو بھگا لایا۔ اس وجہ سے گھر پر پولیس آگئی اور ابا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ابا اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے اور دل کے دورے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

افراہیم کا نکاح ہونے لگا تو انادیہ نے اماں دیوانی سے اس نکاح کو رکوانے کے لیے تعویذ لیے۔ لیکن انادیہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ نکاح ہو گیا۔ چچی نے انادیہ کے بارے میں کہا کہ یہ جس کی زندگی میں جائے گی' اسے جہنم بنا دے گی۔ یہ سن کر انادیہ کے تن بدن آگ لگ گئی۔

افراہیم نے ناصر کو جیل سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اس بات کا بھی غصہ تھا۔ انادیہ نے ایک بار پھر اماں دیوانی سے رجوع کیا۔

فرزانہ ایک بچی کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ روبا امید سے تھی۔ وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی تو اسے انادیہ کی غلطی کہہ کر افراہیم نے انادیہ کو بہت مارا۔ اس تذلیل نے انادیہ کے دل میں شعلے بھر دیے۔ وہ اماں دیوانی کے پاس پہنچ گئی۔

روبا کی زندگی اچانک طوفانوں کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے گھر میں سائے نظر آتے۔ وہ خوف زدہ رہتی۔ اماں کی حالت بھی خراب رہنے لگی۔

روبا کی شادی کاشف سے ہو گئی تھی۔ انابیہ اس کی سوتیلی بہن اس کے مزاج کی سختی کا شکار تھی۔ افراہیم کی امی نے افراہیم کے بیٹے فاتح سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ انادیہ کو اس پر بھی شدید غصہ تھا۔ وہ دن بہ دن غلط عملیات میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

ایک دن ناجو اچانک دیا کے گھر آگئی۔ اس نے بتایا کہ عملیات کی وجہ سے وہ برباد ہو چکی ہے۔ اس نے اس کا ذمہ دار دیا کو ٹھہرایا۔ اس کی ساس نے یہ باتیں سن لیں۔ انہوں نے کاشف اور دیا کو گھر چھوڑنے کے لیے کہا۔

اماں کے دل میں روبا کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ روبا سے خوف زدہ تھیں۔ افراہیم نے بھی تنگ آکر ایک دن کہہ دیا کہ...."تم اماں کے سامنے نہ آیا کرو۔"

پانچویں قسط

پھر تنہائی ملتے ہی افراہیم سے الجھ پڑی۔

"آپ جانتے بھی ہیں کہ اماں کو ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں۔ پھر بھی آپ نے مجھے ملازموں کے سامنے ٹوکا۔ میں اماں کے سامنے نہ بھی جاؤں وہ تب بھی اتنا ہی شور کرتی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں نمی بھرنے لگی۔ "اماں کو نوکروں کے رحم و کرم پہ بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا.... میں خود ان کی دیکھ بھال نہ کروں تو نرس نیند میں خراٹے لیتی رہتی ہے۔"

افراہیم کو فوراً" اپنے سخت لہجے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے روبا سے معذرت کر لی۔ اور پھر جیسے خود بھی الجھ گیا۔

"پتا نہیں روبا! کیا مسئلہ ہے۔ زندگی سے سکون مٹتا جا رہا ہے۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے افراہیم! میں تو نہیں چاہوں گی آپ اور میں بے سکون رہیں۔" اس کی بھیگی آواز نے افراہیم کو چونکا دیا تھا۔ اس نے روبا کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔

"شاید' وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔" افراہیم نے روبا سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ بلکہ الٹا بگڑتا ہی چلا گیا۔

افراہیم نے نئی گاڑی خریدی تھی.... اور اسی خوشی میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دن بڑے دنوں بعد افراہیم پرانے روپ میں آیا تھا۔ شوخ' چنچل اور بے فکرا سا.... بچوں کو بھی ڈھیر سارا وقت دیا اور روبا کے لیے ایک ساڑھی لایا روبا نے کہاں کبھی ایسا لباس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

پہنا تھا۔ وہ لجانے لگی تھی۔
"افراہیم! میں یہ کیسے پہنوں گی؟" وہ گھبرانے لگی۔
"اپنی بھابھی سے سیکھ لینا۔۔۔ وہ تو کاشف کے ساتھ کیا غضب کی ڈریسنگ کر کے سارے شہر میں گھومتی ہے۔" افراہیم کے بتانے پر روبا چونک گئی۔ جب سے وہ الگ ہوئے تھے۔ روبا کو کم ہی ان کے بارے میں کوئی نئی خبر ملتی تھی۔
"دیا ساڑھی پہن کر سارے شہر میں گھومتی ہے؟" روبا کو یقین ہی نہ آیا "کاشف بھائی تو اس معاملے میں بڑے سخت تھے۔ روبا کو چادر کے بغیر باہر نہ نکلنے دیتے۔ چھت پہ جانے کی اجازت نہیں تھی اور گیٹ پہ تو بالکل بھی نہیں اور اب دیا اتنا واہیات لباس پہن کر باہر نکلتی ہے۔"
"ہاں یہ ممکن ہے۔ ان کے نئے گھر میں ابا اور اماں جو نہیں تھے۔ اسے ماننے ہی بنی۔"
"ایسی باکمال ساڑھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں کھل جائیں۔۔۔ دل کرتا ہے جوتی اتار کر اس کے سر پہ دے ماروں۔۔۔ تائی کبھی برقعے کے بنا گلی میں نہیں نکلتی تھیں اور دیا بی بی نے ساری شرم و حیا اتار رکھی ہے۔"
اسے افراہیم کے اس قدر تپنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔ کیا پتا کزن ہونے کے ناتے 'برادرانہ سے غیرت مند جذبات کی بدولت؟
"اور آپ چاہتے ہیں۔۔۔ میں بھی یہ واہیات لباس پہنوں؟ تاکہ کاشف بھائی آپ کے خیالات پہ عمل کر لیں۔ جوتی اتار کر میرے سر پہ دے ماریں۔" روبا نے خفا خفا تیور لیے افراہیم کو گھورا تھا۔
"لباس کوئی بھی واہیات نہیں ہوتا۔ بس پہننے کا سلیقہ ہونا چاہیے اور رہی کاشف کی بات تو اب وہ پہلے سے کافی بدل چکا ہے۔ ماحول چینج ہو تو تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔" افراہیم کا صاف ستھرا جواب آیا تھا۔ روبا نے سر ہلا کر ساڑھی پہننے کا ارادہ بنا لیا۔۔۔ وہ مہذب انداز سے ساڑھی باندھ کر اور تیار ہو کر ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو افراہیم اسے دیکھ کر بے ساختہ خوش ہوا۔

"اب لگ رہی ہو تم مسز کمشنر۔"
"اور پہلے کیا تھی۔" روبا نے مصنوعی خفگی سے تنک کر پوچھا تھا۔
"کمشنر کی کنیز۔" افراہیم نے ترنت جواب دیا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے افراہیم کے کندھے سے آ لگی۔ اور افراہیم نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔
"تم کہیں سے بھی تین بچوں کی اماں جان نہیں لگتیں۔" افراہیم نے اس کے رخساروں کو ملائمت سے چھوتے ہوئے مخمور لہجے میں کہا تھا۔ روبا گلابی پڑ گئی۔ افراہیم سے اسے اول روز کی طرح ہی ڈھیروں شرم آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ گلابی ہونے لگی۔
"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" روبا نے لجا کر پوچھا تھا۔ وہ اس کے کھلے بالوں سے اٹھتی مہک کو اندر اتار کر بولا۔
"میں تو ابھی "ان میرڈ" ہوں۔ لڑکی کے لیے تلاش جاری ہے۔ دیکھو، کہیں بات بنتی ہے یا نہیں۔" افراہیم کی شرارت پہ روبا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
"کہیں تو میں کوشش کروں؟" اس نے بڑے دل کے ساتھ آفر کی تھی۔
"ہرگز نہیں۔" افراہیم نے شان بے نیازی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔
"مگر کیوں؟"
"تم اپنے جیسی کوئی تلاش کر لو گی۔ کنیز کنیز ٹائپ کی۔" افراہیم نے ناک چڑھا کر جتلایا تھا۔
"تو پھر؟" روبا نے بھی تنک کر ناک چڑھائی۔
"تمہاری بھابھی کی خدمات لوں گا۔ اپنے جیسی کوئی ڈھونڈ کر دکھائے۔ ملکہ ملکہ ٹائپ کی۔" افراہیم کے چھیڑنے پر روبا نے ایک مکا اس کے کندھے پہ رسید کیا تھا۔
"آج وہ ملکہ بڑی یاد آ رہی ہے؟" روبا نے غصے اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چبا چبا کر کہا تھا۔ افراہیم نے ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری۔

"ملکہ بھولتی بھی نہیں۔" اس نے جان بوجھ کر حسرت بھرے لہجے میں روبا کو جلایا تھا اور روبا جیسے چیخ پڑی تھی۔

"ایک جان ہیں تو ایک جان ہی رہیں گے۔ اور ایک جان بن کر ہی دنیا سے جائیں گے۔" روبا نے اس کے سینے سے لگ کر بھیگی' نرم اور ٹوٹ پڑتی محبت بھری آواز میں کہا تو افراہیم چیخ پڑا تھا۔

"تمہیں دنیا سے کوچ کرنے کا بڑا ہی شوق ہے۔ ابھی جینے دو مجھے.... ابھی تو تمہارے سنگ بڑا لمبا جیون بتانا ہے بلکہ کسی اور کے ساتھ بھی۔" اس نے روبا کو آنکھ ماری تو وہ بے ساختہ کچھ دیر پہلے والے رنجیدگی بھرے لمحات میں سے نکل آئی۔

"کس کے ساتھ؟ بولیے ذرا۔" وہ اس کا کان پکڑ کر چلائی تھی۔

"میری مجال.... دنیا میں نہیں۔ جنت الفردوس میں۔ حوروں کے ساتھ۔ وہاں تو کوئی پابندی نہیں نا۔" وہ فورا" بات پلٹ کر کانوں کو ہاتھ لگانے لگا تھا۔ روبا اس کی چونچال اداؤں پہ ہنسنے لگی۔ آج وہ بہت دن بعد پرانا والا افراہیم لگا تھا۔ روبا نے شدت سے دعا کی تھی کہ وہ اب ہمیشہ پرانے والا ہی افراہیم رہے۔ لیکن بہت ساری دعائیں کبھی بھی پوری نہیں ہوتیں۔ اس کی یہ دعا بھی خلا میں کہیں اٹک گئی تھی۔ قبولیت کی معراج تک پہنچ ہی نہ سکی۔ حالانکہ ستاروں بھری اس شام کا آغاز بڑا دلفریب تھا۔

اس دن بہت سارے لوگ آئے تھے۔ افراہیم کے کچھ دوست' روبا کی فیملی' اماں' ابا' کاشف بھائی' دیا.... اور دیا کا بھائی ناصر' اس کی بیوی اور بیٹا بھی۔ جو فائح کا بڑا گہرا دوست بن چکا تھا۔ وہ ہمیشہ فنکشنز میں ملتے اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے تھے۔ وہ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ اسی طرح بیہ اور عزہ بھی سہیلیاں تھیں۔ جبکہ ان میں رافع اکیلا تھا۔ روبا کو اکثر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے رافع کا کوئی پارٹنر ہی نہیں۔

لیکن اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ رافع کا پارٹنر کچھ ہی عرصہ بعد ان کی زندگیوں میں "عنایہ" جیسے پُر بہار تحفے کی صورت میں آ گیا تھا۔ روبا کو لگتا تھا۔ عنایہ دنیا میں آئی ہی رافع کے لیے ہے۔ اس کے بد مزاج' چڑچڑے سے موڈی بیٹے کے لیے۔ جسے دیکھ کر وہ اپنا آپ بھول جاتا تھا اور اسے سارا اسنسار بھول جاتا تھا اور اسے پورا جہان بھول جاتا تھا۔ روبا نے محسوس کیا تھا۔ اماں اور دیا اب بھی ایک دوسرے سے کھنچی کھنچی ہیں۔ نہ دیا نے اماں کو سلام کیا اور نہ ہی اماں نے دیا کو پیار کیا۔ یہ چیز روبا کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی تھی۔

ناصر کی بیوی مدیحہ کا موڈ خراب ہی تھا۔ شاید وہ اپنے رشتے داروں کی خوشحال زندگی سے حسد محسوس کرتی تھی۔ یا پھر اسے حسد نہیں کہا جا سکتا۔ ایک طرح کا احساس کمتری۔ جو معاشی لحاظ سے کمزور رشتے داروں کو اپنے مضبوط مالی حیثیت رکھنے والے عزیزوں سے خود بخود محسوس ہونے لگتا ہے۔

روبا جو ذرا دیر کے لیے اٹھ کر اماں کو دیکھنے اور باربی کیو کا انتظام چیک کرنے کے لیے گئی تھی' واپس آئی تو محفل بام عروج پہ تھی اور ناصر نے افراہیم کی گردن پکڑ رکھی تھی۔

"تیرے یہ غیر ملکی دورے کچھ زیادہ ہی نہیں بڑھ گئے؟"

"اب کام کے لیے تو جانا ہی پڑتا ہے۔" افراہیم منمنایا تھا۔ روبا کی سمجھ میں یہی بات آئی تھی کہ افراہیم اپنے پھر کسی سرکاری دورے پہ باہر جانے والا ہے۔ اور یہ کوئی انوکھا واقعہ تو نہیں تھا۔ جس پہ چونکنا ہوا جاتا۔ لیکن وہ "ظہران" کے نام پر بے ساختہ ٹھٹک ضرور گئی تھی۔

"ظہران سے بچ کر آ جانا۔ سنا ہے' عربوں کے پاس ٹھاٹ باٹ اور حسن کی بڑی فراوانی ہے۔" ناصر کی آواز پہ روبا پوری کی پوری افراہیم کی طرف گھوم گئی تھی۔ تو افراہیم اب ظہران جانے والا تھا؟

"سنیں تو...." روبا کو اچانک ہی خیال آیا۔ افراہیم پوری جان سے متوجہ ہوا تھا۔ انا دیہ نے یہ منظر دیکھا

اور نگاہیں کسی بھی تاثر کے بغیر موڑلی تھیں۔ وہ اس وقت بڑے ہلکے پھلکے احساسات کو اپنے من میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔

"سنائیں تو۔" افراہیم کی اس دلربائی پہ وہ بھری محفل کے سامنے جھینپ گئی تھی۔ پھر اپنی جھینپ کو مٹانے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سب ہی کے چہروں پہ دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اماں ' ابا ' ناصر ' مدیحہ ' کاشف بھائی اور حتی کہ دیا بھی ۔۔۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ اور روبا کو آج پتا چلا تھا۔ دیا سادگی سے مسکراتی ہوئی کتنا غضب ڈھاتی تھی اور اس کی مسکراہٹ اتنی حسین تھی کہ دیکھنے کی خواہش میں کئی سال بیت جاتے۔

"آپ کچھ فرما رہی تھیں بیگم صاحبہ!" افراہیم نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ چونک کر بولی۔

"میں یہ سوچ رہی ہوں۔ اگر آپ کے یورپین ٹریپس ختم ہو چکے ہیں تو اماں کو بھی ساتھ لے جائیں۔ اماں کی عمرہ ادا کرنے کی خواہش بھی پوری ہو جائے۔"

"یہ خیال تو بہت نیک ہے بہن! مگر افراہیم مکہ مکرمہ نہیں جا رہا۔ ظہران جائے گا۔ کسی آفیشل کام کے لیے عمرہ پیکج پہ نہیں جائے گا۔" ناصر نے افراہیم کو سوچ میں گم دیکھ کر وضاحت کی تو افراہیم سر ہلانے لگا تھا۔

"اماں کی کنڈیشن ایسی نہیں ' جو سفر کر سکیں۔" افراہیم نے افسردگی سے کہا تو سب لوگ ہی تائید کرنے لگے۔ واقعی اماں اب سفر کے قابل کہاں رہی تھیں۔ فالج کے حملے نے انہیں بستر سے لگا کر رکھ دیا تھا۔ اوپر سے ڈپریشن کے دورے الگ پڑتے۔

"کتنے دنوں کا ٹور ہے؟" کاشف نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ دیا اب اپنی بھابھی سے گفتگو میں مصروف تھی۔ ورنہ جہاں دیا موجود ہوتی وہاں کاشف کم ہی دوسرے لوگوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس کا سارا دھیان اپنی بیوی کی طرف رہتا۔

"اونلی ون ویک۔" افراہیم نے بتایا۔ بچے دالان میں کھیل رہے تھے۔ فاتح اور ناصر کا بیٹا مدیف ۔۔۔ عزہ اور بیبہ جھولے پہ بیٹھی تھیں۔ البتہ رافع الگ تھلگ تھا اور اپنے وائلن کے ساتھ مصروف بھی۔ افراہیم کو خیال گزرا تو رافع کو آواز دی تھی۔ رافع کے آنے سے پہلے وہ ناصر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جو اپنی عادت کے مطابق اسے چھیڑنے میں مگن تھا۔ گزرتے وقت نے ان دونوں کے درمیان زیادہ اچھے تعلقات بنا دیے تھے۔ افراہیم اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

"کیا خبر ' اپنے نصیب بھی چمک ہی جائیں۔ کوئی ریگستانی حسینہ اپنی نظر کرم سے نواز ڈالے۔" افراہیم نے ناصر کی بات کے جواب میں گفتگو آگے بڑھائی تھی۔ روبا مشروب پیش کرتی بے ساختہ چونکی۔

"مجھے تو فکر ہے۔ کوئی صحرائی دوشیزہ تمہیں اپنی زلفوں میں نہ پھانس لے۔ اتنا تو بھولا بھالا ہے ہمارا افراہیم۔" ناصر ہنستے ہوئے افراہیم کو چھیڑ رہا تھا۔

اسی بھول پن میں کسی کو ساتھ نہ لے آئے۔ بھول پن میں تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔" اچانک دیا نے بھی ان کی گفتگو میں حصہ لیا تو افراہیم نے خوب انجوائے کیا۔

"اور بھول میں کیے گئے گناہ تو معاف بھی ہو جاتے ہیں۔" ناصر نے مزید اسے شہہ دی تھی۔ دیا کے اعصاب کھنچ سے گئے تھے۔ جانے کیوں اسے کچھ بھولا ہوا یاد آیا تھا اور گلے کا یہ تعویذ ۔۔۔ وہ بے ساختہ ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔ خلوت کے لمحات میں کاشف نے کئی مرتبہ اس کے گلے سے تعویذ کو اتارنا چاہا تھا۔ لیکن دیا اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتی تھی۔ اور کاشف کو اس تعویذ سے بہت الجھن ہوتی تھی۔

"رقیب لگتا ہے مجھے۔" وہ اس کی گردن کو چھوتا مصنوعی خفگی سے کہتا۔

"تعویذ بھی رقیب ہوتے ہیں؟" وہ آنکھوں میں حیرانی بھر لیتی۔

"میری جان کی گردن سے چپکا ہے تو رقیب ہی ہوا نا ۔۔۔؟" دیا اچانک چونک کر حال میں لوٹی۔ افراہیم اور ناصر نے گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ اب افراہیم اپنے

بیٹے کو گود میں لے کر حاضرین محفل کو کچھ بتا رہا تھا۔ افراہیم کے بیٹے ..... دیا کے دل میں چبھن دیتا ایک احساس۔ ان دونوں کو دیکھ کر جانے کیوں اسے افراہیم کے مارے ہوئے تھپڑ یاد آجاتے تھے اور وہ جوتے جو دادی کے بعد چچی نے اس کے سر پہ مارے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ان لمحات کی ایک مرتبہ پھر اذیت بھر گئی تھی۔ جبکہ افراہیم کچھ فخریہ لہجے میں سب کو بتا رہا تھا۔

"اس بیٹے کی انگلیوں میں جادو ہے۔ اور گلے میں سُر۔" افراہیم اپنی فخریہ پیشکش کے طور پر رافع کو سب کے سامنے متعارف کروا رہا تھا۔ باقی سب نے بھی بڑی ہی دلچسپی محسوس کی تھی۔ تاہم ابا اور اماں کے چہروں پہ ناگواری تھی۔

"گلے میں سُر ہے تو قرآن کا حافظ بناؤ۔ کیا یہ گویا بنے گا؟ ڈوم میراثی؟" اماں نے اپنی ناگواری کسی طور چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ افراہیم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"یہ نالائق اس قابل نہیں ہے۔ ناظرہ پڑھ نہیں سکتا۔ حفظ کیا کرے گا۔ اس کا حافظہ ذرا کمزور ہے۔"

"وائلن بجانا تو نہیں بھولتا۔ نہ نئے پرانے گانوں کے بول ذہن سے نکلتے ہیں۔" اماں نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔ "شوق اور لگن کی ساری بات ہوتی ہے۔" مدیحہ نے بھی گفتگو میں حصہ لے کر بات ختم کرنی چاہی تھی۔

اماں نے ناگواری سے سر جھٹکا اور رافع نے سب کے پُر زور اصرار پہ "اندھیرے رستوں کے مسافر الوداع" یہ زبردست دھن سنائی تھی۔ یوں کہ پورے لان میں سکوت طاری ہو گیا تھا۔ ہر کوئی مسحور اور دم بخود تھا۔

ایک کم سن بچے کا اتنا ٹیلنٹ، بڑا ہی حیران کن واقعہ تھا۔ سب نے تالیاں بجا کر رافع کی حوصلہ افزائی کی تو رافع بری طرح سے شرما گیا۔ جبکہ اماں اور ابا نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ رویا ان کی ناگواری بھرے مظاہرے پہ ہنس پڑی تھی۔ یوں ایک خوب صورت تقریب کا اختتام ہو گیا تھا۔

اور اگلے دن کا آغاز اتنا ہی بدصورت اور تباہ کن تھا۔ اگلی صبح جب وہ سرکاری بنگلے کے وسیع و عریض لان میں نماز فجر کے بعد چہل قدمی کرنے آئی تو سامنے کا منظر اسے چلانے پر مجبور کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کو بچے تھک ہار کر جلدی سو گئے تھے۔ اماں بھی گہری نیند میں تھیں۔ اور افراہیم بھی جلدی سونے چلا گیا تھا۔ رویا کو ابھی افراہیم کے لیے کپڑے نکالنے تھے۔ اس کے آفس جانے کی تیاری کرنا تھی۔ وہ مگن سی ڈریسنگ روم میں کپڑے نکالنے لگی اور کچھ دیر پہلے ہونے والی تقریب کو سوچنے لگی تھی۔ اسے اپنی بھابھی کا رویہ بڑا ہی خوش گوار لگا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے اس میں تبدیلی آئی ہو۔ شاید یہ کاشف کی محبت کا اعجاز تھا۔ آخر دیا کو بھی جینے کا قرینہ آگیا تھا۔ جو بھی تھا۔ رویا کو بہت خوشی ہوئی۔ البتہ اماں ابا کے ساتھ دیا کا رویہ اچھا نہیں تھا۔

جانے ان کے درمیان کیسی ناراضی چل رہی تھی؟ اماں نے کچھ بتایا نہیں تھا اور نہ ہی رویا نے روایتی نندوں کی طرح ٹوہ لینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے اتنی خبر تھی کہ دیا اور کاشف خوشگوار ماحول میں گھر چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ دراصل رویا اکلوتے بھائی کے گھر چھوڑنے پر بھی بہت دل برداشتہ ہوئی تھی۔ کاشف کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بوڑھے ماں باپ کو اس عمر میں تنہا چھوڑ کر اپنی الگ سے دنیا بسا لینا کہاں کی شرافت تھی؟

اور آج تقریب کے بیچ میں جیسے ہی اسے موقع ملا تھا۔ وہ بھائی سے الجھ پڑی تھی۔

"اماں ابا کو اکیلے چھوڑ کر جانے میں کون سی مصلحت پوشیدہ تھی؟ مجھے یہ بات نہیں جاننی۔ مجھے صرف اتنا بتائیں۔ کوئی بوڑھے ماں باپ کو اس طرح چھوڑ کر چلا جاتا ہے؟" رویا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا

سمندر اتر آیا تھا اور کاشف بڑا ہی سنجیدہ اور خفا دکھائی دینے لگا۔

"میں نے ان کو چھوڑا نہیں ہے۔ بس دیا کو الگ کیا ہے۔ میں ان سے روزانہ ملنے جاتا ہوں۔" کاشف نے جوتے کی نوک سے گھاس کھرچتے ہوئے بتایا تھا۔

"دیا پر ایسی کون سی آفت آن ٹوٹی تھی۔ وہاں پہ دس دیور اور نندیں موجود تھیں کیا؟ ایک اماں ابا کا وجود اس سے برداشت نہیں۔" روبا جذبات کی رو میں بہتی رونے لگی تھی۔ کاشف نے اسے نرمی سے ٹوکا۔

"کچھ ایسا ہو گیا تھا۔" وہ کھویا کھویا سا بولا۔ "اس بات کو اب رہنے دو.... میں ان کا بیٹا ہوں۔ اور ان کی پوری خبر گیری رکھتا ہوں۔" وہ بات بدلنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ روبا کو لگا' وہ مزید اس ٹاپک پہ بات نہیں کرے گا۔

سو وہ چپ کر گئی۔ لیکن اس وقت روبا کا ذہن اماں ابا میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

"اماں کو اس عمر میں پورا گھر سنبھالنا پڑتا ہے۔ دیا کی خود غرضی دیکھو۔ اپنے بنگلے میں ان دونوں کے لیے ایک کمرہ نہیں تیار کر سکی۔" وہ بھرے دل کے ساتھ کپڑے پریس کرتی سوچ رہی تھی۔

کام ختم کر کے وہ بیڈ روم میں آگئی۔ افراہیم گہری نیند میں تھا۔ اس کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے چل رہا ہے۔ کوئی گہرے گہرے' لمبے لمبے سانس لے رہا ہے۔ اسے کسی انسانی سانسوں کی آواز بہت ہی قریب سے سنائی دی تھی۔ روبا کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ کوئی تھا؟ کوئی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ چلتی تو چلنے لگتا۔ وہ رکتی تو رک جاتا۔ وہ سانس روکتی تو وہ بھی سانس روک لیتا تھا۔ وہ کون تھا؟ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ خوف سے چک پھیریاں کھانے لگا۔

"عبداللہ۔" روبا کے ہونٹ ہلے اور کپکپانے لگے تھے اور اس کی بازگشت کے ساتھ کسی کا گہرا ہوتا ہنکارا۔ ایک قرار کرتا ہوا انداز۔ تو یہ عبداللہ تھا اور عبداللہ واپس آگیا تھا۔

اس کا دل اول روز کی طرح ہی خوف و ہراس میں جکڑنے لگا۔ اس کے سر پہ بنگلے کا آسمان گرنے لگا۔ اسے کھڑے کھڑے چکر سا آیا تھا۔ وہ دیوار سے ٹکرائی اور فرش پر گر پڑی۔ جانے اسے نیند آئی تھی یا اونگھ۔ اس کی سماعت سے کسی کی بھاری بوجھل آواز ٹکرائی تھی۔

"دھاگوں میں گرہیں لگوانے والی تو سب کچھ بھول بھال کر اپنی زندگی میں کھو گئی۔ لیکن جو گرہیں لگاتی اور چلے کاٹتی ہے وہ نہیں بھولتی۔ اس کے عمل کی نحوست تب تک نہیں ختم ہو گی جب تک وہ خود نہ چاہے۔ وہ بنگالن ساحرہ ادھورے چھوڑے ہوئے کاموں کی تاک میں لگی رہتی ہے۔ اتنے عرصے بعد اسے پھر آپ یاد آگئیں۔ اور اس نے آپ کے پیچھے سر کٹے شیطانوں کو لگا دیا ہے۔"

وہی دھیمی بوجھل آواز۔ وہی ڈھال بنتا نرم سا لہجہ.... وہ ایک مضبوط سا محافظ کا حصار۔ "اس سے کہیں.... گڑھے میں سے زنگ آلود لوہے کا مکان نکال کر اس کا تالا کھول دے۔ ورنہ مکانوں کو تالے لگ جائیں گے۔ گھر اجڑ جائیں گے اور دلوں کو بھی تالے لگ جائیں گے۔ اسے کہیں' قبر کے اندر سے بت نکال دے۔ ایک عورت کا بت' ایک مرد کا بت...." وہ بولتا رہا اور آواز لحہ بہ لحہ دور ہوتی چلی گئی تھی۔

"ان بتوں میں جدائی ڈال دی گئی ہے۔ آگ لگا دی گئی ہے۔" کوئی اسے دس مرتبہ باور کروا کر جا رہا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ٹھنڈے فرش پہ اوندھی گری پڑی تھی۔ لیکن یہ آواز اور بازگشت؟ روبا کو لگا۔ وہ ایک ایک لفظ دس سال گزر جانے کے بعد بھی بھلا نہ پائے گی۔ اسے ایک ایک لفظ یاد تھا۔ یوں لگا جیسے کوئی اس کے قریب کان کے پاس بیٹھ کر رٹا رہا ہے۔

روبا اٹھی تو جسم تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ اور یوں وہ ایک مرتبہ پھر کئی

سال پیچھے چلے گئے تھے۔ اسی آسیب کے زیر اثر۔
گھر میں وہی نحوست اور بے سکونی نے پنجے گاڑ لیے تھے۔ بچے سہمے رہتے۔ رویا چلتے چلتے بے ہوش ہو جاتی اور اماں کی حالت نہایت ہی شکستہ تھی۔ انہیں کئی شیطانی چہرے ڈراتے اور مارنے کی کوشش کرتے۔ اور اماں کو ہر چہرے پہ رویا کا گمان ہوتا۔ یوں افراہیم اس سے الجھنے لگا تھا۔ لڑنے لگا۔
"تم میری ماں سے تنگ آچکی ہو اور اپنی جان چھڑانا چاہتی ہو۔ وہ جھوٹ نہیں بولتیں۔ تم انہیں ماسک پہن کر ڈراتی ہو۔" افراہیم کے یہ الزام رویا کی روح کو زخمی کر دیتے تھے۔ وہ روتی چلاتی صفائیاں دیتی مگر نتیجہ صفر۔
پھر یوں ہوا کہ افراہیم رویا کے روز روز بے ہوش ہونے کے ڈرامے سے بھی تنگ آگیا۔ اسے صحت مند، ہنستی مسکراتی رویا چاہیے تھی۔ اس رویا کا وہ کیا کرتا؟ جو بات بے بات ڈرتی تھی۔ خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگتی۔ کبھی کمروں میں چھپتی۔ کبھی گھر سے نکلنے کی کوشش کرتی۔
پھر افراہیم کی نئی گاڑی کو راتوں رات آگ لگ گئی تھی۔ اس خوفناک حادثے نے رویا کو ذہنی طور پہ بالکل توڑ دیا تھا۔ صاف ستھرے کمروں میں اچانک ایسی خوفناک چمگادڑیں گھس آتیں کہ سارے نوکر انہیں مار مار کے ہلکان ہو جاتے تھے۔ کبھی بند جالی دار دروازوں کے اندر موٹی موٹی مکھیاں ہزاروں کی تعداد میں آجاتی تھیں۔
افراہیم اسپرے کروا کروا کے تھک گیا۔ لیکن عجیب بات تو یہ تھی۔ وہ گھر میں ہوتا تو کوئی بھیانک واقعہ رونما نہ ہوتا۔ گاڑی کے علاوہ کوئی دوسرا غیر معمولی واقعہ افراہیم کو چونکا نہیں سکا تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ صرف رویا کے دماغ کا کوئی فتور ہے۔
گاڑی کا واقعہ بھی اسے اتنا غیر معمولی نہ لگا۔ اس کے خیال میں۔ یہ کسی دشمن کی کارستانی یا نوکروں کی غلطی کا شاخسانہ تھا۔ کسی نوکر نے پیٹرول کھول کر آگ جلائی ہوگی تو گاڑی کو آگ لگ گئی۔
افراہیم کسی بھی سفلی عمل کے ڈرامے کو اب ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔
پھر یوں ہوا کہ ایک دن اماں بھی اچانک چل بسیں۔ جاتے جاتے بھی وہ رویا پہ الزام دھر کے گئیں۔
"یہ میرا گلا دباتی ہے۔ افراہیم اسے نکال دو۔ یہ بد بخت ہے۔ جب سے آئی ہے ہم عذاب سے دوچار ہیں۔" آخر کار اماں نے بھی تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ وہ الفاظ ان کے منہ سے ادا ہو چکے تھے جو کسی زمانے میں رویا سننے کی خواہش رکھتی تھی۔ اب تو رویا کی خواہشوں کا رخ بھی بدل گیا تھا۔
رویا کے لیے اس الزام کے بعد جینا ہی محال تھا۔ وہ جانے اتنا کچھ ہو جانے کے بعد زندہ ہی کیسے تھی؟
پھر اس دوران افراہیم ظہران چلا گیا... اور جب وہ واپس آیا تو ایک بدلا ہوا افراہیم تھا۔ وہ رویا کا افراہیم نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ رویا پہلے والی رویا تھی۔ وہ کوئی اجڑی بکھری بھوت لگتی۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پہننے کا۔ نہ بچوں کا۔ یوں لگتا تھا۔ اماں کا آسیب اب اس کو چمٹ گیا ہے اور اس کی جان لے کر ہی ٹلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔
اوپر سے افراہیم کا بدلا بدلا رویہ.... ان کے ازدواجی تعلقات سرد مہری کا شکار ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی چیخوں سے تنگ آکر افراہیم نے اپنا کمرہ بھی الگ کر لیا تھا۔
لیکن رویا کو ایسا ہی لگتا تھا کہ جب سے افراہیم ظہران سے لوٹا ہے۔ بالکل بدل گیا ہے۔
افراہیم کی مصروفیات کا دائرہ کار وسیع ہوتا چلا گیا تھا۔ وہ زیادہ وقت باہر گزارتا تھا۔ یا پھر سرکاری فون کی تار کھینچ کر کمرے میں بند ہو جاتا۔ اور رویا خالی خالی نظروں سے بند دروازے کو دیکھتی رہ جاتی۔ اکثر اسے اماں والے دورے پڑنے لگے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ وہ خلاؤں میں پاگلوں کی طرح دیکھتی جاتی، روتی جاتی۔ اتفاق سے ایک دن اماں آئیں تو اسے دیکھ کر اور

چیخ پڑیں۔

"تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"پتا نہیں اماں! کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ زندگی من ہی من میں مرجھا رہی ہے۔" اس کا بکھرا بکھرا لہجہ اماں کے دل پہ گھونسہ مار گیا تھا۔ وہ اماں سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ہائے میرے مالک.... وہ آسیب پھر تو نہیں آگیا؟" اماں کا دل بند ہوگیا۔ جسم کانپنے لگا۔

"یہ وہ نہیں کوئی اور ہے اماں! کوئی شیطانی چیزیں .... جو کسی نے ہم پہ مسلط کردی ہیں۔" روبا کا دم الجھنے لگا۔

"وہ چاہتی ہیں.... ہم تکلیف اٹھائیں۔ اور ہم میں پھوٹ پڑ جائے اور افراہیم مجھ سے جدا ہو جائے۔" وہ رونے لگی تھی اور اماں نے اپنا دل پکڑ لیا تھا۔

"میں جانتی ہوں وہ کون ہے؟ کس نے تم پہ جادو پھونکا؟ کون تمہیں افراہیم سے جدا کرنا چاہتا ہے؟" اماں نے اسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔ اور اسے لفظ بہ لفظ ناجو کا کہا بتانے لگیں۔ اور روبا ایسی ساکت کہ دوبارہ بولنے کے قابل ہی نہ ہو سکی۔

پھر اماں افراہیم کو بھی سمجھاتی رہیں اور وہ بیزاری منہ پہ طاری کیے سنتا رہا۔

وہ ایسا ہی بے زار ہو چکا تھا۔ گھر سے 'اپنی بیوی سے اور اس کی نادیدہ بیماری سے۔

لیکن روبا جانتی تھی۔ اس بیزاری کے پیچھے کیا محرکات تھے۔ افراہیم اس سے دور کیوں جا رہا تھا۔

اور اس رات روبا کی ذرا سی باز پرس پہ افراہیم پھٹ پڑا تھا۔ افراہیم کیوں پھٹ پڑا تھا؟ اور اس کے الفاظ!

"کسی آسیب کی طرح میری زندگی سے چمٹ چکی ہو۔ کسی سائے کی طرح میرے پیچھے ہو۔ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ تم ہو ہی سبز قدم۔ جب سے میری زندگی میں آئی ہو۔ پریشانیاں ختم ہی نہیں ہو رہیں۔" وہ غصے کی انتہا پہ چلایا تھا۔

"اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے۔ میں اسے گھر سے چلا جاتا ہوں۔ دفع ہو جاتا ہوں۔ تاکہ میری زندگی میں تمہیں سے سکون آجائے۔ یہاں پر تمہارے وجود کی نحوست چھائی ہوئی ہے۔"

وہ تیزی سے بولتا ہوا روبا کے وجود کو دھجی دھجی ٹھوکروں میں اڑاتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ پھر وہ اس سرکاری بنگلے سے بھی نکل گیا تھا۔ وہ روبا کے گھر سے ہی نہیں زندگی سے بھی نکل گیا تھا۔ کیونکہ روبا جان گئی تھی۔ وہ ظہران سے بدل کر نہیں آیا تھا۔ وہ وہاں کی کسی ریگستانی حسینہ کی زلف کا اسیر ہو کر آیا تھا۔ اس نے روبا کو چھوڑنا ہی تھا۔ آج نہ چھوڑتا تو کل چھوڑ دیتا۔ وہ اسے چھوڑنے ہی تو آیا تھا۔ آیا اور چلا گیا۔ کسی گمنام راہ کا مسافر بن گیا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ اس کی راجدھانی تھی۔ انادیہ کا اپنا راج پاٹ۔ اس سلطنت کی وہ اکیلی مہارانی تھی۔ وہ جو سراپا "دیا" تھی۔ اپنے شیشے کے بنگلے میں بجلی سے جگمگاتے حسن کی تابناکی بکھیرتے ہوئے۔ وہ اکیلی اپنے محل کی ملکہ تھی۔

یہ گھر دیا کے خوابوں کا مرکز تھا۔ ایسے گھر کے اس نے صرف خواب دیکھے تھے۔ اور حقیقت پا کر وہ اپنے "آپے" میں نہیں رہی تھی۔ اوپر سے کاشف کو اتنے سالوں بعد اتنی بڑی خوشی بھی دے رہی تھی۔ اب تو اس کے دل پہ حکومت ہی حکومت تھی۔ اپنی حکمرانی۔ اپنی راج دھانی۔

اور دیا کو صرف یہ خبر نہیں تھی کہ حکومتیں برطرف بھی ہو جاتی ہیں۔ سلطنت کو زوال بھی آجاتا ہے۔ تخت الٹ بھی جاتے ہیں اور قبضے چھن بھی جاتے ہیں۔

ابھی تو وہ لمبے عرصے کے لیے خوش گمانی کے ہنڈولوں میں جھول سکتی تھی۔ اس نے کاشف کے دل کو اپنی طرف پھیر لیا تھا۔ ایک محبت ہوتی ہے جو دور دلوں کو قریب کردیتی ہے اور ایک بدگمانی ہوتی ہے جو قریبی دلوں کو دور کردیتی ہے۔ دیا نے یہی سکہ کاشف پہ چلایا تھا۔ سکہ کھوٹا تھا پھر بھی چل گیا۔

کاشف اپنے گھر والوں سے دور ہو گیا۔ اپنی اس بنائی عارضی جنت میں کھو گیا تھا۔ اور دیا کے لیے اس سے بڑا کوئی اطمینان نہیں تھا۔ اس کی ساس کے لگائے بہتان کے بعد کاشف کا ان سے بددل ہونا دیا کے سکون قلب کے لیے کافی تھا۔ صد شکر کہ کاشف معاملے کی کھوج میں نہیں پڑا تھا۔

اور دوسری بات کہ اماں نے بھی کاشف کے بعد روبا کو کان بھر کے دیا سے متنفر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی روبا اسے ملتی بھی تو عام انداز میں۔

عنایہ کی آمد تک سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا۔ اماں البتہ دل میں آیا بال نہ نکال سکیں اور دیا کو اماں کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ کاشف کی بھرپور محبت اور توجہ اس کے ہمراہ تھی۔ اسے کچھ اور نہیں چاہیے تھا۔ باقی لوگ اس کے نزدیک ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

بس اسے اتنی سوجھ بوجھ نہیں تھی کہ جنہیں ہم کمتر غیر ضروری اور حقیر بنائے رکھتے ہیں۔ وہ بھی رفتہ رفتہ ہمیں ایسا ہی بنا دیتے ہیں۔

اسے پہلی مرتبہ احساس تب ہوا تھا جب عنایہ کی پہلی سالگرہ پہ کوئی نہ آیا۔ یہ دیا کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اتنے لوگوں میں کوئی اپنا موجود نہیں تھا۔ سوائے ابا کے۔ روبا نے معذرت کر لی تھی۔ افراہیم کو کسی میٹنگ میں جانا تھا۔ دیا کو سارے ارینج منٹ، ساری تیاری اور شان و شوکت بیکار ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔

روبا اور افراہیم نہیں تھے تو یہ "دکھاوا" کس کام کا تھا؟ روبا پہ دھاک بٹھانے کی کمینی سی خوشی ہاتھ سے جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ روبا نہ آئی تو اماں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دیا کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔ وہ اپنی قیمتی سلیولیس ساڑھی کی فال درست کرتی کاشف سے الجھ پڑی تھی۔

"دیکھا اپنی ماں کا کام۔ نواسوں کی خوشیوں پہ بھاگی چلی جاتی ہیں اور اکلوتی پوتی کی سالگرہ پہ آ نہیں سکیں۔" اس کا رنج اور ملال غصے میں لپٹ چکا تھا۔

کاشف نے لاپروائی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر ٹھٹک گیا تھا۔

"بیمار ہیں وہ تب ہی آ نہیں سکیں۔ ابا کے ہاتھ تحفہ تو بھیج دیا۔" وہ اس کے سنہرے روپ کو آنکھوں میں سموتا محبت سے بولا تھا۔ وہ اسے آج بھی بہت عزیز تھی۔ اول روز کی طرح' دل میں اترتی ہوئی۔

"تحفہ بھاڑ میں جائے۔ عنایہ کو تحفوں کی کمی نہیں۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی تھی۔ کاشف نے آہ سی بھری۔ اس عورت کا غرور اسے لے ڈوبے گا۔ وہ اکثر سوچتا تھا اور دیا سے کہہ بھی دیتا۔ جواباً" وہ ناک بھوں چڑھانے لگتی تھی۔

"آپ کی بہن بھی نہیں آئی۔ نواب زادی ہم اس کے بچوں کی خوشیوں میں بھاگے چلے جاتے ہیں۔" دیا کا میٹر گھوم چکا تھا۔ اور اب کاشف کی گلو خلاصی ممکن نہیں تھی۔

"افراہیم گھر پہ نہیں تو کس کے ساتھ آئے؟" کاشف نے لولی سی دلیل پیش کی تھی۔ جو نیلی آنکھوں کے شراروں کی وجہ سے فوراً" بھسم ہو چکی تھی۔

"ڈرائیور مر گیا ہے کیا؟ سارے شہر میں ڈرائیور کے ساتھ گھومتی ہے۔ یہاں آتے ہوئے کیا تکلیف تھی۔" اس نے تنفر سے کہا تھا۔

"سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ وہ کہاں ڈرائیور کے ساتھ گھومتی ہے۔ اماں کے گھر آتی ہے بس۔ جب افراہیم نہیں ہوتا۔" کاشف نے ناگواری سے جتلایا۔

"ہونہہ' بہن اور ماں پہ تو آنچ نہیں آنے دیتے۔" دیا کا وہی فطری حسد اور جلن۔ کاشف اسے گھورتا ہوا باہر نکلنے لگا تھا۔ پھر جاتے جاتے رک سا گیا۔

"اگر جلنا کڑھنا ہو جائے تو لان میں چلی آؤ۔ میرا خیال ہے' مہمان بھی پہنچ چکے اور تمہارے بھائی' بھاوج بھی۔" دیا نے کڑھتے ہوئے اپنا سندر سراپا آئینے میں دیکھا اور سر جھٹکتی باہر آ گئی۔

پھر یہ کھولن اور جلن مدیحہ بھابھی کی آنکھوں میں اتری ستائش دیکھ کر ختم ہو گئی تھی۔ چلو' روبا نہ سہی۔

مدیحہ ہی سہی۔ اس کے اندر تپتے احساسات پہ کچھ ٹھنڈی بوندیں پڑی تھیں۔

فنکشن بہت اعلیٰ پیمانے پہ تھا۔ کاشف کے کاروباری دوست ان کی فیملیز۔ دیا ان میں تتلی بنی اڑتی پھر رہی تھی۔ بہت دیر بعد ابا نے اجازت چاہی۔ انہیں اپنا آپ یہاں مس فٹ محسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا بیٹے! چلتا ہوں میں..." انہوں نے کاشف کو دوستوں میں گھرا دیکھ کر دیا سے کہا تو وہ جلدی سے کاشف کو اشارہ کرتی ان کے قریب آگئی تھی۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ آج یہیں رک جائیں۔" دیا کا اصرار اور کاشف کی بڑھتی تائید دیکھ کر انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تمہاری ماں کی صحت اچھی نہیں... رات کو اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ ابھی تو رافع کو بٹھا کر آیا ہوں۔ بہت مچل رہا تھا یہاں آنے کے لیے۔ عنایہ کے لیے جیلی بیلی کا تحفہ بھی خریدا ہوا ہے۔" بہو کا مزاج اچھا دیکھ کر وہ خوش دلی سے بتانے لگے تھے۔ دیا' رافع کے نام پر فوراً "چوکنا ہوئی تھی۔

"رافع ادھر ہی تھا۔ تو آپ لے آتے اسے۔ عنایہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔"

"تمہاری ساس اکیلی تھی۔ اس لیے پاس بٹھا کر آیا ہوں۔" ابا نے حلاوت سے بتایا تھا۔ دیا کا منہ بن گیا۔

"ہونہہ ' ماں بیٹی نے روکا ہو گا۔ ماموں کے گھر نہ جائے۔" وہ اندر ہی اندر کھولتی رہی۔ ابا پیدل ہی آئے تھے۔ کاشف کا یہ گھر ان کے آبائی گھر سے' بہت نزدیک تھا۔ اکثر کاشف بھی واک کرتا کرتا' ماں سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اور ابھی وہ ابا کو جاتا دیکھ کر ساتھ ہو لیا۔ جواز یہ دیا کہ "رات بہت ہو چکی ہے۔ ابا کیسے اکیلے جائیں گے۔"

کاشف کے اڑنچھو ہونے پر وہ خون کے گھونٹ بھرتی سارے مہمانوں کو اکیلے ہی ڈیل کرتی رہی۔ سب سے آخر میں ناصر اور مدیحہ گئے تھے۔ دیا نے نوکر سے کہہ کر ان کے لیے کھانا پیک کروا دیا تھا۔ اور ڈرائیور کو انہیں گھر ڈراپ کرنے کے لیے تیار بھی کیا۔ مدیحہ کو دیا کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بڑا ہی رشک آ رہا تھا۔ ناصر کی بہن نے کیا قسمت پائی تھی۔

ناصر کو کاشف کی غیر موجودگی' بہت کھٹک رہی تھی۔ جاتے جاتے بھی جتانے سے باز نہیں آیا تھا۔

"لاٹ صاحب' مہمانوں کو گھر بلا کر خود سرے سے غائب۔ یہ تو سراسر بے عزتی ہے۔ افراہیم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ وہ گھر بلاتا نہیں۔ خود لینے آجاتا ہے اور گھر چھوڑ کے بھی خود جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں میزبانی۔"

ناصر کی تلملاہٹ پہ مدیحہ نے اسے آنکھ کے اشارے پہ ٹوکا تھا۔ مبادا دیا کو برا ہی نہ لگ جائے اور دیا کو لگا تو بہت ہی برا تھا اور غصہ بھی بہت آیا۔ مگر ناصر پہ نہیں کاشف پہ۔

"گھر آ تو لیں پوچھتی ہوں۔ اتنی بد تہذیبی۔ مہمانوں کو گھر بلا کر خود نکل لیے۔"

وہ سارا پھیلاوا نوکروں کے سپرد کرنے کے بعد خود ڈریسنگ روم میں زیورات اتارتی غصے میں کھول رہی تھی۔

جبکہ دوسری طرف کاشف اپنے ماں باپ کے ساتھ خوشگوار ماحول میں چائے پی رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے ماں کے ہاتھ سے بنی خوشبودار مسور کی دال اور روٹی کھائی تھی۔ اور اب چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے بھول چکا تھا کہ اس کے گھر میں آج شاہی خوان سجا تھا۔ اسے تو دنیا کی ہر نعمت سے اچھی آج مسور کی دال لگ رہی تھی۔ ماں کے ہاتھ کی خوشبو میں گندھی۔

اور اماں کو بخار بھی تھا تب بھی وہ اس کے لیے تازہ پھلکا اور چائے بنا کر لائی تھیں۔

"میرے بیٹے نے کون سا روز روز آنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار تو یہ موقع ملتا ہے۔ اسے کیوں گنواؤں۔" وہ بخار کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی اٹھ کر اس کے لیے کھانا لے آئیں۔ کاشف تب تک رافع کے "شوق" سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر اس کا کندھا تھپک کر

بڑے پیار سے بولا۔

"میرا بھانجا بہت ٹیلنٹڈ ہے۔ میوزک میں بڑا نام کمائے گا۔" ماموں کی تعریف پہ رافع فخر سے پھول گیا۔ کوئی تو تھا جو بابا کے بعد اسے سراہتا تھا۔ ایک بابا اور ایک ماموں.... باقی لوگ اس کے ٹیلنٹ کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والے نہیں تھے۔ یہ اسے بہت چھوٹی عمر میں ہی احساس ہو گیا تھا اور اس کا ننھا سا دل اس صدمے کو سہارنے کے قابل نہیں تھا۔ اوپر سے نانی کی فاتح کے لیے تعریفیں۔

"پڑھائی میں بھی نام کمائے تو تب نا۔ ایک فاتح ہے ہر میدان میں آگے ہر امتحان میں اول۔ میں نے تو کہہ دیا ہے افراہیم سے، تمہارا یہ بیٹا نام ڈبوئے گا۔" اماں نے فوراً" مداخلت کی تھی۔ اور رافع کا منہ بن گیا۔ ہر جگہ فاتح، فاتح اور فاتح۔ اس کے کان پک گئے تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔

"تو پھر افراہیم نے کیا کہا؟" کاشف نے بہت دلچسپی کے ساتھ پوچھا تھا۔

"اس نے کیا کہنا تھا۔ بولا، چلیں نام ڈبوئے گا تو کیا ہوا۔ کچھ تو کرے گا نا۔" اماں نے خفگی سے بتایا تھا۔

کاشف بے ساختہ ہنس پڑا۔

"میرا تو یہ شہزادہ ہے۔" کاشف نے اسے بھینچ لیا تھا۔ "میرے ساتھ چلے گا کیا؟" اس نے رافع کا بازو دبوچ کر کھڑا کیا۔

"جاؤں گا۔" وہ فوراً" تیار ہو گیا تھا نانی کی تنبیہہ کے باوجود۔

"تو پھر چلو۔" کاشف نے چائے کا کپ خالی کیا اور خود بھی اٹھ گیا۔ "اماں! رافع میرے ساتھ جا رہا ہے۔" اس نے ماں کو اطلاع دی تھی۔ وہ جز بز سی ہو گئیں۔ رافع ہمیشہ ایسے ہی کرتا تھا۔ جب بھی ادھر آتا ماموں کے گھر جانے کے لیے مچل جاتا۔

"لے جاؤ بیٹا!" ابا نے فوراً" مداخلت کی تھی۔ مبادا وہ رافع کو جانے سے روک دیں۔ اماں چپ کی چپ رہ گئیں۔ اور رافع مچلتا ہوا کاشف کے کندھوں پہ سوار ہو گیا تھا۔

اور پھر یہ معمول ہی بن گیا تھا۔ رافع نانی کے گھر بہانے سے آجاتا اور پھر ماموں کے گھر چپکے سے نکل جاتا۔ پہلے پہل ماموں خود لے جاتے تھے پھر یوں ہوا کہ وہ پیدل مارچ کرتے ہوئے خود ہی پہنچ جاتا تھا۔

جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا تھا۔ اس کی ماموں کے گھر سے انسیت بڑھتی چلی گئی تھی۔ اور یہ صرف عنایہ کی کشش ہی نہیں تھی بلکہ دیا کی ڈھیر ساری محبت اور توجہ اسے ماموں کے خوب صورت گھر کی طرف کھینچ کر لے جاتی تھی۔ اسے ماموں کے گھر سے اچھا کوئی اور گھر نہ لگتا تھا۔ اور دیا سے اچھی کوئی اور مامی دنیا میں نہیں تھی۔ دیا نے کچھ ایسا ہی حصار رویا کے بیٹے کے گرد کھینچ دیا تھا۔ اس نے رافع کو محصور کر لیا تھا۔

یہ بہار کے بڑے خوب صورت دن تھے۔ درختوں پر شگوفے پھوٹنے کا وقت تھا۔ نئی کونپلیں کھلتی تھیں اور پودوں پہ پھولوں کی نئی قبا دکھائی دیتی تھی۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ اور تتلیاں ہی تتلیاں اڑتی نظر آتی تھیں۔

رافع آج بھی نانی کی نظر بچا کر ماموں کے گھر آ گیا تھا اور اب عنایہ کے ساتھ لان میں بیٹھا اسے پیانو بجانا سکھا رہا تھا۔ بیہ اپنی پڑھائی میں مصروف تھی۔ بیچ میں ایک دفعہ اٹھ کر رافع اور عنایہ کو فرنچ فرائز بنا کر دے آئی تھی۔ دیا ابھی ابھی پارلر سے تازہ بہ تازہ فیشل کروا کے آئی تھی اور اب اے سی چلا کر ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے رافع کو اندر بلا کر پوچھا حالانکہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جواب پہلے سے ہی جانتی تھی۔

"نانی کو بتا کر آئے ہو سویٹ!" وہ محظوظ سی نظروں سے رافع کو دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی رافع اب کیا کہے گا۔

"نہیں۔" رافع نے نفی میں سر ہلایا۔ دیا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اوہ۔ پھر تو مسئلہ ہو تا نا۔ تمہاری نانی مجھ پہ نیا الزام

لگادیں گی۔" دیا کی پیشانی پہ تفکر کی ایک لکیر نظر آئی تھی۔

"آئی ڈونٹ کیئر۔" رافع نے ناک چڑھا کر جواب دیا اور عنایہ کے پکارنے پہ باہر بھاگ گیا۔ دیا ہنسنے لگی تھی۔ بیہ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر زیرلب بڑبڑا کر کہا۔

"آپ اسے منع کیوں نہیں کرتیں دیا! اس طرح وہ عادی ہوجائے گا۔" اسے دیا کا ہنسنا برا لگا تھا۔

بیہ کے جملے پہ دیا کی بھنویں تن گئی تھیں۔ اس کی ہنسی رک گئی۔ ہونٹ سکڑ گئے اور چہرہ رنگ بدل گیا۔

"تو میری بلا سے۔ میں اسے دعوت نامہ بھیج کر تو نہیں بلاتی۔ وہ عنایہ کے لیے آتا ہے۔ اور تم زیادہ عقل نہ جھاڑا کرو مجھ پہ۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔" دیا کے تیز لہجے پہ بیہ کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔ وہ ایسی ہی تھی۔ پل میں جھاڑ کر بے عزتی کر کے رکھ دیتی۔ چاہے پاس نوکر ہوتے یا مہمان۔ اس نے کبھی لحاظ روا نہیں رکھا تھا۔ اور اب تو بیہ نے خود ہی اپنی شامت بلالی تھی۔ رات تک دیا کو یہ بات کھٹکتی رہی۔ پھر وہ رات کو دوبارہ معمولی سی بات پہ انابیہ کو جھاڑنے لگی۔ کاشف اس وقت قریب ہی تھا۔ بیہ کی پتلی حالت دیکھ کر ٹوکے بنا نہ رہ سکا۔

"دیا! اپنا لہجہ نرم رکھو۔ بیہ اب بچی نہیں بڑی ہورہی ہے۔ وہ انسلٹ فیل کرتی ہے۔" کاشف کی حمایت نے دیا کو اور بھی تپا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم وہ خاموش ہوگئی۔ حالانکہ بیہ بچپن سے ہی دیا کے عتاب کا نشانہ بنتی رہی تھی۔ دیا کو عادت تھی، شوہر سے لے کر سسرالیوں تک جس پہ بھی غصہ آتا۔ نکلتا بس بے چاری انابیہ پہ تھا۔ بعض اوقات تو انابیہ کو روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیتی تھی۔

اس گھر میں کاشف کے علاوہ دو اور وجود تھے۔ جن پر دیا کا سکہ چلتا تھا۔ بیہ اور عنایہ۔ اس کی رعایا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ خاص طور پر بیہ کے لیے تو دیا کا ہمیشہ سے ہی دل تنگ تھا۔ اول تو ڈھنگ کا کپڑا لے کر نہیں دیتی تھی۔ اگر لے بھی دیتی تو وہ اتنا گھٹیا اور سستا ہوتا کہ ایک دھلائی میں پھٹ جاتا۔ رنگ اتر جاتا۔

اگر کاشف کو خیال آتا تو وہ عنایہ کے ساتھ بیہ کی بھی شاپنگ کرلاتا تھا۔ اسی بہانے بیہ کو بھی کچھ ڈھنگ کا پہننا نصیب ہوجاتا تھا۔ کہنے کو وہ ایک امیر کبیر بہن کے گھر رہائش پذیر تھی، مگر حالت اس کی نوکروں سے بھی بدتر تھی۔ یہ تو کاشف کی مہربانی تھی جو بیہ عنایہ والے اسکول میں ہی پڑھنے لگی۔ ورنہ پہلے وہ تیسرے درجے کے ایک قریبی اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ اسی اسکول میں روبا کے تینوں بچے بھی پڑھتے تھے۔

یوں بیہ کی اپنی سہیلی عزہ سے روزانہ ملاقات ہوجاتی تھی۔ اسکول کے وہ چند گھنٹے اس کی زندگی کے بہترین لمحات ہوتے تھے۔ اکثر کاشف بھائی عنایہ کے ساتھ سیر بھی کرالاتے اور شاپنگ وغیرہ بھی۔ پھر جب دیا کو خبر پہنچتی تو ایک طوفان آجاتا تھا۔

"کرلو عیش دوسروں کے ٹکڑوں پہ۔" یہ دیا کے بچپن کی انتہا تھی۔ تب بیہ اتنی ذلت محسوس کرتی تھی کہ وہ کپڑے اسے سانپوں کی مانند لگتے تھے اور کھانا زہر سے بھی برا۔ وہ کاشف بھائی کے لائے کپڑے الماری میں ٹھونس دیتی تھی اور کئی کئی دن بھوکی رہتی۔ خود کو تکلیف دیتی، مگر کب تک؟

پھر کچھ وقت آگے کی طرف سرکا تو دیا کے مزاج میں واضح تبدیلی آگئی۔ وہ اپنی ڈگر پر چلتے چلتے رک کر کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔

اور یہ تب ہوا جب وہ یکے بعد دو مردہ بیٹیوں کو دفنا کر گھر آئی تھی اور ڈاکٹر نے اسے مزید بچہ پیدا کرنے سے روک دیا تھا۔ یہ ایک حادثہ تھا جو دیا کے وجود پہ گزرا تھا۔ ایک بیٹا پیدا کرنے کی خواہش کہیں دل میں انگڑائیاں لیتی کرلاتی رہ گئی تھی۔

عنایہ کو بلاوجہ مارنا اور غصہ کرنا ختم ہوگیا۔ بیہ کی مشقت میں کمی آگئی۔ اب اسے روز گالیاں، کوسنے نہیں دیے جاتے تھے۔ نوکروں کی موجودگی میں بیہ

سے کام لروانا ترک کردیا گیا تھا اور سب سے بڑی بات دیا نے کاشف سے کہا تھا کہ وہ اماں ابا کو گھر لے آئے۔

یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ انتہائی خوش گوار تبدیلی تھی جس نے کاشف کے دل کو اس کا اور بھی گرویدہ کردیا تھا' لیکن اماں ابا کے انکار نے دیا کو شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھتی تھی کہ جتنا مرضی اپنی خودی میں ان لوگوں کو دھتکارتی رہے گی۔ اور جب اس کی مرضی ہوگی تو وہ اس کی ایک پکار پہ بھاگے چلے آئیں گے۔ اس کا یقین تب متزلزل ہوا۔ جب اماں ابا نے آنے سے صاف انکار کردیا تھا۔

"اس سونے کے پنجرے میں تم خوش رہو' ہم یہیں بھلے۔"

اماں کے صاف انکار پہ دیا مطمئن نہ ہوئی اور ایک مرتبہ پھر انہیں لینے خود چلی گئی تھی مگر اس کے بعد دوبارہ اس کی اماں کے گھر جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اماں کا دو ٹوک لہجہ اور انداز اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

"تمہارے وہاں جانے سے دلوں کا میل دھل جائے گا؟" اماں کی سنجیدہ نگاہیں اور چہرے پہ پھیلتی نفرت کا عکس دیا کو ہلا کر رکھ گیا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے لوٹ آئی تھی۔

"تم نے کیا سمجھ رکھا تھا' زندگی کی بساط پہ سارے مہرے اپنی مرضی سے چلوگی؟ جب تمہارا دل چاہا بساط بچھائی' چلی' مہرے بدلے اور الٹ دی۔"

دیا تب بھی ان کا جواب سن کر دل مسوس کے رہ گئی تھی۔ اماں نے تو دل میں گرہ ہی باندھ لی تھی۔ دیا کو یہ کوشش بے کار ہی لگی۔ یوں لگتا تھا' اماں' تاجو کی بکواس کو ابھی تک بھولی نہیں ہیں اور دیا کو تو یاد بھی نہیں تھا کہ کبھی اس نے تاجو کے ہمراہ کوئی سفلی عمل کیا بھی تھا۔ اماں نے جانے کیوں دل میں گانٹھ لگا رکھی تھی۔

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ غلطیوں کی تلافی حوصلوں اور معافی کے خالص جذبوں سے ہوتی ہے اور اگر زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش ہو بھی تو آپ کے گناہ' اعمال اور لوگ ہرگز آگے نہیں بڑھنے دیتے کیونکہ وہ کچھ بھولے نہیں ہوتے' وہ راہوں میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

اور ابھی تک زندگی میں اس نے دوسروں کو گھاؤ دیے ہی تھے۔ ابھی گھاؤ لینے کہاں تھے؟ اور اب

"لینے" کا وقت آرہا تھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہر کوئی اس سے اکھڑا اکھڑا کیوں ہے؟

وہ تو اپنی طرف سے اچھا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ پھر بھی وہ بری تھی۔

اگر رویا سے تعلقات اچھے کرنے کی کوشش میں پہل کی تو اس کا سرد رویہ دیکھنے کو ملا۔ افراہیم تو اس کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتا تھا اور ساس سسر تو ویسے بھی اس سے متنفر تھے۔

ایک بھائی اور بھابھی تھے' وہ بھی افراہیم اور رویا کے گیت گاتے۔

ان دنوں دیا نے محسوس کیا کہ کاشف کچھ الجھا الجھا سا ہے۔ گھر میں کھانا بھی نہیں کھاتا تھا اور شدید تناؤ میں نظر آتا تھا۔ نوکروں نے تھوڑی مخبری کی تو پتا چلا کہ زیادہ وقت اماں کے گھر میں گزارتا ہے۔

پھر خدیجہ کے توسط سے دیا نے بھی کچھ اڑتی اڑتی سی خبر سنی اور حقیقی معنوں میں وہ حیران رہ گئی۔ اسے کاشف کے الجھے رویے اور فکرمندی کی وجہ سمجھ میں آچکی تھی' مگر اسے کاشف پہ غصہ تھا۔ وہ اپنی پریشانی اس سے شیئر نہیں کرتا تھا بلکہ وہ بہت ساری باتیں دیا سے چھپانے لگا تھا اور اب دیا باہر کے لوگوں سے گھر کی باتیں سنا کرتی تھی تو اسے غصہ کیوں نہ آتا۔ رات بھی کاشف بہت دیر سے گھر آیا تو دیا اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ کاشف اسے جاگتا پاکر بھی نہ چونکا۔ دیا کے لیے یہ بڑا حیران کن واقعہ تھا۔ کاشف اور اسے نظرانداز کرے؟ وہ ٹھٹک گئی تھی۔

"بہت دیر کردی کاشف! میں آپ کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔" دیا کو جتانا ہی پڑا تھا۔ کاشف کپڑے

تبدیل کر کے آیا اور اپنی جگہ پہ خاموشی کے ساتھ لیٹ گیا۔ دیا اس کے رویے پہ الجھ گئی تھی۔ یہ خاموشی کیوں؟ خیریت تو تھی؟ روبا کا معاملہ کچھ زیادہ نہ بگڑ گیا ہو؟

کچھ دیر بعد کاشف نے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور بڑے ہی عجیب لہجے میں بولا۔

"ہاں' دیر تو کردی اور میں تو اب ہی جاگا ہوں۔ اتنے سال حالت نیند میں رہا۔" کاشف کے الفاظ نے اسے خائف کردیا تھا اور اس کی آنکھیں اور چہرہ؟ دیا کا دل پہلی مرتبہ کسی خوف کے حصار میں جکڑا گیا تھا۔

"کیسی باتیں کررہے ہیں؟ روبا کا مسئلہ کچھ زیادہ ہی سر پہ سوار کرلیا ہے۔ آپ نے تو بتایا نہیں۔ مدیحہ بھابھی نے کچھ اڑتی اڑتی بتائی تھی مجھے بھی۔ افراہیم کسی غیر ملکی لڑکی کے چکر میں ہے۔ مجھے تو سن کر یقین نہیں آیا۔" دیا نے بالآخر اپنی ناراضی بھرا شکوہ کاشف کے گوش گزارا تھا۔ جسے سن کر وہ کرنٹ کھاتے ہوئے اٹھا تھا۔

"روبا پریشان ہوگی اور یقینی طور پہ اماں بھی' لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بہن کی پریشانی میں مجھے کیوں نظرانداز کررہے ہیں۔" دیا نے دلربائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کاشف کے قریب کھسک کر اپنا ہاتھ اس کے سینے پہ رکھا تو کاشف ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھیں عجیب خونی سی ہورہی تھیں۔ دیا کو اپنے بائیں پہلو میں۔۔۔ خوف سرسراتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"روبا کی بربادی میں اگر تمہارا ہاتھ ہوا نا دیا! تو یاد رکھنا۔ میں تمہیں کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔" کاشف کی دھیمی پر غیض آواز میں کسی زخمی بھیڑیے کی غراہٹ تھی۔ دیا کا پہلی مرتبہ سانس حلق میں اٹکا تھا۔ اس کے سر پہ جیسے دھماکا ہوا تھا۔ کئی لمحے تک دیا کے حواس اپنی جگہ پہ نہ آسکے اور پھر کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس نے خود پہ قابو پالیا تھا۔

"روبا کی بربادی میں میرا ہاتھ کیسے ہوگا؟ آپ ہوش میں تو ہیں؟ کیا میں نے افراہیم کے دماغ میں خناس بھرا ہے کہ وہ کسی باہر کی لڑکی سے معاشقہ چلائے۔۔۔۔ میرا اس میں کیا فائدہ ہوگا؟" دیا پوری قوت سے چلا کر کہہ رہی تھی۔ تب کاشف بپھر کر اس کی طرف مڑا تھا۔ پھر اس نے دیا کا بازو دبوچ لیا۔ اس کی آہنی گرفت نے دیا کے دودھیا بازو میں سرخیاں اتار دی تھیں۔

"جو کچھ میں نے سنا ہے۔ دعا کرو' غلط ہو ورنہ تمہارے حق میں ذرا بھی اچھا نہ ہوگا انادیہ بی بی!" وہ غراتا ہوا "آپے" سے باہر ہورہا تھا۔ انادیہ بھی جواباً اسی شدت سے غرائی تھی۔

"عادت ہے آپ لوگوں کو الزامات لگانے کی۔ پہلے ماں نے لگائے اور اب بیٹے کو پمپ کرکے بھیج دیا۔ میں افراہیم اور روبا کو الگ کرکے کون سا انعام پاؤں گی؟ میرا افراہیم سے کیا تعلق؟"

"کھاؤ قسم' افراہیم کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا؟" کاشف نے انگارہ ہوتی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ انادیہ جیسے لحہ بھر میں منجمد ہوگئی تھی۔ تو کیا یہ وقت بھی آنا تھا؟ جب کاشف اس سے جواب طلبی کرتا؟ وہ بھی افراہیم کے حوالے سے؟ دیا کا دماغ سنسنانے لگا۔

اس کے ساتھ افراہیم کا بھلا کیا تعلق تھا؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔۔

"میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا نہ ہے اور اب آپ مجھ پہ بہتان نہیں لگائیں گے۔" وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے آپے میں نہیں لگ رہی تھی۔

"میرے ہاتھ کوئی ثبوت آلینے دو۔ پھر میں تم سے حساب لوں گا اور تمہیں حساب دینا ہوگا۔ میری بہن برباد ہوئی تو آباد تم بھی نہیں رہو گی۔" وہ آگ بگولا ہو کر چلایا تھا۔ پھر غصے میں گالیاں بکتا باہر نکل گیا جب کہ دیا چکراتے سر کو تھامتے ہوئے تکیے پہ ڈھے گئی تھی۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہورہا تھا؟ کیوں ہورہا تھا؟

اتنے سال پہلے افراہیم اور اس کی ماں سے نفرت کے چکر میں جو کچھ بھی اس نے ان کے خاندان کے

ساتھ کیا تھا۔ کیا اب اس سب کا حساب دینے' حساب چکانے' قرض اتارنے کا وقت آگیا تھا؟ اور اس کا شوہر سخت بدگمان لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کون سے شبہات اترے ہوں گے؟ کیا یہی کہ انادیہ ماضی میں افراہیم سے دل لگی کرتی رہی ہے؟

اگر ایسا تھا تو بہت غلط تھا۔ اسے کاشف کو بتانا تھا۔ افراہیم کے لیے انادیہ کا دل تو ہمیشہ ہی خالی رہا۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر کاشف کا شک بے بنیاد تھا اور اسی شک کو "وجہ تنازعہ" بنا کر وہ دیا کے ساتھ جھگڑتا تھا۔ ان کی لڑائیاں ایک معمول بن گئی تھیں۔ کاشف پہ اکثر خون سوار ہو جاتا اور وہ دیا کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا تھا۔

"تمہاری وجہ سے میری بہن اذیت میں ہے۔ تم نے ہمیں برباد کیا ہے۔ تم ہو' خوب صورت بلا۔ آسیب۔" وہ اس شدت سے دھاڑتا تھا گھر کے سارے نوکر اکٹھے ہو کر تماشا دیکھنے لگتے تھے۔ پھر یہ تماشا ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ اسے نوکروں اور بچیوں کے سامنے مارتا تھا۔ جواباً" دیا چلاتی اور ہذیان بکتی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ وقت ایک مرتبہ پھر بہت پیچھے چلا گیا ہے۔ جب اس کی ماں کو دادی جوتوں اور ڈنڈوں کے ساتھ مارتی تھی اور سارا محلہ تماشا دیکھنے آتا تھا۔ یوں دیا بھی اپنی ماں کو پٹتے دیکھتی اور خوش ہوتی۔ اس نے کبھی دادی کو روکا نہیں تھا جس طرح اس کی بیٹی اور بہن کاشف کو روکتی نہیں تھیں۔ ہاں' وہ سہم جاتی تھیں اور اونچی آواز میں دیا کے ساتھ مل کر ضرور روتی تھیں۔

اور جب کاشف اپنا زہر اتار کر گھر سے نکل جاتا تب دیا اپنے کٹے پھٹے وجود کو سمیٹتی اٹھتی اور اپنا سارا عتاب ان دو معصوم جانوں پر نکال دیتی۔

پھر یوں ہوا کہ بیہ کی گلوخلاصی ہو گئی۔ دیا نے اس پہ ہاتھ اٹھانا چھوڑ دیا تھا مگر بیہ یہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے صرف بیہ پر سے ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب دیا کا نشانہ صرف عنایہ تھی۔ کاشف کی عنایہ۔ اس کی اکلوتی اولاد۔

بیہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ماں بیٹی کس جذبے کی تسکین کرتی تھیں۔ ایک مار کر دوسری مار کھا کر۔

اور عنایہ ایسی صابر کہ لبوں سے "سی" بھی نہ نکالتی تھی۔ اس کا ایک آنسو بھی نہ گرتا۔ وہ ایک مرتبہ بھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر روکتی نہیں تھی حتیٰ کہ کاشف بھائی کو بھی نہیں بتاتی تھی۔ بلکہ باپ کے سامنے ہی نہ آتی۔ اپنی چوٹوں کو نہ سہلاتی نہ ان پہ مرہم لگواتی۔ گھٹنے' ٹخنے' سوج سوج کر خود بخود سوزش اتار لیتے۔ زخم ٹھیک ہو جاتے۔ نہ بھی ہوتے تو اسے پرواہ نہیں تھی۔ بیہ کو لگتا تھا۔ وہ دنیا کی صابر ترین لڑکی ہے۔ ایک آہ بھی منہ سے نہ نکالتی۔ ایک بھی حرف شکایت نہیں۔

اور کاشف بھائی اپنے گھر' بیوی اور بچی سے ہی نہیں کاروبار تک سے غافل۔

ان کی آپس میں لڑائیاں بڑھتی رہیں۔ وجہ تنازعہ کیا تھا؟ بیہ اور عنایہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ بلکہ گھر کے نوکر بھی جان چکے تھے کہ "صاحب اپنی بیوی پہ شک کرتا ہے۔"

دیا ایک مرتبہ پھر اسی "بے رحم" دیا کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ وہی کاشف سے بدزبانی اور عنایہ پہ چڑھائی۔ جواباً" عنایہ کی گہری خاموشی.... نہ مزاحمت' نہ انکار' نہ بدتمیزی' نہ سرکشی....

پھر یوں ہوا کہ دیا اور کاشف کی ازدواجی زندگی تنکا تنکا بکھر گئی۔ کاشف کے دل میں ایسی گانٹھ بندھی تھی جو کھل کر نہ دیتی تھی۔ ہر جھگڑے کا اختتام اسی تکرار پہ ہوتا تھا۔

"تم نے مجھے برباد کر دیا ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تم نے میرا سکھ' چین چرا لیا ہے۔" کاشف کے اندر جانے کیسے کیسے جھکڑ چلتے تھے۔

"اس عنایہ کی وجہ سے تم اس گھر میں ہو۔ ورنہ اب تک دفعان کر چکا ہوتا۔" کاشف کی زہریلی آواز۔

جواباً" دیا کا اونچی آواز اور آگ اگلتے لہجے میں ہذیان بکنا۔

تب عنایہ کونوں میں چھپ جاتی تھی۔ خود کو کمرے میں بند کرلیتی۔

کاشف کی مار دھاڑ کا خوف عنایہ کے اندر بیٹھ گیا تھا اور دیا مار کھا کر ڈھیٹ ہو چکی تھی۔ کاشف کے ہزار مرتبہ دھکے دے کر گھر سے نکالنے کے باوجود وہ ایسی ڈھیٹ کہ اپنا سونے کا پنجرہ چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔ جاتی کہاں؟ بھائی کے تین مرلہ مکان میں؟ جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ واپس جانے کے لیے کوئی رستہ نہیں تھا۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اسے کاشف کی نفرت کے ہمراہ اسی گھر میں رہنا تھا۔ کاشف نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ اس نے عنایہ کی وجہ سے اسے گھر سے نہ نکالا تھا۔ اسے کاشف کے اکثر وہ پرانے بھولے بسرے سے الفاظ یاد آتے تھے۔

"محبت کے قاعدوں میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے۔ جو بے دھڑک دل میں آجائے۔ وہ کبھی جا نہیں سکتا اور اگر ایک دفعہ چلا جائے تو کبھی واپس آ نہیں سکتا۔"

وہ کاشف کے دل سے نکل چکی تھی۔ پھر واپس کہاں سے آتی؟!

اس دن دیا کا دل ضرورت سے زیادہ گھبرا رہا تھا اور اس دن دیا نے پہلی مرتبہ بیہ سے نرم لہجے میں بات کی تھی اور اسے کھڑکیاں دروازے بند کرنے کا حکم دیا تھا۔

"پورب سے طوفان اٹھ رہا ہے۔ کھڑکیاں بند کرلو۔"

بیہ، بہن کی ہدایت پہ حیران پریشان کھڑکیاں کھول کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ آسمان صاف تھا اور کسی بھی طوفان کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ پھر بھی اس نے سر شام ہی کھڑکیاں، دروازے بند کرلیے تھے۔

اور اب لاؤنج میں دبک کر بیٹھی تھی۔ عنایہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ وہ بہت کم باہر نکلتی تھی۔ باہر اس کی دلچسپی کے لیے تھا ہی کیا؟ سوائے رافع کے۔ جو بہت کم یہاں آتا تھا، مگر جب بھی آتا اسے عنایہ کے علاوہ پھر اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

رافع کے نانا اور نانی نے اس پہ پابندی لگا رکھی تھی جو کہ آنے والے دنوں میں خود بخود ٹوٹ گئی۔

پھر یوں ہوا کہ .... دیا اپنے "عبادت کدے" (بیسمنٹ) میں گھس گئی تھی جو اس نے کاشف سے بچنے کے لیے ایک ڈھال کی صورت میں بنالیا تھا اور اوپر سر شام ہی ایک اجنبی سی صورت دکھائی دی تھی۔ اسے دیکھ کر بیہ نے واضح طور پر دیا کو دہلتے دیکھا تھا۔ وہ کون تھا جسے دیکھ کر دیا گھبرا گئی تھی؟ بیہ کی سمجھ میں ہی نہ آیا کیونکہ دیا کو نیچے بھی چین نہیں آیا تھا۔ وہ تہہ خانے سے اوپر آگئی تھی اور اب دیا کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکا جو اپنا نام وسیم بتاتا تھا۔ اس نے اسٹڈی میں بند کاشف کو افراہیم کا ایک پیغام دیا تھا اور اس کے بعد کاشف فوری طور پر وسیم کے ساتھ باہر چلا گیا تھا اور اس کے جاتے ہی دیا چکرا کر گر پڑی تھی۔

بیہ نے اس کے نیلے پڑتے ہونٹوں کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

"یہ وسیم ہے 'تاجو کا بھائی اور یہ کوئی اچھا پیغام نہیں لایا۔" دیا کی وہ بڑبڑاہٹ غلط نہیں تھی۔ دیا کے وہ خدشات باطل نہیں تھے اور پورب سے ایک آندھی بھی اٹھی تھی۔ جو ہر شے کو تہس نہس کر گئی۔ ایسا طوفان آیا تھا جو اپنے ساتھ بربادی لایا۔

کچھ گھنٹوں بعد کاشف لوٹ آیا تھا، مگر وہ پہلے والا کاشف نہیں تھا۔ وہ کوئی اور ہی کاشف تھا۔ اس نے آتے ہی دیا کو اندر گھسیٹا اور کمرہ بند کرلیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چرمی تھیلا تھا جس کے اندر سے لوہے کا زنگ آلود تالے والا مکان نکلا، بوسیدہ کھوپڑی، کپڑے کے پتلے، کیل، سوئیاں، خونی ناپاک کترنیں.... وہ ایک ایک چیز دیا کے منہ پہ مارتا اپنے "آپے" میں نہیں لگ رہا تھا۔ بیہ نے یہ سارا منظر عقبی کھڑکی سے لٹک کر دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں ابل کر باہر آگئیں۔

کاشف دیا کو آخری ٹھوکر سے نواز تا 'مغلظات کا ایک طوفان بکتا ہیجانی قسم کی نفرت میں پاگل ہوتا گھر

سے نکل گیا تھا اور پھر بیہ نے اپنی بہن کے سہاگ کو دوبارہ کبھی اس شیشے کے محل میں نہ دیکھا۔

وہ اپنے پیروں پہ چل کر غصے' نفرت اور اشتعال کی ہر حد کو چھوتا گھر سے نکلا تھا اور چند لوگوں کے کندھوں پہ سوار ہو کر گھر لوٹا۔ اس حال میں کہ وہ اس گھر کا پہلا مکین تھا۔ جو اس بدبخت ساحرہ کے چنگل سے آزاد ہو گیا تھا۔ وہ اپنی محبت کی قید سے آزاد ہو گیا تھا۔ وہ اس خوب صورت بلا کے "سحر" سے رہائی پا گیا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کے فسوں کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس نیلی آنکھوں کے کالے جادو سے نجات پا گیا تھا۔ وہ اس گھر کا پہلا خوش نصیب تھا جو رہائی پا گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

یہ ایک روپہلی صبح تھی۔ سنہری کرنوں سے بجی۔ زیبائش و آرائش دیتی۔ دھوپ میں گندھی ہوئی سویر۔ بہت سالوں بعد یہ سنہری سویر شیشے کے محل میں اُتری تھی اور سونے پہ سہاگہ عنایہ کی دلنشین ہنسی کی آواز۔ ایسی کھنک دار ہنسی تو بیہ نے عمر بھر نہ سنی تھی۔ اس نے ایسے ہی کچن کی کھڑکی میں سے ذرا آگے کو لٹک کر جھانکا۔ عنایہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور آنکھیں موندے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

لاؤنج سے گزرتی دیا بھی ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

"یہ عنایہ اکیلی بیٹھی کیوں ہنس رہی ہے؟" اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر سر جھٹک کر بیسمنٹ کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ وہ کاشف کے بعد زیادہ تر بیسمنٹ میں اپنا وقت گزارتی تھی۔ بیہ نے دیا کو بے نیازی سے آگے بڑھتا دیکھا اور جلدی سے باہر آ گئی۔

عنایہ ستون سے ٹیک لگائے چوکڑی مارے آنکھیں موندے بیٹھی تھی اور ابھی تک ہنس رہی تھی۔ بیہ کو اسے ٹوک کر ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اسے ہنستے ہوئے بہت خوب صورت بہت پیاری اور معصوم لگی تھی۔ اس دن کی طرح جب عنایہ نے

ساتھ سالہ بیہ کی گود میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں اور دو تین انچ کی دودھ والی بوتل سے پہلی غذا پیٹ میں اتاری تھی۔

وہ تب سے لے کر اب تک بیہ کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکی تھی۔ عنایہ کی فکر' عنایہ کی دیکھ بھال' عنایہ کی تکلیف' عنایہ کے آنسو۔

بیہ کو اتنا پتا تھا کہ وہ اسی کی طرح ایک محروم زندگی جی رہی ہے۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی اور اب باپ نہیں تھا۔ اور ماں' باپ سے پہلے بھی نہیں تھی۔ نظر آتی یا نہ آتی۔ سامنے ہوتی یا نہ ہوتی۔ زندہ رہتی نہ رہتی۔

وہ کھوئی کھوئی سی عنایہ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ چھوٹی سی عنایہ کتنی بڑی ہو گئی تھی۔ وقت بھی تو کتنا آگے نکل گیا تھا۔ اور ابھی دسویں مہینے میں عنایہ کی سترھویں سالگرہ منائی جائے گی۔ پورے دس مہینے بعد۔

اور بیہ کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ ان دس مہینوں کے اندر عنایہ کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آنے والی تھیں اور ان تبدیلیوں کے ساتھ ہی بیہ کی زندگی میں بھی زلزلہ آنے والا تھا اور اگر پتا ہوتا تو بیہ اس بھاگتے وقت کو روک لیتی۔ اس کی نظروں کا حصار محسوس کر کے عنایہ نے پلکوں کی چلمن اٹھائی تو بیہ اس نیلگوں سمندر میں ڈوب کر رہ گئی تھی۔

"ایسی پیاری آنکھیں..... بندہ ڈوبے نا تو اور کیا کرے۔" بیہ نے سر جھٹک کر سوچا اور مسکراتے ہوئے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ عنایہ کے ہونٹوں کی مسکان ذرا سی سمٹ گئی تھی۔

"بندہ تو ڈوب گیا۔" وہ ہلکی آواز میں بولی اور گلابی سی ہو گئی۔ جیسے اس نے بیہ کی سوچ کو پڑھ لیا تھا۔

"یہ اکیلے اکیلے کیوں ہنسا جا رہا تھا؟" بیہ نے مشکوک انداز میں بازپرس کی تو عنایہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلائی تھی۔

"دیکھو تو۔" عنایہ نے گود میں چھپائی کوئی چیز بیہ کے سامنے لہرائی تھی۔ بیہ چونک اٹھی۔ یہ ایک

اسمارٹ سا بہت قیمتی موبائل فون تھا۔

"یہ کہاں سے آیا؟" بیہ نے حیرانی کے عالم میں پوچھا تھا۔ عنایہ ادھر ادھر دیکھتی ذرا راز داری سے بولی۔

"دیا کہاں ہیں؟"

"نیچے۔ بیسمنٹ میں۔" بیہ نے اسے تسلی دی تھی۔ تب عنایہ گہرا سانس بھرتی ذرا کی ذرا مسکرائی۔

"یہ گفٹ ملا ہے سالگرہ کا' پیشگی تحفہ۔" وہ اس کے اگلے سوال سے پہلے ہی بول اٹھی تھی۔ بیہ کا کھلتا منہ بند ہوا۔

"رافع نے دیا.... مگر کہاں سے؟ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ کسی کالج میں اس کا کوئی کنسرٹ تو نہیں لگ گیا؟" بیہ نے کچھ دیر بعد حیرانی سے پوچھا تھا۔

"اوں ہوں۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ "وہ بے چارا غریب سا بندہ کیا اتنا مہنگا موبائل دے سکتا ہے۔"

"تو پھر؟" بیہ الجھی۔

"فاتح نے۔" عنایہ کھلکھلائی تھی۔ "ہو گئیں ناں حیران.... رافع بھی ایسے ہی حیران ہوا تھا۔ پھر اس کا موڈ آف ہو گیا۔" بتاتے بتاتے وہ کچھ افسردہ ہو گئی تھی۔

"اس کا موڈ تو آف ہو گا۔ فاتح کے ساتھ اس کی بنتی جو نہیں۔" بیہ نے سر ہلایا۔

"پہلے تو بنتی تھی۔ جب فاتح کو گانا سننا ہو تو بنا بھی لیتا ہے۔" عنایہ نے دبی آواز میں بتایا تھا۔

"ہوں.... رافع کی آواز بہت اچھی ہے اور تم بتاؤ ہنس کیوں رہی تھیں؟" بیہ کو خیال آیا کہ وہ کس کام کے لیے کچن سے باہر آئی تھی۔ عنایہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"رافع کا میسج تھا۔" وہ ایک مرتبہ پھر اسکرین پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ بیہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا رافع؟" بیہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ رافع کے لیے عنایہ کے جذبات وہ بخوبی سمجھتی تھی اور رافع تو عنایہ کا تھا ہی دیوانہ....

"کہتا ہے۔ اس موبائل پہ میسج نہیں کرے گا اور یہ کہ میں موبائل توڑ دوں۔" عنایہ نے قدرے افسردگی سے بتایا تھا۔ بیہ اسے گھور کر دیکھنے لگی تھی۔

"تو یہ ہنسنے والی بات ہے؟" اسے عنایہ کی دماغی حالت پہ کچھ شبہ سا گزرا تھا۔ وہ قدرے فکر مند ہو گئی تھی۔

"نہیں۔" عنایہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر؟"

"ہنسنے والی بات تو یہ ہے، جب میں نے کہا.... تم مجھے میسج کس فون پہ کرو گے؟ میرے پاس تو موبائل ہی نہیں.... تو کہتا ہے اوشٹ' کاش میں اتنا غریب نہ ہوتا۔" عنایہ نے رافع کا میسج کھولا اور بیہ کو دکھانے لگی تھی۔ بیہ نے اس کے سر پر چپت رسید کی۔

"تم رافع کی غربت کا مذاق اڑا رہی تھیں؟" بیہ نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کیا۔ عنایہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہرگز نہیں بیہ! میں ایسا کر سکتی ہوں کیا؟" وہ ایک دم روہانسی ہوئی تو بیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے آئی تھی۔ پھر اسے اسٹول پہ بٹھایا اور خود کچن کی سلیب پہ اچک کر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے بیہ نے عنایہ سے موبائل کو چھپا دینے کے لیے کہا تھا۔

"یہ سیل دیا کی نگاہوں سے بچا کر رکھنا اور اسے پتا بھی نہ لگے کہ یہ کس نے دیا ہے؟ جانتی ہو' نا۔ بات کا بتنگڑ بنا دے گی۔"

بیہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ اس نے کبھی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ وہ جس طرح دیا کی بچپن سے لڑکپن تک چپ چاپ مار سہہ لیا کرتی تھی۔ اسی طرح کبھی کسی بات پہ انکار یا مزاحمت بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کے اندر "نفی" والی حس ہی نہیں تھی۔

"اچھا اب تم ناشتا کرو۔ میں دیا کو بلاتی ہوں۔ ناشتا ٹھنڈا ہوا تو خواہ مخواہ چلائے گی۔" بیہ بولتے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی تو عنایہ نے چپکے سے موبائل نکال کر فاتح کو ایک ٹیکسٹ کر دیا تھا۔

دراصل وہ رافع سے نہیں فاتح سے بات کررہی تھی۔

اس نے بیہ سے غلط بیانی کی تھی۔ کیوں کہ رافع تو تھا ہی اس سے ناراض جب سے فاتح نے اسے موبائل دیا تھا رافع کا موڈ آف تھا۔ عنایہ نے بیہ کو نہیں بتایا تھا۔ کیوں کہ بیہ نے پھر ناراض ہونا تھا اور ڈانٹنا بھی تھا کہ اگر رافع کو پسند نہیں تھا تو اس نے فاتح سے موبائل کیوں لیا؟ وہ بیہ کو کیسے بتاتی؟ رافع سے بات کیے بغیر اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا اور اس نے ایک اور بات بھی بیہ سے چھپائی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ اس نے خود فاتح سے موبائل کی فرمائش کی تھی۔ جب وہ دادی کے گھر اس سے ملی۔ عنایہ نے فاتح سے از خود کہا تھا۔

"آپ مجھے اس سالگرہ پہ موبائل گفٹ کرسکتے ہیں؟" عنایہ نے پہلی مرتبہ کوئی فرمائش کی تھی۔ آج سے پہلے عنایہ نے کبھی فاتح سے اتنی بے تکلفی سے بات بھی نہیں کی تھی۔ حالانکہ رافع کی طرح فاتح بھی اس سے بڑا پیار کرتا تھا۔ وہ اس کے ماموں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ سب کو بہت عزیز تھی۔ اپنی پیاری صورت اور اچھی عادتوں کی وجہ سے۔

فاتح نے اس کی فرمائش اور جھجکا سا انداز ملاحظہ کیا اور سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ ابھی ابھی آفس سے آیا تھا اور کچھ تھکاوٹ محسوس کررہا تھا۔ کچھ دیر آرام کے بعد اسے فلائٹ پہ جانا تھا۔ عنایہ کی فرمائش نے اسے چونکا دیا تھا اور عنایہ اس کی سنجیدگی پہ قدرے پریشان ہوگئی تھی۔ اس کو لگا' فاتح نے برا محسوس کیا ہے۔

"سالگرہ کب ہے عنایہ؟" وہ ملائمت سے پوچھ رہا تھا۔ عنایہ کے دھڑکتے دل کو ڈھارس سی ملی۔

"دس ماہ بعد۔" اس نے سر جھکا کر گھبرائی آواز میں بتایا تھا۔ اسے "فرمائش" کرنے کے بعد ڈر لگا تھا۔ کہیں فاتح خفا نہ ہو اور دادی کو نہ بتادے۔

"سالگرہ میں تو دس مہینے پڑے ہیں عنایہ! تمہارا موبائل آج ہی پہنچ جائے گا۔" فاتح کے اگلے الفاظ نے عنایہ کو خوشی سے دیوانہ کردیا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا اور اس نے بے یقینی سے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے منہ پر رکھ لیے تھے۔

"کیا واقعی؟" اس کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ پھسلے تھے۔ فاتح پہلی مرتبہ بہت دل سے مسکرایا۔

"کوئی بھی موبائل تمہاری اس خوشی سے زیادہ قیمتی نہیں۔" وہ اپنی ٹائی کھینچتا پلٹ گیا تھا۔ اپنے جھکے برآمدے میں کھلنے والے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر چلا گیا تھا۔ عنایہ کو بت بنا چھوڑ کر۔ بے یقینی کے سمندر میں ڈوبا چھوڑ کر۔

اور پھر فاتح نے اپنا کہا پورا کردیا تھا۔ وہ اس کے لیے بڑا ہی اسمارٹ فون لایا تھا اور نیا نمبر بھی۔ جو عنایہ نے سب سے پہلے رافع کو دیا تھا اور تب رافع نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اب عنایہ سے کسی بھی وقت بات کرنے میں پرابلم نہیں تھی' مگر جب اسے پتا چلا یہ فون فاتح نے لے کر دیا ہے تو وہ فوراً" برہم ہوگیا تھا۔ اس نے ایک منٹ کی دیر لگائے بغیر عنایہ کو حکم دیا۔

"اس سیل کو توڑ دو۔ مجھے تمہارے پاس یہ سیل نہیں دیکھنا۔"

اور عنایہ اس حکم نامے پہ افسردہ ہوگئی تھی اور اس کی آنکھوں میں نمی بھر گئی تھی۔ تاہم وہ رافع کو بتا نہیں سکی تھی کہ اس نے فاتح سے یہ موبائل اس لیے اپنی انا کو پس پشت ڈال کر لیا تھا تاکہ وہ رافع سے بات کرسکے۔ اور اگر رافع اس شدت کی طلب کو اس کے لہجے سے پالیتا تو کبھی سیل فون توڑنے کی بات نہ کرتا۔

☆ ☆ ☆

یہ ان دنوں کی بات تھی جب دیا اپنا بہت سا وقت بیسمنٹ میں گزارنا شروع کرچکی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک کمرہ الگ تھلگ کرلیا تھا۔ وہ اسی میں قیام

کرتی، عبادت کرتی اور طرح طرح کے وظائف پڑھتی تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ گوشہ نشین ہو چکی ہے یا اس کے دلچسپی اپنی سلطنت اور رعایا میں کم ہوتی چلی گئی ہے۔

اس کی عقابی نگاہیں بیہ اور عنایہ کے پیچھے رہتی تھیں۔ بیہ اب پڑھائی سے فارغ تھی جب کہ عنایہ نے نیا نیا کالج جانا شروع کیا تھا۔ دیا کی حتی المقدور یہی کوشش ہوتی تھی وہ عنایہ پہ کڑی نگاہ رکھے۔ وہ اس کے کالج جانے کے وقت بیسمنٹ سے نکل آتی تھی۔ صبح صبح لاؤنج میں رکھی ڈائننگ چیئر گھسیٹ کر بیٹھ جاتی۔ اس کی عنایہ پہ سخت نگاہیں ٹکی رہتی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ عنایہ کالج جاتے ہوئے تیار تو نہیں ہوتی۔ منہ پہ پاؤڈر، بیس یا کوئی غازہ تو نہیں ملتی؟ آنکھوں میں کاجل تو نہیں لگاتی؟

اور جب اسے اطمینان ہو جاتا تھا کہ عنایہ بنا کسی لوازمات کے دھلے منہ کے ساتھ سادہ مانگ نکال کر کالج جاتی ہے تو اس نے تنقید کا ایک دوسرا رخ تلاش کر لیا تھا۔

اب اسے یہ وہم ہونے لگا تھا کہ یہ کالج کے بہانے کہیں رافع سے تو نہیں ملتی۔ گزرتے وقت کے ساتھ

دیا کو رافع اب اتنا پسند نہیں رہا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ عنایہ اب رافع سے دور ہی رہے۔ رافع کی نسبت فاتح بہتر تھا۔ لائق فائق اور مالی اعتبار سے مضبوط۔ دیا کی پسند کے معیار اور پیمانے اس کی ذہنیت کے مطابق تھے۔ کم تر اور سطحی۔

اب جو اس نے نیا وہم پال لیا تھا کہ عنایہ اپنی دادی سے چھپ چھپا کر تو نہیں ملتی؟ اس وہم کی بدولت دیا کے پیروں میں پہیے لگ گئے تھے۔ وہ دوپہر دو بجے تک گیٹ کے آس پاس چکراتی تھی۔ مضطرب سی ٹہل ٹہل کر اپنی ٹانگیں شل کرتی رہتی اور بیہ اسے گلاس وال سے دیکھتی اپنا سر تھام لیتی تھی۔

"اس عورت کو کبھی بھی ذہنی سکون نہیں مل سکتا۔ جو اتنے لوگوں کا سکون برباد کرے، وہ خود کیسے سکون سے رہ سکتا ہے؟" بیہ کو اکثر کاشف بھائی یاد آجاتے تھے اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔ وہ خوب رو سا، اتنا شاندار انسان۔۔۔ جو اس کی بہن کا نصیب تھا، مگر اس نے اپنی بدنصیبی کی وجہ سے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔

پھر کاشف بھائی کا دیا پہ چیخنا چلانا اور بعد میں انتہائی غصے کی حالت میں گھر سے نکل جانا اور اس کے بعد ان کی واپسی ایسی حالت میں ہوئی تھی کہ جس نے بھی سنا، دنگ رہ گیا۔ اتنا صحت مند انسان منٹوں میں چل بسا۔ ڈاکٹر کہتے تھے ان کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی تھی۔

اور ان کی وفات پہ آخری مرتبہ بیہ نے افراہیم اور روبا کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد بیہ کی ان سے کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ انہوں نے دیا کے ساتھ سب تعلقات توڑ لیے تھے۔

دیا کے ساس سسر بھی اس گھر میں نہیں آتے تھے۔ ایک عرصہ تک ان کے تعلقات خراب رہے۔ پھر ایک مرتبہ عنایہ کی سالگرہ پہ دیا کو بلاوجہ ہی طوفانی غصہ آگیا تھا اور اس نے عنایہ کے پوچھنے پر کہ "دادا دادی کو نہیں بلایا؟" آپے سے باہر ہوتے ہوئے وہی چھری عنایہ کی ہتھیلی پہ بہت زور سے ماری تھی۔ چھری کی دھار تیز تھی۔ بہت گہرا کٹ لگا تھا اور خون اتنا بہا کہ انتہا نہیں اور عنایہ ایسے لب سی کر بیٹھی تھی جیسے کسی نے سوئی دھاگے کے ساتھ ٹانکے لگا کر سلائی کر دیے ہوں اور اس کی نیلی آنکھوں میں بے پناہ کرب ٹھاٹھیں مارتا تھا، مگر وہ ایسی صابر تھی کہ ایک بھی آنسو گرائے بغیر بے حس بنی بیٹھی رہی۔ اس کا بہتا لہو بیہ کے حواس اڑا رہا تھا اور وہ اونچی آواز میں روتی ہوئی بینڈیج ڈھونڈنے بھاگ رہی تھی جب کہ عنایہ ایسے ہی صوفے پہ منجمد اور بے حس بیٹھی بھل بھل گرتے لہو کا شغل دیکھتی رہی۔ حتی کہ اس کا چہرہ سفید سے زرد پڑ گیا۔ جیسے گالوں میں سرسوں کھنڈ گئی ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

تب پہلی مرتبہ بیہ نے فون ڈائری نکال کر عنایہ کے

دادا کو کال کی تھی اور تب فون وہاں فاتح نے اٹھایا تھا۔
اس کی گمبھیر، سنجیدہ اور دلکش مردانہ آواز کو سن کر بیہ کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئی تھیں۔ اس نے بڑے لمبے عرصے بعد فاتح کی آواز سنی تھی۔ اپنے اور اس کے رشتے کا احساس کرتے ہوئے ایک فطری سی جھجک نے بیہ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ تاہم یہ وقت کسی خوب صورت احساس میں کھونے کا نہیں تھا۔ بیہ نے فاتح کو عنایہ کے بے ہوش ہونے کا بتایا تو اس نے اگلی ایک بھی بات سنے بغیر صرف اتنا کہہ کر فون کھٹاک سے بند کر دیا تھا۔
"میں پانچ منٹ میں آیا۔" اور وہ واقعی ہی پانچ منٹ کے اندر اندر ان کے گیٹ سے اندر آچکا تھا۔ تب عنایہ کو فوراً" اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ابتدائی طبی امداد ملنے کی وجہ سے عنایہ کی حالت خطرے سے باہر تھی تاہم اس کی بے ہوشی بہت دیر بعد ٹوٹی تھی۔ بیہ کو تب پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا۔ فاتح، عنایہ کے لیے بہت پریشان تھا۔ وہ بار بار اپنی نانی اور نانا کو تسلی دیتا۔ "وہ ٹھیک ہے اب۔"
لیکن وہ خود عنایہ کے ہوش میں آنے تک بڑا ہی مضطرب رہا تھا اور جانے کیوں فاتح کا عنایہ کے لیے وہ مضطرب انداز بیہ کے اندر جم کر رہ گیا تھا۔
اور اب وہ گلاس وال سے دیا کو باہر چکراتے دیکھ کر نجانے سوچوں کے کون کون سے بھنور میں جا پھنسی تھی۔ چونکی تو تب تھی جب عنایہ کی وین گیٹ پہ آرکی اور دیا نے اس کے وین سے اترتے ہی تفتیش کرنا شروع کر دی تھی۔
"آج دیر سے کیوں آئی ہو؟" دیا کا کڑکتا لہجہ اور عنایہ کی منمناتی آواز۔
"وین کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔" عنایہ نے سر جھکا کر بتایا تھا۔ بیہ نے بے ساختہ گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ معمول سے آدھا گھنٹہ لیٹ تھی۔
"جھوٹ تو نہیں بول رہیں؟" وہی مشکوک انداز، کھوجتا ہوا، اندر تک اترتا ہوا۔
"نہیں ماما۔" عنایہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"دیکھ لو اگر مجھے پتا چلا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو تو ہڈیاں توڑ ڈالوں گی۔" اس نے پھنکارتے لہجے میں اسے دھمکایا تھا۔
"میں کیوں جھوٹ بولوں گی؟" عنایہ کا وہی دھیما پر تحمل، صابر لہجہ۔ نہ وہ جھنجلائی اور نہ غصہ کیا۔ آرام سے تفتیش بھگتتی رہی۔ ہاں، اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا جاتا تو وہاں ان گنت کرب کی لکیریں صاف دکھائی دے جاتیں۔
"کالج سے سیدھے گھر آیا کرو۔ ادھر ادھر اترنے کی ضرورت نہیں۔" دیا نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھور کر جتایا تھا۔ ادھر ادھر سے مراد اس کی دادی کا گھر تھا۔ عنایہ نے سر ہلا دیا۔
"اور رافع سے ملنے کی بھی ضرورت نہیں۔" دیا کی وارننگ پہ عنایہ نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا تھا۔ تب تک دیا بکتی جھکتی اندر جا چکی تھی اور عنایہ مرے مرے قدم اٹھاتی ڈرائیو وے پر چلتی سر جھکائے اندر آگئی۔ عنایہ کی گلو خلاصی پر بیہ نے سکھ بھرا سانس باہر دھکیلا اور جلدی سے اس کا کتابوں والا بیگ پکڑ لیا۔ جو ایک بوجھ کی طرح اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ پھر وہ اس کے جوتے اتارنے لگی تھی۔ کیونکہ عنایہ بے دم ہو کر جوتوں سمیت صوفے پر گر گئی تھی اور اس نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ بیہ کو اس لمحے میں یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ شاید رو رہی ہے۔
لیکن ایسا نہیں تھا۔ عنایہ نے منہ پر بازو رکھ کر صرف اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کی تھی۔ بیہ گہرا سانس بھرتی اس کے جوتے اور جرابیں اٹھا کر اندر لے گئی۔ پھر اس کا زبردستی ہاتھ منہ دھلایا تھا۔ اور کپڑے بھی تبدیل کروانے کے لیے سو جتن کیے تھے۔ وہ سارے تاثرات محفوظ کیے، چپ چاپ بیہ کی ہدایات پر عمل کرتی رہی۔
پھر جب بیہ اس کے لیے ٹرے میں کھانا سجا کر لائی تو عنایہ گھٹنوں پہ سر ٹکائے گم صم بیٹھی تھی۔ بیہ کو

اندازہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے؟ اس نے گہرا سانس بھرا اور عنایہ کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"تمہیں رافع سے ملنے' بات کرنے اور پیار کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا' یہ تمہارا حق ہے عنایہ! اور اپنا حق فضول کے واہموں میں پڑ کر نہیں چھوڑتے۔"

بیہ کے ڈھارس دیتے لہجے نے عنایہ کو رلا دیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ دوبارہ بولی تھی تو اس نے بیہ کو کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"میں ماما کی بات نہیں ٹال سکتی۔ میں ان کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔" اس کے لہجے میں دنیا جہاں کی بے بسی تھی۔

٭ ٭ ٭

سرما کی بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بیچ میں ہی عزہ کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا تھا۔ عزہ کی شادی بہت اچانک ہی طے پا گئی تھی۔ یہ خبر دیا کے کانوں تک بھی پہنچی تھی اور وہ لحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔

عزہ' بیہ سے کچھ ہی چھوٹی تھی۔ اور عزہ کی شادی طے پا گئی تھی جبکہ بیہ کی شادی کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ اور نہ ہی دیا ابھی اس جھنجھٹ کو سوچنے کے موڈ میں تھی۔ عزہ کی نانی تو فارغ عورت تھی۔ سو شادی کا کھڑاک کھڑا کر لیا تھا۔ جبکہ دیا کے تو سو دھندے تھے۔ یوں بیہ کی شادی کا معاملہ ٹھپ ہی رہا۔

اصولی طور پر دیا کو بیہ کے لیے بھی بات کرنی چاہیے تھی تاکہ اس بہت پرانے رشتے پر پڑی گرد کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا جاتا مگر دیا کی ازلی خودی' نخوت اور بے نیازی۔

"ان کو پرواہ نہیں تو میری بھی جوتی کو پرواہ نہیں۔" اور ادھر وہ بیہ کو جان بوجھ کر عزہ کی شادی کے حوالے سے زک پہنچاتے ہوئے نہ چوکتی تھی۔

"بڑی شور بخت ہو تم۔ نصیب ٹھنڈے کے ٹھنڈے رہے۔ اور اس عزہ کو دیکھو ڈاکٹر کو لے اڑی۔" وہ اپنی عادت کی بنا پر کچوکے دینے سے باز نہیں آتی تھی۔ تب بیہ کے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگتا۔ اور اس کا دل چاہتا تھا اپنے لفظوں کا طمانچہ کبھی تو اس کے منہ پر دے مارے۔

"ہاں' اس کی نانی ہے سوچنے والی' اور بہت سے لوگ موجود ہیں عزہ کے لیے سوچنے والے۔ اس کا احساس کرنے والے۔ اور ہمارے لیے سوچنے والی تم ہو۔ سو ہمارے بخت ٹھنڈے ہی رہیں گے۔" اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر اکڑ جاتے تھے۔ لیکن زبان کچھ بولنے سے انتہائی قاصر تھی۔

ان دنوں عنایہ کے پاس تنہائی میں وقت گزارنے کے لیے بڑی اچھی مصروفیت ہاتھ آچکی تھی۔ وہ اب زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ بیہ سے گفتگو بھی کم ہی کرتی۔ موبائل پہ مصروف ہوتی۔ اور بیہ نے کبھی اس سے پوچھا نہیں تھا۔ وہ میسجز پہ کس سے بات کرتی ہے۔ جیسے اسے پورا یقین تھا کہ دوسری طرف رافع ہوگا۔

اس دن بھی بیہ نماز ادا کرنے کے لیے کمرے میں آئی تو عنایہ ہونٹوں پہ دبی دبی مسکان لیے موبائل پر مصروف تھی۔ دراصل کچھ دیر پہلے وہ سہیلی سے ڈاؤن لوڈ کروایا ہوا گیم کھیل رہی تھی۔ جب اسکرین پر میسج کا سائن چمکنے لگا۔ عنایہ نے بے قراری کے عالم میں جلدی سے میسج کو کھولا۔ اسے جیسے یقین تھا' رافع ناراضی بھلا کر خود ہی میسج کرے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ میسج تو آیا مگر رافع کا نہیں فاتح کا۔

"پیاری لڑکی! موبائل اس لیے دیا تھا تاکہ تم اپنی خیریت کی اطلاع دے سکو۔ اور ہمیں تمہارے جینے مرنے کی کچھ خبر ہی نہیں۔" اس نے میسج کو سوبار پڑھا۔ عنایہ کو فاتح کا خیال رکھنے والا انداز بہت ہی بھایا تھا۔ ہاں' فاتح میں رافع والی "میں" اور "انا" نہیں تھی۔ اس نے کبھی بھی رافع کی طرح یہ نہیں سوچا تھا۔ "پہل میں کیوں کروں؟"

عنایہ کو فاتح کی یہ عادت بہت ہی پسند تھی۔ بلکہ ساری ہی بہت پیاری عادتیں تھیں اس کی۔

"اور اگر میں کہوں' عنایہ مرگئی ہے تو؟" عنایہ نے جوابی میسج لکھ کر بھیجا۔ اور اس کا جواب ترنت آیا۔
"تو میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو عنایہ کے جنازے پر پہنچے گا۔" فاتح نے مسکراتے سمبل کے ساتھ جواب دیا تھا۔ عنایہ کو بے طرح ہنسی آئی تھی۔ جسے روکنے کے لیے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔
"یعنی آپ کو میرے مرنے کا دکھ نہیں ہوگا؟"
"ہوگا۔ پر اتنا نہیں۔"
"کیوں؟ زیادہ دکھ کیوں نہ ہوگا؟ آپ کے دل میں میری اتنی سی بھی اہمیت اور محبت نہیں؟" اس نے معصومیت سے ٹھوڑی تلے ہتھیلی کی مٹھی ٹکائی اور میسج بھیج کر کے جواب کا انتظار کرنے لگی تھی۔
"محبت؟" یک لفظی جواب آیا تھا۔ وہ اہمیت کو حذف کر کے محض "محبت" پہ اٹک گیا تھا۔ اور پھر شاید اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تھا۔ وہ عنایہ کو پوری سچائی کے ساتھ جواب دینا چاہتا تھا۔ اور جواب کچھ دیر میں ہی آچکا تھا۔
"ہاں' محبت تو بہت ہے۔"
"تو پھر دکھ کتنا ہوگا؟" عنایہ کو بڑا ہی مزہ آیا۔
"آف کورس' بہت ہوگا۔ لیکن گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں نہیں نکلوں گا۔ گو کہ تم مجھے بہت پیاری ہو۔ اور میرے ماموں کی اکلوتی بیٹی ہو۔" اب کے کچھ طویل جواب تھا۔ عنایہ نے دو تین مرتبہ پڑھا۔ "ایسی اہمیت؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اسے کب کسی نے اتنی اہمیت دی تھی۔ رافع بھی صرف اہمیت لینا چاہتا تھا۔ دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ جبکہ فاتح تو اہمیت بھی دیتا تھا' وقت بھی اور توجہ بھی۔ گو کہ وہ بہت مصروف رہتا تھا۔ اس کے باوجود عنایہ کے لیے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحات ضرور نکال لیتا تھا۔ اور عنایہ اتنی سی توجہ پہ پھولے نہ سماتی تھی۔
"مجھے بھی آپ سے بڑا پیار ہے اور آپ سب سے اچھے ہیں۔ اور نخرا بھی نہیں کرتے۔ میسج نہ بھی کروں تو فون کر لیتے ہیں۔" عنایہ اس کو اس کی وہ خوبیاں گنوا رہی تھی جس سے وہ خود بھی آگاہ تھا۔ اور وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔
"اور اگر میں نخرا کرنے لگوں۔ اور فون بھی نہ کروں' تو میں تمہیں پیارا نہیں لگوں گا؟ اور اچھا بھی نہیں رہوں گا؟" فاتح نے ٹیکسٹ لکھا تھا جس کا جواب بڑا نپا تلا آیا۔
"جی نہیں.... وہ تو آپ لگیں گے ہی...."
وہ تھوڑا سا مسکرائی تھی اور پھر اسکرین پہ مصروف ہوگئی۔ بیہ تب تک نماز ادا کر چکی تھی۔ وہ جائے نماز سمیٹ کر اٹھی تو عنایہ پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گئی تھی۔ وہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ دنیا کی حسین ترین مسکراہٹ کو لبوں پہ سجائے سیل فون پہ مصروف تھی۔ بیہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی۔ پھر اس نے عنایہ کو مخاطب کیا تھا۔
"کون لطیفے سنا رہا ہے عنایہ!" اس کا انداز لاپرواہ سا تھا۔ عنایہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر آنکھیں میچ کر بولی تھی۔ اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔
"فاتح۔" بیہ لمحہ بھر کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ جیسے اسے سننے میں مغالطہ ہوا ہو۔ وہ بے یقینی سے عنایہ کی طرف دیکھنے لگی۔ "یہ رافع سے فاتح تک کا سفر کیسے طے ہوگیا تھا؟"
اس کا دماغ بند ہونے لگا تھا۔ اور سوچیں منتشر ہو چکی تھیں۔ اس کا دل عجیب سی گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔ بیہ نے بے ساختہ اپنے گلے میں لٹکتی چین پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ یہ چین عزہ کو بڑی پسند تھی۔ اور کئی مرتبہ وہ اسے ہتھیانے کی کوشش کر چکی تھی' لیکن بیہ کو اس چین سے پیاری دنیا کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ ہی تو فاتح سے جڑے اس رشتے کی کاملیت کا جیتا جاگتا احساس تھا۔ بیہ اس احساس کو کیسے کھودیتی؟
اور اب عنایہ کو فاتح سے گفتگو میں مگن دیکھ کر بیہ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ فاتح' عنایہ سے بات کرتا تھا؟ کیوں؟ کس لیے؟ اور یہ رافع کہاں چلا گیا؟ ایسی بھی کیا ناراضی اور غصہ؟ عنایہ کو اکیلا کرنے

کا بھلا کیا مقصد تھا؟ وہ تو تنہائی کی ماری تھی۔ اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی اور اب فاتح' یہ سیل فون کا تحفہ؟ اور فاتح کی عنایہ میں بڑھتی دلچسپی؟ اور بیہ کو لگا تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑے گی۔ یہ تکلیف دہ انکشاف اسے ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔

پھر اگلے چار دن بعد جب بیہ اور عنایہ اپنے اپنے بستر پہ لیٹ چکی تھیں اور ہمیشہ سے زیادہ خود کو ایک دوسرے سے دور محسوس کر رہی تھیں اور دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں مگن تھیں جب اچانک ہی اس خاموشی کے' تکلیف دہ احساس کو عنایہ کے موبائل کی وائبریشن نے توڑ ڈالا تھا۔

عنایہ نے بے تابی سے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے فاتح کی آتی آواز نے عنایہ کو ایک اچھوتی خوشی کے احساس سے مالا مال کر دیا تھا۔

"ابھی زندہ ہو عنایہ! یا گزر چکیں؟" فاتح نے اس کی آواز سن کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا تھا اور عنایہ فوراً" اس کے لہجے میں چھپے طنز کو پا گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"گزر چکی ہوتی تو آپ سے بات کون کر رہا ہوتا؟"

"تمہاری روح بھی تو ہو سکتی ہے۔" فاتح نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ عنایہ نے دانتوں تلے زبان دبالی تھی۔ وہ اس کے طنز کو سمجھ رہی تھی اور کچھ شرمندہ بھی ہو رہی تھی۔

"مجھے آپ کو میسج بھی کرنا تھا۔ کال بھی کرنا تھی اور اپنی خیریت کی اطلاع بھی دینی تھی۔" اس نے ایک ہی سانس میں بغیر رکے آنکھیں بند کر کے کہا تھا اور بیہ گردن موڑ کر اس کا چہرہ بس دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ کس سے مخاطب تھی؟ کیا فاتح؟

"تو پھر کی کیوں نہیں؟" فاتح نے مصنوعی خفگی سے پوچھا تھا۔

"میں نے سوچا' آپ بزی نہ ہوں۔" اس نے معصومیت سے عذر پیش کیا تھا جو فاتح نے کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لیا تھا۔

"تمہارے لیے تو بزی نہیں۔" فاتح کی نرم آواز فون سے باہر آرہی تھی۔ بیہ جیسے منجمد ہوگئی۔

"اچھا تو پھر کیسے یاد کیا؟" اس نے بیہ کی طرف دیکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"میں نے نہیں' تمہاری دادی نے یاد فرمایا ہے اور عزّہ نے بھی۔" فاتح کے بتانے پر وہ چونکی تھی۔ فاتح کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔

"اور عزہ کہہ رہی تھی' بیہ کو بھی لے کر آنا۔"

عنایہ کو ہلکی سی کھانسی آئی تھی۔ اس نے شرارتی انداز میں بیہ کو دیکھا جس نے آنکھوں پہ بازو رکھ کر کروٹ بدلی تھی۔

"عزہ کہہ رہی تھی' آپ نہیں کہہ سکتے؟" اس کی شرارت محسوس کرتے ہوئے فاتح نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"جیسے وہ میرے کہنے سے تو آجائے گی۔"

"آپ کہہ کر تو دیکھئے۔" عنایہ نے اسے اکسایا تھا۔

"مجھے بات کہہ کر گنوانی نہیں۔ کیا میں جانتا نہیں' وہ دیا مامی سے پوچھے بغیر سانس بھی نہیں لیتی۔" فاتح کے طنزیہ انداز پہ عنایہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے گہرا سانس کھینچ کر کہا تھا۔

"اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"نیک خیال ہے۔" وہ مسکرایا۔

"ماما نہیں آنے دیں گی۔" اس نے جتا کر کہا تھا۔ انداز میں صاف بے چارگی تھی۔

"یہ تمہارا ہیڈک نہیں۔" وہ مطمئن تھا اور عنایہ پریشان۔ وہ جائے گی کیسے؟ ماما نے تو بالکل بھی نہیں جانے دیں گی۔

فاتح نے فون بند کر دیا تو عنایہ پھر بھی پریشان رہی۔ بیہ اپنے بیڈ پہ سو رہی تھی یا شاید سونے کا ڈراما کر رہی تھی۔ عنایہ نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور پھر کشن اٹھا کر بیہ کی طرف پھینکا' لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ عنایہ کو مجبوراً" اٹھ کر اس کے قریب جانا ہی پڑا تھا۔ پھر اس نے قریب بیٹھ کر بیہ کا کندھا ہلایا۔

"سنتی ہو بیہ! ابھی فاتح کی کال آئی تھی۔"

عنایہ کے بار بار ہلانے پہ بیہ نے قدرے برہمی سے اس کا ہاتھ پرے جھٹکا۔ عنایہ نے اپنے دھیان میں محسوس نہیں کیا تھا اور دوبارہ اس کا شانہ ہلانا چاہا۔

"تو میں کیا کروں؟" بیہ کا انداز شدید برہم تھا۔ عنایہ کو یہی لگا' وہ غنودگی میں تھی اور اس کے ڈسٹرب کرنے پہ برہم ہو رہی تھی۔

"فاتح نے کہا ہے کہ ہمیں دادی اور عزہ نے بلایا ہے۔ ہم کیسے جائیں گے بیہ!" وہ بڑی متفکر تھی۔ بیہ نے کروٹ بدلی اور جھڑک کر کہا تھا۔

"یہ تمہارا دردِسر ہے۔ مجھے کیا پتا ویسے بھی دیا جانے نہیں دے گی۔"

"تم دیا سے اجازت لے لینا' نا۔ پھر اکٹھے چلیں گے۔ عزہ نے اپنی شاپنگ دکھانی ہوگی۔" عنایہ بہت پرجوش تھی۔ ویسے بھی دونوں کہاں باہر نکلتی تھیں' بیہ تو بالکل نہیں جاتی تھی۔ اسی بہانے کچھ آؤٹنگ ہو جاتی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے۔ تمہاری ماں سے جوتے کھانے کی۔ اسے تو بہانا چاہیے' مجھ پہ الزام لگانے کا۔ کہیں گی' فاتح کے لیے بھاگی جا رہی ہوں۔" بیہ نے نہایت غصے میں کلس کر جواب دیا تھا۔ عنایہ لب کاٹنے لگی۔ یعنی دادی کے گھر جانے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔ اگر بیہ اجازت نہیں لے گی تو پھر پروگرام کینسل ہی تھا کیوں کہ دیا سے دادی کے گھر جانے کی اجازت لینے کا عنایہ میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ جانے بیہ کو کیا ہوا تھا؟ ان دنوں کٹ کھنی بلی بنی ہوئی تھی۔ پھر وہ زیادہ دیر تک بیہ کے رویے پہ غور نہیں کر سکی تھی۔ اسے جلد ہی نیند آگئی تھی۔

اور اگلے دن کا سورج عنایہ کے لیے نیک شگون نہیں لایا تھا۔ جانے کس کا صبح صبح منہ دیکھ لیا تھا۔ وین والے نے بھی چھٹی کر لی تھی ورنہ اسی بہانے چار گھنٹے گھر سے دور گزار آتی۔ اس گھر میں چند گھنٹے بھی گزارنا یہاں کے مکینوں کے لیے وبال تھا۔ وہ تو ایک مجبوری کے تحت یہاں رہتی تھیں۔ جانے کب نصیب کا پھیر ایسا آتا اور انہیں اس سونے کے پنجرے سے رہائی مل جاتی۔

وہ سو کر اٹھی تو بیہ کو ڈھونڈتی سیدھی کچن میں آئی تھی' لیکن بیہ یہاں نہیں تھی۔ وہ بیہ کی تلاش میں لان تک آئی تو بیہ اسے جھولے میں بیٹھی دکھائی دے گئی تھی۔

عنایہ دھپ دھپ کرتی اس کے پاس آگئی۔

"ناشتا نہیں بنایا بیہ!" وہ گھاس پہ پھسکڑا مار کر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔ بیہ جو اپنی سوچوں میں گم تھی ایک دم چونک گئی۔ پھر اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔

"آج ناشتا تم بناؤ گی۔"

"میں.....؟" عنایہ تو اچھل پڑی تھی۔ "میں کیسے؟"

وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس نے کیا کبھی کچن میں کام کیا تھا۔ پہلے نوکر تھے۔ پھر پاپا کے بعد دیا نے نوکروں کو نکال دیا تھا اور بعد میں گھر کی ساری ذمہ داری بیہ کے سر آگئی۔ عنایہ کو تو چائے بنانی بھی نہیں آتی تھی۔

"ہاں' تم بناؤ گی۔" بیہ نے بے نیازی سے کہا تھا۔ عنایہ کے حلق میں گولا آن پھنسا۔

"پر مجھے نہیں آتا کچھ بنانا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"سیکھو گی تو آئے گا' نا.... میں ہمیشہ تو تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔" بیہ اس کی بے چارگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آرام سے کہہ رہی تھی۔

"اکٹھے تو رہیں گے۔ ایک گھر میں' نا۔" عنایہ نے لاڈ سے کہا تھا۔ بیہ چونک گئی تھی۔ وہ کس تناظر میں کہہ رہی تھی۔ بیہ حیران سی ہوئی۔

"پتا نہیں' نصیب میں کیا لکھا ہے؟" وہ گہرا سانس کھینچتی اٹھ گئی تھی۔ عنایہ بھی کپڑے جھاڑتی کھڑی ہو گئی تھی پھر بیہ کے پیچھے ہی اندر آگئی تھی۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ کچھ غیر معمولی سا' کچھ انہونا۔ وہ

تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ اسے یوں لگا تھا' جیسے اس کے کمرے میں کوئی گیا ہے۔ کوئی تھا وہاں۔ وہ تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گئی تو وہاں دیا کو دیکھ کر دماغ چکرا گیا تھا۔

دیا اس کے کمرے کی تلاشی لے رہی تھی۔ ایک ایک چیز کھول کر دیکھ رہی تھی۔ دراز' الماریاں' کتابوں کا ریک۔۔۔۔ عنایہ کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ دیا کو کس چیز کی تلاش ہے اور پھر دیا کو بیڈ کا گدا اٹھانے کے بعد مطلوبہ چیز مل گئی تھی اور دوسرے ہی پل دیا نے موبائل اٹھا کر کارپٹ پہ دے مارا تھا اور عنایہ کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔

"کس نے دیا ہے؟" وہ لپک کر عنایہ تک آئی تھی اور پھر اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پہ دے مارا تھا۔ "میری ناک تلے یہ کھیل کھیلا جارہا ہے؟ حیا نہیں آئی تمہیں۔" دیا نے اس کے منہ پر یکے بعد دیگرے کئی تھپڑ مارے تھے۔

"بے شرم' بے حیا! مجھے بدنام کرائے گی؟ کس سے لیا؟ اس نکھٹو رافع سے؟ کیا ڈاکا ڈال کر اتنا مہنگا موبائل لایا ہے؟ اس کے پاس کہاں سے اتنے پیسے آئے؟ اور اس کی نانی کو پتا چلا تو منہ بھر بھر کے مجھے کوسنے دے گی۔"

دیا مغلظات کا ایک طوفان یکتی اپنے آپے میں نہیں لگ رہی تھی اور عنایہ کی یہ حالت تھی کہ بہت خاموشی کے ساتھ دیا سے پٹتی جارہی تھی۔ دیا خود ہی اسے پیٹ پیٹ کر ہانپ گئی تھی اور پھر تھک کر صوفے پہ گری' لیکن اس کا غصہ کسی بھی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

عنایہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔ اندر ہی اندر' بے بسی کا رونا اور گھٹی گھٹی چیخیں۔ بیہ کا دل پھٹنے لگا تھا۔ عنایہ کے لیے دل میں اترتی ہلکی ہلکی برہمی خود بخود ختم ہوگئی تھی تاہم وہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

"کس نے لے کر دیا ہے؟ بتاتی کیوں نہیں؟ پھوٹتی کیوں نہیں منہ سے۔" دیا صوفے پر بیٹھی بھی غرا رہی تھی اور کشن' اخبار' گل دان جو بھی چیز ہاتھ آرہی تھی اٹھا اٹھا کر اسے مار رہی تھی۔

"فاتح نے۔۔۔۔" عنایہ نے منہ کھول ہی دیا تھا اور دیا ایسے چپ ہوئی تھی جیسے کسی نے بجلی کا بٹن دبا کر چپ کروا دیا ہو۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بے یقینی صاف پڑھی جاتی تھی۔

"بکواس کرتی ہو۔" وہ زہر خند ہوئی تھی۔ پھر اس نے سیل اٹھا کر جانچا۔ دیکھا۔ اسکرین تھوڑی خراب ہوئی تھی تاہم سیل ٹھیک تھا۔ کارپٹ پہ گرنے کی وجہ سے کچھ بچت ہوگئی تھی۔

"وہ تمہیں کیوں لے کر دے گا؟ آنکھیں تو تم نے اس نکھٹو سے لڑا رکھی ہیں۔" وہ نہایت عامیانہ انداز میں غصے سے کہہ رہی تھی۔ جیسے اسے عنایہ پہ یقین نہ آیا ہو۔ پھر اس نے سیل کا ان باکس کھول کر چیک کیا تھا اور لحہ بھر کے لیے میسجز پڑھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔ فاتح اور عنایہ کی چیٹ نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

عنایہ کی فاتح کے لیے تعریف اور محبت بھرے الفاظ۔ جواباً "فاتح کا محبت کا اقرار۔۔۔ اگر یہ سلسلہ یہاں چل رہا تھا تو پھر رافع کہاں گیا تھا؟ تو گویا رافع خود بخود نکل گیا تھا اور عنایہ کو بھی شاید عقل آگئی تھی۔ رافع کا بھوت اس کے سر سے اتر گیا تھا۔

دیا نے گہرا اطمینان اپنے اندر اترتا محسوس کیا تھا۔ اس جذباتی' بے روزگار' نکھٹو رافع سے تو فاتح بہت بہتر تھا۔ بلکہ بہت ہی بہتر تھا اور اگر ایسی بات تھی تو بہت اچھا تھا۔ دیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی بے وقوف بیٹی نے کوئی تو ڈھنگ کا فیصلہ کیا۔ دیا کے سر سے تلوار لٹکتی ٹلی تھی۔ اس لمحے وہ قطعاً "بھول چکی تھی کہ فاتح تو بچپن سے ہی بیہ کے ساتھ منسوب ہے۔

☆ ☆ ☆

آج پھر غیر متوقع بارش ہوئی تھی۔ اچانک ہی بادل گھر گھر آئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ہوگیا اور

پھر وین بھی دیر سے آئی تھی اور سوئے اتفاق واپسی پہ خراب بھی ہوگئی تھی۔ لڑکیوں نے وین میں ہی چلانا شروع کردیا تھا۔ ڈرائیور مکینک لینے گیا تو آدھی لڑکیاں اتر کر رکشہ میں بیٹھیں اور یہ جا وہ جا۔

عنایہ بے چاری ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے روٹ کی لڑکیوں نے بتایا بھی نہیں اور خود ہی رکشہ پکڑ نکل گئیں۔ عنایہ کا منہ رونے والا بن گیا تھا' لیکن پھر علاقے پہ غور کیا تو یہ جانی پہچانی کالونی لگی۔ یہاں سے اتر کر چار پانچ میل دور اس کا اپنا گھر تھا اور اس سے پہلے دادی کا گھر آجاتا تھا۔

عنایہ نے باقی لڑکیوں کو بھی جاتا دیکھ کر پہلی مرتبہ اکیلے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ تو کبھی گلی میں بھی نہیں نکلی تھی۔ اب سنسان کالونی میں چلتے ہوئے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا' مگر اس نے دل کڑا کر ہی لیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دادی کا گھر آگیا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے سے سر جھکا کر گزر جانا بڑا ہی مشکل تھا۔ اس گھر میں ناراض ناراض سا رافع بھی تھا۔ ابھی تک خفا' اس کی پہل کا منتظر۔ وہ ایسا ہی تھا۔ ضدی' جذباتی اور موڈی۔ جب ایک بات کہہ دی تو بس کہہ دی تھی۔

اور اس کا دل رافع کے نام پہ مچلنے لگا تھا۔ مڑ مڑ کر نگاہیں دادی کے گھر کی طرف اٹھتی تھیں اور وہ بے چین نگاہوں سے دادی کا جھگے بر آمدوں والا گھر دیکھ رہی تھی۔ شاید کسی دریچے یا منڈیر سے رافع جھانکتا دکھائی دے جائے' لیکن اس کی آنکھوں میں مایوسی اتر آئی تھی۔

اور شاید وہ اپنی دھن میں بہت آگے تک نکل جاتی' لیکن اچانک ہی کسی نے پیچھے سے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ عنایہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا پھر جیسے ہی اس نے گردن موڑی تو حیران رہ گئی۔ پیچھے سے آنے والا اب سامنے کھڑا تھا۔

"آپ...؟ میری جان ہی نکال دی۔" عنایہ نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا اور مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ جواباً" وہ اپنی شہد بھری آنکھوں سے اسے گھورنے لگا تھا۔ وہ ابھی ابھی نیند سے اٹھ کر آیا تھا اور آنکھیں بے پناہ گلابی ہو رہی تھیں۔

"یہ چوروں کی طرح گھر کے قریب سے گزرنے کا کیا مطلب ہے؟" وہ بڑے خفا لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"اگر نانی نہ دیکھتیں تو تم ایسے ہی دبے قدموں بھاگ نکلتیں۔ انہوں نے تمہیں اوپر سے دیکھا اور میرے سر پہ ڈھول بجا دیا۔ قسم سے اتنی نیند آرہی تھی۔" اب وہ اپنی خفگی کی وجہ بتا رہا تھا۔ عنایہ گہرا سانس بھرتی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اب یہاں سے بچ کر کہاں جاتی؟

"چلو آؤ۔" اس نے عنایہ کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوگیا تھا۔ جہاں پہ بے قرار سی دادی نے اسے ساتھ لپٹا کر بھینچ لیا تھا۔

"دیکھا' آپ کی پوتی فرار ہو رہی تھی۔ یہ محبت ہے اسے۔ پاس سے گزر کر جا رہی تھی۔" فاتح نے اسے شرمندہ دیکھ کر کچھ اور شرمندہ کردیا تھا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

"اچھا' اب تنگ نہ کرو۔ آتو گئی ہے نا۔" دادی کو اس پہ پیار آرہا تھا۔ پوتی کو غیر متوقع دیکھ کر وہ بے ساختہ خوش ہوگئی تھیں۔ فاتح نے گھور کر عنایہ کو دیکھا اور دادی کی طرف مڑ کر بولا تھا۔

"آئی نہیں' لائی گئی ہے۔" وہ جتا کر رہ گیا تھا۔ دادی نے خفگی سے اسے گھورا۔ فاتح مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"اب آپ جی بھر کے اپنی پوتی سے باتیں کریں' میں تو سونے چلا۔"

فاتح کے جاتے ہی دادی نے اسے بتایا۔ وہ جو گم صم سی کھڑی تھی۔ دادی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ماورا خان

کمالِ ضبط

کچھ عجیب سا اطمینان اور سکون جھلکتا تھا اس کے چہرے سے 'شاید وہ لوگ جو زندگی کے دکھ اور پریشانیوں کے پیمانے کامل چھت تک پی لیتے ہیں وہ یوں ہی مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں' پھر بچتا جو نہیں ہے کچھ، خالی ہو جاتا ہے پیمانہ سارا 'شاید یہی کچھ عظمیٰ شاہ کے ساتھ ہوا تھا اور وہ یوں مطمئن اور خوش زندگی گزار رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو کبھی 'اس کی یہی آسودگی اور پرسکون طبیعت 'فریحہ کو چڑا دیتی تھی' فریحہ جو عظمیٰ کی بچپن کی دوست تھی 'اس کے گھر کے ہر قسم کے حالات سے واقف تھی' بچپن اور لڑکپن دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا' ایک دوسرے سے بے تکلفی سے ہر بات کرلیتی تھیں۔ فریحہ اکثر اس سے پوچھتی۔

"عظمیٰ! کیا کبھی کوئی بات تمہیں بری نہیں لگتی۔ سسرال کی یا شوہر کی۔ مجھے تو یہ بات بڑی ناممکن سی لگتی ہے۔ میری ہی مثال لے لو گھر کی پریشانیوں سے جان چھوٹی تو شوہر نامدار نے جینے نہ دیا' سسرال والوں کی خاطر مدارت کر کے تھک گئی لیکن ان کا منہ ہی سیدھا نہ ہوا' اب تم ہی بتاؤ' تم سے ہی ہر بات شیئر کرتی ہوں نا' تم بھی تو مجھ سے اپنے دل کی کہہ لیا کرو۔ جیسے بچپن میں کرتی تھیں اور پھر کالج کے زمانے میں۔" فریحہ بولے جارہی تھی اور عظمیٰ مسکراتے چہرے کے ساتھ اس کی سنے جارہی تھی۔

"وہ تھا نا ہمارا کلاس فیلو کیا نام تھا اس کا.... ہاں..... زایان' زایان علی' کتنا اسمارٹ بندہ تھا جو ہمیشہ تمہاری ایک نظر کرم کا منتظر رہتا تھا' لیکن مجال ہے جو کبھی ایک نظر بھی اس پر ڈالی ہو' ویسے برا مت ماننا' ہو تم شروع ہی سے بے حس۔" فریحہ ہنسی۔

"ہاں..... " عظمیٰ سوچنے کے انداز میں بولی۔ "کہہ سکتی ہو' لیکن بے حس نہیں سمجھ دار' بعض دفعہ بہت زیادہ شعور بھی انسان کو بے حس بنا دیتا ہے لوگوں کی نظروں میں۔ آج تم نے یہ بات نکالی ہی ہے تو بتاؤں تمہیں کہ..... میں زایان علی کی ہر ہر حرکت سے واقف تھی اور اس پسندیدگی سے بھی جو وہ میرے لیے رکھتا تھا۔ جانتی ہو میں نے کیوں کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔" وہ رکی۔

"اس لیے کہ ہمیشہ سے ہی میرے دل پر میرے دماغ کی حکمرانی رہی ہے' مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں ساری زندگی اپنی راہ سے کانٹے چنتے ہی گزار دوں۔ میں بابا کے خاندان کو بھی جانتی تھی اور بابا کو بھی' میرے سینے میں بھی دل تھا' میری بھی کوئی پسند ناپسند تھی لیکن میں انجان بن گئی اپنے آپ سے بھی اور زایان سے بھی' اسی میں میری بہتری تھی۔"

"اچھا چھوڑو ان پرانی باتوں کو لیکن اب تو مجھے کچھ بتاؤ۔" عظمیٰ ہنس پڑی۔

"ارے بھئی۔ اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے تو کیا بتاؤں۔"

"رہنے دو عظمیٰ' مجھ سے زیادہ تمہیں کون جانتا ہے۔ جب اس دن میں لینے آئی تھی تمہیں تمہارے گھر' جب ہماری فیملیز نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا تو کس طرح تمہارے شوہر نے ٹانگ اڑائی تھی اور تمہیں جانے سے روک دیا تھا اور تم نے کچھ بھی ظاہر کیے بنا ہمارے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔" تمہاری آنکھوں کی وہ نمی مجھے آج بھی یاد ہے لیکن بڑی مہارت سے تم نے وہ نمی پی کر ہنس کر کہا تھا۔

"پھر کبھی چلی چلوں گی یار! ابھی عفان کو ضروری کام سے دوسرے شہر جانا ہے' پھر بچے اور گھر بھی تو دیکھنا ہے نا..."

مجھے بھی یہ گر سکھا دو نا کہ سب کچھ سر پہ سے گزرتا رہے اور میں خاموش اور سکون سے رہوں۔"

"بڑی ناشکری ہو تم فریحہ! اللہ نے تمہیں ہر نعمت سے نوازا ہے' پھر بھی تم شکوے کیے جاتی ہو۔" عظمیٰ نے سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "اور... سنو... یہ کوئی جادو نہیں کہ تمہیں ایک دن میں سکھا دوں گی' یہ تو برسوں کی مشق ہے جو زندگی اپنے ہر دور میں کرواتی ہے' اب یہ سیکھنے والے پر ہے کہ وہ اس سے کیا سیکھتا ہے۔" فریحہ نے عظمیٰ کو زیادہ سنجیدہ ہوتے دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"اچھا... بس بس رہنے دو اپنی یہ فلسفیانہ گفتگو' پھر کبھی آؤں گی تمہارا دماغ کھانے اور اپنا کھلانے۔" یہ کہہ کر فریحہ ہنستی ہوئی چلی گئی اور عظمیٰ شاہ اپنے اس سفر کے بارے میں سوچنے لگی جو اس نے بچپن سے جوانی اور پھر عظمیٰ شاہ سے عظمیٰ عفان بننے تک کا طے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عظمیٰ کے بابا فیروز شاہ کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا اور ماں ایک متوسط گھرانے کی پروردہ تھی' کالج کے زمانے سے ہی صفیہ' فیروز شاہ کی شخصیت سے ایسی متاثر ہوئی کہ دوستی کا انجام شادی ہوا' کالج کے بعد بھی صفیہ اور فیروز شاہ کا رابطہ رہا' لیکن یہ رابطہ رکھنے میں صفیہ کا ہاتھ زیادہ تھا' کیوں کہ رواج کے مطابق فیروز شاہ کی اپنے چچا کی بیٹی سے شادی ہو گئی تھی جو ان کے بچپن کی مانگ تھی' لیکن صفیہ نے پھر بھی رابطہ رکھا' دکھ تو بہت ہوا ان کی شادی کا' لیکن کیا کرتی' دل کے ہاتھوں مجبور تھی' بھائی نے بہت سمجھایا تھا۔

"فیروز شاہ ایک شادی شدہ اور بال بچوں والا شخص ہے اور تم ان کے گھر میں کبھی فٹ نہیں ہو گی' ہمیشہ مس فٹ رہو گی' سنبھل جاؤ' یہ عشق و محبت تھوڑے دن کا بخار ہے' اتر جائے گا' لیکن صفیہ... اس کو ایسی باتیں اور ایسی باتیں کرنے والا ہر فرد برا لگنے لگتا تھا اور پھر ہوا وہی جو صفیہ نے چاہا یا پھر تقدیر میں یہی لکھا تھا' بابا جان بھی کیا کرتے' شادی کی عمر جو نکلی جا رہی تھی اور پھر فیروز شاہ نے بھی تو عہد باندھا تھا بابا جان سے کہ صفیہ کو بیوی بنا کر گھر لے جاؤں گا۔ عزت دوں گا' سادگی سے نکاح ہوا' نہ ڈھول بجا نہ رخصتی اور صفیہ فیروز شاہ کی زوجیت میں آ گئی۔

فیروز شاہ نے کچھ دن بعد لے جانے کا وعدہ کیا تھا صفیہ کے بھائیوں سے' لیکن یہ کچھ دن سالوں میں بدل گئے اور پھر چھ سال بعد وہ بھی صفیہ کے بے حد

اصرار پر فیروز شاہ اسے اپنے آبائی گھر لے گئے۔ پہلی بیوی کے انداز سے تو ایسا لگا کہ جیسے اسے فیروز شاہ سے یہی توقع تھی' ہاں ماں اور بہنوں نے پہلے صفیہ کے ماں باپ کو برا بھلا کہا' پھر فیروز شاہ سے شکوہ کیا کہ انہوں نے بتایا کیوں نہیں چھ سال تک۔

"بتا دیتا تو کیا تم لوگ خوش ہوتے سن کر' نہیں نا... اب آج پتا لگ گیا' میرے معاملے میں کوئی نہ بولے۔" بڑا رعب تھا فیروز شاہ کا ان کے گھر والوں پر' لیکن فیروز شاہ کی غیر موجودگی میں' جو درگت صفیہ کی بنتی تھی وہ وہی جانتی تھی' کبھی فیروز شاہ سے شکایت کرتی تو وہ غصے سے بولتے۔

"مجھے شکوہ شکایت سننے کی عادت نہیں' میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے کہ تم عورتوں کے جھگڑے ہی نمٹاتا رہوں اور بچوں کو بھی سمجھا دو' یہاں رہنا ہے تو یہاں کے طور طریقوں سے رہیں' ماموں کے گھر کی عادتیں چھوڑ دیں۔"

اور صفیہ' فیروز شاہ کے اس روپ کو دیکھے جاتی' اب کر بھی کیا سکتی تھی اور عظمیٰ جس کا دل بہت چاہتا تھا کہ بابا کی گود میں بیٹھے' بابا اسے پیار کریں' لیکن بابا کو تو فرصت ہی نہ تھی۔ عظمیٰ سے چھوٹی ایک بہن تھی' یہی بہت تھا کہ بابا نے بچوں کو اسکول میں داخل کروا دیا تھا' ان کی پہلی بیوی کے بچے بھی پڑھ رہے تھے۔

صفیہ اور ان کی دونوں بیٹیوں کی حیثیت گھر میں دوسرے درجے کی تھی۔ عموماً" دیکھا گیا ہے کہ دوسری بیوی بڑی لاڈلی اور نخرے والی ہوتی ہے' مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا' وجہ یہی تھی کہ فیروز شاہ نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف چھپ کر دوسری شادی کی تھی' صفیہ کے گھر والے بھی اس شادی پر رضامند نہ تھے' لیکن صفیہ کی ضد کے آگے ہار گئے تھے' فیروز شاہ نے صفیہ کو بیوی تو بنا لیا تھا' مگر وہ حیثیت نہ دے سکے جو ان کی پہلی خاندانی بیوی کی تھی۔ تین بچے پہلی بیوی کے اور دو بہنیں یہ' تو اب فیروز شاہ کی پانچ اولادیں ایک ہی گھر میں رہ رہی تھیں۔ صفیہ کے ساتھ ان کی سوکن کا جو سلوک تھا' عظمیٰ بچپن ہی سے دیکھ رہی تھی۔ ہر چیز پر پہلا حق سوکن اور اس کے بچوں کا تھا تو دوسرے نمبر پر صفیہ اور ان کی بیٹیوں کی باری آتی تھی۔

اگر انہوں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی ہوتی تو شاید سب بہن بھائیوں میں آپس میں محبت ہوتی' لیکن ان کا ساتھ تو جب ہوا جب عظمیٰ پانچ سال کی تھی' جب ان کا میکے میں رہنا مشکل ہو گیا تو شوہر سے اپنا حق مانگا' انہوں نے لے جا کر اپنے آبائی گھر میں ڈال دیا کہ یہاں رہو۔ صفیہ بھی کیا کرتیں' بھائی کے گھر میں صفیہ کون سا خوش تھی' وہاں بھائی اور بھابھیوں کا راج تھا۔ اسی لیے تو فیروز شاہ سے کہا تھا کہ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی' مجھے الگ گھر چاہیے۔

فیروز شاہ نے سوچا کہ بھلا اپنے گھر کی موجودگی میں دوسرے گھر کی کیا ضرورت ہے' ان کے گھر میں ان کی ماں' بہنوں اور بیوی کی راج دھانی تھی۔ صفیہ بچوں سمیت لوگ سہمے سہمے سے اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے۔ باہر نکلتے تو چبھتی ہوئی نگاہیں اور طنزیہ جملے سننے کو ملتے۔ جب کبھی فیروز شاہ کی نگاہ التفات صفیہ کی طرف ہوتی تو وہ دھیرے سے شکوہ کناں ہو جاتیں۔

"میرا دم گھٹتا ہے یہاں کیا میں الگ گھر میں نہیں رہ سکتی۔" اور فیروز شاہ دو ٹوک الفاظ میں یہ کہہ کر چلے جاتے کہ۔

"یہاں ہی رہنا ہے تو رہو ورنہ تم اپنے باپ کے گھر جا کر رہو' میں اس سے زیادہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔۔۔" اور صفیہ کے خواب اور محبتوں کے بت دھڑام دھڑام نیچے آگرتے۔ صفیہ اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی کچن کی طرف چلی جاتی اور عظمیٰ کا معصوم ذہن کچھ سمجھتا اور کچھ نہ سمجھ پاتا۔ گھر میں نوکروں کی پوری فوج تھی' لیکن صفیہ کے سپرد بہت سے کام کر دیے گئے تھے۔ فیروز شاہ کی دولت' عیش و عشرت سب پہلی بیوی اور ان کے بچوں لیے تھے یا بہنوں کا حق تھا۔ اپنا کمرہ یا پھر کچن صفیہ کی پناہ گاہ تھے۔ پورے گھر میں تو پہلی بیوی اور ان کے بچے دندناتے پھرتے تھے اگر صفیہ بچیوں کے ساتھ کبھی آکر سب کے ساتھ بیٹھ جاتے تو پہلی بیوی کی نگاہیں اس طرح ان پر بار بار

انھتیں کہ وہاں سے جانے ہی میں عافیت لگتی۔ فیروز شاہ بچوں کی اس دلی کیفیت سے بے خبر تھے اور انہیں یہاں لاکر گویا بہت بڑا فرض ادا کردیا تھا انہوں نے۔

عظمیٰ پانچ سال کی معصوم بچی گھر میں جس چیز پر ہاتھ لگاتی کہیں سے آواز آتی۔ "نہوں ہوں.... نہیں۔" اور وہ فوراً" ہاتھ کھینچ لیتی۔

انہیں تو صفیہ کی کسی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ اکثر کہتے۔

"تمہارا وہم ہے گھر کو گھر سمجھ کر رہو۔" صفیہ چپ ہوجاتی کیوں کہ دوسری صورت میں فیروز شاہ کی طرف سے کھلی چھٹی تھی کہ اگر تمہیں یہاں تکلیف ہے تو تم اپنے گھر جاکر رہ سکتی ہو۔ میں وہیں آجایا کروں گا اور وہاں جو حیثیت صفیہ کی ہوگئی تھی اس کا اندازہ بھی صفیہ کو بخوبی تھا۔ بقول شاعر۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اپنے میکے کی طرف سے اسے کوئی سپورٹ نہیں تھی کیوں کہ گھر والوں سے لڑکر صفیہ نے یہ شادی کی تھی اور بھائیوں نے صفیہ کا یہ مستقبل اسے پہلے ہی بتا دیا تھا لیکن صفیہ کی آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی تھی لہٰذا شکایت زبان پر لانے کا مطلب اپنی ہار کا اعلان کرنا تھا لہٰذا انا کی ماری اپنی عزت رکھ رہی تھی۔

وقت کا کام گزرنا ہوتا ہے لہٰذا گزر ہی گیا ان ہی حالات میں پل کر ہم بڑے ہوگئے۔ بابا کے گھر سے دو گھر چھوڑ کر فریحہ کا گھر تھا۔ ہم اسکول میں بھی ساتھ ساتھ تھے اور اب ہم دونوں کا ایک ہی کالج میں ایڈمیشن ہوا تو دوستی پکی ہوگئی۔

میں نے اپنی امی کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ اکثر بابا جان سے الجھ پڑتیں یا پھر ہم بہنوں کی شامت آئی رہتی۔ بابا امی کی ہر ضرورت پوری کردیا کرتے تھے پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ مطمئن نہیں تھیں اپنی زندگی سے۔ میں اب بڑی ہوچکی تھی اکثر ان سے سوال کرتی کہ آپ کو تو بابا جان کے بارے میں سب کچھ پتا تھا کہ ان کے بیوی بچے ہیں پھر جان بوجھ کر آپ نے اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا امی؟"

"تمہارے بابا نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں اپنی پہلی بیوی کے ساتھ رکھوں گا تمہیں۔" اور میں سوچتے ہوئے کہتی۔

"اور نہ ہی یہ کہا ہوگا کہ الگ گھر دوں گا۔"

"ہاں۔" امی خجل سی ہوکر کہتیں۔

"پھر؟ پھر ان کا مقصد یہی ہوگا کہ آپ ماموں جان کے گھر ہی رہیں گی ہمیشہ۔"

"ہوں!" امی آہستگی سے کہتیں۔

"تو پھر رہتیں ناوہاں۔ کیوں آئیں یہاں اپنی اور اپنے بچوں کی بے عزتی کروانے۔"

"یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو مجھ سے۔" اور پھر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور میں ان کے گلے لگ کر انہیں خوب پیار کرتی۔

بابا ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر شاید پریشان ہوتے ہوں۔ ایک بار ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ فوراً" اسپتال لے جایا گیا۔ دو دن اسپتال میں داخل رہے پھر گھر آگئے۔ امی نے بابا کی تیمارداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی.... اور.... بڑی امی وہ تو صرف آرڈر دیتی تھیں کہ یہ پکالو وہ پرہیزی کھانا بنانا ہے۔ بچوں کے لیے یہ بنانا ہے اور امی حکم کے غلام کی طرح ان کی ہر بات سر جھکا کر مانتی رہتی تھیں۔

بچپن ہی سے میرا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ استانی تھیں جو بچپن میں ہمیں قرآن پڑھانے آیا کرتی تھیں۔ وہی مجھے سمجھاتی تھیں۔

"بیٹا نماز پڑھا کرو ہمیشہ نماز کبھی نہ چھوڑنا" میں تو تمہاری امی سے بھی یہی کہتی ہوں کہ دل کا سکون چاہتی ہو تو نماز کی پابندی اختیار کرلو لیکن ان کا دل جھکتا ہی نہیں ہے اس طرف۔" استانی جی مجھ سے باتیں کررہی ہوتیں تو امی بھی آکر اکثر بیٹھ جاتی تھیں۔

"رہنے دیں استانی جی! کیا نماز پڑھنے سے زندگی کی تلخ حقیقتیں چھپ جائیں گی۔ نماز پڑھتے وقت بھی دھیان اپنے مسائل میں ہی لگا رہتا ہے۔" پھر استانی

سمجھانے والے انداز میں کہتیں کہ۔
"نماز سمجھ کے پڑھا کرو، ترجمہ ذہن میں رکھو کہ تم کیا پڑھ رہی ہو جو باتیں تمہارے نزدیک بڑی بڑی اور مسائل بنی ہوئی ہیں نا وہ باتیں پس پردہ چلی جائیں گی اور بہت چھوٹی نظر آئیں گی پھر جب تم سجدے میں اللہ کا تصور باندھ لوگی تو تمہیں نماز میں لطف آنے لگے گا۔" لیکن امی کا دھیان استانی کی باتوں سے ہٹ کر پتا نہیں کہاں چلا جاتا تھا جو وہ اپنی پریشانیوں پر قابو نہ پاسکیں۔ ہاں، میں ان کی ہر ہر بات گویا گرہ میں باندھ لیتی تھی۔

جب عید یا کسی تہوار پر پھوپھیاں گھر آتیں تو امی رات رات بھر جاگتی رہتیں اور صبح سویرے اٹھ جاتی تھیں کہ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔
میں اکثر کہتی تھی۔
"امی آپ بھی آرام کرلیا کریں۔" وہ بڑے دکھ سے کہتیں۔
"نہیں بیٹا۔ اتنا کچھ سن چکی ہوں کہ اب اپنے لیے کوئی برائی برداشت نہیں ہوتی۔" حالانکہ اب ایسا بھی نہیں تھا شاید امی اپنے سسرال کو لے کر کافی حساس ہوگئی تھیں یا شاید شروع میں امی کے ساتھ پھوپھو اور دادی کا جو سلوک تھا اور بڑی امی جس طرح امی کے ساتھ کرتی تھیں، وہ باتیں وہ بھلا نہیں پائی تھیں۔
بابا نے انٹر کے بعد میری پڑھائی ختم کرادی حالانکہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا، لیکن میں خاموش تھی۔

اگست کا مہینہ تھا اس دن خوب زوروں کی بارش ہورہی تھی۔ طوفان تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بابا زمینوں سے واپس آرہے تھے کہ انہیں راستے میں ہی شدید دل کا دورہ پڑا اور وہیں سے اسپتال جاتے جاتے دم توڑ گئے۔ گھر میں ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔
بابا تھے تو پھر بھی ہمارے کچھ حقوق تھے اس گھر میں، لیکن بابا کے بعد تو ایسا لگتا تھا کہ ہم بالکل ہی پرائے ہوگئے ہیں۔ پھوپھی اور دادی کی وہ محبتیں بھی ہم سے روٹھ گئی تھیں جو ہمیں بابا کی وجہ سے بھیک میں مل گئی

تھیں اور اسی پر بس نہیں تھا بلکہ بابا کی موت کی قیامت ابھی کم نہیں ہوئی تھی کہ صفیہ پر ایک اور ستم توڑ دیا گیا۔
"تم واپس اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ۔ بچے ہمارے ہیں تمہارا ان پر کوئی حق نہیں۔" صفیہ نے رو کر صدائے احتجاج بلند کی۔
"نہیں نہیں اس گھر پر بچوں کے ساتھ ساتھ میرا بھی حق ہے۔ ماں ہوں میں ان کی، مجھ سے یہ حق تو نہ چھینو انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔"
"تو پھر۔ ساتھ لے جاؤ۔" یہ چچا کی آواز تھی۔
عظمیٰ فوراً بولی۔ "یہ ناانصافی ہے چچا جان!"
چچا بولے۔ "ہمیں معلوم ہے کیا انصاف ہے اور کیا ناانصافی سبق مت پڑھاؤ ہمیں۔ اگر اپنی ماں سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر چلی جاؤ تمہارا جو حق ہے تمہیں دیں گے۔"
"ہونہہ۔ گھر میں رکھ کر کون سے حقوق ادا کیے ہیں جو بے گھر کرکے ادا ہوں گے۔" عظمیٰ نے دکھ سے سوچا۔ اور پھر وہی ہوا جو انہوں نے چاہا۔ یہ سب کچھ بڑی امی کی ایما پر ہورہا تھا۔ ظاہر ہے اس سب میں درپردہ ان ہی کا ہاتھ تھا، ان کی ہر بات گھر میں مانی جاتی تھی کیوں کہ وہ صفیہ کی طرح خالی ہاتھ نہیں تھیں بلکہ انہیں باپ کی طرف سے وراثت میں کئی ایکڑ زمین ملی تھی، جب ہی گھر میں ان کا دبدبہ تھا۔
صفیہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ چند کپڑے لے کر اپنے بھائیوں کے در پر آگئیں۔ بھائیوں نے تو اپنے احساسات چھپالیے، لیکن بھابیوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔
"ہم تو پہلے ہی کہتے تھے یہ ہوگا۔" چھوٹی بھابھی بولیں۔
"ایک گھر تو اپنے نام کروالیتیں اتنے عرصے میں تاکہ سر چھپانے کو کچھ تو ہوتا۔" بڑی بھابھی نے لقمہ دیا۔ صفیہ نے حیرت سے بھابھی کو دیکھ کر کہا۔
"ابا جان کا گھر بیچ کر یہ گھر خریدا تھا تو کیا میرا کوئی حق نہیں ہے اس گھر پر۔

"لو اور سنو' تمہاری شادی پر دے دیا تمہیں جو تمہارا حق تھا اب تمہارے بھائیوں کے پاس اس گھر کے علاوہ کچھ تھوڑی ہے۔" بڑی بھابھی تو صاف صاف لڑائی پر اتر آئی تھیں۔

"ایسا ہوتا تو نہیں۔" صفیہ نے دبے لفظوں میں دھیرے سے کہا۔ صفیہ کا یوں ہمیشہ کے لیے چلے آنا انہیں بڑا کھل رہا تھا وہ بھی سترہ سال بعد.....

✡ ✡ ✡

صفیہ برسوں کی مریض لگنے لگی تھیں۔ چھوٹی بہن کی پڑھائی بھی ڈسٹرب ہو گئی۔ ماموں میری شادی کی فکر میں تھے' کچھ بھی تھا صفیہ آخر تھیں تو ان کی بہن' دل تو ان کا بھی دکھتا تھا بہن کے دکھوں پر' لیکن کیا کر سکتے تھے خود کردہ را علاج نیست والا معاملہ تھا صفیہ کا' جانتے تھے کہ صفیہ پہلے ہی پشیمان ہے۔

صفیہ کی وہی مصروفیات یہاں بھی ہو گئیں جو بابا کے گھر میں تھیں۔ کچن سنبھالنا اور بھابھیوں کا کہنا ماننا۔ کبھی جب وہ کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتیں تو بڑی نڈھال نڈھال سی نظر آتیں۔ عظمیٰ' ماں کو اس حال میں دیکھتی تو دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ حتی الامکان کوشش کرتی کہ گھر کے کاموں میں ان کا ساتھ دے' لیکن وہ تو جیسے اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھیں۔

ایک دن ماموں آفس سے آئے تو کچھ پریشان پریشان لگ رہے تھے' میں سمجھی کہ گھر کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں شاید اس لیے پریشان رہتے ہیں..... میں نے ڈرتے ڈرتے ماموں سے کہا۔

"ماموں جان! میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"ہیں.....؟ ہوں....." ماموں کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔

"تمہاری امی کہاں ہیں' بیٹا' ذرا بلاؤ تو....."

"امی!" میں نے آواز دی۔ "ماموں جان بلا رہے ہیں۔"

"جی بھائی صاحب۔" صفیہ اندر۔۔۔ آتے ہوئے بولیں۔

"بیٹھو!" ماموں بغور انہی کو دیکھتے ہوئے بولے۔ صفیہ پریشان ہو کر بولیں۔

"خیر تو ہے بھائی صاحب! کیا بات ہے آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" ماموں چند لمحے خاموش رہ کر بولے۔

"تمہارے دیور کا فون آیا تھا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں میں کہیں عظمیٰ کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اس کا انداز اطلاع دینے کا تھا۔"

"ہیں.....؟" صفیہ حیرت سے بولیں۔

"مجھے اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا نہیں' اب یہ کون سا حق جتا رہے ہیں اپنا۔ میں تو کبھی ان کے خاندان میں اپنی بیٹی کی شادی نہ کروں۔"

"اس نے تمہیں صرف اطلاع بھجوائی ہے مشورہ نہیں مانگا تم سے۔ تمہارے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے صفیہ بیگم۔ تم نہ چاہو گی پھر بھی ہو جائے گی یہ شادی..... تمہارا واسطہ جن لوگوں سے ہے نا' تم انہیں اب تک نہ سمجھ پائیں۔ یہ لوگ اپنی بیٹیوں پر اسی طرح حق جماتے ہیں' جو کچھ عظمیٰ کے باپ کی طرف سے عظمیٰ کا حق ہے تو کیا وہ یوں ہی جانے دیں گے۔ عظمیٰ کو کسی اور خاندان میں' اپنی جائیداد تمہارے یا کسی اور کے حوالے کبھی نہیں ہونے دیں گے اور بڑا اثر و رسوخ ہے ان کا..... آ رہے ہیں وہ لوگ کل' عظمیٰ کو لینے' تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے انہیں....." ماموں سر جھکا کر بیٹھے تھے۔

"تمہاری ایک غلطی نے ہمارے پورے خاندان کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج سے نہیں بائیس سال پہلے سے....." ماموں دکھ سے بولے گئے اور عظمیٰ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ بابا کے خاندان والوں نے کبھی صفیہ کو عزت نہیں دی۔ ہمیشہ باہر سے آئی ہوئی سمجھا' کبھی اپنا نہیں مانا پھر..... یہ رشتہ؟

"کیا میری حیثیت بھی امی کی طرح ہو گی ان کے خاندان میں..... کیا میں بھی ساری زندگی رو رو کر گزاروں گی۔" عظمیٰ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ صفیہ سے کیا کہتی' وہ تو گم صم بیٹھی تھیں' کچھ

سمجھ میں نہیں آیا تو فریحہ کو فون کردیا۔ ساری روداد فریحہ کو سنا کر بولی۔
"ہائے فریحہ! اب کیا ہوگا؟"
"وہی ہوگا جو تمہارے بابا کے گھر والے چاہیں گے۔"
"مجھے بتاؤ میں کیا کروں اب۔"
"صدائے احتجاج بلند کرو۔"
"پھر؟"
"پھر تمہاری صدا دبادی جائے گی۔"
"پلیز فریحہ! مذاق نہیں کرو میری جان پر بنی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔"
"نہیں یار' میں مذاق نہیں کررہی بلکہ تمہارے احساسات سمجھ رہی ہوں وہ تمہارے چچا ہیں تمہارے لیے برا تو نہیں چاہیں گے نا۔"
"تم نہیں جانتی انہیں۔ وہ نہ میرے بارے میں اچھا سوچیں گے نہ برا' انہیں تو بس مجھے ٹھکانے لگانا ہے۔" عظمیٰ کے لہجے میں مایوسی صاف جھلک رہی تھی۔ فریحہ سے بات کرکے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا۔
عظمیٰ جب کمرے میں داخل ہوئی تو صفیہ کو مصلے پر سجدہ ریز دیکھا۔ جب ان کا سر سجدے سے اٹھا تو چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ دعا مانگ کر فارغ ہوئیں تو عظمیٰ بولی۔
"ممّا! آپ کیوں پریشان ہورہی ہیں۔"
"پریشانی کی تو بات ہے یہ۔"
"آج آپ نے اپنے سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیے' اب اللہ پر بھروسا رکھیں اور اچھے کی امید رکھیں۔" اور واقعی نماز کے بعد صفیہ بڑی مطمئن اور پرسکون ہوگئی تھیں۔ عظمیٰ نے پیار سے ماں کی پیشانی چوم لی جواب میں صفیہ نے بھی اسے پیار سے لپٹالیا۔ عظمیٰ کو بہت دکھ ہوتا تھا جب اس کی امی روتی تھیں' ان کے آنسو گویا اس کے دل پر گرتے تھے۔
"آج سے آپ روئیں گی بالکل نہیں۔" عظمیٰ کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمانے بھر کی خوشیاں لاکر ماں کے قدموں میں رکھ دے۔ چھوٹی بہن ثمرہ کی سوچیں بھی عظمیٰ جیسی ہوتی جارہی تھیں۔ ایک دن اس نے بڑے دکھ سے عظمیٰ سے کہا۔
"آپی! یہاں ماموں کے گھر اجنبیت لگتی ہے نا' وہ جیسا بھی تھا' تھا تو ہمارے بابا کا گھر نا....."
"ہوں۔" عظمیٰ سوچتے ہوئے بولی۔ "تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو' ماموں کہہ رہے تھے' کل تمہارا ایڈمیشن ہوجائے گا اسکول میں' دل لگ جائے گا تمہارا۔" عظمیٰ نے پیار سے بہن کو سمجھایا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن چچا اس کے ماموں کے گھر آئے اور صفیہ' عظمیٰ اور ثمرہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ عظمیٰ اور اس کی امی کو یہی پریشانی کھائے جارہی تھی کہ نہ جانے کہاں رشتہ طے کردیا ہے۔ یہ معمہ اس وقت حل ہوا جب اگلے دن فیروز شاہ کی رشتے کی بہن اپنے گھر والوں کے ساتھ آئیں اور عظمیٰ کے سر پر دوپٹہ ڈالا بظاہر تو بڑے خلوص سے ملی تھیں' صفیہ بھی ان سے واقف نہیں تھی کیوں کہ یہ فیروز شاہ کے دور کے رشتے دار تھے جب ان کے بارے میں صفیہ نے بڑی پھپھو سے معلومات لینی چاہیں تو پھپھو نے بڑی رکھائی سے کہا۔
"شکر کرو کہ تمہاری بیٹی خاندان میں ہی کھپ گئی۔ زمیندار ہیں' پہلی بیوی عمر میں عفان سے بڑی ہے دس سال' اولاد نہیں ہوئی' دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"
یہ سن کر صفیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تو گویا میری بیٹی بھی سوکن کا دکھ جھیلے گی۔ اف میرے خدا.... میری خطا کی سزا میری بیٹی کو نہ دے۔ عظمیٰ جو پیچھے ہی کھڑی تھی اس نے صفیہ کو سہارا دیا اور ایک طرف لے گئی۔
"امی! آپ پریشان نہ ہوں۔ بیمار ہیں آپ' آپ کو کچھ ہوگیا تو؟ پلیز امی سنبھالیں اپنے آپ کو' آپ میری فکر نہ کریں۔" پتا نہیں اتنا حوصلہ عظمیٰ میں کہاں سے آگیا تھا کہ اپنے اوپر ضبط کرکے ماں کو تسلیاں دے رہی تھی اسے اپنی زندگی کی پروا نہیں تھی۔ پروا تھی تو ماں کے سکون کی ماں کی خوشی کی۔
"امی پلیز.... جو میری تقدیر میں لکھا ہے وہ ہوکر

رہے گا۔ بس آپ مجھ سے کبھی ناراض نہ ہونا اور میرے لیے دعا کریں۔ میرا راستہ آسان ہوجائے گا' امی....."

صفیہ نے چونک کر بیٹی کو دیکھا۔ کہاں سے آگیا ہے اس میں اتنا حوصلہ۔ صفیہ ضبط کی جس منزل سے گزر رہی تھی اسے لگا جیسے عظمیٰ پتھر کی ہوگئی ہے یا پھر واقعی اسے اللہ پر اتنا بھروسا ہے اور وہ بائیس سال پیچھے.... چلی گئی جب اس نے ماں باپ کی رضا کے خلاف شادی کی تھی اور آج تک دکھوں کے سمندر میں گھری ہوئی تھی۔ دل دکھایا تھا نا اس نے ماں باپ کا اور زندگی بھر وہ جس اذیت میں رہی' آج اذیت کی وہی مالا وہ بیٹی میں منتقل ہوتے دیکھ رہی ہے۔

"نہیں نہیں' میرے اللہ میں توبہ کرتی ہوں اپنی خطاؤں کی' بے شک وہ توبہ قبول کرتا ہے۔" صفیہ نے عظمیٰ کی پیشانی چوم کر کہا۔

"ہاں بیٹا! اللہ تمہارے لیے آسانیاں کرے گا...."

شام تک انہیں گھر بھجوا دیا گیا' اگلے مہینے کی چھ تاریخ کو نکاح قرار پایا۔

صفیہ سوچ رہی تھی کہ اس سے نادانستگی میں ہی سہی کوئی نیکی ضرور ہوئی ہے جو اتنی سعادت مند اور عقل مند بیٹی اللہ نے اسے دی ہے۔ جو ہر دکھ اور پریشانی پر صبر کی سل اپنے سینے پر رکھ لیتی ہے اور کچھ ظاہر بھی نہیں ہونے دیتی۔ اس نے نماز پڑھی اور عظمیٰ کی اچھی تقدیر کی دعا کی۔

☆ ☆ ☆

سادگی سے عظمیٰ کی شادی ہوئی اس کی چند سہیلیاں جن میں فریحہ بھی تھی اور آس پاس کے لوگ شریک ہوئے۔ سوکن نے استقبال کیا' ساس اس دنیا میں نہیں تھیں۔ عفان کی ایک چھوٹی بہن تھی جو دور کے گاؤں میں بیاہ کر گئی تھی۔ نند نے عظمیٰ کو اس کے کمرے تک پہنچایا۔

عظمیٰ سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں اس کا شوہر کیسا ہوگا' کتنی عجیب بات تھی کہ جس سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ اس سے بالکل ناواقف تھی۔ کیا اس زمانے میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ عظمیٰ نے صرف اپنی ماں کی خاطر یہ شادی کی تھی' کیوں کہ اگر وہ انکار کرتی تو امی پریشانیوں میں گھر جاتیں۔ چچاؤں کا دباؤ بڑھتا تو صفیہ کی حالت اور خراب ہوجاتی لہٰذا عظمیٰ نے اپنی ماں کو بھی تسلی دی اور خود کو اللہ کے بھروسے پر حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ عجیب عجیب خیالات دل میں آرہے تھے۔ کمرہ تو اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ یک دم دروازہ کھلا.... اور دروازے کے ساتھ عظمیٰ کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر شرمندہ سی ہو کر منہ بند کرکے سر جھکا لیا۔

"یہ تو... یہ تو اچھا خاصا ہینڈسم بندہ ہے' بس ذرا عمر زیادہ ہے۔"

"السلام علیکم!" بھاری سی آواز میں سلام کیا گیا۔ عظمیٰ نے دھیرے سے سلام کا جواب دیا۔ دوبارہ سر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"آپ کو میرے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی بس میری پہلی بیوی کی عزت کرنا۔" لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی بلکہ حکمیہ انداز تھا۔ بالکل اس کے بابا اور چاچاؤں کی طرح....

اگلے دن رواج کے مطابق بابا کے گھر کی بڑی نوکرانی مٹھائی کے ساتھ آئی اور اسے لے کر فیروز شاہ کے گھر گئی۔ بڑی امی نے کوئی خاص آؤ بھگت نہیں کی' ہاں دادی اور پھپھو نے سر پر ہاتھ رکھا اس نے سوچا۔ چلو یہی غنیمت ہے پھر اسے اپنی ماں سے ملنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

ماں کے گلے لگی تو آنکھوں میں رکے آنسو بہہ نکلے....

"کیا ہوا بیٹا؟" صفیہ ایک دم پریشان سی ہوگئیں۔

"کچھ نہیں۔" اس نے ہاتھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "بس آپ یاد آرہی تھیں۔"

"اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔" صفیہ نے دعا دی۔ ماموں اور ممانی نے بھی پیار سے گلے لگایا۔

اور.... عظمیٰ سوچ رہی تھی' اگر ہم یہ تسلیم کرلیں

کہ جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آرہا ہے یہ سب اور جو آگے ہونے والا ہے، سب اللہ کے ہاں پہلے ہی درج ہے تو پھر پریشانی کس بات کی اور جو کچھ ہم سے کھو جاتا ہے اسے کھونا ہی لکھا ہوتا ہے تو پھر ہم واویلا کیوں کریں۔ بس اللہ مجھے میری تقدیر پر صابر و شاکر رکھے۔۔۔۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے اس کے چہرے پر ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

فریحہ کی شادی اس کے ابو کے دوست کے بیٹے سے ہوگئی۔ یوں دونوں کی ملاقاتیں بہت کم کم رہ گئیں، لیکن فریحہ جب بھی ملتی اپنے سسرال کی، شوہر کی ایک ایک بات اسے بتاتی اور وہ مسکرا مسکرا کر سنتی رہتی۔

کافی دنوں بعد دونوں کی ملاقات ہوئی۔

"اے ہیلو میڈم یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ کہیں عفان بھائی نے جادو تو نہیں کر دیا کہ بالکل ہی گم صم ہو گئی ہو۔" فریحہ اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلا کر کہتی اور جواب میں پھر وہی مسکراہٹ ہی ہوتی۔ فریحہ ادھر ادھر دیکھ کر کہتی۔

"سوکن صاحبہ تم سے جلتی تو ضرور ہوں گی۔"

"نہیں بھئی۔۔۔۔ یہ تم کن وسوسوں میں پڑ گئیں۔ کوئی اور بات کرو۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔" فریحہ پیچھا نہ چھوڑتی۔ "تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارا شوہر صرف تمہارا ہوتا۔"

"کیوں۔۔۔؟ میرے شوہر اب بھی میرے ہی ہیں۔"

"اوہو۔۔۔۔ اللہ رے کیا شان بے نیازی ہے تمہاری، پتا ہے میرے شوہر اگر کسی عورت کی طرف دیکھ بھی لے نا تو قسم سے آنکھیں نکال دوں۔"

"تو تم کیا چاہ رہی ہو۔" عظمٰی ہنسی۔ "میں عفان کی آنکھیں نکال لوں اور خود دوسرے دن ماموں کے گھر بیٹھی ہوں۔" عظمٰی ہنس ہنس کر اس کی باتوں کا جواب دیتی رہتی۔

"پھر بھی تمہارا دل تو دکھتا ہوگا نا جب وہ تمہاری سوکن سے بات چیت کرتے ہوں گے۔" فریحہ بھی اسے کریدنے میں لگی رہتی۔ عظمٰی ایک گہری سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی اور بولی۔

"جب عفان میرے ساتھ اچھے ہیں اور انہوں نے مجھے ضروریات زندگی کی ہر نعمت مہیا کی ہوئی ہے تو میں خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر انہیں کیوں تنگ کروں۔۔۔۔ اور پھر فریحہ، بے گھری کا عذاب بڑی بری چیز ہوتی ہے اور یہ عذاب میں بچپن سے جھیلتی آئی ہوں تو اب اللہ تعالیٰ نے مجھے میرا گھر عطا کر دیا ہے تو ناشکری کیوں کروں اور پھر میری امی کی دعائیں ہر وقت میرا حصار کیے رکھتی ہیں، میں خوش ہوں۔۔۔۔ بہت۔۔۔۔ خوش۔۔۔۔

سنو! جب میری شادی ہوئی تھی نا تو میں نے بڑوں کی مرضی پر سر جھکایا تھا۔ دعائیں لی تھیں سب کی۔ اگر میں اس شادی پر واویلا کرتی تو شادی تو ہونا ہی تھی، لیکن سب مجھ سے ناراض ہو جاتے اور امی۔۔۔۔ امی کو تو پتا نہیں کیا کچھ سننا پڑتا۔ ماموں والوں کی طرف سے بھی اور چچاؤں کی طرف سے بھی۔" فریحہ بغور اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"شام گہری ہوتی جارہی تھی۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ فریحہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی، سوچ رہی تھی کہ واقعی عظمٰی کی باتوں میں گہرائی بھی ہے اور سچائی بھی۔ عظمٰی نے جو فریحہ کو خاموش دیکھا تو بولی۔

"کیا سوچنے لگیں۔"

"کچھ نہیں۔" فریحہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔ باہر سردی ہے۔" عظمٰی نے مسکرا کر کہا اور دونوں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے' یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی' ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہرماہ یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہرماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی' آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں' تائی جان' مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں' ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

دسویں قسط

مہاہ کے اعصاب ٹھٹھر سے گئے۔

"یہ نام.....؟"

اس نام سے آفندی ہاؤس والے ناواقف نہیں تھے اور صدیقہ بیگم نے تو بطور خاص سب بچوں کو وقار آفندی اور زرنگار کی رنگین کہانی کئی بار۔ سنائی تھی۔

اس نے سنسناتے دماغ کے ساتھ ایک دبیز دھند کو اپنے اردگرد پھیلتے محسوس کیا اور دوبارہ سے حواس کھو بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

موحد..... وقت پر لوٹ آیا تھا۔ کبیر سامان لوڈ کروا کر نکل ہی رہا تھا۔ اس لیے موحد کی گاڑی اس کے پاس سے گزری تو وہ رکا نہیں بلکہ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا اور ساتھ ہی او کے کا اشارہ کیا۔

وقت دیکھتا وہ تیزی سے گاڑی بھگاتا ہوا پارلر کے باہر پہنچا۔ مہاہ کو دیے گئے وقت سے دس منٹ ہی اوپر ہوئے تھے پارکنگ میں گاڑی لگا کر اس نے مہاہ کو کال کی۔

دور..... کہیں، بہت دور گھنٹی بج بھی رہی تھی..... مگر اس کال کو اٹینڈ کرنے والی ہوش و حواس سے بے گانہ تھی۔

ایک بار، دوبار، تیسری بار۔

اس کے بعد موبائل سوئچڈ آف (بند) آنے لگا۔ کبیر الجھن کا شکار ہوا۔

اگر مہاہ پارلر میں ہی تھی تو کال اٹینڈ نہ کرنے کی وجہ؟ (کہیں گھر تو نہیں پہنچ گئیں؟)

اسے پہلے کا واقعہ یاد آیا۔ جب وہ موحد کے ساتھ تھی اور گھر میں اس کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی۔ گہری سانس بھر کے اس نے سوچا کہ کس کو فون کرے..... جہاں سے اسے اصل صورت حال پتا بھی چل جائے اور پورے گھر میں ہلچل بھی نہ مچے اور ایسا بندہ..... اس کے ذہن میں ملاحہ کی شبیہہ لہرائی۔ "اونہوں....." اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر فون انڈیکس میں سے تزئین کا نمبر سامنے کیا۔

"انفارمیشن تو ان سے بھی وہی ملے گی۔"

وہ مطمئن ہو کر دوسری طرف جاتی فون کی گھنٹی سننے لگا۔

دوسری طرف تزئین نے بھی، بہت حیران ہوتے ہوئے کبیر کی کال اٹینڈ کی۔ کہ کبھی انہیں پک کرنے کے سلسلے میں پڑنے والی ضرورت کے علاوہ کبیر نے کسی کو کال نہیں کی تھی۔

"ہیلو.....!"

"السلام علیکم تزئین بی بی! میں مہی بی کو پارلر سے پک کرنے آیا ہوں۔ مگر وہ میری کال اٹینڈ نہیں کر رہیں۔" کبیر نے محتاط لفظوں میں بتایا۔

"تو.....؟" مہاہ کا تو نام ہی ان دنوں زہر لگ رہا تھا۔ تزئین نے کاٹ کھانے والے انداز میں پوچھا تو وہ گڑبڑایا۔

"میں نے سوچا شاید وہ گھر واپس آگئی ہوں۔"

"گھر تو نہیں آئی۔ ابھی تائی جان کہہ رہی تھیں کہ مہاہ آجائے تو چائے اس کے ساتھ ہی پئیں گی۔" انداز دھیما مگر تیکھا ہی تھا۔

تزئین کو ویسے تو مہاہ کے آنے جانے کی خبر رکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ مگر یہ بات اسے تائی جان کے حوالے سے یاد آگئی۔

"ہوں..... لیکن اب ان کا موبائل آف آرہا ہے۔ مجھے یہاں دس پندرہ منٹ ہوگئے ہیں۔ ان کے دیئے ٹائم

سے آدھا گھنٹہ اوپر ہو چکا۔ بس دس منٹ ہی لیٹ تھا میں۔"
وہ بے چارگی سے بولا۔ اب بھلا خان زادہ پارلر سے مہپاہ کو کیسے بر آمد کرتا۔
"تم کہاں تھے؟ اب وہ چاہے رکشہ لے کر گھر آ رہی ہو۔ پتا تو ہے اس کی جلد بازیوں کا۔" وہ تنک کر بولی۔
مجبوراً" کبیر کو وضاحت کرنی پڑی۔" مجھے موحد صاب نے فیکٹری بھیجا ہوا تھا کام کے سلسلے میں 'وہ خود شہر سے باہر تھے۔"
"تو عقل مند شخص 'پارلر کے باہر ڈور بیل بھی ہوتی ہے۔ وہ بجاؤ یا واچ مین سے کہو کہ وہ اندر سے مہپاہ آفندی کو بلا دے۔"
تزئین نے ضبط کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔
کبیر نے ذرا آگے کو جھک کر دیکھا۔ واقعی پارلر کے باہر گن مین موجود تھا۔ وہ گاڑی سے نیچے اترا۔
اور اس سے اگلے لمحات کبیر کے لیے شدید تشویش اور پریشانی کے تھے۔
"مہپاہ آفندی کی آج اپائنٹمنٹ تھی مگر وہ اپنے کام سے پانچ دس منٹ پہلے ہی فارغ ہو کر چلی گئی تھیں۔"
گارڈ نے آکر اطلاع دی۔ جو اسے پارلر کے اندر سے موصول ہوئی تھی۔ کبیر کی پیشانی چمک اٹھی۔
اگر وہ یہ بھی فرض کر لیتا کہ مہپاہ پارلر کے باہر اسے موجود نہ پا کر خود گھر چلی گئی ہو گی.... تو بھی اس گزرے آدھے گھنٹے میں اسے آفندی ہاؤس میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ بمشکل پانچ منٹ لگتے تھے رکشے میں گھر پہنچنے میں 'اب کی بار اس نے تائی جان کو کال کی.... ملاحہ کے نمبر پر تو اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی۔

☼ ☼ ☼

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ وہ تمہارے ساتھ گئی تھی اور تمہارے ساتھ ہی آنا طے تھا۔ بے وقوف ہے، جو نکل آتی اکیلے ہی۔"
تائی جان اس پر برس پڑی تھیں۔
تزئین نے معنی خیز نظروں سے ماں کو دیکھا۔
"پارلر کے اندر جا کر پتا کرو۔ وہیں ہو گی۔"
انہوں نے کبیر کو اچھی خاصی سنا کر لائن ڈراپ کی تھی۔
"کیا پتا کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہو تائی جان! اس روز الحمرا سے بھی تو ایسے ہی گئی تھیں محترمہ۔"
تزئین نے بظاہر بڑی سادگی سے کہا۔ مگر اس کا طنز تائی جان کو اچھی طرح محسوس ہوا۔
"اپنے داماد کو فون کریں۔ کیا پتا دونوں لانگ ڈرائیو پہ نکل گئے ہوں۔"
سائرہ چچی بظاہر بڑی ہمدردی سے بولتی تھیں اور تائی جان کا خون تھا کہ ابال کھاتا تھا۔ مگر پچویشن ایسی تھی کہ کسی کا منہ نہیں توڑ سکتی تھیں جب تک کہ مہپاہ کا پتا نہ چل جاتا کہ کہاں ہے۔
"اتنی لاپروا ہے تو نہیں۔ میں پوچھتی ہوں طلال سے۔ ملاحہ فون تو ملا کر دو ذرا۔"
ان کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اور یہ تزئین اور سائرہ چچی کے طنز و استہزا کا ہی اعجاز تھا کہ انہوں نے دو ہفتے بعد باقاعدہ داماد بننے والے شخص سے نرمی اور احتیاط سے بات کرنے کے بجائے اس کے سلام کا جواب ہی بڑے تیکھے انداز میں دیا۔ پھر بڑے لٹھ مار انداز میں بولیں۔
"مہپاہ کہاں ہے؟"
"جی.... کیا مطلب آنٹی؟" وہ گڑبڑایا۔

"وہ پارلر گئی تھی۔ ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔" وہ بمشکل تحمل سے بول سکی تھیں۔
"آجاتی ہے ابھی آنٹی! ایسی جگہوں پر دیر سویر ہو ہی جایا کرتی ہے۔" وہ ان کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ مگر الحمرا والے واقعہ کو یاد کرتے ہوئے تائی جان کو یہی شک تھا کہ کہیں آج بھی وہ ضد کر کے مہپاہ کو ساتھ نہ لے گیا ہو۔
"دیکھو بیٹا! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ اس روز بھی اس کا موبائل آف آرہا تھا۔ آج بھی آف ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ ہے تو صاف بتاؤ۔" وہ قدرے سائیڈ پر چلی آئیں اور درشت لہجے میں بولیں۔
اب کی بار طلال کو بھی ہتک کا احساس ہوا۔
"کیسی باتیں کر رہی ہیں آنٹی! اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو مجھے بھلا آپ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس دن بھی وہ آپ کو بتا کر ہی لانگ ڈرائیو پر گئی تھی۔"
اس کی بات سن کر تائی جان کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ (تو پھر مہپاہ کہاں تھی؟ اور جس سے یہ بات چھپانی چاہیے تھی نادانستگی میں اسی کو سب سے پہلے بتادی)
"میں پتا کرتا ہوں۔ کون سا پارلر ہے؟"
ان کی ایک دم سے چپ والی کیفیت نے طلال کو متفکر کر دیا۔ تو وہ جلدی سے بولا۔ انہوں نے مرے مرے انداز میں پارلر کا نام بتایا۔ ان کا دل جیسے اتھاہ گہرائی میں اتر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ.....
"او کے۔ میں پتا کر کے بتاتا ہوں آپ کو۔" طلال نے فون بند کر دیا تھا۔
انہیں ڈائننگ کے پاس ساکت کھڑے دیکھ کر ملاحہ ان کے پاس آئی۔
"کیا ہوا امی..... طلال بھائی کے ساتھ ہیں آپی؟"
اس نے امید بھرے دل کے ساتھ پوچھا مگر ان کا نفی میں ہلتا سر دیکھ کر دل ڈوب سا گیا۔
"ابو کو بتاؤں.....؟ کبیر نے بھی کال نہیں کی۔ اس کا مطلب کہ اسے بھی کچھ پتا نہیں چلا۔"
وہ بے دم سی ڈائننگ چیئر پر ڈھیر ہو گئیں۔
سونامی کی پہلی لہر آفندی ہاؤس کی دیواروں سے آن ٹکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

کہاں دیکھتے 'کہاں پتا کرتے؟ ملاحہ نے بہانے سے اس کی دوستوں کو بھی فون کر کے مہپاہ کی بابت پوچھ لیا۔ مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ تائی جان تو رو رو کر بے حال ہونے لگیں۔ گھر میں یک لخت ہی صف ماتم بچھ گئی۔
ہر سڑک ہر گلی..... ملاحہ اور تزئین پارلر کے اندر تک جا کر دیکھ آئیں۔ پارلر اونر نے سی سی ٹی وی فوٹیج تک دکھا دی پارلر کی۔ جس میں مہپاہ باقاعدہ طور پر چادر اوڑھ کر پارلر کے دروازے سے باہر جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ کبیر چھ بج کر دس منٹ پر باہر آیا ہو گا اور وہ چھ بجنے میں ابھی دس منٹ تھے جب پارلر سے باہر نکلی۔
"یہ اس کا قصور ہے۔ اس سے کوئی کیوں نہیں پوچھتا۔ یہی لے کر گیا تھا میری بچی کو۔" کبیر کو دیکھتے ہی تائی جان چیخنے لگیں تو وہ بے بسی سے آغا جان اور مبین صاحب کو دیکھنے لگا۔
"میں تو وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اب وہی وقت سے پہلے پارلر سے نکل گئیں تو میرا کیا قصور اس میں۔"
"میرے خیال میں پولیس کو رپورٹ کر دینی چاہیے آغا جان۔" سہیل آفندی نے کہا۔
"نہیں....." آغا جان قطعی انداز میں بولے تو آواز کی گرج برقرار تھی۔ مگر پیشانی پر چمکتا پسینہ اور چھڑی پر ٹکے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اس بات کی گواہ تھی کہ آفندی ہاؤس میں نقب لگ چکی تھی۔

"کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ گھر کی عزت کو اب تھانوں میں اچھالیں گے ہم۔"

"میری بیٹی کون سا خدانخواستہ بھاگ۔ گئی ہے کسی کے ساتھ آغا جان! رپورٹ درج نہیں کرائیں گے تو ملے گی کیسے۔" تائی جان بلبلا اٹھیں۔

ثمو نے تاسف سے انہیں دیکھا۔ (اس عورت کو ساری عمر بات کرنے کی تمیز نہیں آئی)

"بکواس مت کرو صدیقہ۔"

آغا جان طیش میں آئے تو وہ دبک سی گئیں۔ مگر پھر بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور وہ بہ آواز بلند رونے لگیں۔

"ایسے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے تو مہپاہ نہیں ملے گی آغا جان!"

موحد ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور قدرے مضطرب نظر آرہا تھا۔ کبیر کے ساتھ گھنٹوں بھاگ دوڑ اسی نے کی تھی مگر مہپاہ کی خاک تک نہ ملی تھی۔

"دھیان رکھنا۔ ابھی لڑکے والوں تک یہ بات نہ پہنچ پائے۔ اللہ خیر کرے تو مہپاہ آجائے گی واپس۔"

آغا جان بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے تنبیہی انداز میں بولے تو تائی جان کا رونا ایک دم سے تھم گیا۔

انہیں فی الفور ہی اس خوفناک حقیقت کا ادراک ہوا تھا جو آغا جان کے لفظوں کی تہ میں پوشیدہ تھی۔

وہ دوپٹے میں منہ دیے بلک اٹھیں۔

اور اب جہاں تمام عورتوں کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہیں مردوں کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ہوش میں آئی تو چیخ چیخ کر رو رو کر اپنی آواز خراب کرلی۔ مگر کوئی کمرے میں نہ آیا۔ وہ یونہی پیچھے بندھے ہاتھوں کے ساتھ زمین پر بچھے گدے پر گر سی گئی۔

اور تب کلک کی آواز کے ساتھ دروازے کا لاک کھلا تو اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سر اٹھایا۔

وہاں عام سے نقوش والی مضبوط ہاتھ پیر کی عورت تھی۔ جس کے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ سے دروازہ باہر سے لاک کرنے کی آواز آئی تھی۔

"کون ہو تم... اور مجھے کیوں لائی ہو یہاں؟" مہپاہ دکھ، بے یقینی اور صدمے کی کیفیت سے گزر کر اب خوف کی زد میں تھی۔

اسے یاد آگیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے گاڑی میں بیٹھ کر اسے بے ہوشی کی دوا سونگھائی تھی۔

وہ عورت اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ناقدانہ نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

مہپاہ پر وحشت طاری ہونے لگی۔

"نم... نمیر کہاں ہے؟"

اسے یک لخت خیال آیا۔ کچھ بھی ہو وہ اس کا چچا زاد تھا۔ کچھ تو خیال کرتا اس کا۔

"کھانا لانے لگی ہوں تمہارے لیے ابھی۔ آرام سے کھالینا۔" اس عورت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"پلیز... پلیز مجھے بھوک نہیں ہے۔ مجھے میرے گھر جانا ہے پلیز... میرے گھر میں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔" وہ جلدی سے اٹھی۔

"چلو میں تمہارے ہاتھ کھول دوں۔ ہاتھ منہ دھولو۔ پھر آرام سے کھانا کھالینا۔"

وہ عورت جیسے اس کی زبان سمجھتی ہی نہ ہو۔ اپنی ہی کہے گئی۔ مہپاہ نے شکر ادا کیا۔ اتنے گھنٹوں سے بندھے

ہاتھ اور کندھے ٹوٹنے والے ہو رہے تھے اب تو۔

"سنو۔ نمیر کہاں ہے؟ اس سے کہو میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

مہپاہ کا حوصلہ اور اعتماد کچھ بحال ہوا۔ ان لوگوں کا رویہ زیادہ برا نہیں تھا۔

"یہ باتھ روم ہے۔ جاؤ اور منہ ہاتھ دھو لو۔ اور ہاں... اندر کنڈی نہیں ہے۔ صرف لاک ہے جو باہر سے بھی کھل جاتا ہے چابی کے ساتھ۔" اس عورت نے اب بھی اپنی ہی کہی۔

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں اور مجھے کھانا نہیں چاہیے۔ آزادی چاہیے۔ کیوں لائے ہو تم لوگ مجھے یہاں؟"

وہ یک لخت ساری برداشت کھو کر چلا اٹھی۔

"یہ تو صاب ہی بتائے گا۔"

اب کی بار وہ لاپروائی سے بولی تھی۔ مہپاہ کو غصہ آیا۔

"تو بلاؤ اپنے صاحب کو... میں بات کرنا چاہتی ہوں اس سے، وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے میرے ساتھ۔"

"ابھی تو صاب نہیں ہے۔ تم کھانا کھا کر سو جاؤ۔ صبح بات کرے گا وہ تم سے۔"

وہ عورت اطمینان سے بولی تو مہپاہ کو زوردار جھٹکا لگا۔

"صبح...؟" اس نے بے یقینی سے پھٹی نظروں سے عورت کو دیکھا۔

"میں رات بھر یہیں رہوں گی کیا؟"

"ہاں...!" یک لفظی قیامت ٹوٹی تھی مہپاہ کے اعصاب پر۔

"شٹ اپ..." وہ خود پر سے قابو کھو کر زخمی شیرنی کی طرح اس عورت پر جھپٹی۔

"ہوتے کون ہو تم لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے۔ جانے دو مجھے یہاں سے۔"

اس مضبوط جثے والی عورت کے سامنے مہپاہ تو نازک سی گڑیا تھی۔ ایک ہاتھ سے مہپاہ کا بازو موڑ کر کمر کے پیچھے کرتے ہوئے اس عورت نے اس کا دوسرا بازو بھی جکڑ لیا تھا۔ مہپاہ تکلیف سے کراہ اٹھی۔

"بی بی... عزت کرو اور عزت کرواؤ... مجھے حکم نہیں ہے سوائے اپنی حفاظت کے تم پر سختی کرنے کا۔ تم بھی ذرا دھیان رکھو۔"

وہ کرختی سے بولی۔ تو مہپاہ کو رونا آ گیا۔

"یا اللہ..." وہ آنکھیں میچ میچ کر کھولتی تھی۔ شاید یہ خواب ہو اور ٹوٹ جائے۔

"میرے گھر والے...؟؟ آغا جان...؟؟"

اسے یاد آیا اس کی شادی میں محض دو ہفتے باقی تھے۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ باقاعدہ رونے لگی۔

اس عورت نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے زمین پر پڑے اسی گدے پر دھکیل دیا۔

"اچھی طرح رو لے۔ میں کھانا لاتی ہوں۔ پھر سکون سے کھانا۔"

وہ مشورہ دیتی ہوئی دروازے تک گئی اور ایک دو بار ناب کو گھمایا تو باہر سے دروازے کا لاک کھول دیا گیا۔ وہ باہر چلی گئی دروازہ پھر بند ہو گیا۔

مہپاہ آفندی کا رونا دیکھنے والا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

تائی جان اور ملاحہ کا رو رو کر حشر ہو رہا تھا۔

"مبین صاحب! کچھ کریں۔ ایسے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہائے میری مسکین بچی۔"

وہ بار بار مبین آفندی سے کہتیں۔

"حوصلہ کرو صدیقہ! اللہ بہتری کرے گا۔"

ان کے اپنے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ گھر کی عزت جانے کہاں رُل رہی تھی۔ مرد تھے۔ رونے میں انا آڑے آتی تھی۔ سب کے سامنے نہ سہی مگر گزری رات وہ اللہ کے حضور سجدہ ریز کتنی ہی دیر آنسو بہاتے رہے۔

"ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا مبین صاحب۔ نہ کسی کے نفع میں نہ نقصان میں... یا اللہ۔"

تائی جان کی بے بسی، بے چارگی بن گئی تھی۔ انہیں اپنا ایسا کوئی گناہ یاد نہ تھا جس کی سزا اتنی سنگین ہو۔

لیکن آگے کے بجائے آدمی کو ہمیشہ پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہیے۔ اپنی بہت سی کوتاہیاں نظر آجاتی ہیں۔ مگر کوئی دیکھنا چاہے تب۔

آغا جان نے پولیس کو مطلع کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا اور گھر کے مرد اس بات سے متفق بھی تھے۔ اس شہر میں جتنی عزت وہ کما چکے تھے، بات پھیلتی تو وہ عزت سڑکوں پر آجاتی۔

سب ہی غم سے چور تھے۔ اور آغا جان کو تو اس بات کا صدمہ بھی لگ گیا تھا کہ تائی جان اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں طلال کو بھی مہپاہ کی گمشدگی کی اطلاع دے چکی تھیں۔

طلال اور اس کے گھر والے رات گئے تک بیٹھے رہے۔ کوئی فون کوئی اطلاع۔

"انکل! آپ غلطی کر رہے ہیں۔ جوں جوں ٹائم گزرے گا۔ مشکل ہوتی جائے گی۔ پولیس کی مدد لے لینی چاہیے۔"

طلال کا بھی یہی مشورہ تھا۔

اس کی پریشانی، دل کی بے چینی اور اضطراب اس کے چہرے، اس کے ہر انداز سے جھلک رہا تھا۔

"برخوردار۔ ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ پولیس کے پاس جا کر کس دشمن کے خلاف پرچہ کٹوائیں ہم؟ کل تک دیکھیں گے کیا بنتا ہے۔ پھر جو اللہ کو منظور۔"

آغا جان نے بات ہی ختم کر دی تھی۔ وہ لوگ بھی چپ ہو گئے مگر رات گئے تک کہیں سے کوئی خبر نہیں ملی۔ کبیر اور موحد تمام سڑکیں پھر آئے۔ طلال کے ساتھ جا کر دارالامان تک دیکھ آئے۔

مگر آج تائی جان کی ایک ہی ضد تھی کہ پولیس میں رپورٹ درج کروا دی جائے۔ بھاڑ میں جائے ایسی عزت جسے بچاتے بچاتے واقعی عزت چلی جائے۔

"میں آغا جان سے بات کرتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو صدیقہ۔ صبر کرو۔"

مبین صاحب خود بھی اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔ تحمل سے کہہ کر اٹھ گئے۔ ملاحہ ماں کے گلے لگی چپکے سے آنسو بہانے لگی۔

اس کی نازک سی پیاری سی بہن جانے کن حالوں میں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کل سے بھوکی پیاسی تھی۔ رونا رونا اور صرف رونا۔

اب تو اس کی آنکھیں بھی خشک ہونے کو تھیں۔ پوری رات گھر سے باہر گزارنے کا مطلب ایک لڑکی کے لیے کیا ہوا کرتا ہے؟؟ اس کا دل اس سوچ کے ساتھ پھٹتا تھا۔

ابھی بھی شخص اس نے ناشتے کی ٹرے میں سے صرف چائے کا کپ اٹھایا تھا۔ وہ عورت اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"کچھ کھا بھی لو۔ رات سے بھوکی ہو۔"

"تم بھی ایک عورت ہو، تمہیں رحم نہیں آتا۔ اگر تمہاری بیٹی کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرے تو تمہارے دل پر کیا بیتے گی؟"

آنکھوں میں آنسو بھرے وہ اس عورت سے دل پسیج دینے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ مگر بڑے بڑے نوٹوں کا لالچ فی الحال اسے قبر کے سانپ بچھو بھلائے ہوئے تھا۔

"یہ چائے ختم کرو۔ پھر میں بات کرتی ہوں تم سے۔" عورت نے اکھڑ انداز میں کہا اور سچ تو یہ تھا کہ کل سے لے کر اب تک مہماہ کی ساری ہمت اور اعتماد دم توڑ چکا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" کی تلوار سر پہ لٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے اتنے لہجے کو ہی بہت جان کر مہماہ نے دو تین بڑے گھونٹوں میں چائے ختم کر دی۔ اس عورت نے برتن اٹھا کر سائیڈ پر رکھ دیے۔ اب وہ اور مہماہ آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔

"دیکھو۔ میں نہیں جانتی کہ تمہاری اور صاب کی کیا دشمنی ہے۔ میں نوکری پیشہ ہوں۔ مجھے جس کام کی تنخواہ مل رہی ہے بس میں وہی کروں گی اور بس۔" وہ ذرا تھمی تو مہماہ نے جلدی سے کہا۔

"تم اس سے کہو۔ وہ مجھ سے بات کرے، کیا چاہتا ہے وہ؟ دشمن ہی سہی مگر خون کا رشتہ تو ہے نا ہمارے درمیان۔"

"یہاں سارا انتظام ہے۔ تم جو بول رہی ہو، وہ صاب سن رہا ہے۔" وہ عورت آرام سے بولی تو مہماہ چپ سی ہو گئی۔

"اتنا ہی بزدل ہے کہ سامنے آکر بات نہیں کر سکتا تو یہ سارا ڈراما کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اسے۔" اس نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد تلخی سے کہا تھا۔

"جب پرندے کے پر کاٹ دیے جائیں تو اس کے پاس ماسوائے پنجرے کے ساتھ سمجھوتا کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں بچتا لڑکی! تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنے آپ کو صاب کی ہر شرط ماننے کے لیے راضی کر لو۔ اگر اس قید سے رہائی چاہتی ہو تو۔"

وہ بڑے سیانے پن سے کہہ رہی تھی۔ مہماہ اندر ہی اندر تلملائی۔

"نمیر وقار آفندی! یوں بزدلوں کی طرح کیوں چھپ کر بیٹھ گئے ہو اب۔ بتاؤ کتنا حصہ چاہیے تمہیں آغا جان کی جائیداد میں سے؟"

اس نے چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے اونچی اور تلخ آواز میں پوچھا تھا۔ جواباً کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ مہماہ کے اندر جیسے غضب کا طوفان کروٹیں لینے لگا۔

"افسوس ہے، مجھے بے حد افسوس ہے تم بھی اپنی "ماں" ہی کا بیٹا ہونے کا ثبوت دے رہے ہو۔ کاش کہ تم ثابت کرتے اپنے عمل سے کہ تم وقار آفندی کے بیٹے ہو۔"

یہ مہذبانہ انداز میں طوائف کا بیٹا ہونے کی گالی تھی۔ جو مہماہ نے نمیر آفندی کو دے ڈالی تھی۔ مگر اس وقت وہ شل ہوتے دماغ کے ساتھ غم و غصے کی جس کیفیت میں تھی، جانے کیا کچھ کہہ دیتی۔

"وہ اس گھر میں اپنا مقام چاہتا ہے تو اس سے کہو میں بات کروں گی آغا جان سے۔ مگر اس قدر گراوٹ کا مظاہرہ نہ کرے۔" مہماہ نے بے بسی سے اس عورت سے کہا۔

"وہ تم سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔"

اس عورت نے اس قدر اطمینان سے کہا جیسے کوئی ادھار کی چیز مانگ رہی ہو۔

مہاہ نے ناسمجھی والے انداز میں اسے دیکھا۔ ابتدائی جھٹکا یہی تھا۔ اس کے ذہن نے اس بات کو جیسے سمجھا ہی نہ تھا۔

"واٹ...؟" پھر وہ بھک سے اڑی۔ "دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا..." وہ غرائی تھی۔

"یہاں سے اگر آزادی چاہتی ہو تو تمہاری آزادی کی قیمت یہی ہے۔" وہ پرسکون انداز میں بولی تھی۔

"اس کا دماغ خراب ہے... میں... دو ہفتوں بعد میری شادی ہے۔ وہ میرے ساتھ ایسی بکواس کیسے کر سکتا ہے؟" وہ غم و غصے سے جیسے پاگل ہونے لگی۔

"جتنی جلدی فیصلہ کرو گی۔ اتنی ہی جلدی یہاں سے آزاد ہو گی۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم کتنا وقت لیتی ہو۔" وہ جیسے مہاہ کی بات تو سنتی ہی نہ تھی۔ اپنی ہی بات کرتی تھی۔

"کبھی نہیں۔" وہ زور سے چیخی۔ "پاگل ہو گیا ہے وہ۔ میری شادی طے ہے اور نہ بھی ہوتی تب بھی میں لعنت بھیجتی اس کی آفر پر۔"

اس عورت نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ "عزت دے رہا ہے تمہیں پھر بھی تمہارے مزاج نہیں مل رہے۔"

"عزت چھین کے عزت دینے والے واہ واہ کے مستحق نہیں ہوتے۔" وہ تلخی سے بولی۔ تو انداز تند و تیز تھا۔

"خوش قسمت ہو' عزت کے بدلے عزت ہی دے رہا ہے۔ ورنہ یہاں اس کی قید میں ہو۔ جو چاہے سلوک کر لے کیا کر سکتی ہو تم؟"

اب کی بار اس عورت نے چبھتے لہجے میں اسے گویا اس کی موجودہ "اوقات" یاد دلائی تو مہاہ کا دل کسی کھائی میں جیسے ڈوب کر ابھرا۔

"اس سے کہو آکر مجھ سے بات کرے۔ پلیز بات کرنے سے ہی مسئلے حل ہوا کرتے ہیں۔ ایسی فضول حرکت سے نہ تو اسے جائیداد میں سے حصہ ملے گا اور نہ ہی خاندانی حیثیت... آغا جان کو پتا چلے گا تو وہ اسے گولی سے اڑا دیں گے۔"

وہ ذرا دھیمی پڑی۔ پہلے ملتجیانہ انداز میں کہا پھر ساتھ ہی دھمکا بھی دیا۔

"وہ جو چاہتا ہے میں نے تمہیں بتا دیا ہے بی بی۔ تم اپنا زیادہ دماغ مت دوڑاؤ۔ بس یہ سوچو کہ تمہاری یہاں سے آزادی کی ایک ہی قیمت ہے۔"

"مسلمان ہو تم اور وہ بھی۔ اتنا نہیں جانتے ہو کہ اس طرح کے زبردستی کے نکاح کی اسلام میں کوئی وقعت کوئی حیثیت نہیں۔ ایک کام شرعاً ہی ٹھیک نہیں تو اس سے کیا فائدہ حاصل۔"

مہاہ نے اب دوسری طرح سے اسے سمجھانا چاہا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے بال ہی نوچ لیتی۔ تب ہی وہ عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہاہ نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جو کام عزت سے ہوتا ہو وہ عزت سے ہی کر لینا چاہیے بی بی۔ صاب جی کی قید میں ہو۔ وہ بنا نکاح کے تمہارے پاس آئیں گے تو تمہیں بھی یہ بات پسند نہیں آئے گی۔"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تو مہاہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بکواس بند کرو تم بھی اور اس آدمی کو بھی کہہ دینا۔ میں مر جاؤں گی مگر یہ کام کبھی نہیں کروں گی۔ کر لے وہ جو کر سکتا ہے۔" غصے سے لال بھبھوکا چہرہ لیے وہ درشتی سے بولی تھی۔

اس عورت نے گہری سانس بھری پھر تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آگے تمہاری مرضی ہے۔ اگر دل کو منالوگی تو باعزت رہوگی۔ ورنہ جو تمہیں اغوا کر سکتا ہے اسے تم کچھ بھی کرنے سے روک نہیں سکتیں۔" وہ کہہ کر چلی گئی تھی۔

اور مہواہ.... وہ لحہ بھر تو اس کی بات سمجھ کر سناٹے میں رہی پھر یک لخت ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"یا اللہ.... رحم...." اسے حقیقی معنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس مصیبت کا شکار ہو چکی تھی۔

آفندی ہاؤس کے مکینوں میں سے کسی کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ نمیر وقار آفندی اس کے اغوا میں ملوث ہو سکتا ہے۔ برسوں پہلے وقار آفندی اور زرنگار کے ساتھ ان سب نے نمیر آفندی نامی بچے کو بھی مردہ تصور کر لیا تھا۔

اور یہ سب سوچیں اتنی خوفناک تھیں کہ مہواہ کے آنسو اور ہچکیاں نہ رکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ تھکا ماندہ گھر لوٹا تو سب کو سلام کر کے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔

"طلال....!" پاپا نے اسے آواز دی تو وہ گہری سانس بھرتے ہوئے پلٹا۔

شام کی چائے پر ماما' پاپا اور بھابھی بھی موجود تھیں۔

بھابی کی نگاہوں سے استہزا جھلکتا تھا۔

"کچھ پتا چلا مہواہ کا؟"

اس کی ماما نے پوچھا تو انداز میں پہلے والی گرم جوشی نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں میچ کر کھولیں اور نفی میں سر ہلایا۔

ایک رات اور آج کا پورا دن گزر چکا تھا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی جا چکی تھی۔ مگر مہواہ آفندی کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

"ادھر آؤ طلال! یہاں بیٹھو آکر۔" پاپا نے اپنے سامنے والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"پھر سہی پاپا۔ ابھی تھکا ہوا ہوں۔"

وہ معترض تھا۔ فی الحال وہ مہواہ کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہ سننا چاہتا تھا اور نہ اس بارے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے طلال کہ ہم ایک دوسرے سے نظریں چرائے حقیقت سے آنکھ بچا کر گزار دیں۔ بیٹھو یہاں کچھ باتیں طے کرنی ہیں۔ آج ہی ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔"

پاپا نے قطعی لہجے میں کہا تو اسے بیٹھتے ہی بنی۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے نیکسٹ؟" وہ سیدھے سبھاؤ پوچھ رہے تھے۔

"میرا دل کہتا ہے مہواہ مل جائے گی پاپا...." وہ نروٹھے انداز میں بولا۔ نظروں میں احتجاج کی کیفیت تھی۔

"پھر....؟" ان کی پیشانی پر بل پڑے۔ استفہامیہ انداز میں بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"پھر؟ ہماری شادی کی ڈیٹ فکس ہے پاپا۔" طلال نے گویا انہیں یاد دلایا۔

"شادی تو تب ہوگی جب وہ واپس آئے گی۔ دو دن ہو گئے ہیں اس کا کچھ پتا نہیں۔ اللہ رحم کرے اس بچی پر۔" ماما نے آزردگی سے کہا۔

"پولیس میں رپورٹ کرا دی ہے ماما۔ ان شاء اللہ مل جائے گی۔" وہ پُر یقین تھا۔

"اور تم اسی لڑکی سے شادی کرو گے۔ جسے جانے کس نے اغوا کیا ہے اور نجانے وہ کن حالات میں ہے۔"

پاپا نے تیکھے انداز میں کہا تو وہ چپ سا ہو گیا۔
"وہ ایک اچھی فیملی کی لڑکی ہے پاپا۔ اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔" توقف کے بعد وہ بولا۔
"اچھی فیملی کی تھی تب ہی شادی طے کی تھی اس سے۔ مگر اب حالات کچھ اور ہیں طلال۔ بیوقوفی مت کرو۔ نجانے کیسے ہاتھوں میں گئی ہے اور کس کنڈیشن میں واپس آئے۔ تم اپنا فیصلہ پہلے سے سوچ کر رکھو۔" وہ قطعیت بھرے مخصوص انداز میں بولے تو وہ تلخ سوچ ایک کڑوی حقیقت بن کر طلال کے سامنے آن کھڑی ہوئی جس سے وہ کل سے نظریں چرا رہا تھا۔ بار بار اسے ذہن سے جھٹک رہا تھا۔
"ہم بھی خاندان والے ہیں طلال۔ دس بارہ دن بعد شادی کی تاریخ ہے۔ اللہ جانے کب مہر کا پتا چلے گا اور اگر عین وقت تک وہ نہ آئی تو ہم کیا بتائیں گے سب کو؟؟"
ماما بھی آزردہ تھیں۔ مگر بہرحال اپنی عزت انہیں زیادہ پیاری تھی۔
"تو آپ ہی بتائیں۔ میں کیا کروں؟؟"
وہ بے بس سا کرسی پر گر پڑا۔ سر نیہوڑائے وہ ـــــ بے بس لگتا تھا۔ دھول سے اٹے بال اور نیند کی کمی کی وجہ سے لال ہوتی آنکھیں یہاں باپ کا دل دکھا گئیں۔
مہاہ آفندی اس کا پیار تھی۔ بڑی ضد اور مان کے ساتھ اس نے مہاہ کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ منوایا تھا اور اس سلسلے میں وہ اپنی بہو کی ناراضی مول لے چکے تھے جس کا ارادہ اپنی بہن کو دیورانی بنانے کا تھا۔
"حقیقت پسند بنو طلال اور حقیقت یہی ہے کہ ایسی لڑکی کو تم اپنی بیوی نہیں بنا سکتے۔"
ماما نے محتاط انداز میں کہا تو وہ بے ساختہ شکوہ کناں نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔
"صحیح کہہ رہی ہیں یہ۔ کس کس کو جواب دو گے سوالوں کا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا کہیں اتا پتا ہی نہیں۔ شادی کی بات تو بعد کی ہے۔" پاپا نے بھی صاف گوئی سے کہا تو وہ سر گرائے بیٹھا جانے کیا کیا سوچ گیا۔
"آج رات تک کا وقت ہے تمہارے پاس طلال۔ اچھی طرح سوچ لو۔ کیا ایسی لڑکی کا ساتھ تم ساری زندگی کے لیے لوگوں کے سوالات اور طنزیہ نظروں کے ساتھ برداشت کر لو گے؟ پھر کل پرسوں تک میں ان لوگوں کو جواب دے دوں گا۔"
پاپا نے قطعی انداز میں کہا تھا۔
"پاپا پلیز... اسے واپس تو آلینے دیں۔ پتا نہیں وہ کن حالات میں ہے۔" وہ ضبط کی انتہا پر تھا۔
ہنستی مسکراتی خوب صورت خوابوں سے سجی زندگی ایک دم سے اتنا خوفناک موڑ لے بیٹھی تھی کہ سب کے ساتھ وہ بھی دنگ رہ گیا تھا۔
"یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں بیٹا۔ نجانے کن حالات سے گزر کر آئے وہ۔ بہتر یہی ہو گا کہ جگ ہنسائی سے پہلے ہی ہم کوئی فیصلہ کر لیں... اور ہاں۔ میں اسی تاریخ کو تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر لڑکی مہاہ نہیں ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ اچھی طرح سوچنے کے بعد تم مجھے حق پر پاؤ گے۔"
انہوں نے بات ہی ختم کر دی تھی۔
طلال سے مزید کچھ سنا ہی نہیں گیا وہ تیزی سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ ماما کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جبکہ بھابی کے ہونٹوں میں ہلکی سی مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں وہی مزہ لیتی تمسخرانہ کیفیت۔

☼ ☼ ☼

"نکاح خواں آئیں گے۔ تم ان کے سامنے ہاں کے علاوہ ایک لفظ بھی مزید نہیں بولو گی۔ ورنہ نتائج کی ذمہ

داری تم پر ہوگی۔" پہلے دن کے بعد وہ آج تیسرے روز اس کے سامنے آیا تھا۔
"خدا کے لیے... بس کرو یہ کھیل..." مہاہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور سسک اٹھی۔
"تم نے سنا میں نے کیا کہا؟ ورنہ ساری عمر اسی کمرے میں گزار دو گی تب بھی تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔" وہ سختی سے بولتا اسے بے حد ظالم لگا۔
"تم نے بدلہ لینا ہے تو آغا جان سے لو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ پلیز مجھے جانے دو۔" وہ تڑپ رہی تھی۔
"میں نے کہا نا۔ نکاح نامے پر تین عدد سائن اور بس... بس اس کے علاوہ کوئی بحث نہیں۔"
وہ محض اتنا کہہ کر چلا گیا تھا۔ وہ عورت مہاہ کے پاس ہی تھی۔
"کیوں اپنی جان مشکل میں ڈال رہی ہو بی بی۔ غلط کاری تو نہیں کر رہا تمہارے ساتھ۔ نکاح پڑھوا رہا ہے۔"
وہ منہ بنا کر بولی تو مہاہ کا دل چاہا اس کا منہ نوچ لے۔
"تو تم کیوں نہیں پڑھوا لیتیں نکاح، اتنا ہی ثواب کمانے کا شوق آرہا ہے تو۔" وہ اس پر چلائی تھی۔
"میں تو بس ایک بات جانتی ہوں۔ نیت کر کے دل سے مان کر نکاح کرو گی تو یہ نکاح جائز ہو گا۔ لیکن اب بھی اگر تم محض زبردستی مجبور کرنے پر ہامی بھرو گی اور وہ بیوی مان کر تمہارے پاس آگیا تو... سوچ لو پھر۔ ناجائز تعلق نبھانے آسان نہیں ہوا کرتے بی بی۔ دل سے مان کر نکاح کر لو۔ جب بھی موقع ملا نکلنے کا تو جو دل چاہے فیصلہ کر لینا۔"
اس نے ایک اور سوچ... پتا نہیں صحیح تھی یا غلط... مہاہ کے منتشر اور تھکے ہوئے ذہن کو تھما دی۔
اور واقعی... جب تک مہاہ کی دلی رضامندی نہ ہوتی، یہ نکاح جائز ہی کہاں تھا۔ نہ اس کے ولی پاس تھے نہ گواہان... اور ایسے میں اگر واقعی وہ حق جتانے اس کے پاس آجاتا تو... وہ لرز اٹھی۔ گھٹنوں میں منہ چھپائے وہ زور زور سے رونے لگی۔
اسے یاد آیا... دس دنوں بعد وہ طلال کی دلہن بننے والی تھی۔ مگر نہیں... ہارنا اس کا مقدر تھا۔

☼ ☼ ☼

آفندی ہاؤس میں تو گویا صف ماتم بچھ چکی تھی۔ ملاحہ اور فرزین کی سہیلیوں کو ڈھولک کے لیے منع کر دیا گیا تھا۔ آغا جان کی خرابی طبع کا بہانہ کر کے۔
تائی جان تو بستر پر ہی پڑ گئی تھیں۔ ہر وقت مہاہ مہاہ یا پھر ہائے ہائے کی پکار۔ ملاحہ نے کالج جانا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ بھی مہاہ کو یاد کر کر کے روتی رہتی تھی۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ مہاہ اب کہیں نہیں ہے۔
مرے ہوئے پر تو صبر آجاتا ہے۔ زندہ بچھڑے ہوؤں پر نہیں۔
"مجھے تو موحد اور اس کی ماں پر شک پڑتا ہے مبین صاحب۔ انہوں نے ہی غائب کرایا ہو گا میری مہو کو۔" وہ آج روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
"کیا بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو صدیقہ۔" وہ ان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نرمی سے ٹوک کر بولے۔
"اسی نے کبیر کو بلایا تھا فیکٹری۔ وہ دس منٹ لیٹ ہوا ادھر میری بیٹی غائب ہو گئی۔"
"وہ آفس کے کام سے شہر سے باہر تھا صدیقہ! آفس ریکارڈ موجود ہے۔ میں نے وہاں سے بھی پتا کروایا ہے جہاں موحد موجود تھا۔" انہوں نے رسان سے کہا۔
"آپ نہ مانیں۔ مگر ان دونوں کے علاوہ پوری دنیا میں ہمارا کوئی بھی دشمن نہیں ہے مبین صاحب۔" وہ بضد تھیں۔

"مہو کو اغوا کر کے انہیں کیا حاصل صدیقہ۔" وہ تھکے تھکے انداز میں بولے تو وہ رونے لگیں۔
"مجھے نہیں پتا مبین۔ میری بیٹی مجھے لا کر دیں۔ ہائے میری بچی۔ نجانے کس حال میں ہوگی۔ میری نازوں پلی۔ یا اللہ کن ظالموں کے ہتھے چڑھ گئی۔ تو اپنا رحم کرنا الٰہی۔"
"آمین۔۔۔!" مبین صاحب نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے صدق دل سے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نمیر۔۔۔ یہ تمہاری حرکت ہے نا؟"
کال ملتے ہی تیز لب و لہجے میں وہ اتنے یقین سے بولی کہ اپنی کرسی پر آرام دہ کیفیت میں بیٹھا نمیر آفندی بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا۔ پھر اس کے الفاظ کا مطلب سمجھ میں آتے ہی ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے بولا۔
"کس حرکت کی طرف اشارہ ہے تمہارا؟"
"مہاہ دو تین روز سے گھر سے غائب ہے نمیر۔" وہ دانت پیس کر بولی۔ در حقیقت وہ شاکڈ تھی اور اب غصے میں بھی۔
"اچھا! تو تمہارا زریں خیال یہ ہے کہ وہ محترمہ میرے ساتھ بھاگ گئی ہیں؟" نمیر نے تیکھے لہجے میں پوچھا تو وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گئی۔
"تو۔۔۔؟ کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے؟"
"میری سمجھ میں نہیں آتا سومی! تمہارا اس سارے معاملے سے کیا لینا دینا ہے۔ فضول میں اپنا خون جلا رہی ہو۔"

وہ اسے ٹال رہا تھا۔ سومیہ کو صاف محسوس ہو رہا تھا۔
"اگر تم نے ایسی حرکت کی ہے تو تمہیں شرم آنی چاہیے نمیر۔ بدلہ لینے کے لیے تم نے ایک کمزور لڑکی کو نشانہ بنایا۔" وہ تاسف سے بولی۔
"بدلہ لینے کے لیے وار ہمیشہ کمزور جگہ پر ہی کیا جاتا ہے۔" وہ مطمئن تھا۔
"ہاں۔ جیسے آفندی ہاؤس والوں نے کیا تھا۔ تمہاری ماں پر۔۔۔ کیونکہ وہ وقار آفندی کی کمزوری تھیں اور اب تم بھی اسی انداز میں ان سے بدلہ لے رہے ہو۔۔۔ ہو تو ایک ہی خون نا۔"
وہ سلگ کر بولی۔ تو نمیر آفندی کے دل کو کسی نے کند چھری سے ذبح کیا۔
"برے کے ساتھ برا نہ ہو تو اسے سمجھ کیسے آئے سومیہ جی۔۔۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔
"بس کرو نمیر خدا کے لیے۔ تم ہی بارش کا پہلا قطرہ بن جاؤ۔ ختم کر دو اس دشمنی کو۔"
وہ زچ آ گئی تھی۔ سالوں ہو گئے تھے اس آتش مزاج کو سمجھاتے۔ مگر وہ آج بھی دشمنی کے اسی درجے پر فائز تھا۔ مر جاؤ یا مار ڈالو والا اصول اپنائے۔
"کر دیا بس۔۔۔ ختم کر دی دشمنی۔ اب خوش؟" وہ ایک دم سے بولا تو سومیہ چپ رہ گئی۔
"تو پھر۔۔۔ مہاہ کہاں ہے؟"
"میرے پاس نہیں ہے۔" وہ سکون سے پُر لہجے میں بولا۔
"اب نہیں ہے یا پہلے بھی نہیں تھی؟" سومیہ اس سے اگلوانا چاہ رہی تھی۔
"تم کیا مجھ پر انویسٹی گیشن (تفتیشی) آفیسر لگی ہوئی ہو؟" وہ ناگواری سے بولا تھا۔

"تمہارے اندر بھی آفندی ہاؤس والوں کا ٹچ ہے نمیر۔۔۔! وہ بھی تمہاری طرح ظالم ہیں۔ انسان کی قدر نہ کرنے والے۔" وہ تپی۔ جواباً" نمیر نے ہنس کر اسے اور تپایا۔ "مگر انا اور ضد کے کھیل میں بدلہ تو شاید جیت جائے، مگر ہار صرف مہراہ کا مقدر بنے گی نمیر۔۔۔! جو بالکل بے قصور ہے۔ زرنگار وقار آفندی کی طرح۔"

سر سراتے لہجے میں اس نے کہا تو وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "یہ تو دنیا کا قانون ہے۔ سزا ہمیشہ بے گناہ کو ہی ملتی ہے ڈیئر۔"

"تم ہی کچھ تبدیلی لے آتے۔ ہاتھی کے پاؤں میں پاؤں رکھنا ضروری تھا کیا؟"

"اچھا اب بس کرو۔ بور ہو رہا ہوں میں۔ دوست تم میری ہو اور فیور مہراہ آفندی کی کر رہی ہو۔" وہ فوراً" ہی بدمزاج سا نمیر بن گیا تھا۔

"سچ بتاؤ نمیر! خیریت سے ہے نا مہراہ؟" سومیہ نے ملتجیانہ پوچھا تو قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔

"خیریت سے ہی ہو گی۔۔۔۔ مگر میرے پاس نہیں ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" سومیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔۔ ریڈ کرا دو پولیس کی۔ شاید نکل ہی آئے تمہاری مہراہ آفندی یہاں سے۔" وہ غصے سے بولا اور لائن ہی کاٹ دی۔ اس کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ تھی۔ "مہراہ آفندی۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔ صدیقہ بیگم۔ اب پتا چلے گا تمہیں کہ ایک طوائف کا بیٹا بطور داماد کیسا محسوس ہوتا ہے اور ایک طوائف زادے کی ساس ہونا کیسا لگتا ہے۔"

آج بہت عرصے کے بعد اس کا کھل کر قہقہہ لگانے کا دل چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پولیس میں رپورٹ درج کروانے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ تین روز یوں ہی گزر گئے۔

اور آج چوتھے روز کی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب آفندی ہاؤس میں لینڈ لائن پر کال آئی۔ جو اتفاق سے موحد نے ریسیو کی۔

دوسری جانب سے جانے کیا کہا گیا۔

"جی ہاں۔۔۔ جی جی۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔ یہی گھر ہے۔" فطری طور پر سب ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"جی۔۔۔ ٹھیک ہے۔ اوکے۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں۔ آپ ذرا دھیان رکھیے گا۔" وہ بہ عجلت بولا اور فون رکھ دیا۔

"کیا ہوا۔۔۔ کون تھا؟ کس کا فون تھا موحد۔۔۔۔" مبین صاحب اور سہیل آفندی اس کے پاس آ گئے تھے۔

"کسی نے ایک اشارہ دیا ہے مہراہ کے لیے۔۔۔۔ میں پتا کر کے آتا ہوں۔" وہ تیزی میں تھا۔

"میں ساتھ چلتا ہوں۔۔۔۔" مبین صاحب کی شفقت پدری نے جوش مارا۔

"پکی اطلاع نکلی تو آپ کو بتاؤں گا تایا جان۔ ابھی فی الحال مجھے جانے دیں، پلیز۔"

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ثمرہ ناراض نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان سے نظر چُراتا باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے کبیر کو آواز لگائی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں اسپتال کے استقبالیہ پر پہنچے۔

موحد نے اسپتال سے آنے والی کال اور مریضہ کے متعلق بتایا تو نرس ان کے ساتھ چل پڑی انہیں کمرہ دکھا کر لوٹ گئی۔

موحد نے بے ساختہ کبیر کی طرف دیکھا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔"
وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "جی بہتر۔"
اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے لیڈی ڈاکٹر باہر نکلی۔ موحد تھم سا گیا۔
"آپ؟" ڈاکٹر نے ان دونوں پر نظر ڈالی۔
"جی۔ میں مریضہ کا کزن ہوں۔ آفندی ہاؤس سے۔" موحد نے تعارف کرایا۔
"ہوں۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔
"تین روز پہلے کوئی اس لڑکی کو زخمی حالت میں یہاں چھوڑ گیا تھا۔ سر پر چوٹ آئی تھی اندرونی۔ جس کی وجہ سے وقتی طور پر اس کی یادداشت چلی گئی تھی۔ آج اللہ کا شکر ہے طبیعت سنبھلی تو سب یاد آ گیا۔ اسی نے نمبر دیا تھا گھر کا۔ میں نے ہی اطلاع دی ہے آپ لوگوں کو۔" ڈاکٹر نے تفصیل بتائی تھی۔
"میں مل سکتا ہوں اس سے؟" موحد نے محتاط انداز میں پوچھا۔ کبیر کو بھی شک ہی تھا کہ کوئی اور ہی نہ ہو۔
"جی ضرور۔۔۔ مہماہ آفندی ہی نام ہے نا آپ کی کزن کا؟" وہ مسکرائی۔ تو ایک نظر اسے دیکھ کر موحد فوراً" دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔
اور سامنے ہی بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے مہماہ موجود تھی۔ موحد کو دیکھ کر بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی۔
"مہو۔۔!" موحد نے بے ساختہ اسے پکارا تو وہ رو دی۔ اور پھر روتی ہی چلی گئی۔ بہ آواز بلند۔ خود پر سے قابو کھو کر۔ موحد کا ہاتھ تھام کر۔ جیسے اپنی تمام پونجی لٹا آئی ہو۔۔۔ کیا خبر۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

تائی جان نے تو جب سے سنا کہ موحد کو مہماہ کے بارے کسی نے کوئی اطلاع دی تھی تب سے ان کے دل کو پر لگے ہوئے تھے۔
"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ خود جانے کے بجائے اسے بھیج دیا۔ وہ کہاں کا سگا ہے ہمارا۔"
"جو بھی بات ہوگی وہ اطلاع دے گا صدیقہ۔ اللہ سے رحم مانگو۔" وہ خود بھی دل ہی دل میں محو مناجات تھے انہیں جھڑک دیا۔ مگر ماں کے دل کو سکون کہاں؟
کبھی اٹھتیں، کبھی بیٹھتیں۔ "یا اللہ۔ مہماہ خیریت سے ہو۔ میری بیٹی پر اپنا رحم کرنا مولا۔" ان کا دل بہت بری طرح سے دکھا ہوا تھا۔
گاڑی پورچ میں آکر کھڑی ہوئی تو مہماہ کو لگا اس کی جان نکلنے والی ہے۔
آنے والی قیامت کا وہ صرف اندازہ ہی کر سکتی تھی۔
وہ موحد کی کہنی دبوچے خوف زدہ سی کیفیت میں اندر کی طرف بڑھی اور موحد آفندی خاموش تھا۔۔۔ بے حد خاموش۔ اس نے تمام راستے ایک بھی لفظ مہماہ سے نہ پوچھا تھا۔
تائی جان مہماہ کو دیکھتے ہی چیخ مار کر اس کی طرف لپکی تھیں۔ سر پر بندھی پٹی اور ایک پٹی کلائی پر لپٹی ہوئی تھی۔ مہماہ ماں سے لپٹ کر جو روئی تو پھر جیسے آسمان بھی اشک بار ہو گیا تھا۔
وہ اگلے ہی پل حواس سے بیگانی زمین پر پھسلتی ان کے بازوؤں کے گھیرے سے نکلتی چلی گئی۔ مبین صاحب نے بے قراری سے اپنی راج دلاری کو سنبھالا تھا۔
موحد اچٹتی نگاہ ہوش و حواس سے عاری صوفے پر لیٹی مہماہ پر ڈالنے کے بعد اب آغا جان سمیت ان سب کو مہماہ کے شدید ایکسی ڈنٹ اور اس کے بعد وقتی طور پر یادداشت گم ہو جانے کی تفصیل بتا رہا تھا۔

آغا جان سمیت مہماہ کے والدین کا اعتماد پھر سے لوٹنے لگا کہ ان کی عزت سلامت رہی تھی۔
"یا اللہ.... تیرا شکر۔"

✵ ✵ ✵

طلال کو خبر ملی تو وہ اڑتا ہوا آفندی ہاؤس پہنچا۔
"کہاں سے 'کب' کیسے؟" وہ ملاحہ سے مارے تحیر اور بے یقینی کے سوال پر سوال پوچھتا تھا۔
وہ گڑبڑا گئی۔ پھر اسے ساری تفصیل بتائی تو سکون کی لہر طلال کے تن من کو بھگو گئی۔ مہماہ آفندی بالکل خیریت سے تھی۔
"کہاں ہے وہ ملاحہ؟ مجھے ملنا ہے اس سے۔" وہ بے قرار ہوا۔
"ایک منٹ ٹھہریں۔ میں ذرا دیکھ کر آتی ہوں۔ آپی سو نہ رہی ہوں آپ دیکھیں۔ ایک ہی خاموشی طاری ہے ان پر۔" ملاحہ کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔
مہماہ کے لوٹنے کا سکون تو جو تھا سو تھا' مگر گزرے چار دن ان سب کے چین و آرام اور اعتماد کو بری طرح مجروح کر گئے تھے۔ ان کا اثر ابھی تک باقی تھا۔
"تم پتا کر کے آؤ۔ میں ویٹ کر رہا ہوں۔" وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ ملاحہ سرہلاتی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔
وہ ابھی فوری طور پر اس عروس جان سے مل کر اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اگر وہ ان چار دنوں میں برے حالات سے گزری تھی تو وہ بھی کانٹوں کے بستر پر سویا تھا۔
اوپر سے گھر والوں کا رویہ۔ جو کسی بھی صورت ایک اغوا شدہ لڑکی کو بہو بنانے کو تیار نہ تھے۔ وہ بے اختیار مسکرا رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو تائی جان مہماہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی زبردستی اسے دلیے کا پیالہ کھلا کر فارغ ہوئی تھیں۔ ملاحہ ہلکے سے جوش کے ساتھ مسکراتی ہوئی مہماہ کے بالکل پاس جا کر ٹک گئی۔
اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا اور مسکرا کر بولی۔
"آپی! طلال بھائی آئے ہیں۔"
تائی جان نے تشکر بھری سانس لی۔
ان حالات میں بھی داماد کا ساتھ دینا اور بھرپور اعتماد رکھنا شکر گزاری کے زمرے میں ہی آتا تھا۔
مہماہ کی پوری جان جیسے اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ چہرے پر ایک خوف زدہ سی کیفیت۔ سپید پڑتا رنگ اور.... ایک جھٹکے سے ملاحہ سے اپنا ہاتھ چھڑانا۔
"کون طلال....؟" اس نے بڑی بیگانگی سے پوچھا تھا۔
ملاحہ کی آنکھوں ہی نہیں چہرے پر بھی تحیر اتر آیا۔
"طلال بھائی.... ان سے آپ کی شادی ہونے والی ہے آپی۔" اس نے بے ساختہ یاد دلایا۔
"مل لو مہو.... بہت پریشان رہا ہے وہ بھی۔ بڑی بھاگ دوڑ کی ہے اس نے۔" تائی جان نے پیار سے کہا۔
مگر وہ تکیہ سیدھا کرتی لیٹ گئی۔
"مجھے کسی سے نہیں ملنا ملاحہ....!" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو ملاحہ پریشان سی ماں کا منہ دیکھنے لگی۔
"ایسے مت کہو مہماہ۔ وہ برا محسوس کرے گا۔ تمہاری فکر میں ہی بھاگا چلا آیا ہے نا۔" تائی جان نے نرمی سے

اسے سمجھایا۔
"وہ ملنے آئے گا تو مجھے برا محسوس ہوگا امی۔ اسے واپس بھیج دیں۔"
وہ درشتی سے بولی۔ تو ملاحہ خائف سی ہو کر اٹھ گئی۔
"چلیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں کہہ دیتی ہوں آپی سو چکی ہیں۔"
"اس سے جھوٹ مت بولو۔ وہ پھر آئے گا۔ اسے صاف کہہ دو کہ میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔"
مہراہ نے اسے ٹوک دیا۔ صاف آواز میں۔
سارے آنسو تو جیسے وہ قید خانے میں ہی بہا آئی تھی۔ اب تو صرف فیصلے ہی کرنے تھے۔
اور جو فیصلے کرنا ہی نصیب ٹھہرے ہوں ان پر رونا بے سود ہوتا ہے کہ ان پر مہریں "اوپر" سے ثبت ہو چکی ہوتی ہیں۔
ملاحہ آزردہ سی کمرے سے نکل گئی۔
تائی جان نے خفگی سے مہراہ کو دیکھا۔ "ایسے مت کرو مہو۔ اس کے دل میں خیال آئے گا۔"
"خیال ہی تو نکالنا چاہ رہی ہوں امی۔" وہ اسی بے تاثر انداز میں چھت کو دیکھتے ہوئے بولی تو وہ الجھ سی گئیں۔
سر پر ٹھوڑی کے نیچے سے گزار کر باندھی گئی سفید پٹی کے بیچ اس کا چہرہ زرد.... بہت زرد لگتا تھا۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ ہفتہ بھر رہ گیا ہے شادی میں اور تم اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔"
"ہاں امی.... کیوں کہ میں اس حقیقت کو سمجھ چکی ہوں کہ ہر زمین پر ایڑیاں رگڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ ہر زمین سے آب زم زم نہیں نکلتا۔ میں نے بھی قسمت سے ضد لگانا چھوڑ دی ہے۔" وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔
تائی جان کو خوف محسوس ہوا۔ اس کے سر میں چوٹ کی وجہ سے تین دن تک اس کی یادداشت متاثر رہی تھی۔ کہیں اس چوٹ کا اثر دوبارہ سے تو نہیں ہو رہا۔
(مبین سے کہتی ہوں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں) انہوں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا تھا۔
"چلو ٹھیک ہے۔ ابھی تم آرام کرو۔" وہ اٹھ گئی تھیں۔
"لائٹ بند کر جائیں امی۔ (میں اندھیرے میں رونا چاہتی ہوں)۔" مہراہ نے بھرآئے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی باہر نکل گئیں۔
اور ان کے باہر نکلتے ہی مہراہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنے تمام خساروں پر۔

☼ ☼ ☼

"موحد.... میں نے تمہیں ایک ٹائم پیریڈ دیا ہوا تھا۔ اگر تمہیں یاد ہو تو...."
ثمرہ نے اسے گھیرنا چاہا جو عجلت میں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔
وہ ٹائی کی ناٹ صحیح کرتا آئینے کے سامنے کھڑا بال بناتے ہوئے آئینے میں انہیں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔
"کون سا ٹائم پیریڈ ماما؟ اور کس کام لیے؟"
"شاباش...." انہوں نے گہری سانس بھری۔ "یعنی تمہارے لیے اس معاملے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ جس طرف میرا سارا دھیان رہتا ہے۔"
وہ خفگی سے بولیں۔ وہ خود پر پرفیوم چھڑک کر ان کی طرف آیا۔
"میری پیاری ماما جان۔ ایسا کون سا معاملہ ہے۔ ذرا میری یادداشت پر بھی تو دستک دیں۔" انہیں شانوں سے

تھام کر مسکراتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔
"تمہاری اور سومیہ کی شادی کا۔" وہ مسکرا کر بولیں، مگر ساتھ ہی اپنے شانوں پر اس کے ہاتھوں کی ہلکی پڑتی گرفت کو بھی انہوں نے فوراً" محسوس کر لیا تھا۔
"تم نے وعدہ کیا تھا موحد۔ کہ تم سوچو گے اس بارے میں۔" انہوں نے جلدی سے اسے یاد دلایا۔
"بس ماما۔۔۔ ٹائم ہی نہیں ملا۔" ہاتھ ہٹا کر پلٹتے ہوئے وہ ان کی بات ہنسی میں اڑا کر ہینگر پر سے کوٹ اتار کر پہننے لگا۔
"تو ٹائم نکالو موحد۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں، سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم بس فیصلہ کر لو۔" انہوں نے گویا چٹکی بجا کر حل نکال لیا تھا۔
"واہ۔۔۔" وہ پھر سے ہنسا۔ "یعنی شادی جیسے اہم معاملے کے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ واہ واہ۔" وہ گویا سر دھن رہا تھا۔
"خیر یوں لٹکانے کی بھی ضرورت نہیں۔" انہوں نے ناک بھوں چڑھائی۔
"آپ بے فکر رہیں۔ نہیں لٹکاؤں گا اور جلدی ہی پار لگا دوں گا۔" وہ انہیں یقین دلا رہا تھا۔ اپنا موبائل اور چابیاں اٹھائیں۔
"مجھے تو تمہارے ارادے مشکوک لگ رہے ہیں موحد۔" انہوں نے اسے گھورا تھا۔
"ارے واہ۔۔۔ نجومی ہو گئی ہیں آپ تو۔"
"بکو مت۔۔۔ اور جلدی کرو کوئی فیصلہ۔ میں نہیں چاہتی اس گھر پر چھائی نحوست ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔"
انہوں نے اسے جھڑکا۔ ان کے لب و لہجے میں اوہام بول رہے تھے۔
"کم آن ماما۔ آپ کب سے اتنی وہمی ہو گئی ہیں۔"
وہ انہیں بہلا رہا تھا مگر وہ آزردہ ہونے لگیں۔
"پتا نہیں موحد! اس گھر سے مجھے کبھی بھی سکھ نہیں ملا۔ ان سے کٹ کر ان لوگوں سے دور رہے تو دل کو سکون تھا۔ ان سے رابطہ ہوتے ہی جیسے دوبارہ آندھیوں کی زد میں آ گئے ہیں ہم لوگ۔"
"اب ان کی باری ہے ماما۔" وہ بے ساختہ بولا تھا۔
ثمو نے اسے دیکھا۔ آفس جانے کے لیے مکمل تیار حالت میں وہ بے حد "مکمل" لگ رہا تھا۔ انہوں نے بے اختیار ماشاءاللہ کہا۔ پھر اسے ٹوک دیا۔
"اگر تو تم مہا ہو والے واقعہ کا ذکر اتنے طنزیہ انداز میں کر رہے ہو تو بہت بری بات ہے موحد۔"
"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان کے ساتھ اچھا ہو رہا ہے، مگر بعض اوقات بددعا دینے کی نہیں محض صبر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے بندے پر وہ صبر بہت بھاری پڑ جاتا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہہ کر شانے اچکائے۔
"اللہ سب پر رحم کرے اور سب کو ہدایت دے۔" ثمو نے دعا کی تھی۔ پھر کچھ پڑھ کر موحد پر پھونک ماری اور بولیں۔ "میں سومیہ کے معاملے میں بالکل سنجیدہ ہوں موحد۔"
"تو یہ اس کے لیے جادو بھری پھونکیں مار رہی ہیں مجھ پر؟" وہ مصنوعی تحیر سے بولا تو انہیں ہنسی آ گئی۔
"شٹ اپ۔۔۔"
"آئم سوری ماما۔۔۔" وہ سنجیدہ ہوا۔ "میں سومیہ کے معاملے میں بالکل بھی سنجیدہ نہیں ہوں۔ آپ اس کے لیے

کوئی اور اچھا سا لڑکا دیکھ لیں۔"
آج اس نے کہہ ہی دیا تھا۔ ثمو نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔
"پلیز ماما۔۔۔ آپ جانتی ہیں میں کیوں کہہ رہا ہوں۔ میرے تمام پرابلمز سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ میری زندگی بہت آسان نہیں ہے۔ اور میں سومیہ کو اس ماحول کا حصہ نہیں بنانا چاہتا۔"
اس نے صاف گوئی سے کہا اور جھک کر ان سے پیار لیتے ہوئے ان کے ساتھ ہی کمرے سے باہر کی طرف چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

طلال کی فیملی مہراہ سے ملنے آئی تو اب کی بار ان کا موڈ بہتر تھا۔ مہراہ کے اغوا کی بجائے ایکسی ڈنٹ کی خبر نے سب ہی کے خیالات کا دھارا بدل دیا تھا۔
"کہہ دو میں میڈیسن لے کر سو رہی ہوں۔" مہراہ پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہونے لگی۔
"کم آن آپی۔ ایسی کون سی میڈیسن ہے۔ جو کھا کر اتنی گہری نیند آ گئی۔ وہ بے وقوف نہیں ہیں۔"
ملاحہ خاصا برا مان کر بولی۔ پھر اسے جتایا۔
"آج پھر طلال بھائی ساتھ آئے ہیں۔"
"کہہ دو' زہر کی گولی کھا کے سو گئی ہے۔" اس کی آواز یک لخت بھر آگئی تھی۔ اس نے منہ تک کمبل اوڑھ لیا۔ ملاحہ اندر تک دہل کر رہ گئی۔
مگر ہوا وہی جو مہراہ نے چاہا تھا۔
وہ لوگ ایک گھنٹہ بیٹھے۔ آنٹی بھابھی کمرے میں آئیں' مگر مہراہ کی خود ساختہ نیند نہ ٹوٹی۔
ان لوگوں کے جانے کے بعد اس بار تو تائی جان کو بھی غصہ آیا۔
"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ سسرال والے ہیں تمہارے۔ کوئی اہل محلہ نہیں جنہیں تم اپنی مرضی سے شرف ملاقات بخشو گی۔" وہ تکیہ اونچا کرتی اٹھ بیٹھی۔
"میری کوئی سسرال نہیں ہے امی۔" اس کا لب و لہجہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔
"اور طلال۔۔۔؟ اس کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" انہوں نے طنزیہ پوچھا تھا۔ مہراہ کی آنکھوں میں اضطرابی کیفیت ابھری۔ دل میں بھی قیامت خیز بھونچال آیا' مگر لبوں پر اگلنے کو فقط زہر تھا۔
"کون طلال۔۔۔؟ میں کسی طلال کو نہیں جانتی۔" وہ بڑے حوصلے کے ساتھ آنسو پی کر بولی تھی۔
تائی جان تو ایک طرف رہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے آغا جان اور مبین صاحب بھی ٹھٹک گئے۔
"ہوں۔۔۔" آغا جان کھنکھارے تو دونوں ماں بیٹی سنبھل گئیں۔
"کیا بات ہے مہو! کیا رویہ ہے تمہارا ان لوگوں کے ساتھ۔ کیوں نہیں مل رہیں تم کسی سے؟" آغا جان نے اکھڑے ہوئے انداز میں پوچھا۔
اور ان کے سامنے فراٹے سے زبان چلانے والی مہراہ کی زبان کی نوک پر جیسے کانٹے اگ آئے۔
"تمہارا رویہ اس رشتے کو خراب بھی کر سکتا ہے۔ وہ رشتہ توڑ بھی سکتے ہیں۔"
وہ اسے سمجھانے آئے تھے۔ مبین صاحب نے انہیں مہراہ کا رویہ بتا دیا تھا جو وہ طلال اور اس کی فیملی سے روا رکھے ہوئے تھی۔ اب جب کہ شادی میں محض چند دن باقی تھے۔ آغا جان کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔
"رشتہ تو خراب ہو چکا آغا جان۔" وہ آنسو پیتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی تو کمرے میں داخل ہوتا موحد

آفندی دروازے میں ہی رک گیا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔ اس ذات نے بہت کرم کیا ہے ہم پر۔''

وہ تفاخر سے کہہ رہے تھے۔ پھر انہوں نے عجیب سا منظر دیکھا۔ مہماہ اپنے سر اور ٹھوڑی پہ بندھی پٹی کھول رہی تھی۔

تائی جان نے اسے روکنا چاہا۔ ابھی پرسوں اسی اسپتال سے اسی لیڈی ڈاکٹر سے دوبارہ پٹیاں کروا کر اور دوا لے کر آئے تھے وہ لوگ۔ مہماہ نے ہاتھ سے انہیں پیچھے کر دیا۔

اب وہ اپنی کلائی کی پٹی کھول رہی تھی۔

''یہ دیکھیں.... کوئی زخم نہیں ہے۔ نہ میرے سر پہ نہ کلائی پر۔'' وہ اپنا سر اور کلائی دکھا رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو' لرزتے کپکپاتے ہاتھوں اور وجود کے ساتھ۔ اس کا انداز ہیجانی تھا۔ اس کے سر اور کلائی کی جلد واقعی بے داغ تھی۔

وہ سب گنگ رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''اور یہ دیکھیں....'' اس نے جھک کر ڈسٹ بن میں سے گرہ لگا شاپر نکال کر کھولا۔ اس میں رنگ برنگی کئی گولیاں تھیں۔ لرزتے ہاتھوں سے ان کے سامنے کیں۔

''یہ ساری میڈیسن۔ میں نے ایک بھی ٹیبلٹ نہیں کھائی۔''

''مگر کیوں مہو.... میری بچی....'' تائی جان کو لگا جیسے مہماہ پر کوئی دورہ پھر سے پڑنے لگا ہو۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔

اور موحد سانس روکے جیسے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

''کیوں کہ نہ تو میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور نہ ہی میں کوما میں گئی تھی امی۔'' وہ رونے لگی۔

''کیا بات ہے مہو۔ جلدی سے بتا دو' میرا دل پھٹ جائے گا ورنہ۔'' مبین صاحب کپکپا اٹھے تھے۔

''مجھے کڈنیپ کیا گیا تھا....'' وہ بھنچے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کون.... کس نے؟'' آغا جان کا اونچا شملہ پھر سے تھرتھرانے لگا۔ ان کی آواز سرسراتی ہوئی تھی۔

''نمیر وقار آفندی نے آغا جان.... آپ کے وقار آفندی کا بیٹا۔'' وہ پھپھک کر رو دی تھی۔

ان تمام نفوس کے وجود پر سے گویا ٹرین گزر گئی تھی۔ تائی جان تو لڑکھڑا کر اس کے بستر پر گر سی گئیں۔

''میرے اللہ!!'' مگر مہماہ کی کہانی ابھی ختم کہاں ہوئی تھی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''اس نے.... زبردستی.... نکاح کر لیا مجھ سے آغا جان۔'' کیا ہی وقار آفندی کے زرنگار سے نکاح نے اس گھر پر قیامت ڈھائی ہو گی.... جو پرخچے آج آفندی ہاؤس کے اڑے تھے۔ مہماہ اور نمیر وقار آفندی کے نکاح سے۔

موحد آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر چلا گیا۔

آغا جان لڑکھڑائے' سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی۔ مبین صاحب نے بے اختیار انہیں تھام کر کرسی پر بٹھایا۔ اور یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے آغا ذوالفقار علی خان کی آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھی۔

کمرے میں مہماہ کی ہچکیاں گونج رہی تھیں اور آفندی ہاؤس والوں کی زندگیاں ایک سوالیہ نشان بن گئی تھیں۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

فوزیہ اشرف

فیصلہ

رشیدہ بیگم نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ حسنہ نے اندر جھانکا اور منہ بنا کر پیچھے ہٹ گئی ”چلو جی یہاں تو لمبے ٹائم والا کام چل رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ رشیدہ بیگم کی دعا نماز سے بھی لمبی ہوتی ہے۔ اور انہیں دعا مانگتے وقت کسی دوسرے کا پکارا جانا یا شور و کھٹکا بہت گراں گزرتا تھا۔ سارے گھر کے لیے نام بنام دعا مانگا کرتی تھیں وہ۔ پھر محلے اور ملنے جلنے والوں کی باری آتی۔

وہ ایسی ہی تھیں محبتوں سے گندھی۔ سراپا ملنسار۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک، عبادت گزار۔ ساری ساری رات رو رو کر اللہ کو پکارتے گزر جاتی، محلے کے لوگ باقاعدہ آکر دعا کے لیے درخواست کرتے تھے۔ کسی کا مقدمہ چل رہا ہے۔ کسی کے گھر بیماری ہے؟ کوئی گھریلو خاندانی جھگڑا ہے۔ سب دوا کے ساتھ ساتھ رشیدہ بیگم کے پاس دعا کروانے ضرور آتے تھے۔

”اماں جی تو دعا کر رہی ہیں رو رو کر۔ شکر ہے ان کی آنکھیں بند تھیں ورنہ اگر جو دعا میں خلل پڑ جاتا تو انہوں نے بعد میں مجھے چھوڑنا نہیں تھا۔“ حسنہ نے پھولی سانسوں کے ساتھ کچن میں پہنچ کر صالحہ بیگم سے کہا۔

”تو آرام سے نہیں آسکتی۔ لگتا ہے خوب دوڑتی بھاگتی آئی ہے۔ چل دو گھڑی بیٹھ کر سانس بحال کر اپنی۔ پھر اگلا کام کرنا۔“ صالحہ خاتون نے قدرے خفگی سے کہا۔

”آپ نے ہی کہا تھا کہ جلدی آکر بتاؤں اماں جی اس وقت خالی چائے پئیں گی یا ساتھ کچھ کھانا پسند کریں گی۔ دیر ہو جاتی تو پھر آپ نے ہی ڈانٹنا تھا۔“ حسنہ نے منہ پھلا کر کہا۔

”ہاں تیرا تو سر قلم کروا دینا تھا میں نے۔ جلاد تیار کھڑا تھا تیرے لیے۔“ صالحہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

”مچھلی دھو کر مسالا لگا دیا ہے میں نے رات کے کھانے کے لیے۔ وقت کے وقت فرائی ہو جائے گی۔ اب میں تو جا رہی ہوں نماز پڑھنے۔ تم دھیان سے سارے برتن اکٹھے کر کے دھو ڈالو۔ پھر بچیوں کو بلاؤ آ کر شام کی چائے کی تیاری کریں۔ ان کی تو باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔“ صالحہ بیگم نے ہاتھ دھو کر مچھلی والا بڑا پیالہ فرج میں رکھا اور باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

رشیدہ بیگم کے دو بیٹے تھے اسرار اور اعتزاز۔ اسرار کی تین بیٹیاں تھیں۔ شانزہ، ثمائزہ اور حوریہ۔ جبکہ اعتزاز کے دو بچے تھے۔ ستارہ اور ابراہیم۔ رشیدہ بیگم کی ایک ہی بیٹی تھی گلناز۔ جو بہت امیر کبیر خاندان میں بیاہ کر گئی تھی اس کا ایک ہی بیٹا تھا عذیر۔

رشیدہ بیگم اپنے سب سے بڑے بیٹے اسرار کے پاس ہی رہا کرتی تھیں۔ آج اسرار کی بڑی بیٹی شانزہ کے رشتے کے سلسلے میں لوگ آرہے تھے۔

☆ ☆ ☆

”شانزہ آپی! تم تو نہا کر اچھے سے کپڑے پہنو اور مزے سے اے۔ سی چلا کر بیٹھو۔ موج ہے تمہاری۔ اب کام تو ہماری ہی جان ناتواں پر ہو گا۔ مگر کیا کریں تمہاری خاطر یہ بھی منظور ہے۔ بس اللہ جلدی سے تمہارے ہاتھ پیلے کرے۔“ ثمائزہ نے مزاحیہ انداز

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سے ہاتھ نچا کر کہا۔
"چلو شائزہ کچن میں چلیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں امی کا پیمانہ صبر لبریز ہو جانا ہے اور پھر ہمارے لیے کہیں جائے امان نہیں ہو گی۔" حوریہ نے ہاتھ میں پکڑا رسالہ میز پر رکھا اور چپل پاؤں میں اڑس کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

آج آنے والا رشتہ "تقریباً" پکا ہی تھا۔ وہ لوگ کئی چکر لگا گئے تھے۔ ایک بار یہ لوگ بھی جا کر لڑکا اور گھر بار دیکھ آئے تھے۔ انہیں بھی رشتہ پسند تھا اور وہ لوگ تو دل و جان سے فدا تھے شائزہ پر۔ بس آج کل میں فائنل فیصلہ ہونے والا تھا۔ شائزہ کے مقدر کا۔ سو اسی لیے آج صالحہ بیگم نے خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔

مہمانوں کو رات کے کھانے پر بھی روکنا تھا۔ دراصل آج لڑکے کی ماں نمرہ خاتون سے بھی ملاقات ہونی تھی۔ ورنہ جب سے بات چیت چلی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ عمرے کی غرض سے سعودیہ گئی ہوئی تھیں۔ اور ساری بات چیت لڑکے کی پھوپھوں اور دادی سے چل رہی تھی۔ لہٰذا آج کا مہمانوں کا یہ دورہ زیادہ اہمیت کا حامل تھا ان کے لیے۔

"ابراہیم اٹھ جاؤ اب۔ اف توبہ اتنی لمبی نیند۔ چلو اٹھو اب۔ فریش ہو جاؤ نہا کر۔" نمرہ نے ابراہیم کو اٹھایا۔

"اف مما! اٹھ جاتا ہوں۔ آپ بھی ناں کیا کروانا ہے مجھ سے۔"

"کروانے کے بچے بتایا تو تھا صبح آج تمہارے تایا کے گھر مہمان آنے والے ہیں۔ مجھے بھی کہا تھا صالحہ بھابھی نے آنے کو۔" نمرہ نے مدعا بیان کیا۔

"اچھا چلتے ہیں ناں اتنی جلدی کیا ہے۔"

"جلدی کے بچے مہمانوں سے پہلے پہنچ جانا چاہیے ہمیں۔ بس اٹھ جاؤ اب۔ میں ستارہ کو اٹھاتی ہوں۔" نمرہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

"آگئیں محترمہ یہ نہیں کہ ذرا جلدی آجاؤ۔ اب بھی نہ آتیں جب سب ریڈی ہو جاتا تو بلا لیتے شہزادی صاحبہ کو۔" شمائزہ نے تیزی سے سموسے بناتے ہوئے کہا۔

"وہ بس ٹریفک میں پھنس گئے تھے اس لیے۔ لاؤ میرے حصے کا کام بتاؤ۔" ستارہ نے آستین اوپر چڑھا کر سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔

"دہی بھلوں کی تیاری کرو۔ جلدی سے۔ میں بس ادھر سے فارغ ہو کر حوریہ کی فروٹ چاٹ بنانے میں مدد کرواتی ہوں۔ چنا چاٹ بھی بن چکی' باقی نمکو' گلاب جامن اور کیک ابو آفس سے آتے ہوئے لے کر آئیں گے۔" شمائزہ نے لگے ہاتھوں مینیو بھی بتا ڈالا۔

"کھانا پکانے کا کیا سین ہے۔" ستارہ نے دہی بھلوں کے لیے پھلکیاں نکالتے ہوئے کہا۔

"وہ تو سب سیٹ ہے۔ مچھلی کو امی نے مسالا لگا کر رکھ دیا ہے' پلاؤ کے لیے بھی یخنی بنا کر مسالا تیار ہے۔ چاول چن لیے ہیں' کھیر تو امی نے رات کو بنا کر ٹھنڈی ہونے کے لیے فریج میں رکھ دی تھی۔ وائٹ چکن حوریہ بنائے گی اور میں اور تم ابھی پیٹ پوجا کرنے کے بعد مٹن قورمہ بنالیں گے اور کھانوں کو فائنل ٹچ دے کر سلاد تیار کرلیں گے۔ نان تو بازار سے ہی آئیں گے۔ اگر کچھ اور کرنا ہے تو تم مشورہ دے دو۔"

"نہیں ٹھیک ہے اتنا کچھ تو ہے۔ بس یاد سے اندر چائے بھجوانے سے پہلے اپنے لیے کھانے کے لیے نکال لینا۔" ستارہ نے یاددہانی کروائی۔

"ہاں خوب یاد دلایا۔ آج تو خوب پلیٹیں بھر بھر کر نکالوں گی' پچھلی بار کی کسر بھی آج پوری کروں گی۔ یاد ہے ساری چیزیں اندر بھجوادیں تو ہمارے لیے کچھ بھی نہ بچا۔" شمائزہ ہنسی۔

"یہ خوب رواج ہے دادی کا ڈالا ہوا کہ جس کا رشتہ کرنا ہے وہی لڑکی اندر آئے۔ باقی باہر ہی رہیں گی۔ ورنہ میں نے تو اندر گھس کر بھی کچھ نہ کچھ کھا ہی آنا تھا۔ اور وہ لوگ بھی اتنے ندیدے تھے کہ سارا کچھ چٹ کر گئے۔ اب ایسی غلطی نہیں کرنی۔" ستارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

ان کے اسی ندیدے پن کی وجہ سے تو دادی نے وہاں رشتہ نہیں ہونے دیا۔ ان لوگوں کی عادتیں دادو کو پسند نہیں آئیں۔ ورنہ اپنی شائزہ آپی کو تو جو ایک بار دیکھ لیتا ہے لٹو ہی ہو جاتا ہے۔" شمائزہ نے بتایا۔

یہ حقیقت تھی کہ اسرار احمد کی تینوں بچیاں بہت خوب صورت تھیں۔ مانو یوں جیسے چراغ لے کر بھی ان جیسا حسن و سلیقہ نہ ملے۔ رشتوں کی قطار تھی مگر دادو کے فرمان کے بغیر گھر میں پتا بھی نہ ہلتا تھا۔

دادو ہر ہر بات کو باریک بین نظروں سے دیکھتی تھیں اور دونوں بیٹے تو تھے ہی ماں کے دیوانے' ہر بات ماں سے پوچھ کر۔ ہر کام ماں کے کہنے پر حتیٰ کہ کھانا بھی ماں کی پسند کا پکتا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ خود ہی اتنی اچھی تھیں کہ گھر میں کبھی بھی اپنی مرضی نہ چلائی' بلکہ سب گھر والوں کی پسند ناپسند کے چکر میں پڑی رہتی تھیں۔

آج کل وہ اپنی بڑی پوتی کے لیے رشتہ دیکھ رہی تھیں۔ کہیں کوئی بات آڑے آجاتی کہیں کوئی۔ پچھلی بار تو فائنل ہوتے ہوتے لڑکے والوں کے ندیدے پن

کی وجہ سے رہ گیا۔ دادو کو بہت غصہ تھا کہ کیا خاندانی لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ پلیٹوں میں رکھا سب چٹ کر جاؤ۔ پتا نہیں اپنے گھر کھانے کو نہیں ملتا شاید۔

وہ کہا کرتی تھیں کہ رشتہ طے کرتے وقت چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مد نظر رکھو اور باریک بینی سے جائزہ لو۔ بچیوں کی ساری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے۔

ثمائزہ کا رشتہ تو دادو نے اپنے تئیں اپنی بیٹی گلناز کے گھر طے کیا ہوا تھا' اس کا بیٹا عذیر دادو کو اپنی ثمائزہ کے لیے بھا گیا تھا۔ حالانکہ عذیر کی طبیعت میں لاابالی پن بہت زیادہ تھا۔

کئی بار دبے لفظوں میں اسرار صاحب نے بھی اماں سے اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی تھی اور لڑکیاں تو جب بھی فیس بک پر اس کے دیے گئے مختلف اسٹیٹس چیک کرتیں۔ اماں کو ضرور باتوں باتوں میں بتایا کرتیں کہ آج عذیر کی فلاں کے ساتھ دوستی ہے اور کل فلاں کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔ مگر پتا نہیں کیوں اماں جی ابھی تک ان کی باتوں کو سرسری انداز میں لے رہی تھیں۔ اور اپنے فیصلے پر قائم تھیں۔

گھر والے منتظر تھے کہ کب اماں کی نظریں باریک بینی سے اس معاملے کا جائزہ لیں گی اور سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔

صالحہ بیگم تو اپنی دیورانی ثمو سے سمدھن کا رشتہ جوڑنے پر دل و جاں سے راضی تھیں۔ خود ابراہیم اور اس کے گھر والے ہر وقت ثمائزہ اور ابراہیم کے رشتے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مگر نجانے کیوں ابھی اماں بی کو فی الحال عذیر اتنا اچھا رہا تھا۔

بہرحال اسرار صاحب کو یقین تھا کہ ان کی اتنی زیادہ سمجھ دار اماں جان ثمائزہ کے مستقبل کا کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گی۔ ابھی تو وہ اس معاملے کو سرسری لے رہی ہیں اور ثمائزہ کے رشتے کی طرف ان کی ساری توجہ ہے۔

البتہ صالحہ بیگم کا دل ڈوبتا تھا۔ جب بھی اس معاملے کو سوچتیں۔ ان کے خیال میں گلناز نے اپنی زمینوں' کوٹھیوں' روپے پیسے کے چرچے کر کر کے اماں کو عذیر اور ثمائزہ کے رشتے پر راضی کر ہی لیا ہے۔

یہ حقیقت بھی تھی اپنے بیٹے کے فلرٹ کے قصے تو وہ کم ہی اماں جان کو سنایا کرتیں بلکہ وہ تو اپنے بیٹے کو مذہب سے لگاؤ رکھنے والا بنا کر پیش کرتی تھیں۔ جیسے اس جیسا کوئی اچھا ہی نہیں۔

چاہے لندن عیش کرنے گیا ہو مگر وہ کہتیں "اماں عمرہ کرنے جانا تھا تو لندن والا کام بھی کر آئے گا۔"

"اب ان حالات میں اماں بی درست فیصلہ کہاں کر پائیں گی۔" صالحہ بیگم کو یہ ہی پریشانی تھی۔ ویسے بھی نواسے کے مقابلے میں پوتا کہاں نظر آئے گا۔ یہ پریشانی تو تقریباً" دونوں گھروں میں تھی۔

مگر پھر بھی سب اچھا ہونے کی آس میں دن گن رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"لڑکیوں کہاں تک پہنچی تمہاری تیاری۔" صالحہ بیگم نے کچن میں جھانکا۔

"امی ریڈی ہے سب کچھ۔" ثمائزہ نے ماں کو تسلی دی۔

"دہی بڑے چیک کرواؤ۔ مرچیں زیادہ تو نہیں۔" صالحہ بیگم اسٹول پر بیٹھ گئیں۔

"سموسے ان کے آنے پر تلنے کے لیے کڑاہی میں ڈالنا۔ یہ نہ ہو اوون میں گرم کرنے کے چکر میں پہلے ہی تل تلا کر فارغ ہو جاؤ۔" صالحہ بیگم کی تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"پتا ہے امی پتا ہے۔" حوریہ نے کہا۔

"کبھی ہم پر بھی اعتماد کر لیا کریں' تائی امی۔" ستارہ نے بھی کہا۔

"مہمان گھر سے نکل گئے ہیں۔ ابھی ابھی اسرار کو فون آیا ہے۔" ثمو کچن میں داخل ہوئیں۔

"امی جائیں آپ اندر۔ پریشان نہ ہوں۔ سب کچھ ریڈی اور اے۔ ون ہے۔" حوریہ نے ماں کو تسلی دی۔

"اور ہاں شانزہ کو ہی بھیجنا اندر... کہیں تم ساری کی ساری ٹپک پڑو۔" ثمو نے جاتے جاتے بھی شانزہ کی طرف دیکھ کر یاددہانی کروائی۔

"جی یہ بھی پتا ہے۔" حوریہ کے کہنے پر تینوں نے قہقہہ لگایا۔

"توبہ ہے ان لڑکیوں سے تو۔" ثمو کہتے ہوئے کچن سے نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

شانزہ ٹرالی ڈرائنگ روم میں پہنچا کر سب سے ملنے کے بعد باہر جا چکی تھی۔

"یہ سموسے لیں ناں آپ۔ گھر کے بنے ہوئے ہیں۔" ثمو نے لڑکے کی ماں نمرہ خاتون کی پلیٹ میں سموسہ رکھا۔

"جی جی میں 'وہ تو...'" وہ ایک دم بوکھلا گئیں۔

"آپا گھر کے بنے ہیں۔ صحت کے لیے کوئی نقصان نہیں ان کا۔ اچھے والے گھی میں تلے ہیں۔" صالحہ بیگم نے تسلی دی۔

"کیچپ ڈال لیں۔" ثمو نے کیچپ کی بوتل پکڑائی۔ پکڑتے پکڑتے بھی نمرہ خاتون کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ کر نیچے جا گری۔

"کوئی بات نہیں۔" ثمو نے جلدی سے انہیں تسلی دی۔

لڑکے کی ماں نے باتوں میں زیادہ حصہ نہیں لیا۔ البتہ لڑکے کی دادی خوب زور و شور سے باتوں میں مصروف رہیں۔ ساتھ لڑکے کا باپ اور ایک اس کا بھائی تھا۔ مردانی باتوں میں لگے رہے۔

چائے کے تھوڑے دیر بعد لڑکے کی دادی نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ "بہن اب آپ جلد ہی چکر لگائیں ہم لوگ منتظر رہیں گے۔"

"جی ضرور۔" اماں بی مسکرائیں۔

اسرار صاحب اماں کی طرف دیکھ کر ہولے سے کھنکھارے مگر اماں بی بے نیازی سے بیٹھی رہیں۔ قریب بیٹھی صالحہ بیگم نے اماں کا ہاتھ دبایا مگر اماں ٹس سے مس نہ ہوئیں اور مہمان اٹھ کر سب سے ملنے لگے۔ اسرار صاحب بے چین ہوئے مگر ماں کے اشارے پر چپکے ہو رہے اور مہمان چلے گئے۔

"اماں! آج تو مہمانوں کو کھانے پر روکنا تھا۔" ثمو بس مہمانوں کے جانے تک ہی صبر کر سکیں۔

"روکنا تھا اگر ہمارے دل میں اترتے تو..." ابراہیم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دادو کا فقرہ سنا۔

"اماں! دل میں تو وہ پہلے ہی اتر چکے تھے۔ باہر کب نکلے دل سے۔" ابراہیم کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

اعتزاز صاحب نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ جب بڑے بات کر رہے ہوں تو مت بولا کرو۔" ثمو نے ڈپٹ کر کہا۔

"میں بھی بڑا ہو گیا ہوں۔ کیوں دادو۔" ابراہیم نے دادی کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک بازو دادی کے شانے پر پھیلا دیا۔

"صالحہ بیٹی' بوا نورن کے ہاتھ انکار کہلوا دینا ان لوگوں کو۔" سب کے منہ حیرت سے کھلے۔

"اور تم اعتزاز! جو اس دن اپنے جنرل منیجر کے بیٹے کا ذکر کر رہے تھے وہی جو ڈاکٹر ہے ثنا ہسپتال میں ان لوگوں کو بلوا لو کسی دن۔" اماں بی اعتزاز صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

"مگر اماں! آج کیا بات ہوئی؟" ابراہیم نے آہستہ سے پوچھا سب کی سوالیہ نظریں اماں جی کی طرف اٹھ گئیں۔

"جانتی ہوں یہ سوال تم سب کے دلوں میں کھدبد کر رہا ہے۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ مخاطب ہوئیں۔

"آج تمہیں نمرہ خاتون کے چہرے کی بے بسی اور اس کی ساس کا رعب و دبدبہ نظر نہیں آیا۔ بار بار اس کی ساس سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھتی تھی۔

جس کی وجہ سے وہ گھبرا جاتی تھی۔ اور بے چاری کچھ کھا بھی نہ سکی۔

اس میں اعتماد ہی نہ تھا تو جس گھر میں پرائی بیٹی کو لا کر اس کا خون اس طرح خشک کیا جاتا ہے۔ وہاں ہم اپنی بیٹی کیوں دیں گے وہاں تو آج تک نمرہ خاتون اپنی

حیثیت نہ منوا سکیں تو ہماری بچی کیا کرے گی۔"
"مگر اماں ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کی غلط فہمی ہو۔"
اسرار صاحب نے نکتہ نکالا۔
"میں بھی عورت ہوں اور ساس کا عہدہ بھی رکھتی ہوں۔ اگر میں دوسری عورت کے رنگ ڈھنگ نہ پہچانوں گی تو اور کون جان پائے گا۔ انہوں سہما سہما کر رکھا ہوا ہے۔ اپنی بہو کو' صرف ساس کی چلتی ہے۔ جو وہ اپنی بے وقوفی سے زیادہ ہی چلا رہی ہے۔ مگر خیر... چلو اب کھانا بنواؤ سب کے لیے۔ اللہ بہتر کرے گا پریشانی والی کیا بات ہے۔
یہ اب جن لوگوں کو بلانے کے لیے۔ اعتزاز کو کہا ہے وہ کافی اچھے لوگ ہیں۔ امید ہے یہاں ہم اپنی بچی کا رشتہ کر ہی دیں گے دراصل یہ رشتہ پہلے والے رشتے کے بعد میں آیا تھا تو میں نے سوچا کہ جہاں پہلے بات چل رہی ہے اگر وہاں ہی بات بن جائے تو اچھا ہے کیا نئے لوگوں سے ملنا۔ مگر اب ان سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔
تم لوگ وہاں تقریباً" بات طے ہی سمجھو۔ وہ لوگ تو بہت بے چین ہیں اپنی شانزہ کے لیے۔ انہوں نے کسی میلاد میں دیکھا تھا شانزہ کو۔
اب کھانے والے کو دیکھو گی تم لوگ یا ہڑتال ہے؟" اماں جی نے ثمو اور صالحہ بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً" اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئیں کہ بچیوں کو کھانا جو تقریباً" تیار تھا۔ لگانے کو کہیں۔

☼ ☼ ☼

رات کھانے پر دعوت کا سماں تھا۔ اماں بی بہت خوش تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے اور ان کی اولادیں اکٹھی بیٹھ کر آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں تو وہ کیوں نہ خوش ہوتیں۔
اچانک سب کی توجہ خبروں نے اپنی جانب مبذول کروالی۔ "مری میں 4200 گاڑیاں داخل ہو گئیں۔ ٹریفک جام ہو گیا۔ رہنے کے لیے کمرے دستیاب ہیں نہ دوسری سہولیات۔ کھانے پینے کی اشیاء کی قلت ہو گئی۔"
اب فوٹو گرافر کے کیمرے کا رخ سڑک پر لمبی قطاروں میں لگی گاڑیوں کی طرف تھا۔ جن میں سے لوگ اپنی اپنی گاڑیاں مقفل کر کے پریشانی کے عالم میں باہر نکل رہے تھے۔
"ارے وہ تو عذیر کی گاڑی ہے۔" اعتزاز صاحب نے بھانجے کی گاڑی پہچان کر کہا۔
اب سب کی نظریں اسی گاڑی پر جمی تھیں' اماں بی کو خود اس ہلکے سبز رنگ کی ہنڈا سوک کا نمبر زبانی یاد تھا۔ پچھلی بار جب گلناز آئیں تو بطور خاص اماں کو اس گاڑی میں بٹھا کر سیر کروائی تھی اور بتایا تھا کہ اماں عذیر کو یہ نئی گاڑی لے کر دی ہے۔ علیحدہ سے۔ اس کا نمبر تو دیکھیں کتنا آسان ہے۔ انہوں نے خود اماں کی توجہ نمبر کی طرف مبذول کروائی تھی۔
اب اماں سمیت سب ہی اس گاڑی سے باہر نکلتے عذیر اور اس کی چچازاد کزن کو دیکھ رہے تھے۔ جو گہرے گلے والی فل سلیو ٹاپ اور جینز میں ملبوس اب عذیر کے ساتھ چپک کر چل رہی تھی۔
اب کیمرہ دوسرے لوگوں کو دکھا رہا تھا کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یوں لگتا جیسے اماں جی گہری سوچ میں ہیں۔
اچانک انہوں نے ثمو اور اعتزاز کو مخاطب کیا۔ "اب تم کتنی دیر کرو گے۔ اگر آج شانزہ کا رشتہ طے نہیں ہو سکا تو ثمائزہ کا تو ہو سکتا ہے ناں۔"
"جی..." ثمو حیران رہ گئیں' خوشی سے ان سے تو بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری۔
"کھلی ہو گی اماں۔ کھلی ہو گی آپ کی بہو کی انگلی میں۔" ستارہ نے ماں کا ارادہ بھانپتے ہوئے شور مچایا۔
ثمو نے فوراً" انگوٹھی انگلی میں واپس پہنی۔ گلے سے سونے کا لاکٹ اتار کر ثمائزہ کے گلے میں ڈالا اور اب وہ پاس پڑے کھیر کے ڈونگے سے ہی چمچ بھر کر ثمائزہ کو کھلا رہی تھیں۔ اور کمرے میں سب کے قہقہے گونج رہے تھے۔
☼

مصباح علی سید

سبزے سے لدے پہاڑوں کی چوٹیاں پانی سے بھرے سیاہ بادلوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ مخملیں زمردی چادر میں لپٹا پتھریلا راستہ کسی دوشیزہ کی طرح بل کھاتا نیچے کی جانب جاتا تھا۔ اوپر آسمان پر دلہن کی طرح شرماتا سنہری سورج بمشکل کسی بادل کی درز سے جھانکنے کی کوشش کرتا ٹھنڈی کرنوں کو ادھر ہوا گھرکتی، بادل زور سے ڈپٹ دیتا۔ لجلجایا سا سورج پھر کسی چٹان کی اوٹ میں سر نہیوڑا لیتا۔ فضا میں تیرتے مست بگولوں کے سروں نے خوشبودار ہوا کو مترنم کر دیا، چہار سو رباب کے تار بکھر گئے۔ چٹان کے داہنی طرف گہرے پانی کی نیلی جھیل تھی۔

وہ جھیل کنارے بیٹھی اپنا جال پانی میں پھینکتی دائرے بنا کر ڈوبتے جال میں نیلی، سنہری، نارنجی چکنی مچھلیاں سب آ گئیں۔ بھاری جال اس سے اوپر کھینچنا مشکل تھا۔ اس نے پوری قوت لگائی یک لخت کوئی چوڑا سا ہاتھ آگے بڑھا اور جال کو اس کے ہاتھ سے کچھ ہی فاصلے سے مضبوطی سے پکڑا۔ گرفت مضبوط تھی، جال اوپر اٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ پانی کی سطح سے بھی اوپر آ گیا۔ اس کی ہرنی سی بھوری آنکھیں تحیر سے پھیلتی رہیں۔ نازک ہاتھوں کی گرفت بالکل ڈھیلی پڑ گئی۔ کپکپاتی لانبی پلکیں دھیرے سے اٹھیں۔ بصارت مہربان کا چہرہ دیکھنے کو بے تاب تھی۔

اس کا چہرہ خاصا دھندلا تھا۔ اس نے پوری کوشش سے اسے دیکھنا چاہا۔ وہ جال کنارے پر رکھتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بھرے بھرے ہونٹ واضح ہوئے۔ معانی خیز مسکان میں پھیلی سیاہ مونچھوں سے ہوتی نگاہ ابھی رخساروں تک کا سفر کرنے لگی تھی کہ چاندی کی تاروں کا ریشمی سا پردہ درمیان میں آ گرا۔ ہر تار پر تتلیاں جگنو لپٹے تھے وہ اس کے مقابل کھڑی تھی اور اپنی مخروطی انگلیوں سے پردہ درمیان سے چاک کیا۔ وہ جال چھوڑ، رخ بدلے جا رہا تھا۔ بے آب تڑپتی مچھلیاں، کروٹیں بدلتی ایک ایک کر کے کھلے جال سے جھیل میں گرنے لگیں۔ مچھلیوں کے پانی میں جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فرق پڑتا تھا تو اس

اجنبی کے بنا ملاقات کیے یوں چلے جانے سے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی۔ فلانچ بھر کر کندھے سے جا پکڑا۔ چہرہ نقاب میں تھا۔ اسے الجھن ہونے لگی۔

"کیا زنانہ خصلت ہے، سامنے آتا بھی ہے، دکھائی بھی نہیں دیتا۔"

بے ساختہ اس کا دل گدگدایا۔ نازک کامنی سا ہاتھ اس کے چہرے کی جانب بڑھا تھا کہ نقاب نوچ لے۔ ہوا حریف بنی تھم گئی۔ بادلوں نے رقیبوں جیسی چنگھاڑ مچائی۔ کیا جی جمائی اسمبلی میں اپوزیشن جماعتوں کی تالیاں پیٹنے پر نعرہ بازی ہوتی ہو گی جو اس کے گرد شروع ہو گئی تھی۔ ٹپ ٹپ بوندوں نے موسلا دھار مینہ کا روپ دھار لیا۔ جگنو، تتلیاں تاروں سے پھسل پانی کی نظر ہو گئیں۔ رنگین مچھلیاں جھیل کی سطح پر تیرتی ٹاٹا بائے بائے کرتی کنارے سے دور جا رہی تھیں اور وہ؟ وہ تو لگتا تھا نمک کا دیوتا تھا بارش کے پانی میں گھل کر کہیں غائب ہو گیا۔ بس اک جل تھل تالاب اس کے گرد بچا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بھیگے چہرے پر پھیرتے پٹ سے آسمان کو تکنا چاہا۔

"تم.....!"

چھڑکاؤ کرتی اریبہ کو دیکھ کر اس کا تن من سلگ گیا۔ سرخ آنکھوں میں تندی لیے خونخوار شیرنی کی طرح غرائی تھی "تم ابھی کے ابھی میرے ہاتھوں سے قتل ہو جاؤ گی، اچھی بھلی نقاب کشائی کرنے لگی تھی، تم اپنی منحوس صورت لے کر آ گئیں....."

نیند سے جاگی، غصے میں وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔ دمکتی رنگت میں گلابی ڈورے اریبہ نے دانت نکوسے ادا سے پوچھا۔ "کس کی؟"

"کسی کی نہیں۔" جل تھل پلنگ سے وہ ذرا کنارے تک سرکی "اس سے پہلے کہ تم واجب القتل ہو جاؤ..... یہاں سے صورت گم کرو۔"

چچا اعظم کی یہ بیٹی اسے قطعاً" پسند نہیں تھی حالانکہ پورے خاندان میں اس کی ہم عمر ہم راز سہیلی تھی مگر جب جب اس کے کسی معاملے میں دخل اندازی کرتی اس کا جی چاہتا کہ اسے صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ سب سے پہلے تو تین ماہ بعد ہی دنیا میں آ کر اس کی اہمیت گھٹائی، جوں جوں بڑی ہوئی ہر چیز میں حصہ دار اور جب بڑی ہو گئی تو اپنی چاپلوس فطرت کے تحت دادی کے سامنے اس کے نمبر گھٹانے کی کوشش کرتی۔

جانے وہ کرتی بھی تھی یا صرف منعم کے دماغ کا خلل تھا اور آج تو حد ہی کر دی۔ لو بتاؤ، خواب میں گھس کر ہر چیز تحلیل کر دی۔ منعم کا جی چاہا زومبی بن کر اس کا خون پی جائے۔ نہیں تو کم از کم جو اس کے ہاتھ میں چمکتا کانچ کا گلاس ہے وہی کھینچ کر اس کے ماتھے پر آلو بنا دے۔ اس کی اکتاہٹ بھری کیفیت سے لطف اندوز ہوتے وہ سامنے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی اور پوچھا۔

"کوئی لپالو یونانی دیوتا، کوہ قاف پلٹ شہزادہ ہی دیکھ رہی ہوں گی، ہے نا؟"

دن بدن اس کی معانی خیز مسکراہٹ ڈھکے چھپے جملے اسے تپ چڑھا رہے تھے۔ یا تو وہ کچھ چھپا رہی تھی یا پھر خوامخواہ اترانے کی بیماری۔ فون پر بھی اکثر باتیں کرتے معانی خیز قہقہے اس کے مردہ ہوتے ضمیر کی گواہی تھے۔ منعم کا جی چاہتا اسپیکر پر ایسی جوابی چنگھاڑ مارے کم از کم ایک کان سے تو بہری ہو ہی جائے۔ اب بھی اس کے ترچھے چتون اسے اکسا گئے وہ چلائی۔

"بکواس نہیں کرو، کوئی لپالو، بھالو نہیں ہے اور میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔"

"جی نہیں منعم میڈم ذرا تصحیح کر لیں میں نہیں جا رہی۔" اس نے کندھے اچکائے اور ایک بے کار میں نکلی لٹ خوامخواہ انگلی پر لپیٹنے کی کوشش کی "البتہ آپ کے جانے کی بھرپور تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

اس نے نا سمجھی میں بھنویں اچکائیں مگر اس کی جاسوسی مسکراہٹ تپا ہی گئی۔ "کیا بکواس ہے، اب پھوٹو بھی۔"

"تو محترمہ" اس نے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔ "محترمہ منعم طارق حسین صاحبہ، میں یہ پھوٹ رہی ہوں" وہ کہتے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی مبادا وہ کچھ مار کر پھوڑ ہی نہ دے "آپ کی دادی بتول حسین صاحبہ کے کمرے میں

آپ کا ذکر خیر چل رہا ہے' باندی کی اطلاع پر دادی نے کمرے کو رونق بخش دیں۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے مجھ سے اس انداز میں بات نہ کیا کرو۔" اس نے تکیہ اٹھا کر مارا اس نے کیچ کر لیا۔

"میں تمہارا منہ..."

"میرا منہ توڑ دیں گی۔" اس نے لقمہ دیا۔ "تو بی بی منعم آپ کے لیے پورے منہ کا انتظام کیا جا رہا ہے' خوب توڑیے گا' تڑوایئے گا... اسی سلسلے میں آپ کی پیشی ہے۔"

"مطلب...؟"

"مطلب یہ" وہ اپنے انداز میں لوٹی "کہ دادی بلا رہی ہیں' انسان بن کر جلدی آجاؤ' تمہارا دیس نکالا جاری ہونے والا ہے۔" وہ کہہ کر فوراً بھاگ گئی۔ منعم کی پلکیں پہلے سمٹیں پھر پھیلیں۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے دوپٹہ پھیلایا۔ "ایک تو دادی بھی ناں۔"

وہ پانچ ماہ کے اسپیشل میڈیکل کورس کے بعد آج ہی راولپنڈی سے لاہور آئی تھی۔ ان پانچ ماہ میں شروع کے ہفتوں میں چند دن کے لیے ایک فری کیمپ کے سلسلے میں یہاں آنا ہوا۔ اسے تب ہی اندازہ ہو گیا تھا دادی اس کے بغیر کس قدر اداس اور فکر مند ہیں اور وہ خود کون سا خوش تھی لیکن وہ کورس بھی دادی کی طرح بے حد ضروری تھا۔ اور اب واپسی ہوئی تو ہاسٹل کی تھکا دینے والی زندگی' سخت پریکٹس کے بعد آج فراغت ملی تھی۔ وہ دل کھول کر سونا چاہتی تھی۔ اونچے نیچے دلکش راستوں کے سفر نے خواب بھی دلفریب بنا دیا مگر بھلا ہو دادی کی محبت کا اور اس اریبہ کا جو کہرام برپا کرنے آ گئی۔ دادی کے فرمان نے تو چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

"شام کو اچھا سا تیار ہو جانا۔" بھلا پوچھو کوئی گندا سا بھی تیار ہوتا ہے۔ خیر وہ مزید کہہ رہی تھیں "تمہاری بڑی دادی آ رہی ہیں۔"

"بڑی دادی!"

جانے ہر روز یہ بڑی دادی کہاں سے پیدا ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ آج تک سمجھ نہ پائی۔ بتول حسین (دادی) حد درجہ سادہ لوح' عام فہم سی تھیں۔ دل کی اس قدر پر خلوص کہ جس سے ملتیں' محبت کا اٹوٹ رشتہ جوڑ لیتیں۔ ایک بار ملاقات کرنے والا برسوں یاد رکھتا تھا۔ اور اگر کوئی ہم عمر' ہم مزاج مل جاتا تو بس' سب کے لیے اسے اپنے ہم منصب رشتے پر فائز کر لیتیں۔ البتہ حد درجہ سادگی میں بھی عمر کا خیال بدرجہ اتم موجود تھا۔ اپنی ہم عمر تو ہم عمر' چند سال چھوٹی کو بھی آپا کہہ کر بلاتیں اور سب بچوں کی وہ بن جاتیں بڑی دادی۔ منعم نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"کون سی والی بڑی دادی اور کیوں آ رہی ہیں؟"

میٹھی نیند سے جگا کر اسے بطور خاص مطلع کیا جا رہا تھا۔ وال کا کالا اس کی خاص سمجھ میں نہیں آیا۔ دادی کے برابر بیٹھے چاچا اعظم کو دیکھا ان کی معانی خیز مسکراہٹ مزید الجھا گئی۔ وہ اٹھے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھا اور اماں سے کہا۔

"ماں جی انتظام کے لیے جو کچھ چاہیے' زبیدہ کو بتا دینا' وہ منگوا لے گی۔" دادی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کوئی مجھے بھی بتائے' کون ہے' کیوں آ رہا ہے..." چاچا کے باہر نکلتے ہی دادی نے اسے گھر کا۔ "کیا مطلب کون؟ بھلے تیرا منہ چوسی امبی (چوسا آم) جیسا ہو گیا' مگر بھیجا نہیں۔ جو مطلب سمجھ نہ آئے۔"

دادی اس کے چہرے کو تب ہی نشانہ بناتیں جب دن بدن بڑھتی ہوئی پڑھائی اور بڑھتی عمر انہیں پریشان کرتی۔ انہیں اندر تک ہول اٹھتے "پڑھ پڑھ کر اپنی جان سوکھے کانٹے جیسی کر لی' نین نقشہ تو پہلے ہی الو جیسا تھا اوپر سے یہ موٹی عینک چڑھا لی' آگ لگے تیری ان ڈگریوں کو بجن کے پیچھے رنگ روپ جھونک دیا۔" غلطی سے بھی اعظم چچا حمایت کرتے تو بے بھاؤ کی سنتے۔

"سارے خاندان نے اپنی بیس' بیس کی بیاہ دیں اور تو پڑھانے لکھوانے کے چکر میں اپنے سینے پر مونگ دلوا' ایک چھوڑ دو' دو... جب چونڈے سفید ہو جائیں گے تو چاندی کے ظروف بنا کر سجا لیو' رشتے کے

لیے تو کوئی پھٹکے گا بھی نہیں، ہونہہ..... لڑکی ذات کون گھر میں رکھے، ہاتھ پیلے کرکے بھیج۔"

بھلے کوئی یرقان زدہ سمجھ کر منہ بھی نہ لگائے۔

پر ناجی شادی ہو جائے۔ جیسے ہی اس کا ایم بی بی ایس مکمل ہوا، دادی کا ایک پاؤں گھر اور دوسرا رشتے والی خالہ کے ساتھ۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا دن کی چوتھائی گھڑی میں اسے رخصت کردیں۔ تانگے پر ڈھول رکھ رشتے کی منادی کریں یا مسجد میں اعلان۔ بس کہیں سے کوئی اچھا رشتہ آجائے اور اسے چلتا کریں۔ اسے تو کئی بار دادی کے ساتھ باہر آتے جاتے خوف محسوس ہوا کہیں کسی راہگیر کے ساتھ ہی چلتا نہ کردیں اور اب تو جناب سالم رشتہ موجود تھا۔

اور موجود کیا؟ سمجھو آدھا نکاح کردیا تھا۔ بس راولپنڈی والے کورس کے ختم ہونے کا انتظار تھا کہ آئے اور نکاح نامے پر دستخط کردے، یہ بھی صد شکر کہ جلدی میں دادی نے اپنا انگوٹھا نہیں لگادیا۔

☆ ☆ ☆

دادی بم پھوڑ کر ہلکی پھلکی ہوگئی تھیں اور زبیدہ چچی کے لگتا تھا پاؤں کی جگہ پہیے لگ گئے۔ اٹھا پٹخ جھاڑ پونچھ، گھر میں آفت مچا رکھی تھی۔ مہمانوں نے کل آنا تھا اور چچی نے سب کا ناطقہ بند کردیا، کرفیو سا سماں۔ ڈرائنگ روم میں جھانکنے تک کی اجازت نہ تھی۔ جہاں سے چیز اٹھاؤ، واپس وہاں رکھو۔

اریبہ نے جھوٹا چمچ غلطی سے کرسی کی ہتھی پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد ٹھک کرکے اس کی کمر پر بجا۔ بے چاری چھپکلی کے خوف سے چلائی تھی۔ کتابیں رسالے سب اپنی اپنی جگہ پر، چچا کو اپنا گھر خاصا پرایا لگ رہا تھا۔ کتنی بار لاؤنج میں قدم رکھتے چونکے۔

"میں کسی ہمسائے کے گھر تو نہیں آگیا....."

"جی نہیں" بیگم جو تھکی ہوئی تھیں فوراً بولیں "اگر ہمسائے کے ہوتے تو اب تھانے سے برآمد کرنا پڑتا، کسی کے گھر بلا اجازت قدم رکھنے کے جرم میں۔"

اریبہ کی کمر کام کرکر کے دہری ہوچلی تھی، باہر کی جھاڑ پونچھ سے فارغ ہوکر کچن میں برتن خشک کررہی تھی۔ ساتھ چائے بنانے کے لیے پانی بھی چولہے پر رکھا تھا۔ اچانک ہاتھ ٹکرانے سے گلاس کاؤنٹر سے نیچے جاگرا۔

"چھن.....!"

"کیا توڑ دیا..." زبیدہ فوراً "حاضر ہوئیں اور بولیں۔

"توڑو، توڑو... سارے توڑ دو، جو رہ گئے ہیں ناں وہ بھی توڑ دو۔ آئندہ پانی پینے کے لیے گلاس کی جگہ لوٹے لایا کروں گی۔"

"ایک تو لوٹا یاد آجاتا ہے آپ کو فوراً" "ہونہہ۔" کانچ سمیٹ کر اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ "اچھی مصیبت ہے، شادی منعم کی، جہیز، بری، دولہا اسے ملے گا، اور مزدوری کے ساتھ جھاڑ میں سنوں۔"

"بے فکر رہو...." انہوں نے آگے بڑھ کر ابلتی چائے کا چولہا بند کیا۔ "جب تمہاری باری ہوگی بلالوں گی منعم کو....."

"بالکل، بالکل۔" اس نے دو کپ کاؤنٹر پر رکھے چائے انڈیلنے لگی "وہ تو جیسے آہی جائے گی، میاں نہیں آنے دے رہے، ساس بیمار ہے، چھوٹو کا دانت نکل رہا ہے۔"

اس کا ٹیڑھا میڑھا منہ، بگڑی آواز، زبیدہ کا جھانپڑ کھا کر سب سیدھا ہوگیا۔ "دفعان ہوجا، ابھی رشتہ پکا ہوا نہیں ہم چھلے چھٹی تک پہنچ گئیں۔ حد ہوگئی، کام کرتے ہاتھ ٹوٹتے ہیں، فرشتے دکھائی دیتے ہیں، چلی جا یہاں سے، کرلوں گی میں خود۔"

"لو جی۔" تحیر سے وہ تقریباً "اچھلی تھی۔ "جب سارا کام ہوگیا، تو آپ فرمارہی ہیں، کرلوں گی میں خود..... یہی بات چند گھنٹے پہلے کہہ دیتیں، قسم سے میں بالکل مروت نہ کرتی۔"

وہ دونوں کپ اٹھا کر اپنے اور منعم کے کمرے کی جانب تقریباً "بھاگتے ہوئے بڑھی تھی کیونکہ امی جوان اولاد پر ہاتھ اٹھاتے ذرا نہ جھجکتی تھیں۔

وہ سر تھامے بیڈ کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ خوب

صورتی سے اسٹیپس میں کٹے بال دونوں جانب سے پھسل اس کی گردن اور رخسار کو چھو رہے تھے۔ اریبہ نے کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا ڈیئر؟"

چہرہ سرعت سے اٹھا۔ دھواں دھواں نیلی آنکھیں بھیگے گلابی گال لمحہ بھر کے لیے اس سنڈریلا پر اریبہ کو ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

"ارے رو کیوں رہی ہو؟" وہ اس کے بالکل پاس بیٹھ گئی۔ ہاتھ سے بال کان کے پیچھے کیے۔

"جیسے تم تو جانتی ہی نہیں میں کیوں رو رہی ہوں۔" رندھی آواز نے اس میں مزید دلکشی بھر دی' جی میں آیا اسے سب بتا دے مگر سرپرائز بھی کسی بلا کا نام ہے یا نہیں۔

"اوہ مائی ڈیئر کل صرف وہ لوگ دیکھنے آ رہے ہیں' زیادہ سے زیادہ ایک انگوٹھی ڈال کر بیعانہ دے دیں گے' بارات نہیں لا رہے۔ جو ابھی سے رونے کی پریکٹس شروع کر دی۔"

اس کا جملہ جلتی پر تیل کا کام کر گیا اور وہ سوکھی لکڑیوں کی طرح جلنے لگی "تم کیا سمجھتی ہو میں مان جاؤں گی' آنے دو انہیں ذرا اپنی ٹانگیں تڑوا کر گلے میں لٹکا کر جائیں گے' بڑے آئے۔۔۔ نہیں کرنا مجھے کوئی شادی وادی۔" وہ چلاتی ہوئی اٹھی اور کمرے کے وسط میں کھڑی ہو گئی۔

"میری جان! کون کہہ رہا ہے کرو۔" اریبہ نے تجاہل عارفانہ سے کہتے کپ اٹھایا' ایک گھونٹ بھر کر اس کے غصے سے لطف اندوز ہوتے کہا۔

"ابھی تو وہ صرف تمہارا مکھڑا دیکھنے آ رہے ہیں' بقول دادی کے سوکھا چھوہارہ۔۔۔۔ پسند آتا بھی ہے یا نہیں۔۔۔۔"

"میں اس وقت بہت غصے میں ہوں' فضول مت بولو۔" اس نے مٹھیاں بند کر کے لمبے لمبے سانس لیے' ذرا توقف سے بولی "مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی نائی سے ملنے کا۔"

ہنسی روکنے کے چکر میں اریبہ کو اچھو لگ گیا اور

گرم چائے کا اچھو بڑی تکلیف دیتا ہے۔ مگر اس وقت منعم کو اس کی ذرا پروا نہیں تھی' وہ اپنے مسئلے میں الجھی بیٹھی تھی۔

"دادی نے آخر سوچ بھی کیسے لیا کہ میری شادی کسی نائی سے کروائیں گی' نائی بھی وہ جو درزی بننے کا اضافی شوق رکھتا ہو۔" اریبہ کا چہرہ اچھو اور اس کے دلفریب غصے سے دہک رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پیا۔ گلاس واپس رکھ اس کے قریب چلی آئی۔

"میری بات سنو۔"

"مجھے کسی کی کوئی بات نہیں سننا اریبہ! میں پھر سے کہہ رہی ہوں' میں یہ شادی نہیں کروں گی' جان دے دوں گی' چھت سے کود جاؤں گی۔"

"چہ چہ چہ۔" اریبہ مسکرائی۔ "پھر تو تم انتہائی بے وقوفی کرو گی' ہماری چھت زیادہ سے زیادہ دس گیارہ فٹ اونچی ہے' زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا' تمہاری ٹانگ یا پھر کمر کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ پھر تو نائی کیا' سونھو بھی شادی نہیں کرے گا تم سے۔"

وہ شیرنی کی طرح جھپٹی' اریبہ قدرے پیچھے ہو گئی۔

"ایک آئیڈیا دیتی ہوں' درخت سے لٹک جانا' مگر نہیں۔" چہرے پر تمام بیچارگی اتر آئی۔ "اس طرح تو صرف شاخ ٹوٹے گی اور کسی معصوم پرندے کا گھونسلہ... پنکھا... پنکھا صحیح ہے۔"

"او ہیلو' پنکھا کہاں سے صحیح ہے۔" شیری (اریبہ سے چھوٹا) ابھی کمرے میں آیا تھا' چند جملوں سے ہی موضوع بحث پتا چل گیا اور اپنا تجزیہ پیش کر رہا تھا۔

"بجلی کی عدم دستیابی کے سبب اسے گھومنے کی عادت نہیں ہے اور زنگ آلود ہے آپا کو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا' البتہ پنکھے سمیت بیڈ پر گر گئیں' بیڈ کی ٹانگ ضرور ٹوٹ جائے گی... اور ٹوٹی ٹانگ والے بیڈ کے نیچے اینٹیں رکھ کر ہماری زندگی گزرے گی' یہ محترمہ تو نئے بیڈ کے مزے لوٹیں گی اور جھولا ہماری قسمت میں۔"

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی ہمارے معاملے میں بولنے کی۔"

منعم کی ڈپٹ کا اس پر ذرہ برابر جو اثر ہوا ہو۔ "آپا بازار سے چوہے مار گولیاں لا دیتا ہوں' اگر آپ کی قسمت نے ساتھ دیا' گولیاں خالص نکلیں' سمجھو کام ہو گیا' ورنہ بھگتنا اپنے نائی کو۔"

پھر وہ لمحہ بھر نہ رکا' منعم نے اپنی سینڈل اتار لی تھی۔

اریبہ نے اسے سنبھالا۔ "اتنا غصہ نہ کرو ڈیئر' ذرا غور کرو' جب تم ہسپتال سے تھکی ہوئی آؤ گی' تیار فریش کھانا ملے گا' جدید طرز کے کپڑے مفت میں سلیں گے' اور کیا چاہیے۔"

"مدد نہیں کر سکتیں تو دفع ہو جاؤ۔" اب کے گھونسا مار ہی دیا' وہ کندھا سہلانے لگی۔

"نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔"

"تو یہ نیکی تم کیوں نہیں کر لیتیں تم اٹھا لو نا فائدہ تم دکھائی نہیں دیتیں دادی کو' مجھ سے زیادہ چھوٹی نہیں ہو' صرف چند ماہ کا فرق ہے۔"

"اوہ ڈیئر..." وہ ڈھٹائی کے ریکارڈ توڑتے ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھ گئی۔ "وہ کیا کہتے ہیں' دادی کو تم سے بہت پیار ہے ناں' تم ان کی پہلی' چہیتی پوتی ہو' ورنہ میں تو سر کے بل اس رشتے کے لیے تیار ہوں۔"

منعم کے تلووں لگی سر پر بجھی۔ "سب جانتی ہوں تمہاری اداکاری اور فرمانبرداری' تم ہمیشہ اپنے نمبر بنوانے کے لیے دادی کی ہاں میں ہاں ملاتی ہو' تمہیں پتا ہے تم ہاں کر دو گی اور تمہارے والدین اپنے طور پر انکار کر دیں گے' ظاہر ہے وہ اپنی سافٹ ویئر انجینئر بیٹی کو کسی نائی قصائی کے ساتھ تو نہیں بیاہ سکتے' سو جتنیں' دلیلیں نکال دادی کو قائل کر لیں گے' یہ تو میں ہی ہوں ناں قربانی کا بکرا جس کا کوئی والی وارث نہیں' کسی بھی راہگیر کو ہاتھ پکڑا' چلتا کرو' بوجھ ہوں اتار پھینکو... اگر میرے والدین کو میرا احساس ہوتا تو کوئی میرے ساتھ ایسا کر سکتا تھا' بنا پوچھے' بتائے نائی سے رشتہ طے کر دیا۔" اس کی آواز بھرائی۔ "میرے ساتھ کھڑے ہونے والے ماں باپ جو نہیں ہیں' واقعی جن کے والدین بے حس ہوں نہ' بچے یہی ڈیزرو کرتے ہیں' بلکہ نائی کیوں' کوئی دھوبی' خاکروب' میراثی ڈھونڈ لیتے' جو

نائی کیوں، کوئی دھوبی، خاکروب، میراثی ڈھونڈ لیتے، جو گلے میں ڈھول ڈال تالیاں پیٹتا آتا، مجھے بیاہ لے جاتا۔"

اریبہ کو اس کی منظر کشی پر ہنسی آ رہی تھی بمشکل دبائی۔ وہ اب دھپ سے بیڈ پر بیٹھ کر دھواں دھار رونے لگی تھی۔ وہ اسے چپ کروانے آگے بڑھی اور جیسے سکتے میں آگئی، شیری جاتے ہوئے دروازہ کھول گیا تھا اور اس آدھ کھلے دروازے سے اسے دادی کھڑی نظر آگئی تھیں۔ لٹھے کی طرح سفید پڑتا جھریوں زدہ چہرہ اور آنکھوں میں زمانے بھر کی تھکن آج محسوس ہوئی تھی۔

بے گانی اولاد سے بھلے کتنا ہی لاڈ پیار کر لو، مگر بے اعتبار ہونے میں پل نہیں لگاتی، انہیں اس کی بے اعتباری نے کھڑے قد سے زمین میں اتار دیا تھا۔ خدا جانے انہوں نے کیا کیا سنا تھا اور کیا رہ گیا تھا۔ وہ بمشکل دادی کی جانب بڑھی۔ لیکن اس کے پاس آنے سے پہلے ہی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ دروازہ بند کر لیا۔ اریبہ کو منعم پر دل کھول کر غصہ آیا تھا۔ پلٹی اور اسے بے نقط سنائیں۔

"بولنے سے پہلے بندے کو کچھ سوچ لینا چاہیے، تمہارے لفظ کسی کے دل پر گراں گزر سکتے ہیں۔"

"ہونہہ..." وہ دادی کی آمد سے ابھی تک بے خبر تھی، پیٹھ موڑے ویسے ہی بیٹھی ہونٹ چباتی رہی۔

"میرے رونے، دھونے، احتجاج پر کسی کو فرق نہیں پڑا، الفاظ کس کھاتے میں ہیں۔"

"منعم آنسوؤں سے زیادہ انسان کے تلخ الفاظ، ان کا اظہار کام کرتا ہے، سمجھیں..." اس نے ایک چپت اس کے سر پر مارتے ہوئے کہا تھا۔ مگر وہ نہ سمجھی۔

"کیا... کس کا دل اتنا موم ہو رہا ہے۔ میرے الفاظ سے۔ آج تک ماں باپ کا تو ہوا نہیں، کسی اور پر کیا اثر کریں گے۔"

"دادی... دادی پر کر گئے۔" اریبہ چلائی اور ان کی آمد، واپسی کا بتایا۔

وہ حیران ہوئی ہیں! وہ کب آئیں؟"

✲ ✲ ✲

ان کا کمرہ مغرب کے وقت سے بند تھا۔ اس نے کئی بار کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ رات کے کھانے پر اریبہ نے زبیدہ اور اعظم کو یہ کہہ کر تسلی دی۔

"انہیں بھوک لگ رہی تھی، میں نے کھانا دے دیا۔ اب شاید دوا کھا کر سو گئی ہیں۔" ساس بہو میں ہنسی مذاق میں نوک جھونک ضرور ہوتی تھی مگر دونوں ایک دوسرے کو دل سے چاہتی تھیں، فکر مند بھی ہوتی تھیں بلکہ اس گھر کے تمام افراد ہی ایک دوسرے کے لیے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ تب ہی ان کی غیر حاضری کا پوچھا پھر اطمینان ہوا۔

"ہاں، سارا دن تو انہوں نے فکر میں گزارا، یہ بنالو، وہ کرلو... مہمان خوش جائیں... ظاہر ہے تھک گئی ہوں گی، پھر صبح بھی تو تہجد میں اٹھ جاتی ہیں۔" ان کی اچٹتی نگاہ منعم پر گئی جو پلیٹ میں ڈالا کھانا صرف ٹونگ رہی تھی۔

"صحیح طرح کھاؤ۔ پہلے ہی کمزور ہوتی جا رہی ہو، چہرہ دیکھا ہے اپنا سوکھ سوکھ کر ایک انچ کا ہو گیا۔"

اریبہ نے اپنی مسکراہٹ دبائی اور اس کے پاؤں پر اپنا جوتا مارتے ہوئے کہا۔ "باقی لمبائی دادی پوری کریں گی۔" اس نے کھسیاہٹ میں تھوڑا سا کھانا کھایا۔ البتہ اریبہ اسے مسلسل گھورتے ہوئے احساس دلاتی رہی

"دادی بھوکی سوئی ہیں۔" زبیدہ، اعظم کو اریبہ نے بھنک بھی نہ پڑنے دی لیکن اس سے انتہائی قطعیت سے کہا تھا۔

"دادی جان تم سے ناراض ہیں، مناؤ گی بھی تم اکیلی، امی ابو کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ خوامخواہ ڈپریشن ہو گا۔"

وہ بے چاری کیا کرتی۔ پہلے آہستہ آہستہ ان کا دروازہ بجایا مگر نہیں کھلا، رات کے کھانے پر بھی نہ آئیں، جب سب سونے کے لیے چلے گئے وہ دادی کو

منانے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ آج سے پہلے وہ کبھی ناراض نہیں ہوئی تھیں۔ سوچ سوچ کر دماغ مفلوج ہو رہا تھا۔

اس نے اریبہ سے مشورہ مانگا۔ "کیسے مناؤں؟"

"یہ تو پھوٹنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا' اب مجھے نہیں پتا جو مرضی کرو مگر مناؤ....."

وہ چادر تان سونے کے لیے لیٹ گئی۔

"تمہیں سونے کی پڑی ہے' اگر دادی جان کو کچھ ہو گیا' انہوں نے کچھ غلط کر لیا.... تو۔" اریبہ جھلا کر اٹھی۔ پھر قدرے تحمل سے جتا کر کہنے لگی۔

"پہلی بات ہماری پیاری دادی قطعاً" بے وقوف خواتین میں سے نہیں ہیں جو اپنے ساتھ کچھ غلط کریں اور دوسری بات اب تم ان کے لیے اتنی اہم نہیں رہیں کہ وہ تمہاری بے وفائی میں انتہائی قدم اٹھائیں' تم نے اصلیت دکھا دی.... اور اب مجھے سونے دو۔"

اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ لیٹتی منعم نے چادر کھینچ کر' گولا بنا کر اس کے منہ پر ماری۔ "میں اہم ہوں' دادی آج بھی مجھ سے پیار کرتی ہیں.... سمجھیں تم۔"

اس کے اٹل انداز پر اریبہ نے دانت پیسے۔ "جی نہیں' تم ان کے بارے میں نادر خیالات دے چکی ہو۔"

اس کی بات پر منعم کا دل بھر آیا۔ اس سے پیشتر وہ اپنے سابقہ ریکارڈ کی طرح چلا کر روتی اریبہ نے اسے دروازہ دکھایا تھا۔ "جاؤ اور مناؤ' میری جان چھوڑو۔"

وہ بہت دیر ان کے دروازے پر دستک دیتی رہی' منمنائی' بند کھڑکی کی جالی کے قریب ہو کر دادی کو پکارا۔ مگر مجال ہے کہ اندر سے سوئی گرنے کی بھی آواز آجائے۔ مہیب سناٹا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس کے دماغ میں ترکیب آئی۔ وہ پچھلے صحن کی جانب گئی۔ جہاں دادی کے کمرے کا روشن دان کھلتا تھا۔ اور اسے اچھی طرح سے معلوم تھا دادی وہ کھول کر رکھتی ہیں۔ تاکہ مؤذن کی آواز اور ہوا' روشنی آتی رہے۔ اب دادی غصے میں کھڑکی دروازہ تو بند کر سکتی تھیں مگر روشن دان تک ان کا ہاتھ نہیں جاتا اور یقیناً" کمرے میں ایسی کوئی چیز نہ ہوگی جس سے وہ بند ہو سکے۔ لکڑی کی بوسیدہ سی سیڑھی صحن کے کونے سے اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگائی۔ رات کا سحر انگیز اندھیرا' صاف آسمان پر چاند سے سرگوشیاں کرتے تارے اور گنگناتی ہوا اپنی بے بسی پر اسے قہقہے لگاتے محسوس ہوئے۔ وہ کلمہ پڑھتے آہستہ آہستہ سیڑھی پر چڑھی۔ مبادا گر کر اگلے دانت ہی نہ ٹوٹ جائیں "اف کیسی چڑیل لگوں گی۔"

اللہ کا شکر روشن دان کھلا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ روشن دان میں رکھا اور دوسرا قریب سے گزرتے لوہے کے پرنالے پر۔ پاؤں کی گرفت سیڑھی پر جمائی اور گردن روشن دان میں گھسا ہی دی۔

"دادی.... دادی۔" اس نے سرگوشی کی۔ وہ سامنے مسہری پر بیٹھی بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

"دادی پیچھے کہاں دیکھ رہی ہیں' یہاں اوپر۔"

جیسے ہی انہوں نے چھپکلی کی جگہ اسے لٹکتے دیکھا دہل ہی گئیں۔ "یہ مکھی بن کر کیسے چپک گئی۔" دل تھام لیا۔ "اے یہاں لٹکی کیا کر رہی ہے' کیوں گر گرا کر ٹانگ بازو تڑوائے گی۔"

"آپ دروازہ جو نہیں کھول رہیں۔"

ہاں اسی لیے چوہا بن کر روشن دان سے کودے گی۔ دفع ہو' نیچے اتر۔"

"ایک شرط پر....."

"اے شرط لگاتے ہاتھ نہ چھوڑ دیو....."

"نہیں چھوڑتی' پہلے بتائیں' مانیں گی۔"

"اب بول بھی۔"

"اگر آپ چاہتی ہیں نا میری ٹانگ بازو سلامت رہیں تو پلیز دروازہ کھولیں۔"

"کیوں کھولوں۔" وہ مکر گئیں۔ "میں کیا لگتی ہوں تیری' تیرے بوجھ کو سر سے اتار رہی ہوں ناں۔"

"دادی....." وہ منمنائی۔

"نہ دادی مت کہہ' بتول بی بی کہہ۔ لاوارث ہے نا تو' پھر میں کون تیری' میں کیوں تیری حمایت میں کھڑی ہونے لگی۔"

"دادی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"چل جو بھی تھا' اب تیری ہی چلے گی' میں بھلا جاہل گنوار' رشتے ناتے کیسے کرتے ہیں میں کیا جانوں۔"

"دادی پلیز ایسے نہ کہیں۔" پھر وہ کہتے ساتھ دھواں دھار رونے لگی۔ اس کے بھیگے رخسار اور منمنائی آواز دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا یہ چھبیس سالہ لڑکی ہے' پانچ چھ برس کی ضدی بچی لگ رہی تھی۔ دادی کے دل کو کچھ ہوا۔ مصنوعی خفگی کے ساتھ ہاتھ جوتے کی جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"اب تو اترے گی یا نہیں۔"

"جب تک آپ دروازہ نہیں کھولتیں میں نہیں اتروں گی' دیکھ لیں دادی سیڑھی دیمک زدہ ہے' چرمرکی آوازیں بھی آرہی ہیں' آپ جوتا ماریں گی اور میں دفاع میں پیچھے ہٹی زمین بوس.... بازو' ٹانگیں سب ٹوٹ جائیں گے۔"

"دُر لعنت...." ان کا دل ہول گیا' اسے لتاڑتی اٹھیں اور دروازہ کھول دیا "اب اتر نیچے کم عقل....."

کچھ دیر بعد وہ دادی کے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ بھلے انہوں نے اسے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دے دی مگر ناراضی ابھی تک باقی تھی۔ وہ بہت دیر انہیں منانے کی تگ ودو کرتی رہی مگر وہ چپ۔

"دادی میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

"وہ تو میں اچھی ہوں' تب کرتی ہے۔ ورنہ۔" لہجے میں کوراپن تھا۔

"میرا مطلب وہ نہیں تھا دادی' جو آپ سمجھیں۔"

"چل جو تھا وہ اب بتا دے۔" انہوں نے لیٹنے کے لیے ٹانگیں پھیلائیں۔

"دادی۔" اس نے ان کے گھٹنے سہلائے "میری اچھی دادی' پلیز معاف کردیں۔"

"اچھا کردیا.... میرے گھٹنے چھوڑ' آگے ہی بہت دکھتے ہیں۔" ان کے نروٹھے پن پر اس نے بیچارگی بھری نگاہ اٹھائی اور وہ غور سے دیکھتے کہہ رہی تھیں۔

"اب وہی ہوگا' جو تو چاہے گی۔" وہ ان کے چہرے کو ٹٹول رہی تھی۔

"ناراض تو نہیں ہیں۔"

"ہوں۔" حد کی صاف گوئی "تو سمجھ دار پڑھی لکھی' میں جاہل' کم عقل تیرا میرا کیا میل۔"

وہ تکیہ سیدھا کرکے لیٹ گئی تھیں' وہ بھی "دادی" کہتی ساتھ لپٹ گئی۔ "زیادہ رولا رپاڑا ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے' اگر وہ کل آئے تو کردوں گی صاف انکار۔" دادی نے دوسری جانب رخ پھیر لیا۔

☆ ☆ ☆

وہ باہر سے تھکا ہوا آیا تھا۔ نہادھو کر فریش ہوا' پھر کچن میں جھانکا' حسب معمول تمام برتن جوں کے توں خالی ڈھکے رکھے تھے۔ ایک کوفت بھری نگاہ پیچھے بند دروازے پر ڈالی' جہاں نانی دنیا ومافیہا سے بے خبر سو رہی تھیں۔ اس نے فٹافٹ فریج سے بون لیس چکن کا پیکٹ' مشروم کا کین اور چند سبزیاں نکالیں۔ ان سب کو فرائی کرکے لزانیہ ابال کر ڈش میں سب اوپر تلے بچھایا اور سویٹ چیز ڈال کر چند منٹ کے لیے اوون میں رکھ دیا اور اپنے لیے ایک کپ چائے تیار کرکے اور لاؤنج میں لے آیا۔ وہ گلاس ونڈو کے پاس کھڑا گھونٹ گھونٹ چائے پیتے خود ترتیب دیے اپنے چھوٹے سے لان کو دیکھنے میں محو تھا۔

سوچیں مستقبل کی رتھ پر سوار اس پرسکون لان سے ہوتی کس کس وادی کی سیر کو نکلی تھیں۔ وہ کامنی سی لڑکی ہمراہ تھی۔ بادل' ٹھنڈی بوندیں' مسحور ہوا میں لپٹ کر رنگین رم جھم پھوار برسانے کو بے قرار تھے۔ اس کے سنگ ابھی پوری طرح بھیگنے بھی نہ پایا تھا کہ پشت پر پڑنے والے نانی کے زوردار ہاتھ نے ساری وادی میں زلزلہ برپا کردیا۔ بادل' بارش' ہوا' پھول سب زلزلہ زدگان کی طرح ماتم کناں محسوس ہوئے۔ نانی کی طاقت سے قطعاً اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بوڑھی ہوچکی ہیں۔ اس نے پشت سہلاتے نانی کو دیکھا۔ وہ حسب عادت مسکرا رہی تھیں۔

"تو کب آیا؟"

"اچھا انداز ہے پوچھنے کا۔ ایسے ہی پوچھ لیتیں مہر ضرور ثبت کرنی تھی۔"

اس کی روتی شکل پر نانی کی مسکراہٹ گہری ہو چلی تھی اور وہ شکر کر رہا تھا چائے ختم ہو چکی تھی۔ ورنہ اس جان دار دھپ سے کم از کم پاؤں ضرور جلتے۔ اس نے خالی کپ میز پر رکھا۔

"بہت دیر سے آیا ہوا ہوں' سارے گھر میں آپ کے خراٹے گونج رہے تھے۔"

"اچھا۔"

انہیں اچنبھا ہوا۔ "چل پھر کھانے کا کچھ کر' مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔" وہ پاؤں پسارے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ایسے حکم دیا جیسے سگھڑ بہو آئی ہو۔

"کر چکا ہوں۔ آپ ہاتھ دھوئیں۔" وہ کہہ کر کچن کی جانب بڑھا۔ لزانیہ کی ڈش' پلیٹیں' چمچ کانٹے' کولڈ ڈرنک لیے واپس آیا۔ اس کے ہاتھوں میں تھامی ڈش کو نانی نے نخوت سے دیکھا تھا۔

"کیا تو روز روز دنیا جہان کا الابلا گھول کے مجھے کھلا دیتا ہے۔ مجھ سے نہیں کھائے جاتے ایسے کھانے 'بد ذائقہ' بد شکل۔"

"نانی یار' دنیا جان دیتی ہے ایسی کھانوں پر' آپ گھر بیٹھے مزے لوٹ رہی ہیں۔" اس نے ایک پلیٹ میں لزانیہ ڈال کر انہیں پیش کیا پھر اپنی میں ڈالا۔

"مجھے نہیں دینی اپنی جان وان' میرے ابھی بہت کام پڑے ہیں' ابھی تو تیرے سر پر سہرا سجانا ہے۔ تیری دلہن' تیرے بچے دیکھنے ہیں۔"

پہلے چمچ نے ہی اس کے منہ میں ذائقہ گھول دیا تھا۔ گھنی مونچھوں تلے بھرے ہونٹوں پر مسکان آ ٹھہری۔ اس سے پیشتر کہ وہ وہ سب بتائے جو کچھ دنوں سے بتانا چاہ رہا تھا نانی بول پڑیں۔

"تیرے لیے دلہن کا انتظام کر لیا ہے میں نے۔"

"جی؟" اس کے حلق میں مشروم کا پیس اٹک گیا تھا۔ فوراً" پانی کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے تو پہلے ہی پتا تھا میرا بچہ ہے ہی بہت شرمیلا'

فرماں بردار' میری نزہت کی اولاد ہے بھلا انکار کیوں کرے گا فوراً" جی کہے گا۔" اٹکتے گھونٹ کے ساتھ اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

"اگلے مہینے کی تاریخ پکی کر دی میں نے۔"

اس نے گلاس واپس رکھا قدرے سنبھل کر بولا۔

"لیکن نانی؟"

"کیا لیکن....." انہوں نے اس کی بات اچک لی تھی "بہت پیاری ہے' ایسی خوب صورت ہے کہ کیا بتاؤں۔"

نانی اماں نہ بھی بتاتیں وہ تب بھی نانی کی خوب صورتی کے معیار کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ کام والی ماسی نسیم نانی کو دنیا کی خوب صورت ترین عورت لگتی تھی اور جس دن اس کا میاں اسے مار پیٹ کرتا تو اس کے گہرے سانولے چہرے' بازوں پر پڑنے والے نیل دیکھ کر نانی دہل جاتیں' اپنے سے تین گنا بھاری نسیم کو ایسے پچکارتیں جیسے وہ چار سال کا بچہ ہو۔

"ہائے ہاتھ ٹوٹ جائیں اس بدبخت کان کٹے کے' مل گئی ناں تجھ جیسی پری' قدر نہیں ہے اس دیو کو تیری..... ناس جائے اس کا کیسے حسین چہرے پر نیل ڈال دیے۔" اس کے میاں کو بیش بہا گالیاں دے کر نیم گرم دودھ دیتیں' ہلدی تیل بنا کر ٹکور کے لیے تھماتیں۔ ہلدی تیل کے لیپ میں نسیم' نانی کو مس ورلڈ لگتی تھی۔ دل کی انتہائی سادہ' پر خلوص نانی کو دنیا کا ہر مظلوم شخص خوب صورت ترین اور ظالم بد صورت لگتا تھا۔

کچھ دن پہلے کا واقعہ تھا۔

فلٹر پانی کے کین لانے والا آدمی سامنے گھر میں کین پکڑا رہا تھا۔ ایک کین ہاتھ سے چھوٹا ڈھکن ڈھیلا تھا کچھ پانی چھلک گیا۔ ایک بیس بائیس سال کا بھاری بھر کم لڑکا گھٹنوں سے ذرا نیچے پتلون اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہنے' کانوں میں ہینڈز فری' گنگناتا اور عادتاً" پاؤں گھسیٹ کر چلتا' پانی پر سے گزرا پاؤں پھسل گیا۔ نانی کھڑکی سے دیکھ رہی تھیں وہاں سے ہی چلائیں۔

"او منحوس کالے سانڈ' ٹوٹے ہاتھوں میں دم نہیں

تیرے ' دکھائی نہیں دیتا تجھے ' پھول سا بچہ گرا دیا۔"
پٹھان نے حیرت سے انہیں دیکھا کہ یہ کالا سانڈ مجھے ہی کہا گیا ہے اور پھر اس پھول کو اٹھتے دیکھا جو دنیا کے سب سے بھاری کالے گلاب پر بھی بھاری ہو گا۔ لحہ بھر اس نے پھر سوچا' نانی کی غضیلی آنکھوں کو دیکھ کر اشارتاً "سلام کر کے گاڑی بھگا لے گیا۔ یہ تھا نانی کا خوب صورتی کے لیے معصوم معیار' اب جانے کسی نے کیا ہمدردی کر دی یا پھر کیا ظلم دیکھ کر اس کی رائے لیے بنا اسے سولی چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خوب صورتی کی فرمائش تو وہ کبھی بھولے سے بھی نہ کرتا اس نے فوراً" تعلیم کا سہارا لیا۔
"نانی! مجھے پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا ہے۔"
"ہاں.... تیری بڑی نانی بتا رہی تھیں دس جماعت سے زیادہ پڑھا ہے اس نے اور دسویں میں تو پورے شہر میں سب سے زیادہ نمبر تھے اس کے۔"
اس کی حیرت "دس جماعتیں" کو خاطر میں لائے بغیر وہ کہہ رہی تھیں۔ "تجھے کیسے بتاؤں کتنی اچھی ہے وہ' ایسا نرم ہاتھ ہے اس کا' ٹیکے کی سوئی کا مجھے پتا بھی نہیں چلا' کب سوئی گئی' کب نکالی' ذرا سا روئی کا پھایا ملتے دیکھا' نے.... لگ گیا ٹیکا۔"
"کک' کیا مطلب۔" اس کی بھنوئیں قدرے سکڑیں" نرس ہے وہ؟"
نانی کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ نرس ہے۔ لیکن اسے اس کے پیشے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پیشے سارے ہی محترم تھے۔ مگر اپنے دل کا کیا کرے جو خوامخواہ ہی الجھ گیا تھا۔ ہزار جھٹکنے کے باوجود اسی کا خیال آیا پہلے تو اکثر نظر آجاتی تھی لیکن ان چار پانچ ماہ سے کہیں دکھائی بھی نہیں دی۔ جب جب نانی نے اس کی شادی کا ذکر کیا' ہر بار جی چاہا کہ انہیں اس کے بارے میں بتا دے۔ مگر ہر بار یہ سوچ کر رہ گیا۔ ابھی کیا جلدی ہے اور ویسے بھی نانی تو ہر نیک کام اتنی جلدی کرتی تھیں کہ ہتھیلی پر سرسوں جمالیں۔ اگر غلطی سے بتا بھی دیتا تو فوراً" نہ صرف رشتہ لے جاتیں بلکہ اس کے سر پر سہرا باندھ ہانکتی لے جاتیں۔ شادی ہی اس کی زندگی کا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ شادی سے پہلے وہ اپنے آپ کو مالی لحاظ سے مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ کرائے کے گھر سے بمشکل جان چھوٹی تھی۔ نانی نے اپنا ذاتی گھر صرف اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بیچا تھا۔ دنیا میں کوئی ہو گا اتنا عظیم زلیخا نانی جیسا۔ جنہوں نے اسے سگے ماں باپ سے بڑھ کر چاہا۔ قابل رشک پرورش کی۔ زلیخا نانی سے اس کا خون کا رشتہ نہیں تھا۔ لیکن خونی رشتوں سے بڑھ کر مان دیا تھا۔
نزہت' زلیخا کی پڑوسن تھی۔ انتہائی صابر' فرمانبردار' نیک سیرت اور پھرتیلی سی لڑکی۔ زلیخا نے محلے کی بہت سی لڑکیوں کو قرآن پاک اور گھر گرہستی کی تعلیم دی تھی۔ نزہت ان سب بچیوں میں الگ تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے آتی باتوں باتوں میں ڈھیروں کام نبٹا جاتی۔ شادی سے پہلے تک تو ٹھیک تھا شادی کے بعد بھی اس کے انداز میں فرق نہ آیا۔ زلیخا اسے ہٹاتی رہ جاتیں مگر وہ خالہ خالہ کرتی بہت کچھ سنوار دیتی۔
الماریاں ٹھیک کرتی' پنکھے دروازے صاف' گدے رضائی میں تگندے ڈالتی۔ اور جب اس کی طبیعت بھاری ہوئی تو زلیخا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بٹھایا۔
"ٹک کر بیٹھ جا' دو گھڑی کے لیے آتی ہے.... ملنے آتی ہے یا میرے کام کرنے۔"
"خالہ وہاں بھی تو کرتی ہوں۔"
"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں' سسرال میں کام کرتی ہے' میکے میں آکر آرام کیا کر۔"
میکے کے لفظ پر اک سایہ سا چہرے پر گزرا۔ ماں باپ تھے نہیں' تایا تائی نے بھلے بوجھ سمجھ کر مگر پالا پوسا' جوان ہونے پر قریبی گاؤں میں بیاہ دیا۔ محبت شفقت ساری پڑوسن خالہ زلیخا اور ان کے میاں سرفراز صاحب نے دی تھی۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کے ان سے لپٹ گئی۔
"میرا میکہ تو آپ ہیں خالہ۔"
"تو پھر آرام کر یہاں۔" کٹے سیبوں کی پلیٹ اس کے سامنے رکھی۔
بیٹے کی پیدائش کے بعد نزہت کا شہر آنا قدرے کم

ہو گیا تھا۔ پہلوٹھی کی اولاد' مصروفیت ہی مصروفیت۔ اس کا بیٹا تقریباً" دو سال کا تھا جب خبر ملی کہ چھت گرنے سے نزہت اور اس کا میاں فوت ہو گئے۔ زلیخا پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"ابھی کل تو اس سے بات ہوئی تھی فون پر... ٹھیک ٹھاک تھی یوں اچانک کیسے چلی گئی۔"

وہ نقاہت زدہ حالت میں بمشکل گاؤں تک گئیں۔ دو سال پہلے وہ اس کے بیٹے کی چھوچھک لے کر گئی تھیں اور آج اسی رستے پر اس کا آخری دیدار کرنے۔ ان کا کلیجہ بار بار منہ کو آتا۔ نزہت کا بیٹا باہر دادی کے پاس سو رہا تھا اسی لیے بچ گیا اور سب سے پہلے اسی بچ جانے والی اولاد کی پرورش کا مسئلہ اٹھا۔ ودھیال کے نام پر صرف ایک بوڑھی دادی تھی۔ جو جوان بہو بیٹے کے غم میں نڈھال تھی۔ نحیف بدن میں اتنی سکت نہ تھی کہ بچے کو پال سکے۔ بلکہ خود اپنی بہن کی پاس جانے کا قصہ لیے بیٹھ گئیں۔ نزہت کے تایا تائی پہلے ہی اسے پال چکے تھے اب مزید ذمہ داری سے کتراتے تھے۔ زلیخا کے میاں سرفراز آگے بڑھے اور نزہت کی ساس سے کہا تھا۔

"آپا! نزہت ہمیں اپنی اولاد کی طرح پیاری تھی اور یہ اس کی اولاد ہے' مہربانی کر کے یہ بچہ ہمیں دے دو' پرورش میں کوئی کوتاہی برتی تو قیامت میں گریبان پکڑ لینا۔"

دادی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی مجبوری کے سبب بچہ ان کے حوالے کر ہی دیا۔ شروع میں کبھی کبھار دیکھ جاتی۔ اس بچے کے آنے سے زلیخا کے سونے آنگن میں بہار آگئی تھی۔ اکثر اپنے میاں کو کہتیں۔

"اللہ کے ہر کام میں بڑی دانائی ہے' ہم اکثر شکوہ کرتے تھے ہمارے سارے بہن بھائی صاحب اولاد ہیں ہم کیوں بانجھ رہ گئے' بندہ کتنی جلدی اللہ سے شکوہ و شکایت پر اتر آتا ہے' حالانکہ ہمارا بے اولاد ہونا کسی کی اولاد پلنے کا سبب تھا اللہ ایسے ہی وسیلے بناتا ہے۔"

دونوں نے اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ رکھی تھی۔ سرفراز کے ہارٹ اٹیک کے وقت وہ اٹھارہ سال کا تھا۔ ان کے بعد بھی زلیخا نے اسے کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اور نہ ہی اس نے زلیخا نانی کو اکیلے پن کا احساس ہونے دیا۔ اپنی جوان ہوتی بانہوں کے حصار میں لے لیا تھا۔ "حکمت والا رب اپنے بندوں کو سنبھالنے کے لیے اپنے ہی بندوں میں سبب بناتا ہے۔" اس نے نوکری کرنی چاہی تو' نانی نے منع کر دیا۔

"تیری پڑھنے کی عمر ہے' پنشن سے گزارہ کر لیں گے۔"

جب تعلیمی اخراجات بڑھے' گھر بیچ کر کرائے کا لے لیا۔ اسے ایم بی اے کے بعد ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی تھی۔ باپ کی وراثت سے اچانک رقم ملی' کچھ کمپنی سے ایڈوانس لے کر سب سے پہلے چھوٹا سا گھر خرید ا تھا۔ جسے آج کل وہ اور نانی دونوں مل کر سنوار رہے تھے۔ اتنی مہربان نانی کی جتنی فرماں برداری کرے کم تھا۔ لیکن یہ کیا شادی... بالکل ان جان لڑکی اور دل کسی اور کو ڈھونڈ رہا تھا۔

خالی چمچ ہاتھ میں پکڑے آنکھیں سکیڑے نانی کا خوشی سے تمتماتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی روانی سے اس لڑکی کی روداد سنا رہی تھیں۔ تقریباً" تین ماہ پہلے ان کی کالونی میں ایک رفاہی ادارے نے ہفتے بھر کے لیے میڈیکل کیمپ لگایا تھا۔ پڑوسن نے نانی کو بتایا۔

"خالہ بہت اچھی لیڈی ڈاکٹر آئی ہوئی ہیں' میں خود دوا لے کر آرہی ہوں' آپ بھی جاؤ۔"

"مگر کیمپ تو غریبوں کے لیے ہوتا ہے۔" نانی کو تعجب ہوا۔ "میرا نواسا بہت خوددار ہے' غصہ کرے گا۔"

"اوہو خالہ۔" پڑوسن نے ترغیب دی۔ "تم کون سا منسٹر لگی ہو اور اگر پیسے دینے ہی ہیں تو چندے کا ڈبا رکھا ہوا ہے' اس میں جو مرضی اپنا حصہ ڈال دینا۔"

یہ بات نانی کے دل کو لگی تھی۔

پرچی بنوانے کے بعد وہ بہت دیر سے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ان کی ہم عمر خاتون بھی برابر میں آبیٹھیں۔ اچھے وقتوں کے پر خلوص لوگ باتوں باتوں میں اپنے گھر کے حالات' خاندانی

شجرے تک بتا دیے۔ دونوں باتوں میں اس قدر محو تھیں کہ نمبر پکارنے کا بھی پتا نہ چلا۔ تب احساس ہوا جب گنتی کی چند خواتین بینچ پر رہ گئیں۔

وہ سرخ کاٹن کے سوٹ پر سفید اوور آل پہنے ایک ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ اور دوسرا ہاتھ اوور آل کی جیب میں ڈالے تیز تیز چلتی آ رہی تھی۔ بھورے بالوں کی اونچی پونی سے چند لٹیں سپید چہرے کے گرد نکلی تھیں۔ اس نے اپنی عینک نازک ناک پر جماتے ان خواتین کو دیکھا قدرے چونکی پھر ان ہی کی جانب قدم بڑھائے۔

"دادی آپ! آپ کب سے یہاں بیٹھی ہیں؟" وہ بتول سے مخاطب تھی جو اسے دیکھتے ہی اٹھ گئیں۔

سر پر ہاتھ پھیرا' پیشانی چومی۔ "تجھے کھانا دینے آئی ہوں۔"

دادی کو جس دن سے پتا چلا تھا کہ وہ ہفتے بھر کے لیے اسی کالونی میں کام کرنے آئی ہے۔ جان میں جان آ گئی تھی۔ رات میں تو گھر پر ہوتی تھی' دوپہر کے کھانے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے ذمہ لے لی۔ روزانہ وقت پر کھانا تیار کرواتیں' پیک کروا کر لے آتیں۔ اس نے بہت منع کیا "ہمیں وہاں اچھا کھانا ملتا ہے۔" مگر وہ نہیں مانیں۔

"ایک ہفتے کے لیے تو آئی ہے' پھر چلی جائے گی پنڈی ہاسٹل' اب تینوں وقت گھر کا کھا۔" اسے کھانے کا ٹفن تھماتے ساتھ بیٹھی خاتون کا تعارف بھی کروا دیا تھا۔ "اپنی بڑی دادی کو سلام کر۔"

اس نے سر خم کرتے ہوئے سلام کیا' جواباً وہ اٹھ کر لپٹ گئیں اور آنکھوں میں پانی بھرتے سوچا تھا۔

کتنی خوب صورت بچی ہے' اور ماں باپ کیسے ظالم..... ہک ہا اللہ کیسی بستی ہے تیری' کوئی اولاد کے لیے ترستا ہے اور کوئی پیدا کر کے بھول جاتا ہے' بے شک پالنے والا تو ہی ہے' کیسا اچھا پال دیتا ہے' ماں باپ کے ساتھ بھی ان کے بغیر بھی۔" وہ ان سے الگ ہوتے ہوئے دادی کو گھر واپس جانے کا کہہ رہی تھی تب دادی نے کہا۔

"چلی جاتی ہوں' مگر یہ تیری بڑی دادی کب سے بیٹھی باری کا انتظار کر رہی ہے' مجال ہے جو نمبر آ جائے' جلدی چیک کروا' بہت گھٹنوں میں درد رہتا ہے' دیکھ چہرے پر بھی سوجن ہے' رنگ پیلا پھٹک۔۔۔"

دادی مبالغہ آرائی میں جانے کتنی بیماریاں اور بتا دیتیں اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا' ساتھ ہی پرچی مانگی۔ "لائیں پرچی دکھائیں۔"

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا تعویذ نما کاغذ اسے پکڑا دیا۔ پسینے میں بھیگا کاغذ اس نے قدرے ناگواری سے کھولا۔ نمبر پڑھا۔

"آپ کا نمبر تو کب سے گزر گیا۔"

دادی نانی دونوں کو حیرانی ہوئی۔ "آئیں میں آپ کو چیک کر لیتی ہوں۔" اس نے عارضی بنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ مگر بڑی دادی کہنے لگیں۔

"میں نے بڑی ڈاکٹر کو چیک کروانا ہے۔"

اس سے پہلے وہ کچھ کہتی دادی بول پڑیں "میری پوتی بھی اچھی ڈاکٹر ہے' بڑی اچھی دوائی دیتی ہے' تم کھاؤ گی تو دیکھنا دو دن میں گھوڑے کی طرح چھلانگیں مارو گی۔"

اپنی تعریف اور ان کی سادگی پر وہ قدرے مسکرائی۔

"چلیں میں آپ کو بڑی ڈاکٹر سے چیک کروا دیتی ہوں۔"

ان کے تذبذب پر وہ انہیں اپنی سینئر کے پاس لے گئی۔ انہوں نے چیک اپ کے بعد دوائیں اور انجکشن لکھ دیے۔

انجکشن کا سنتے ہی وہ اچھلیں۔

"میں نے کبھی نہیں لگوائے' سوئی سے ڈر لگتا ہے۔"

"بی بی! ایک ہفتہ لگوا لیں' آپ کی ٹانگوں کا درد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ایک ہفتہ!" ان کی آنکھیں ابل پڑیں۔

کیا کوئی بچہ شور مچاتا ہو گا جو انہوں نے اس وقت مچایا تھا۔ بازو نرس کے ہاتھ میں تھا۔ آخر منعم آگے بڑھی۔ نرس کے ہاتھ سے سرنج پکڑ لی۔

"لائیں میں لگا دیتی ہوں آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

اور واقعی انہیں پتا بھی نہیں چلا۔ انہوں نے اسے ڈھیروں دعائیں دیں اور پھر پورا ہفتہ وہ اس سے ٹیکا لگوانے آتی رہیں۔ بڑی دادی اور دادی کے آنے کے اوقات ایک سے تھے یا خاص طور پر طے کر رکھے تھے۔ وہاں ہی ان کی دوستی ہوئی اور بچوں کا رشتہ بھی طے کر دیا۔ دادی کو ان کے نواسے کی تصویر بے حد پسند آئی تھی۔ اور بڑی دادی کو منعم۔ وہ خوشی سے بولیں۔

"دیکھو آپا۔"

پہلے تو آپا لفظ پر ہی مسئلہ ہوا' یہ طے نہ ہو رہا تھا کون کس کی آپا ہے' خیر اس بات پر متفق ہوئیں کہ دونوں ہی ایک دوسرے کو آپا کہہ لیں گی۔

"آپا دونوں بچے ہی ایک جیسے ہیں' ماں باپ کے بغیر۔" بڑی دادی نے کہا۔

"اللہ رکھے میری پوتی کے ماں باپ دونوں سلامت ہیں' بس ذرا....." آواز میں تاسف ابھرا۔

"ہاں ہاں۔" نانی سنبھل گئیں۔ "میرا مطلب ہے ان کی سرپرستی کے بغیر.... اللہ نے ملائی جوڑی' اک اندھا' اک کوڑی۔"

لو جی نانی کی تیسری غلطی' دادی تو کبھی برداشت نہ کرتیں' فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپا! یہ اندھا کسے کہا ہے۔"

ہاتھ کمر پر جم گئے "میری پوتی کے زیادہ پڑھنے سے عینک ضرور لگ گئی ہے مگر نظر پورا آتا ہے' ہاں البتہ تیرا نواسا ہو گا کوڑھی۔"

"ہائے ہائے آپا' کیسی باتیں کر رہی ہو' چاند کا ٹکڑا ہے میرا نواسا' وہ تو محاورۃً میرے منہ سے نکل گیا۔"

"تو پھر اپنے منہ میں پان ڈال کر رکھا کرو نا' تاکہ پیک کے علاوہ کچھ نہ نکلے۔"

"اوہو آپا!"

نانی نے ہتھیار ڈالے۔ "چلو بات بدل لیتی ہوں۔ اللہ نے ملائی جوڑی اک راجہ' اک گوری۔" یوں دونوں خوش ہو گئیں۔

نانی کی خوشی کا فہد کے سوال "آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟ مجھ سے پوچھے بنا؟" نے مفقود کر دی۔ اس نے پلیٹ میز پر رکھی۔ ان کے اترے چہرے کو دیکھے بنا کمرے میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

تقریباً" آدھی رات کا وقت تھا۔ چھوٹے سے لاؤنج میں وہ بے کلی سے ٹہل رہا تھا۔ کبھی صوفے پر گرنے کے انداز میں ڈھے جاتا' ٹانگیں میز پر پھیلاتا۔ پھر یک لخت گہری سانس لے کر اٹھتا تیز تیز کمرے میں جاتا' دو چار چیزیں الٹ پلٹ کر پیشانی سہلاتا پھر باہر لاؤنج میں۔ بوتل نکال پانی پی' پھر ٹہلنے کا دورہ۔ بھاری ڈیل ڈول کی نانی دوپٹہ جمائے عینک صاف کرتی باہر نکل آئیں۔

"فہد تیرا پیٹ ٹھیک ہے؟"

"جی.... کیوں؟" اسے تعجب ہوا۔

"بہت دیر سے تجھے کھڑکی سے دیکھ رہی ہوں' چکر کاٹ رہا ہے' کمرے میں جاتا ہے' آ کر پانی پیتا ہے' خیریت ہے نا' بیٹھ میں تجھے پھکی دیتی ہوں' اللہ بخشے تیرے نانا کو' حکیم سے نسخہ لکھوا کر لائے تھے' بڑی اکسیر پھکی ہے' سارا مروڑ دور ہو جائے گا۔"

وہ کچن کی جانب بڑھیں وہ گھوم کر سامنے آ کھڑا ہوا۔

"نانی' میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

انہوں نے سر سے پاؤں تک اسے گھورا۔ "پھر کیا باؤلا ہوا ہے' جو یوں آدھی رات کو پھیریاں کاٹ رہا ہے' جا' جا کر سو۔"

"نیند نہیں آ رہی۔"

"اسی لیے کہتی ہوں' یہ رنگ برنگی الا بلا پکا کر نہ کھایا کر' رات کو خوف آتا ہے اس سنڈے' سنڈیوں والے کھانے سے۔"

"نانی یار' پلیز بی سیریس....."

"اچھا چل اب بتا' کیا بات ہے۔" وہ نہایت سنجیدگی سے کہتی سامنے بیٹھ گئیں۔

"آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں' مجھ سے پوچھے بنا۔"

"آئیں... کیا کردیا میں نے، بیٹھی ہی تو ہوں، لے کھڑی ہو جاتی ہوں۔"
وہ کھڑی ہونے لگیں، اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں روکا۔ "نانی یار، پہلے پوری بات تو سن لیا کریں۔"
"اچھا چل بول۔"
"وہ... رات والی بات۔" وہ رک کر بولا "رشتے والی بات کر رہا ہوں۔"
انہوں نے سرعت سے استعجابیہ نگاہ اٹھائی آنکھوں کے دیپ یک لخت ماند پڑ گئے تھے۔
"نانی میں بہت بے ادب بہت برا ہوں..."
اس نے لفظ جوڑنے شروع کیے البتہ نانی صاف گو تھیں "وہ تو خیر تو ہے، اب صاف بتا وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے؟"
یہ تو ابھی تک اسے بھی معلوم نہیں تھا اب ہونٹ کاٹنے کی باری تھی۔ "ہے بھی یا ہوا میں اڑتی ہے۔"

✡ ✡ ✡

وہ فٹ پاتھ پر بہت دیر سے کھڑی بس کی منتظر تھی۔ پاکستانی ٹریفک کے نظام کو دل میں کوستی ڈرائیور کو لیٹ ہونے پر تقریباً پھانسی تک پہنچا چکی تھی۔ سامنے کی بات ہے اگر دیر سے پہنچی تو کسی کی جان جا سکتی ہے۔ اور سارا قصور ڈرائیور کا۔ اس کی خود کلام گالیوں کا سلسلہ قریب زن سے گزرتی بائیک نے توڑا۔ اسپیڈ بریکر پر جمپ لگا آگے بڑھ گیا اور کیریئر سے کچھ اچھل کر زمین پر گرا اس نے بغور دیکھا اور بڑھ کر فائل اٹھائی۔ نام پڑھا اور تقریباً چلاتے ہوئے صدا لگائی۔
"اے مسٹر... او مسٹر فہد۔"
وہ دو چار قدم آگے بڑھی، مخاطب رکنے کے چکر میں نہیں تھا۔ مگر ہوا کی رتھ پر سوار اشارہ بند ملنے پر رک گیا۔ اس کی آواز تو نہ پہنچی مگر دو چار لوگوں نے اشارے سمجھ کر اسے مخاطب کیا۔ اس نے رخ پھیرا، اس لڑکی کے ہاتھ میں لہراتی فائل لمحہ بھر دیکھی پھر خالی کیریئر۔ اسے سمجھنے میں ایک پل لگا جس تیزی سے گیا تھا اس سے زیادہ تیزی سے پلٹا۔ وہ بدک کر پیچھے ہوئی۔ قدرے کھردرے لہجے میں بولی تھی۔
"کیا موت کے کنوئیں میں بائیک چلاتے ہو یا ایک تار پر پہیہ؟"
"جی!" اس کے لمبے سے جی پر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے بھی لمبا جی بولی۔ "جی... یہاں کی ایرانی سرکس نہیں لگا ہوا، یہ سڑک ہے سڑک... اگر ایکسیڈنٹ ہو گیا تو پلیز۔" انگشت اٹھائی "یہ ہسپتال مت آنا، وہاں پہلے ہی ایمرجنسی لگی رہتی ہے۔"
وہ اتنی منہ پھٹ تھی نہیں، جتنی اس وقت بن گئی۔ جہاں اسے خود حیرت تھی وہاں وہ بھی متحیر ہوا۔
پہلی ملاقات اور اتنی جھاڑ۔ فائل ہی گری ہے، اٹھا کر پکڑا دی۔ اس میں ہاسپٹل تک پہنچانے کی کیا تک، خیر۔ وہ تھینک یو جھاڑ چلا گیا۔ انٹرویو دینا تھا نا۔ اس واقعے کے تقریباً" دس پندرہ دن بعد کی بات ہے چچی زبیدہ کا موڈ بے حد خراب تھا۔ میاں کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرنا ہر عورت کی طرح ان کا بھی بہترین مشغلہ تھا۔ اور وہ بھی ساس کے اردگرد۔ دادی مبہم مسکراہٹ دبائے، بہت دیر سنتی رہیں پھر بولیں۔
"بس کر جا زبیدہ! مجھے تو شک ہے جہنم کی آگ جلانے کو تیری زبان چاہیے ہو گی۔"
انہوں نے اگلے دانت جماتے ساس کو گھورا۔ "ہاں میری تو ہر بات بری لگتی ہے، بیٹا بہت اچھا ہے ناں آپ کا مجال ہے جو ان کے کان پر جوں رینگ جائے۔"
"امی۔" شیری بلا گھماتا لاؤنج میں داخل ہوا اور زمانے بھر کی معصومیت سجا کر بولا "ابو کے سر میں جوئیں پڑ گئی ہیں؟"
"کیوں؟" لہجہ خونخوار "تجھے کس نے کہا؟"
"ابھی تو آپ بتا رہی تھیں، جوں رینگتی ہے۔"
امی نے ایک نظر اسے دوسری تیز دھار چھری پر ڈالی وہ اندر بھاگ گیا۔
وہ تیار ہو کر ہسپتال کے لیے نکلی تھی، چچی کا غصہ

دیکھ کر مسکرادی۔ "کیا ہوا ڈیئر چچی 'کیوں اتنا کھول رہی ہیں ؟"

انہوں نے کڑوا گھونٹ نگلتے اپنا دکھ سنایا۔ "ہونا کیا ہے' ہزار بار تمہارے چچا سے کہا ہے گیس کا بل جمع کروادو' کل آخری تاریخ ہے..... پر نہیں' کل ہی کروالیں گے' اللہ کرے میٹر کٹ جائے پھر پتا چلے گا صاحب بہادر کو۔"

"لائیں مجھے دیں' میں جاتے ہوئے کروا دوں گی۔" اس نے بات ختم کرنا چاہی دادی نے ٹوکا۔

"ارے تو کہاں مردوں میں گھسے گی۔"

"دادی ہسپتال میں بھی بہت مرد ہوتے ہیں 'لیڈیز فرسٹ' جلد جمع کرلیں گے۔"

✡ ✡ ✡

وہ بل لے کر گھر سے بینک کی جانب گئی تھی۔ بینک لاؤنج میں لمبی قطار تھی۔ خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ وہ ناگواری سے کبھی گھڑی کبھی سستی سے سرکتی قطار پر غور کرتی رہی۔

"خوامخواہ کی پیشکش بھی خوار ہی کرتی ہے۔"

وہ مینیجر کے کمرے کا دروازہ دھکیلتا بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ نگاہ کالے 'سفید ڈاٹس والی زرد قمیص پہنے اس لڑکی پر گئی۔ حافظہ تیز تھا فورا" پہچان گیا۔ اس نے آج تک کسی کا ادھار نہیں رکھا تھا پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے اس کے قریب آکر کھنکھارا۔

"محترمہ آپ؟" موبائل اسکرین پر حرکت کرتی انگلی روک کر اس نے نگاہ اٹھائی۔ "جی..." اچنبھا ہوا۔

"ظاہر ہے میں ہی ہوں 'کوئی کام۔" اسے فورا" ... یاد آگیا۔ موبائل بند کرکے نیچے کیا اور قطعیت سے بولی۔ "میں نے آپ کی فائل سے کوئی کاغذ نہیں نکالا تھا۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی استفسار کرے 'خوامخواہ الزام لگائے اس نے تردید کی۔ وہ مسکرایا۔

"جی جی.... میں تو یہ پوچھ رہا ہوں' آپ یہاں' خیریت؟"

اس نے بل لہرا کر سمجھایا۔

"مجھے خواتین انتظار میں لگی اچھی نہیں لگتیں لائیں مجھے دیں۔"

اس نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی' دوسری قطار میں لگی باقی خواتین پر اور جتا گئی۔ "یہاں اور بھی ہیں.... خواتین۔"

"جی بالکل۔" وہ قدرے مؤدب بنا "لیکن مجھ پر صرف ایک خاتون کا ادھار ہے.... وہ فائل والا۔"

کوئی اور وقت ہوتا وہ اس کی بے تکلفی پر سینڈل اتار کر مارتی مگر اس وقت اسے دیر ہو رہی تھی۔ بحث میں نہیں پڑی۔ بل اور رقم دی۔ اس کی کچھ جان پہچان تھی گھنٹے کا کام دس منٹ میں کروا دیا اور منعم شکریہ ادا کر گردن اٹھا کر باہر نکلی۔ اس نے کون سا احسان کیا تھا۔ بدلہ چکایا تھا۔

احسان کا بدلہ احسان.... وہ کچھ لمحے اس کی ادائے بے نیازی دیکھتا رہا پھر مسکرا کر گردن جھٹکی۔

✡ ✡ ✡

اترتی شام کا وقت تھا' سارے شہر کو ہلکے بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ مدھر ہوا پودوں کونپلوں کی خوشبو بکھراتی مست چکرا رہی تھی۔ موسم کے تیور دیکھ کر وہ دونوں سامنے والی سڑک پہ ٹہلنے نکلیں۔ اس کا ایم بی بی ایس مکمل ہو چکا تھا' ہاؤس جاب کے لیے اپلائی کر رہی تھی۔ جب کہ اریبہ کی انجینئرنگ مکمل ہوئے سال بھر گزر گیا تھا۔ آج کل ایم ایس۔ کے چکر میں تھیں۔ اس کی ہاؤس جاب پر بات کرتے کرتے اریبہ نے کہا۔

"یار! واک میں بور ہونے کا کیا فائدہ' چلو کسی مال میں چلتے ہیں' جسٹ فار انجوائے منٹ۔"

وہ بھی متفق تھی۔ کالونی کے مال میں انہیں قطعا" مزہ نہیں آیا۔ پرانی شکلیں' پرانا مال' دو لیسوں خرید کر اریبہ نے مشورہ دیا۔

"صدر چلیں.... ہلکی پھلکی شاپنگ ہو جائے گی۔"

اریبہ کی نگاہ اس کے کندھے پر جھولتے بڑے سے بیگ پر تھی اور اس کی اچٹتی نظر اس کے فرنچ پاؤچ پر

منعم نے کندھے اچکائے۔ "شیور۔"
سڑک پر آتے ہی منعم نے اشارے سے ٹیکسی روکی۔ دونوں بیٹھ گئیں۔ ٹیکسی صدر کے مشہور مال کے سامنے رکی تھی۔ منعم نے بیگ کی اوپری زپ کھول کر دو سرخ نوٹ ڈرائیور کو تھمائے اور آگے بڑھ گئیں۔ وہ مال میں اس شان سے داخل ہوئیں جیسے مال کی بولی لگانے آئی ہوں۔ دکان در دکان پھر بیس منٹ میں گھس گئیں اور وہاں جو انہوں نے چیزیں پسند کرنی شروع کیں بیگز، ڈیکوریشن، مختلف سائز جوسز اور پیک فوڈ کے ڈبے۔ بھری ٹرالی میں گھسیٹتے کاؤنٹر کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ منعم نے اریبہ سے پوچھا۔
"تقریباً کتنا بل بن جائے گا۔"
"یہی کوئی پانچ چھ ہزار۔"
"تمہارے پاس ہوں گے؟"
اس کے استفسار پر اریبہ گھوم کر سامنے آئی "کیا مطلب؟"
"مطلب تمہارے پاؤچ میں؟"
"میرے پاؤچ میں صرف میرا موبائل ہے وہ بھی میسج پیکج پر بیلنس ختم ہے۔"
"تو پھر دماغ میں شاپنگ کا کیڑا کیوں کاٹا تھا۔" منعم نے اسے گھورا۔
"اچھا۔" وہ چبا کر بولی "اور یہ جو تم کندھے پر تھیلا اٹھائے لائی ہو اس میں کیا ردی بھری ہوئی ہے؟"
"یار! یہ تو میں نے چلتے چلتے ویسے ہی اٹھا لیا تھا، ہم کون سا شاپنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے۔"
"پھر جیسے اٹھایا تھا، ویسے ہی چلتے چلتے پے منٹ کرو۔"
منعم آواز دبا کر ڈوبتے دل سے بولی۔ "کہاں سے کروں؟" اس نے بیگ میں اچھی طرح جھانکا صرف بیس کا نوٹ تھا اور جو چند نوٹ تھے وہ ٹیکسی والے اور بیلوں پر لگ گئے۔ اہانت سے دونوں سرخ تھیں۔ پھر بھی چہرے پر زبردستی مسکراہٹ کا جال تھا۔ کاؤنٹر پر بل بناتا لڑکا سامان سے کیس ٹرالی دیکھ کر انہیں مسکراتی نگاہوں سے ویلکم کر رہا تھا۔

"اب کیا کریں؟" وہ ادھر ادھر دیکھتے ایک دوسرے سے مخاطب تھیں۔
"یار! یہ جو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا ہے ناں، خالی پرس کا سن کر بڑی بے عزتی کرے گا۔" منعم گھبرائی۔
نہیں نہیں، زیادہ نہیں کرے گا، صرف اتنا کہ سامان واپس ریکس میں لگانے جیسے آرڈر سخت لہجے میں دے گا۔"
"اف۔۔۔" اس نے آنکھیں میچیں۔
"ایسا کرتے ہیں ٹرالی واپس پیچھے لے چلتے ہیں، ادھر ادھر کہیں چھوڑ کر بھاگ نکلیں گے۔"
"جی۔۔۔جی۔" اریبہ نے دانت جمائے۔ "سی سی ٹی وی کیمرے پتا ہے ناں، یہاں خوب نصب ہیں اور یہ جو مسکرا کر ویلکم کرنے کو بے قرار ہے ناں" اس نے سامنے لڑکے کی جانب اچٹتی نگاہ ڈالی "ہماری گردنیں دبوچ کر واپس لے جائے گا۔ کچھ بعید نہیں کمینہ سزا میں اضافی سامان بھی سیٹ کروائے۔"
"اسی لیے۔۔۔ اسی لیے مجھے سی سی ٹی وی کا موجد دنیا کا ناکام انسان لگتا ہے۔" منعم نے اپنی اونچی ہوتی آواز پر قدرے قابو کیا "بھلا اپنے سامان کا خود دھیان نہیں رکھ سکتا تھا جو مشینوں کا سہارا لیا، ہمارے لیے بھی پنخ ڈال دی۔" پھر کچھ توقف سے بولی "چچی کو میسج کرو۔"
"جی بالکل، وہ تو جیسے سنتے ہی بے قرار ہوئی دوڑی آئیں گی ہمیں چھڑوانے۔" اریبہ نے منہ بنایا۔
"اگر آ بھی گئیں تو کفگیر ڈوئی ساتھ لائیں اور ان سے کوئی بعید بھی نہیں یہاں ہی شروع ہو جائیں، کان پکڑوا کر سوری کروائیں گی۔"
"چچا کو بتانے کا تو بالکل رسک نہیں لے سکتی تھیں، وہ پہلے ہی کہتے تھے۔
"کھوتوں کی طرح بڑی ہو گئی ہو، کہیں سے نہیں لگتا ہائیر اسٹڈیز سے دور کا بھی واسطہ ہو، کچھ اور سوچو ڈیئر۔"
اریبہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا ان کے اور کاؤنٹر کے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ دو تین لوگ ان

سے آگے تھے۔ جن کا دھڑا دھڑ بل بن رہے تھے ان دونوں کے دل بیٹھنے لگے دفعتاً پہلو سے آواز ابھری۔

"ہیلو مس!"

دونوں چونکیں۔"کیسی ہیں آپ؟"

وہ اخلاقیات کا اشتہار بنا منعم سے پوچھ رہا تھا۔ ان کی ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا جو بول پڑتی۔

"فائن....."

وہ خیریت میں سرہلاتی زبردستی مسکرائی۔ یہ وہ اور خدا جانتا تھا کہ اندر سے کس قدر پریشان تھی کہ اب ان موصوف کے سامنے بے عزتی ہوگی۔

"آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ خیریت ' مے آئی ہیلپ یو؟"

اس کے پوچھنے کی دیر تھی۔ منعم کے حاضر دماغ نے فوراً" کلک کیا۔ آنکھیں جگمگا گئیں' پھر معانی خیز ہونق بنی دونوں کو تکتی اریبہ کو دیکھا اور ترچھے چتون اس کی جانب اٹھاتے کچھ سمجھایا پھر بولی۔

"جی آپ نے صحیح گیس کیا' اکچولی مجھے اور میری کزن کو پچھلے ایک کاؤنٹر پر بیگ پسند آگیا ہے۔"

"تو لے لیں' مسئلہ کیا ہے۔"

اس نے شانے اچکائے' پھر تفتیشی انداز میں پوچھا۔

"کیا پیسے نہیں ہیں؟"

"نہیں' نہیں۔" دونوں بیک وقت بولیں۔ اب سارا پلاٹ اریبہ کی سمجھ میں آگیا تھا فوراً" کہا۔

"اکچولی' ہم سے فیصلہ نہیں ہو رہا کہ ہم میں سے کون جائے اور لے آئے۔"

"ایسا کریں مجھے رنگ اور کاؤنٹر بتادیں' میں لے آتا ہوں۔"

"مسٹر آپ سمجھ کیوں نہیں رہے۔" منعم اکتا کر بولی۔ "ہم دونوں جانا چاہ رہی ہیں' لیکن ہم جو یہ اتنی بڑی ریڑھی (ٹرالی) گھسیٹتے پھر رہے ہیں' اس کی حفاظت کون کرے گا؟"

وہ نرم نگاہوں سے دیکھتا اپنی مسکراہٹ دبا گیا تھا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں' آپ کی ریڑھی پر کوئی ڈاکا نہیں پڑنے والا..... میں کھڑا ہوں۔" پھر وہ سر پر پاؤں رکھ کر پیچھے بھاگیں۔

وہ ان کے وہاں سے ہٹتے ہی منیجر سے کہہ رہا تھا۔

"یار بچیاں ہیں' نئی نئی ٹرالیاں دیکھ کر بھر لیں..... تم سیٹ کروالینا۔"

ویلکم والے چہرے نے اسے اس کے بل کی رسید تھماتے زبردستی موسٹ ویلکم سجایا اور وہ اپنا شاپر اٹھا باہر نکل آیا تھا۔ مال کے بڑے سے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے ان دونوں کو ٹیکسی والے سے بات چیت (پیسے گھر جا کر) کے بعد بیٹھتے دیکھا۔ خوامخواہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سج گئی۔ بلکہ کوئی اور چیز بھی دل میں اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

کچن سے مسالا بھوننے کی خوشبو چچی کے من پسند موضوع چچا کی برائیوں جیسی آواز میں لپٹ کر سارے گھر میں پھیلی تھی۔

"اس آدمی سے کبھی ڈھنگ کی سبزی نہ خریدی گئی' سارے ٹھیلے' ریڑھے چھان کر گند اٹھالاتے ہیں' بڑی سستی ڈھونڈ کے لایا ہوں' ہونہہ' آدھی سے زیادہ کانی نکلتی ہے۔"

دادی دامن بچا کر پچھلے صحن کی جانب نکل گئیں۔ بیٹے کی کنجوسی سے اچھی طرح واقف تھیں۔ کہاں تک اس کی داستان سنتیں۔ صوفے پہ بیٹھے ان دونوں نے اک دوجے کو دیکھا۔ انہیں بہت اچھی طرح سے آج کا مینو یاد تھا۔ شلجم کی بھجیا' دھنیے کی چٹنی' ٹماٹر پیاز کا سلاد۔

"اف' میرا بالکل اس شاہی کھانے کا موڈ نہیں۔" منعم نے میگزین بند کرکے اریبہ کی گود میں پٹخا' اریبہ خود نبولی نگل رہی تھی۔ مگر امی کو انکار' قسمت کو انکار۔

"آئیڈیا۔" اریبہ نے چٹکی بجائی۔ اٹھی اور کچن کے دروازے پر کھڑے کھڑے امی کو بتایا۔

"امی' صدف کی بہن کا انٹری ٹیسٹ کلیئر ہوگیا ہے۔ ہم ذرا مبارک باد دے آئیں۔"

زبیدہ نے ایک اکتاہٹ بھری نگاہ ڈالی اور ہاتھ ایسے جھٹکا جیسے کہا ہو "جاؤ دفع ہو جاؤ" اور وہ تیار ہو کر اس کی جانب نکل تھیں۔ اس کی بہن کے نمبر واقعی اچھے تھے۔ ایک پر تکلف چائے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی... دروازہ بجانے پر اس کا چھوٹا بھائی نکلا' نہایت بے مروتی سے بولا تھا۔

"آپی اور باجی 'امی کے ساتھ بازار گئی ہیں۔"

دونوں پر اوس گر گئی وہ کف افسوس ملتی گھر کی طرف مڑی تھیں کہ ندیدی اریبہ کے ذہن میں ایک گھٹیا پلان آیا۔

"کیا یاد کرو گی' لعنت بھیجو چائے پر' ایک زبردست ڈنر کرواتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ منعم نے اسے گھورا تھا" پیسے ہیں تمہارے پاس؟

اس دن مال والی اہانت بہت اچھی طرح یاد تھی کتنی بار اندر ہی اندر شرمندہ ہوئی ہیں۔ "یار ہم نے اس بیچارے کے ساتھ اچھا نہیں کیا' کیا سوچتا ہو گا کہیں ہمیں چور نہ سمجھ رہا ہو۔" اور اریبہ ہر بار اسے کہتی۔

ایسے ہیلپرز کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے' ایک دو فضول ملاقات سے ہی بڑی ہمدردی ہو رہی ہے۔" مگر اب وہ اس قسم کا رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔

"مفت میری جان مفت۔" وہ اس کا بازو پکڑے تقریباً" گھسیٹتی سڑک پار کر رہی تھی۔

"مجھے تمہاری یہ مفت خوریاں بہت بری لگتی ہیں' گھر چلو ورنہ چچی کو شکایت لگا دوں گی۔"

لیکن اریبہ رکی ہی نہیں' سڑک کے دوسری جانب بڑا سا میرج ہال تھا اور رش بھی خوب۔

منعم نے اسے دھپ لگائی "یہ' یہ کیا حرکت ہے؟"

"کچھ نہیں ڈیئر' بس تم پر اعتماد رہنا' ایڈونچر بھی کسی بلا کا نام ہے یا نہیں۔"

"مجھے معاف رکھو ایسے ایڈونچر سے۔"

"اوہو..." وہ اب لوگوں کے کافی قریب آ گئی تھیں۔

"یار تم سب کو دیکھ کر ایسے مسکرانا جیسے اس فیملی کا حصہ ہو۔ پھر دیکھو کتنا انجوائے کریں گے' مفت کی شادی۔"

"کیا بدتمیزی ہے اریبہ' میرا بازو چھوڑو۔" اس نے بازو چھڑانا چاہا گرفت مضبوط تھی۔

"کوئی بدتمیزی نہیں' اتفاق میں برکت۔" بارات آ چکی تھی۔ بوفے ٹیبلز سج گئی تھیں' نا چاہتے ہوئے بھی اس نے ہال میں قدم رکھا۔ چکا چوند روشنیاں' رنگ' خوشبوئیں اور کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو' ہر چیز پر وہاں چلتے پھرتے وجود بھاری پڑ گئے تھے۔ ان دونوں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اندر تک خوف اترنے لگا۔ اریبہ کو سپاٹ اور سلو موشن میں منعم نے کہتے سنا۔

"یار میں نے آج سے پہلے کبھی سنڈوں کی تقریب اٹینڈ نہیں کی۔"

"میں نے بھی۔" وہ بھی دم بخود تھی۔

"پھر؟"

"پھر کیا' دل کڑا کرو۔" اریبہ نے کہا۔

"اگر انہوں نے ہمارے کڑاکے نکال دیے' برفانی تودوں میں دب کر آج تک کوئی زندہ نہیں بچا۔"

"بیوقوف یاد کرو۔ دادی کا فرمان۔" اریبہ اسے بار بار حوصلہ دے رہی تھی۔

"کون سا..."

"موٹا دیکھ کر ڈرنا نہیں' کمانگڑ دیکھ کر لڑنا نہیں' یہ اپنا وزن اپنے پیروں پر اٹھا لیں بڑی بات ہے۔"

"اور اگر ہم ان کے پیروں تلے آ گئے' مانو اسٹیکر بن جائیں گے ہمارے۔"

وہاں دیکھنے میں ایسا لگتا تھا جیسے مقابلہ صحت ہو۔ اور جو حالت ان کے ہاتھوں میں ابلتی پلیٹوں کی تھی۔ بس براتوں میں منہ مارنے کی کسر تھی' منعم کو ابکائی آنے لگی "اف" وہ آنکھیں پھاڑے سب کے ہنستے چہرے' چھلکتے ڈوبتے پیٹ دیکھ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اریبہ نے گم صم منعم کو ٹھوکا دیا" جلدی جلدی کھانا لو اور نکلو۔"

"یار میں اپنے ہسپتال کے ایمرجنسی بیڈ گن رہی

ہوں اور کئی ڈاکٹرز چھٹی پر ہیں۔۔۔ اگر اس یاجوج ماجوج کی قوم کو کچھ ہو گیا' میرا تو بینڈ بج جائے گا' جونیئرز کے ساتھ بڑا برا سلوک ہوتا ہے۔۔۔"

"اوہو۔۔۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں' لیڈیز کے بالوں میں پھٹے بم سے نہیں لگ رہا' بارات کسی اور شہر سے آئی ہے۔"

"کہاں سے؟"

"بکرا منڈی سے۔" اریبہ نے سر جھٹک پلیٹ اٹھائی۔

"جہاں سے بھی آئی ہو' یار یہاں سے خیر سے نکل جائیں' جو کچھ ہونا ہے' انہیں اپنے شہر ہی جا کر ہو۔" میز کے قریب کھڑے بھی ان کی ہمت نہیں تھی ان کے سامنے کھانا نکالنے کی۔ اریبہ نے ہمت کر کے ایک روسٹ پلیٹ میں نکال رہی تھی کہ ایک کھنکتی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"بھائی! یہ تپلی لڑکیاں کس کی ہیں؟" اس نے ہاتھ روک پیچھے دیکھا۔ خاصے فاصلے پر ایک سفید گائے نما خاتون سیاہ گینڈے سے مخاطب تھی۔ آواز ایسی چبھتی ہوئی جیسے کان کے پردے پھاڑ دیے ہو اور وہ کالے میاں اپنی یادداشت کھنگالنے کے بعد اونچی ڈکار لے کر پیٹ کھجاتے بولے تھے۔

"ہمارے خاندان کی تو نہیں؟" لڑکی کے خاندان سے ہوں گی اتنی بیمار سی۔"

"نکلو اریبہ' اس سے پہلے کہ ہم پہلوانوں کے نرغے میں پھنس کر رہیں۔"

اریبہ نے سنتے ہی ایک شناسا سا مسکراہٹ ان مبصرین پر اچھالی۔ پلیٹ رکھ کر باہر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ منعم اس سے آگے تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر جاتیں ہال کے دروازے پر ڈاکٹر عثمان کو دیکھ کر وہ ہونق ہو گئی۔ اس کا حلق تک سوکھ گیا۔

"ارے ڈاکٹر منعم آپ یہاں؟"

"یس۔۔۔ یس سر!" ہکچولی۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ الٹ پلٹ بولتی اریبہ استفہامیہ لہجے میں بولی تھی۔ ارے منعم۔۔۔ یہ' یہ وہی ہیں ناں' تمہارے۔۔۔"

منعم نے اس کے سوالیہ رکنے کا اشارہ فوراً سنبھال لیا۔ "آں' ہاں ہاں۔۔۔ یہ میرے فزیالوجی کے ٹیچر ڈاکٹر عثمان۔"

"بہت خوشی ہوئی سر آپ سے مل کر۔" اریبہ بات بدل چکی تھی۔ "منعم اکثر آپ کا ذکر کرتی ہے' بہت فیورٹ ہیں' آپ اس کے۔"

وہ سانس روکے حیرت سے اس کی اداکاری دیکھ رہی تھی۔ بھلا اس نے کب ذکر کیا' وہ تو ڈاکٹر عثمان کے سائے سے بھی ڈرتی تھی۔

"ان فیکٹ' یہ میری بہت قابل اسٹوڈنٹ رہ چکی ہیں۔"

انہوں نے سراہا۔ "اور کیا بنا آپ کی ہاؤس جاب کا؟"

"جی وہ۔۔۔ میں جناح میں کر رہی ہوں۔" بدحواسی پر قابو پالیا تھا۔

"بیسٹ آف لک۔" کہہ کر سر تھپکتے وہ آگے بڑھ گئے۔

منعم نے سینے پر ہاتھ پھیلاتے مطمئن سانس اتاری۔ نگاہ ٹیرس کی سیڑھیوں پر چلی گئی۔ اف۔

"چلو' ابھی اور اسی وقت چلو۔" اس نے اریبہ کے بازو کو اچھے خاصے جھٹکے دیے۔ "اس سے پہلے دوسری بلا چمٹ جائے۔۔۔ میں تمہاری طرح اداکاری میں ماہر نہیں ہوں۔" وہ بولتے ہوئے اسے گھسیٹتی لے گئی۔

"اوہو تم خوامخواہ کنفیوژ ہو رہی ہو۔ کھانا بھی رہ گیا۔"

"میں نے کہا چلو' راستے میں بتاؤں گی۔" وہ پل بھر رکنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس نے کچن سے کھلنے والے ٹیرس سے اسے ڈاکٹر عثمان سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو ایک دو ہدایت دے کر جب تک وہ تیزی سے سیڑھیاں اترا۔ وہ جا چکی تھی۔ ہال کے باہر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر نہیں ملی ڈاکٹر عثمان بھی گھر والوں کو اللہ حافظ کرتے تیزی سے باہر نکل گئے تب اس نے اپنی قسمت پر ماتم کیا۔

"آج پوچھ ہی لیتا کہاں رہتی ہے' خیر پھر مل جائے گی۔"

پھر تو وہ کبھی نظر ہی نہیں آئی تقریباً" پانچ ماہ ہو گئے تھے اور اب نانی پوچھ رہی تھیں "تُو بے بھی یا ہواؤں میں اڑتی ہے۔"

نانی نے اسے گم صم دیکھ کر پوچھا"چپ کیوں ہے' کوئی چھل پیری تو نہیں پیچھے پڑ گئی؟"

وہ جیسے خواب سے جاگا۔ صوفے سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔"نہیں نانی! لڑکی ہے' اسی شہر میں رہتی ہے' کئی بار ملا ہوں' بات بھی ہوئی ہے... میں اس کے بارے میں ساری معلومات لے کر آپ کو بتادوں گا' آپ کو پسند آئے گی۔"

"نہ میں کوئی پولیس والی ہوں۔" وہ بدقت بولیں۔

"جو چھاپا مار کر لڑکی برآمد کرنی ہے' تو اس کی معلومات رہنے دے' خصوصیات بتا۔"

ان کی برجستگی پر اس نے ہنسی اندر ہی کنٹرول کی۔

"ہاں ہاں.... چند دن میں اس سے ملوادوں گا' آپ پلیز وہاں انکار کردیں جہاں بات چلا رکھی ہے۔"

ایک ٹیس سی دل میں اٹھی مگر دبنگ طبیعت نے ڈھانپ لی۔

"وہ تو بہت خوب صورت لڑکی ہے' ہمارے انکار کی نوبت تب آئے گی ناں' جب وہ تجھ چول کو پسند کرے گی۔"

جانے کس دل سے انہوں نے اسے "چول" کہا تھا ورنہ اس کی پیشانی کو دن میں کم از کم چھ بار تو ضرور چوما کرتی تھیں۔ خیر اٹھتے ہوئے اسے ڈپٹ کر کہا تھا۔

"اب اٹھ' جا کر سو.... کل دکان پر جاتے وقت مجھے ان کی طرف اتار دینا.... کروں گی خود ہی انکار۔"

"نانی...." اس کا سرپیٹنے کو جی چاہا۔ جب جب نانی اس کے ہوٹل کو دکان کہتیں وہ چلا پڑتا' مگر آج وہ کسی احتجاج کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

منعم جب پیدا ہوئی اس کے والد آسٹریلیا میں تھے۔ فون پر ہی مبارک باد وصول کی۔ آتے جاتے کے ہاتھ گفٹ بھیجے' تصویریں منگوالیں۔ دن گزرتے رہے۔ دادی فون پر پوچھتیں۔

"کب آئے گا تو.... منعم کا دانت نکل آیا۔"

ابا نے اچھا کہا اور کسی آنے والے کے ہاتھ بہترین ٹوتھ برش' ٹوتھ پیسٹ کی کٹ بھیج دی۔

"منعم چلنے لگی۔" بہترین جوتے آگئے۔ وہ یہ کھاتی ہیں' وہ پیتی ہے' باہر سے چاکلیٹس' پیکڈ فوڈ' جوسز کے ڈبے آنے لگے۔ نہ آئے تو صرف ابا۔ یہاں تک کہ وہ اسکول جانے لگی۔ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا۔

"کسی مناسب اسکول میں داخل کروانا' یہاں اخراجات بہت ہیں' زیادہ پیسے نہیں بھیج سکتا۔"

"اخراجات؟ کیسے اخراجات.... اکیلی جان کا کیا خرچا ہوگا۔"

"اماں! کھانا' پینا' رہنا سہنا اکیلی جان کے ساتھ بھی ہوتا ہے' بہت مہنگائی ہے ادھر' ڈالرز میں قیمت ہوتی ہے۔"

"تو کمانا بھی تو ڈالرز میں ہے' کون سا کوڑیاں کمارہا ہے۔"

"تو یہی کہہ رہا ہوں' بڑی مشکل سے گورے ڈالر نکالتے ہیں' کھاؤں' پیئوں یا آپ کو بھیجوں۔"

دادی نے سینہ تھام لیا۔ سعیدہ کی جگہ خود بات کرتی تھیں' اس کی ہر فون پر لڑائی ہو جاتی۔

"یہاں بھی تو ضرورت ہے۔ بیوی' بیٹی اور پھر ماں بھی۔"

بتول بیگم نے کئی بار سمجھایا اگر وہاں روزگار نہیں ہے تو واپس آجا' چھوٹا موٹا کام کرلے' جیسا وہاں کھینچ تان کر گزارہ کررہا ہے' یہاں بھی ہو جائے گا۔ کم از کم بیوی بیٹی کے سر پر تو ہوگا۔ لیکن طارق حسین ہر بار ٹال دیتے۔ کبھی ایگریمنٹ کا بہانہ' کبھی آنے والے بہتر مستقبل کے خواب۔ بتول بیگم باتوں میں آجاتی تھیں لیکن سعیدہ آنے والی نہیں تھیں۔ میاں کی اس قدر بے اعتنائی ان کی برداشت سے باہر تھی۔ بھلے انہوں نے ہی بے حد اصرار سے انہیں باہر جانے کے لیے

قائل کیا تھا۔ خوشحال زندگی کا شوق انسان کی فطرت میں گندھا ہے 'جیسے جیسے انسان بڑا ہوتا ہے شوق آرزو بن کر جوان ہو جاتا ہے 'کڑیل مضبوط جوان۔ اور اس منہ زور جوانی کے تحت ہی انہوں نے طارق حسین کو آسٹریلیا کے لیے قائل کیا۔ ان کے جانے کے تقریباً" چھ ماہ بعد منعم پیدا ہوئی۔ خوشی بہت تھی مگر آ نہیں سکتے تھے۔

وقت کی لہریں گھاٹ گھاٹ تیرتی جاتیں۔ لیکن وہ ایک بار بھی نہ آسکے۔ یہاں تک کہ منعم چار سال کی ہو گئی۔ بابا جانی صاف بولتی 'باتیں کرتی۔ اسکول جاتی۔ مگر آنکھیں باپ کے لیے ترسی ہوئی تھیں۔ فون پر باتیں کرتی۔ شروع شروع میں شوق سے سنتے پھر مصروفیت کے بہانے بند کر دیتے۔ سعیدہ کو شک گزرا' ایک دن فون پر ہی شکوہ کیا۔

"آخر تم آتے کیوں نہیں ہو' بچی تمہیں یاد کر کے روتی ہے۔"

"تمہیں رقم مل جاتی ہے' اسے کتابیں' کھلونے' پھر رونا کس بات کا؟"

"رقم کھلونے اس کے باپ کا متبادل نہیں۔"

"باپ نہیں آسکتا' مجبور ہے۔"

"کیسی مجبوری۔۔۔"

"سعیدہ بیگم ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔" اور فون کھٹاک سے بند کر دیتے۔ اگلے فون پر پھر وہی باتیں اصرار۔ دن بدن تقاضا بڑھ کر غصے میں ڈھلنے لگا۔ ایک دن سعیدہ نے خاصے طیش میں پوچھا تھا۔

"کہیں تم نے وہاں شادی تو نہیں کر رکھی۔"

"تو کیا شادی کے بغیر میں یہاں رہ سکتا تھا؟ سعیدہ! میں انسان ہوں' کچھ جبلی تقاضے ہیں اور کچھ معاشرتی۔ یہاں رہنے کے لیے ٹھکانہ چاہیے۔"

سعیدہ میں بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا مگر آواز میں فرق نہ آنے دیا۔ "تو کیا میں انسان نہیں ہوں' میرے جبلی تقاضے نہیں ہیں۔۔۔ مجھے بھی مضبوط چھت چاہیے۔"

"رقم بھیجتا تو ہوں اور کتنی مضبوطی چاہیے۔"

"رقم ہر تقاضا پورا نہیں کرتی طارق حسین۔" وہ ان سے زیادہ طیش میں تھیں۔

بتول بیگم نے بہت منتیں کیں' ہاتھ جوڑے مگر سعیدہ کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ میاں کا لفظ "جبلی تقاضے" انی کی طرح دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ چند دن بعد ہی انہیں فون کر کے صاف کہہ دیا۔

"تمہاری بیٹی تمہاری ماں کے پاس ہے' جی چاہے لے جاؤ' یا وہاں ہی پلنے دو' مجھے بھی اپنے جبلی تقاضے پورے کرنے ہیں' آزاد کرو مجھے۔"

وہ خاصے پریشان ہوئے' پیار محبت' ڈانٹ ڈپٹ سب کیا مگر نہیں تو نہیں۔ اتنی سنگدل ماں بن گئیں۔ منعم کو بتول کے پاس چھوڑ پلٹ کر نہ دیکھا۔ بتول بیگم سوچتی رہ گئیں۔ وہ کون سی مائیں ہیں جو اپنی جوانی' بچوں پر لٹا دیتی ہیں' کما کر پال لیتی ہیں اور سعیدہ صرف میاں کا ایک لفظ نہ سہہ پائی۔

ماں تو ماں' باپ کا دل اس سے بھی سخت نکلا۔ پہلے بچی کا خرچا کم کیا' آہستہ آہستہ بند ہی کر دیا' جب بھی بتول نے احساس دلایا چپ کر کے سن لیتے پھر فون کرنے بھی بند کر دیے۔ وہ دونوں اپنی زندگیوں میں آباد ہو گئے تھے۔ خالی پن آیا صرف منعم کے حصے میں۔ بڑی ہوئی تو ماں باپ کے بارے میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی تھی' اچھا نہ برا۔ اور اس خالی پن کو بھرنے کے لیے بتول اور زبیدہ چچی نے اسے اپنے بے حد قریب کر لیا تھا۔ بچپن میں بے حد ضدی' چڑچڑی تھی۔ وقت کے ساتھ دبو اور ہر بات ماننے والی بنتی گئی۔

گھاٹ گھاٹ تیرتی لہریں کناروں سے سر پٹخ آگے بڑھیں۔ سورج دہکتے تانبے کی طرح انگارے برساتا' چاند کی ٹھنڈی سنہری کرنیں لہروں میں کروٹیں بدلتیں۔ پنچھی آکر چونچ میں پانی بھر اڑ جاتے اور لہروں کا سفر سبک رفتاری سے جاری تھا۔ وقت پچیس سال آگے بڑھ گیا۔

ان پچیس سالوں میں ایک بار تقریباً" دس سال پہلے طارق حسین پاکستان آئے تھے۔ اپنے تین عدد بچوں کے ساتھ' بتول نے واضح ناراضگی کا اظہار کیا

تھا۔ لیکن ماں تھیں۔ معافی تلافی لیٹ چمٹ سے صاف کر ہی دیا۔ البتہ منعم کسی اجنبی کی طرح سامنے بیٹھی رہی۔ خاموش گم صم۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی مجبوریاں' ذمہ داریاں سنتی رہی۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ ایسے جیسے ریڈیو سنا بند کردیا۔ انہوں نے اس سے بہت کچھ پوچھا تعلیم' شوق' مصروفیات۔ اس نے بھی غیر شناسا شخص کی طرح تین لفظی جملے' سب ٹھیک ہے' کچھ خاص نہیں کہہ کر چپ۔ اس کا احتراز واضح محسوس ہوتا تھا۔ کئی بار اکیلے میں پوچھنے کی ہمت کی۔ وہ پھیکا سا مسکرا کر ہٹ گئی۔

وہ ایک ماہ کے دورے پر تھے اور یہ مہینہ اس کو ساری زندگی سے بھاری لگا تھا۔ اسکول سے آتی سیدھی اپنے کمرے میں۔ اگر ان کے بچے پاس آکر بیٹھ جاتے تو خود کتاب اٹھا کر چھت پر' کسی نے محسوس کیا یا نہیں البتہ دادی محسوس کرکے درگزر کرتی رہیں۔ جاتے وقت جب انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی وہ جلدی سے بیگ اٹھا کر اسکول کے لیے نکلتے نکلتے آہستہ سے کہہ گئی۔

"مجھے اب اس ہاتھ کی ضرورت نہیں رہی۔"

بھائی کی اہانت اعظم چچا نے محسوس کی پھر تسلی بھی دی۔ "بچی ہے بڑی ہوگی تو سمجھ جائے گی۔"

✵ ✵ ✵

خوشی کی لپٹیں دادی کے چہرے سے پھوٹتی تھیں۔ اتنا اچھا رشتہ کہ وہ پھولی نہیں سما رہی تھیں ورنہ جس طرح طارق اور سعیدہ اس سے لاپروا ہو گئے تھے' بالکل اسی طرح وہ بھی خود سے بے حد لاپروا ہو گئی تھی یصرف وہ اور اس کی کتابیں۔ دادی کو ہر وقت اس کی شادی کے ہول اٹھتے۔ ان کی خواہش تھی اپنی آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس کو بیاہ دوں اور اب تو بہترین رشتہ مل گیا تھا۔ یہ اندازہ سب سے پہلے زبیدہ چچی نے لگایا تھا کہ کچھ تو ہے جو اماں کا چہرہ دن بدن گلابی ہوتا جا رہا ہے۔ اعظم چچا نے باتوں باتوں میں وجہ پوچھی۔ وہ مسکرا کر بولیں۔

"میں تجھے بتانے ہی والی تھی۔ اپنی منعم کا رشتہ میں نے پکا کردیا۔"

"کیا؟" چچا کا منہ کھل گیا۔

"یوں اچانک' بنا بتائے؟" بھلا انہوں نے کبھی کسی فرض سے لاپروائی برتی تھی' طارق کے باہر چلے جانے کے بعد انہوں نے تو کبھی علیحدہ ہونے کا تذکرہ بھی نہ کیا تھا۔ اب اماں نے بتانا تک پسند نہ کیا۔

"اماں! آپ نے بتایا بھی نہیں؟" زبیدہ نے البتہ اپنے شکوے کو آواز دی۔

"کیا بتاتی.... بتاؤ گے تو تم' جب اس کا گھربار دیکھ کر آؤ گے' میں نے تو صرف لڑکے کی تصویر اور نانی دیکھی ہے' یقین مانو بہت ہی سادہ' پرخلوص محبت کرنے والی عورت ہے' نواسا بھی اسی جیسا ہوگا' تصویر میں تو خوب گھبرو لگ رہا تھا۔"

"ہماری ماں اور ماں کی سادگی۔" وہ اتنا سوچ کر رہ گئے۔ پھر تحمل سے بولے۔

"لڑکا کرتا کیا ہے؟" اب اس لڑکے کے کام' آفس کا نہ تو نانی کو ڈھنگ سے پتا تھا اور نہ ہی دادی کو۔ کہیں نوکری کرتا تھا' نانی نے بتایا' انہوں نے آگے۔ لیکن نائی کی نانی کو بھی سمجھ تھی اور دادی کو بھی اسی لیے جلدی سے بتایا۔

"نائی کا کورس کرکے آیا ہے اور شاید کوئی اپنی دکان بھی کھول رہا ہے۔"

"کیٹرنگ!" چچا کی پوری آنکھیں پھیلیں وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا کہا آپ نے نان بائی.... لڑکا نائی ہے.... اب کیا منعم کا رشتہ نائی کے ساتھ کریں گے.... اس لیے اتنا پڑھا ہے اس نے۔"

دادی کو چچا کی کم علمی پر بے حد افسوس ہوا ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ "عام نائی نہیں ہے وہ' بڑے والا نائی ہے۔"

زبیدہ چچی کلیرت کو ساس کے آخری جملے "بڑے والا نائی" نے توڑا۔ ان کے ذہن میں ان کا پرانا بڈھا سا نائی گھوم گیا۔ جو اکثر شادی شدہ بیاہ پر آکر دیگیں پکاتا تھا

انہوں نے فوراً" پوچھا۔
"اماں کیا وہ غفور انائی سے بھی بڑا ہے۔" دادی نے انہیں گھورا۔
"جاہل عورت' وہ پڑھا لکھا نائی ہے.... جو وہ بڑے والے ہوتے ہیں۔ اب تم جاہلوں کو کون سمجھائے۔"
"آپ نہ ہی سمجھائیں تو اچھا ہے۔" چچا کہہ کر کمرے میں چلے گئے۔
غالباً" وہ لڑکا ایم بی اے کی جاب کے ساتھ ہوٹل مینجمنٹ کا کورس اور شیف کی پریکٹس کر رہا تھا۔ فیشن کا دور ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے کئی طرح سے پلان تھے وہ فیشن ڈیزائننگ میں بھی خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے اپنی نانی سے ویسے ہی تذکرہ کیا۔ اکثر ہی آفس سے لیٹ ہو جاتا تھا بتانا پڑا۔ نانی کو آفس اور جاب کی سمجھ نہیں تھی سو دادی کو نائی اور درزی کے شوق کا بتا دیا۔ ساتھ یہ بھی کہ کمائی زیادہ ہے۔
اماں کی بات چچا اعظم کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ کسی طور نائی کے ہاں رشتہ دیکھنے پر راضی نہ تھے۔
اور اماں شدید خفا "کیوں نائی انسان نہیں ہوتے۔" جب جینا مرنا ہوتا ہے' وہی دیگیں پکاتے ہیں۔"
زبیدہ نے میاں کو پیار سے سمجھایا۔ "بنا دیکھے بھالے یہ کہنا مجھے پسند نہیں' خوامخواہ کی بدگمانی ہے' ایک بار اس سے مل لیں' کسی اور حوالے سے ہی سہی .... پھر اماں کو ہم دونوں مل کر مناسب طریقے سے قائل کرلیں گے۔"
ان کی بات دل کو لگی تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ غیر محسوس طریقے سے اس لڑکے سے مل کر آئے پتا نانی نے بتایا تھا وہاں۔ پہلے تو ملتے ہی رائے بدل گئی۔ پھر چند جاننے والوں سے تسلی ہوئی تو گھر بھی چلے گئے اور نانی سے اس کی تصویر لے آئے تھے بچوں کو دکھانے کے لیے۔
زبیدہ اعظم کے پاؤں زمین پہ نہ ٹکتے تھے۔ اماں کی دور اندیشی کے قائل ہو گئے۔ ان دنوں منعم راولپنڈی ایک کورس کے سلسلے میں گئی ہوئی تھی۔ اس کا فیصلہ اکیلے کرنے سے اعظم قدرے ہچکچا رہے تھے۔ کچھ بھی تھا۔ ماں باپ زندہ تھے۔ انہوں نے بھائی کو فون پر ساری صورت حال بتائی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے کہا۔
"اچھا چلو دیکھتے ہیں۔" کہہ کر بات ختم۔ کئی دن گزر گئے ان کے دیکھنے کے انتظار میں' پھر اماں کے کہنے پر دوبارہ فون کیا۔ طارق اپنے چھوٹے بیٹے کے اچانک ایکسیڈنٹ سے خاصے پریشان تھے ٹانگ کا فریکچر تھا۔ بھائی کا مدعا سن کر کہہ دیا۔
"دیکھو اعظم! میں پاکستان چھوڑ چکا ہوں' تم وہاں رہتے ہو' وہاں کے لوگ' ان کے طور طریقوں کو جانتے ہو' مناسب سمجھو تو بسم اللہ کر دو...... اور پھر منعم کون سا بچی ہے' سارے معاملات سمجھتی ہے' اس سے مشورہ کر لو اور ہاں جو خرچے وغیرہ کی ضرورت ہو وہ بتا دینا۔"
ہاتھوں میں فون تھامے اعظم چچا کی نگاہوں میں تعجب ہی تعجب رہ گیا۔
"اسے اب خرچے کی ضرورت نہیں رہی' اپنا کماتی ہے۔"
انہوں نے صرف اتنا کہا۔ لائن کاٹی اور دل میں آیا "کاش منعم بھی اریبہ شیری کی طرح میرے ہاں ہی پیدا ہوئی ہوتی۔ اتنا بے حس باپ۔
باپ اور اولاد کا تعلق بھی تب رہتا ہے جب اولاد اور باپ کے درمیان ماں جیسا مضبوط پل ہو۔ اگر وہ گر جائے تو فاصلے کبھی نہیں پاٹے جاتے۔ طارق حسین تو باپ تھے منعم کی سگی ماں نے اپنا کون سا فرض ادا کیا تھا۔ چار سالہ بچی کو چھوڑ کر میکے گئیں۔ ماں باپ نے بہتیرا سمجھایا حماقت نہ کرے' اولاد کی خاطر سہنا پڑتا ہے مگر نہیں مانیں' سال کے اندر اندر طلاق لی اور اپنے ایک دور کے کزن سے شادی کرلی۔ وہ دبئی میں رہائش پذیر تھا۔ پہلی بیوی حادثے کی نذر ہو گئی تھی۔ تنہا زندگی بہت مشکل ہوتی ہے۔ سعیدہ حسین جوان' چٹ پٹ اسباب بن گئے اور ساتھ لے گیا۔ جاتے وقت ممتا نے جوش مارا تھا۔ میاں سے منعم کو ساتھ لے جانے کی دبی دبی فرمائش کی لیکن اس نے صاف

گوئی کی انتہا کردی۔

"دیکھو بیگم! کسی کی اولاد پالنا نہایت مشکل ہے، جتنا مرضی پیار کرلو رہتی بیگانی ہے اور پھر اپنے رقیب کی.... بے حد مشکل، اگر یہی صورت حال تمہارے ساتھ ہوتی تو میری اولاد تم پالتیں ضرور مگر بددلی سے۔ مگر مرد میں بددلی کا بھی ظرف نہیں ہوتا۔ تو پلیز جہاں وہ پل رہی ہے وہیں پلنے دو۔"

اس دن وہ اپنے فیصلے پر پہلی بار پچھتائیں۔ جاتے ہوئے کچھ دیر کے لیے آئیں اور مل کر چلی گئیں۔ کبھی کبھار فون پر حال چال پوچھ لیتیں پھر اولاد ہوگئی منعم کی بھول بڑتی گئی۔ جب سالوں بعد پاکستان آتیں کچھ تحفے لیے ملنے چلی آتی تھیں۔ منعم، دادی اور چچی کی اوٹ سے سہم کر جھانکتی رہتی۔ بازو پکڑ آگے کیا جاتا مگر جاتی نہ تھی۔ ان کے جانے کے بعد کئی دن تک بے چینی رہتی۔ جیسے جیسے بڑی ہوئی — بے چینی چڑچڑاہٹ میں بدل گئی۔ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی لڑکی صرف اک ملاقات کے بعد چیزیں اٹھا پٹختی اور رات کو تیز بخار۔ دادی چچی کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔

ایک مرتبہ اعظم چچا نے کہہ ہی دیا۔ "سعیدہ بہن! جب آپ اسے چھوڑ ہی چکی ہیں، تو خدا کے لیے جینے تو دیں، چند لمحوں کی ملاقات اس پر ہفتوں بھاری گزرتی ہے۔"

منعم تقریباً" سولہ برس کی تھی۔ جب سعیدہ پانچ سال بعد آئی تھیں۔ بہت لگاوٹ سے ملنا چاہا مگر اس کے جذبات بالکل ٹھنڈی ندی جیسے ہوگئے تھے۔ دور دور سے سلام کیا۔ دادی نے نگاہوں سے گھورا، قریب ہونے کی تنبیہہ کی مگر وہ اریبہ کے ساتھ جڑی الگ صوفے پر بیٹھی ٹانگ پر ٹانگ جھلاتی رہی۔

"منعم میری جان! ادھر آؤ میرے پاس اپنی چھوٹی بہن کے پاس بیٹھو، کچھ اپنی اسٹڈیز کے بارے میں بتاؤ۔" ان کے مٹھاس بھرے انداز پر اس نے قدرے پہلو بدلا اور ان کے ساتھ بیٹھی کم عمر لڑکی کو استہزائیہ دیکھا پھر بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"میری کوئی بہن نہیں ہے، چھوٹی نہ ہی بڑی....

میں تنہا ہوں، تنہا تھی۔"

وہ جھٹکے سے اٹھی میز پر رکھے لوازمات سمیٹے اور جاتے جاتے چچی زبیدہ سے مخاطب ہوئی۔

"چچی! کل کالج میں پیرنٹس ٹیچر میٹنگ 10 بجے ہے، اور پلیز چچا سے کہنا آپ کو دس بجے ہی لے کر آئیں، حسب عادت گھنٹہ پہلے مت آجانا۔"

اس کا تحمل سے کہا گیا جملہ سعیدہ کا اندر تک کاٹ گیا تھا۔ اس نے رک کر ان کے چہرے پر پھیلے تاسف کو دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ وہ سعیدہ کے سامنے بڑی بہادری سے کچن میں کھٹر پٹر کرتی رہی لیکن ان کے جانے کے بعد بہت دیر سنک کے کھلے نل پر جھکی چہرہ دھوتی رہی۔ اعظم آگئے اور ان کے گلے لگ کر بہت زور زور سے روئی تھی۔

"چچا وہ کیوں آتی ہیں یہاں، انہیں منع کریں، مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے ان بچوں کے ساتھ انہیں دیکھ کر۔"

"بیٹا وہ تمہاری ماں ہیں۔" انہوں نے اس کے بال سہلائے۔

"ماں.... کون سی ماں، جو چار سال کی عمر میں چھوڑ گئی تھی، میں راتوں کو ڈرتی تھی کہاں تھیں وہ، دادی سے لپٹتی تھی، تکیوں میں منہ چھپاتی تھی، تب کہاں تھی ماں.... وہ جن بچوں کو ساتھ لیے پھرتی ہیں ان کی ماں ہیں، میری نہیں۔"

اس کی گھٹتی آواز پر چچی نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ "آپ کیوں مجھ سے پیار کرتی ہیں؟" وہ نروٹھے پن سے بولی تھی "لوگ تو کہتے ہیں بیگانی اولاد بیگانی ہی رہتی ہے، پھر آپ کو ڈر نہیں آیا مجھ پر خرچا کرنے سے۔"

"کس نے کہا بیگانے بیگانے ہوتے ہیں۔ بیوقوف۔" انہوں نے اسے پھر ساتھ لگالیا "بچوں کو جو دو، وہ وہی لوٹاتے ہیں۔ خواہ بچے اپنے ہوں یا بیگانے۔"

زبیدہ کا دل بے حد نرم تھا اپنی اولاد کی طرح منعم کو پالا تھا۔ دادی ایسے جذباتی موقعوں پر کہیں غائب ہوجاتی تھیں۔ منعم کے آنسو کہاں برداشت تھے۔

اب رشتے کی صورت حال میں اعظم مخمصے میں پڑ

گئے سعدیہ کو بتائیں یا نہ بتائیں۔ کیونکہ بہت عرصے سے وہ نہیں آئی تھیں کبھی کبھار فون کر لیتیں۔ مگر بتول بیگم نے کہا۔

"بتانا ہمارا فرض ہے' آگے وہ آئے نہ آئے۔"

☆ ☆ ☆

وہ دونوں پہلو بدلے بظاہر آنکھیں بند کیے سو رہی تھیں مگر نیند دونوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ خود بھی خوش نہیں تھی اپنی جان سے عزیز دادی کو ناراض کر کے' آخر انکار کیوں کر رہی ہے' کسی سے کمٹڈ بھی نہیں تھی۔ البتہ اپنے ماضی اور ماں باپ کی بے حسی نے اس خواہش کو پنپنے نہیں دیا لیکن یہ تو طے تھا شادی ضرور ہو گی۔ کوئی خاص آئیڈیا بھی نہیں تھا البتہ وہ خیالوں میں آجاتا۔ ایسے ہی خوامخواہ میں۔ مگر اب ایسا بھی نہیں تھا اس کی خاطر دادی کی پسند سے ٹکرا لیتی لیکن نائی؟ درزی بننے کا اضافی شوق رکھنے والا' زنانہ خصلت اسے یک لخت جھرجھری آگئی۔

دادی کی نیند یہ سوچ کر اڑی جا رہی تھی آخر کیا وجہ ہے انکار کی۔ آج تک میری سب مانتی آئی ہے۔ جو کہا' جیسے کہا۔ اب اچانک کیا ہو گیا۔ حالانکہ جب تسلی کے بعد اعظم اور زبیدہ لڑکے کی تصویر لے کر آئے اور دادی کے ہاتھ میں تھمائی پہلے تو دادی نے اسے چوما پھر کہا تھا۔

"مجھے تو سو بار آپا زلیخا نے دکھا رکھا ہے' تو دیکھ....."

انہوں نے قریب بیٹھی اریبہ کی جانب بڑھائی جو گردن اچکا اچکا کر دیکھنے کی کوشش میں تھی۔ تصویر ہاتھ میں لیتے ہی اس کی چنی منی آنکھیں قدرے پھیل گئیں۔

"ہیں' یہ نائی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" اعظم نے تصحیح کی۔ "شیف کا کورس کر رکھا ہے' اور اب تو بڑا سا میرج ہال بھی بنا لیا ہے' باتوں سے لگتا ہے چین بنائے گا۔"

"تم تو ایسے دیکھ رہی ہو' جیسے جانتی ہو۔" زبیدہ نے اس کی آنکھوں میں شناسا چمک دیکھی تو وہ بولی۔

"اوہ ہوں..... میں بھلا کہاں سے جاننے لگی نائی کو ..... میرا مطلب ہے شیف کو۔" وہ فوراً" سنبھل کر بولی۔

اسے سپر اسٹور والی اہانت آج بھی یاد تھی۔ وہ تو شاید بھول بھی جاتی مگر منعم کو بہت شرمندگی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اسے کہا تھا۔

"یار ہم نے اس بیچارے کے ساتھ اچھا نہیں کیا' اس نے میری مدد کی تھی۔"

اسے بینک والی فیور شرمندہ کر رہی تھی۔

"پھر تو وہ پکا ہیلپر ہوا..... تم فیل نہیں کرو' عادت ہے اسے خوب صورت لڑکیوں کا غلام بننے کی۔"

"نہیں یار! چھچھورا تو نہیں لگتا تھا۔"

"اچھا۔" اریبہ نے استہزائیہ کہا تھا۔

پھر تو اکثر ہی بیٹھے بیٹھے اس کا ذکر چھڑ جاتا کبھی پرسنالٹی' کبھی چال' کبھی ڈیشنگ لب ولہجہ۔ آخر اریبہ نے ایک دن آڑے ہاتھوں لیا۔

"تم اس سے کب کب' کہاں کہاں ملتی رہی ہو' جو اتنی امپریس ہو۔"

"اوہ نہیں یار' صرف اتفاقیہ دو چار بار۔"

"بس اتفاقیہ ہی ہے یا کچھ اور بھی اتفاق ہوا۔"

"نہیں نہیں بس اتنا ہی۔" اس کی تفتیشی نگاہ سے وہ فوراً" گھبرائی۔ دل کی دھڑکن خوامخواہ تیز ہو گئی تھی۔

اریبہ نے اپنے خالی ہاتھ جھاڑے بیڈ پر پھسکڑا مارا۔

"چلو پھر ٹھیک ہے۔" منعم کی چمکتی آنکھوں میں کچھ نہاں تھا جو شاید اسے خود بھی معلوم نہیں تھا سو بات آئی گئی ہو گئی۔ وہ ایک کورس کے سلسلے میں چار پانچ ماہ سے فیملی ہسپتال راولپنڈی میں تھی۔ اسی لیے دادی اریبہ کو تصویر دکھاتے اس کی پسند جاننے کی کوشش میں تھیں۔

"پسند آجائے گا' اپنی منعم کو؟ تو اسے جانتی ہے' پسند ناپسند۔"

کہنا تو وہ چاہتی تھی سر کے بل آجائے گا کیونکہ جتنا وہ ذکر کرتی اور انداز بتاتا تھا۔ مگر سنبھل کر بولی۔

"ہاں ہاں دادی' اپنی منعم تو نیک پروین ہے' بلکہ

گائے ہے، جہاں باندھو گے بندھ جائے گی۔"
اسے یقین تھا اپنے قیافے پر اور دادی اسی کے یقین پر تکیہ کیے رشتہ پکا کر بیٹھیں۔ سعیدہ اور طارق سے بات کی وہ خوش تھے اور شادی پر آنے کا عندیہ بھی دیا۔ جب سب ہو گیا بڑی دادی رسماً "ہاتھ پر شگن" رکھنے آرہی تھیں تو منعم نے رونا پیٹنا ڈال دیا۔ وہ ساری رات الجھی رہیں' انکار کریں تو کیسے۔
جب بہت دیر ہو گئی۔ منعم کمرے میں واپس نہ آئی۔ اریبہ کو تشویش ہوئی۔ کمبل پھینک باہر نکلی کہ کہیں دادی اور اس کا زیادہ ہی کھڑاک تو نہیں ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھا سب نارمل تھا۔ دادی کے دروازے پر ہلکا سا ہاتھ رکھا۔ کھلتا چلا گیا۔ محترمہ ان سے لپٹی ہوئی تھیں۔
بھول کر تجھ کو زندہ رہنا' مشکل ہے بڑا مشکل ہے' بالکل فلم "مشکل" کا مکمل سین لگتا تھا۔
"لگتا ہے دادی نے تصویر دکھا دی۔ ہونہہ میں تو چاہ رہی تھی نانی کا عقدہ شادی والے دن ہی کھلتا۔" اپنا سرپرائز خراب ہو جانے پر اسے ملال ہوا۔ منہ بناتی واپس ہولی۔ "دادی اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتیں۔"

☼ ☼ ☼
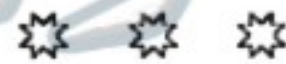
صبح کا سورج آسمان پر جلوہ افروز ہو چکا تھا۔ دادی ناشتے کے بعد خاصی ست لگی تھیں۔ زبیدہ کا خیال تھا اماں آج کام کروا کروا کر تھکا دیں گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔ دوسرا خیال گزرا طبیعت ناساز ہو۔ پوچھ بھی لیا شامت کی ماری نے۔ دادی جو پہلے ہی اندر تک بھری تھیں ہر لحاظ بلائے طاق رکھ تنک کر بولیں۔
"کیوں تیرے میکے والوں نے دیگیں دم رکھنی ہیں۔"
زبیدہ گڑبڑا گئیں۔ بہت عرصے بعد اماں پرانی جون میں لوٹی تھیں۔ کچھ توقف سے بڑھاپے میں جھانکا۔ وہی اچھا لگا پھر خفت مٹاتے ہوئے کہا تھا۔
"ویسے ہی بس دل اچاٹ ہو رہا ہے۔"

دل کے اچاٹ ہونے کا بھی جلد ہی پتا چل گیا۔ جب تقریباً گیارہ کے بعد داخلی گھنٹی بجی۔
وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوٹل جاتے ہوئے نانی کو ان کے گیٹ پر اتارا' گھنٹی بجا کر جیسے ہی گیٹ کھلا خود بائیک اسٹارٹ کر یہ جا وہ جا۔ ہوٹل جانا تو نانی کے سامنے ایک بہانہ تھا۔ اسے اب ڈاکٹر عثمان کے پاس جانا تھا۔ وہ اس کے قریبی دوست کی چچا تھے۔
اس لڑکی کا ڈاکٹر عثمان سے باتیں کرنا اچھی جان پہچان ظاہر کر رہا تھا۔ بھلے اس شادی کو چار پانچ ماہ گزر گئے تھے مگر ان پہلوانوں کا فنکشن' ان کی ریکارڈ توڑ خوش خوراکی کوئی بھولے نہیں بھول سکتا تھا۔
تھوڑی دیر بعد وہ اپنے دوست کے ہمراہ ڈاکٹر عثمان کے سامنے قصہ لیے بیٹھے تھے۔ وہ بہت غور و خوض کے بعد بولے۔ "ہاں ہاں یاد تو آرہا ہے' بٹ صاحب (ان کے ہمسائے) کی شادی تمہارے ہوٹل میں' میں نے اٹینڈ تو کی تھی' لیکن جس طرح کی لڑکی تم بتا رہے ہو' وہ تو بٹ کی سات نسلوں میں پیدا نہیں ہوئی ہو گی۔"
"آپ اس سے بہت اچھے موڈ میں بات کر رہے تھے۔"
"کی ہو گی' ایکچولی اس دن میرا فوکس ان لوگوں کی خوراک اور ہسپتال کی ایمبولنس پر تھا....
وہ لوگ ایسے کھا رہے تھے جیسے کھرلی میں بہت سی گائے' بھینس چھوڑ دی ہوں.... بہت کھاتے ہیں وہ لوگ یار۔"
"خیر چھوڑیں ان کی کھرلی کو۔"
وہ اپنی بات پر آیا۔ "سر وہ دبلی پتلی' کافی الگ تھی سب سے' ایگزٹ پر ملے تھے آپ لوگ۔"
"ہوں....
بے تحاشا حافظہ کھنگالنے کے بعد یاد آہی گیا۔
"اچھا اچھا وہ.... دو لڑکیاں تھیں ایک جیسی۔"
"جی' جی...." وہ بے تاب ہوا۔
"وہ میری اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے۔"
"جی جی سر' ان کا ایڈریس چاہیے۔"

"بڑی قابل بچی ہے۔"

"جی... ایڈریس چاہیے۔" وہ اتاؤلا تھا۔

"ایڈریس تو مجھے اس کا نہیں پتا۔"

اوہ بھاڑ ہی میں جائے ڈاکٹر تیرا۔ دو گھنٹے برباد کر دیے یاددہانی میں۔ اس کے دل سے ہوک اٹھی۔

"اکچولی بیٹا ہمارے پاس اسٹوڈنٹ کے ایڈریس نہیں ہوتے۔ خیر کوئی خاص کام تھا ان سے۔"

"جی چچا۔"

جواب دوست نے استہزا میں دیا "ان کی طبیعت بہت خراب ہے ان سے علاج کروانا تھا۔"

"لیکن وہ تو ابھی ہاؤس جاب کر رہی ہے۔"

اٹھ کر مصافحہ کرتے وہ یک لخت ٹھٹکا۔ رابطے کی امید جاگی پھر سے بیٹھ گیا۔

"کہاں؟ کس ہسپتال میں؟"

وہ پھر سے سر کھجاتے سوچنے لگے۔ "بتایا تو تھا اس نے... شاید سروسز' جناح یا شاید گنگارام کا کہا تھا... صحیح سے یاد نہیں آرہا۔"

فہد نے انہیں کھا جانے والی نگاہ سے دیکھا پھر دوست کو ایسے جیسے کہا ہو "یہ ہے ڈاکٹرز کا حال' جن سے ہم علاج کرواتے ہیں' آدھی آبادی تو ان کی یاددہانی کی نظر ہو جاتی ہو گی۔"

ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ نانی بھی ناراض ہو گئیں اور محترمہ کا بھی اتا پتا نہ چلا۔

☆ ☆ ☆

وہ ممکنہ دو تین ہاسپٹلز میں گیا' شاید کچھ سراغ ملے۔ وہاں رش اس قدر تھا کسی نے منہ نہ لگایا۔ پہچان پر وقت کون لگاتا۔

شام دیواروں پر پھسلنا چاہتی تھی تب اسے یاد آیا نانی کو رقیبوں کے گھر سے بھی لینا ہے۔ خاص طور پر ہدایت تھی جاتے ہوئے لے کر جانا' حالانکہ یارانے لگاتے وقت پہلے خود ہی آتی جاتی رہی ہوں گی۔

نانی' دادی بہت دیر سے لاؤنج میں بیٹھی راز و نیاز کر رہی تھیں۔ دادی البتہ چہرے سے مطمئن سی لگتی تھیں۔ غالباً "بڑی آپا کو اپنے منہ انکار نہیں کرنا پڑا' وہ خود ہی بہت کھسیانی بنی بیٹھی تھیں۔ دبے دبے لفظوں میں انکار کی حجتیں ڈھونڈ رہی تھیں۔

"بس آپا! نئی نسل کے کیا ہی کہنے' جو من کو بھائے اسی کے لیے منڈیا ہلائے... آہ ہم نے تو بس چارپائی پر بیٹھ' وقت برباد کیا اور چونڈے سفید۔"

ان سے ملنے سب آئے تھے۔ منعم البتہ چوروں کی طرح آئی' تھوڑی دیر بعد اٹھ گئی۔ زبیدہ بہت دیر بیٹھی رہیں۔ خوامخواہ کی وضاحتوں سے دل کھٹا ہو گیا تھا۔ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ تین چار دن کی گھریلو مزدوری نے یک لخت جسم کی ساری چولیں (جوڑ) ہلا دیں۔

وہ کچن سے پانی پی کر لاؤنج کی جانب بڑھی تھی جبھی اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ چچا گھر پر نہیں تھے۔ چچی' اریبہ اپنے کمرے میں نانی پر تبصرہ کر رہی تھیں اور شیری تو ویسے ہی خواتین کی باتوں کا شائق تھا۔ وہی گیٹ کے قریب تھی' تمام تر اکتاہٹ سجائے گیٹ کی جانب بڑھی۔

"کون.....؟"
"جی..... وہ میں..... نانی۔"
"ہائیں! مردانہ آواز اور اس قسم کا تعارف۔" اس نے جھٹ سے گیٹ کھولا' یک لخت بولی۔
"جی آپ نانی ہیں!"
"ہیں۔" تو منہ میں ہی چپک گیا تھا۔ دونوں مارے حیرت کے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے' اس نے تو باقاعدہ پلکیں پٹپٹا کر یقین دہانی کی اور پہلا خیال سپر اسٹور والی حرکت کا آیا اور ساتھ ہی جھماکا انہیں پہچان کر ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے قدم..... اف یہ گھر تک آ گیا..... توبہ ہی ہے' سال نہیں تو کم از کم آٹھ مہینے تو ہو ہی گئے ہوں گے ان واقعات کو' عورتوں کی طرح جس بات کو پکڑ لو' چپک جاؤ۔
وہ ساکت کھڑا کڑی سے کڑی ملا رہا تھا۔ اگر یہی وہ لڑکی ہے جس کے لیے نانی..... لیکن وہ تو نرس' ڈاکٹر عثمان نے بتایا تھا ان کی اسٹوڈنٹ ہاؤس جاب..... نانی

اور نانی کی معلومات اف بالکل صحیح کہا' دھوکا اور کھوتا کھانے کے بعد ہی پتا چلتا ہے اگر نانی نے انکار کر دیا۔ لوجی' بھٹہ تو میرا بہہ گیا۔"
منعم نے خود پر قابو پاتے گردن اکڑا کر پوچھا تھا۔
"کس لیے آئے ہیں آپ' کس سے ملنا ہے؟"
"جی وہ میری نانی۔" وہ کہتا آگے بڑھا وہ پیچھے ہوتی گیٹ کے ساتھ لگ گئی۔
"اوہو تو وہ جو اندر بیٹھی ہیں' اس کی نانی ہیں۔"
وہ تین گھنٹوں سے نانی کا گھٹنا پکڑے بیٹھا تھا۔ مگر نانی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ سلام دعا تعارف کے بعد پہلے تو وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے ان کے کان میں گھسر پھسر کرتا رہا۔ نانی نے گھر کا۔ جب معاملے کی سنگینی کا پتا چلا پھر تو مانو اس نے ان کا گھٹنا ہی پکڑ لیا۔ ناک سے لکیریں تو کیا سر کے بل چل کر سرکس دکھانے پر راضی تھا۔ اعظم گھر آ چکے تھے اور ساری داستان زبیدہ نے گوش گزار گیٹ کھولتے کھولتے کر دی۔
اس کا پچھتاوے بھرا دل تیز دھڑک رہا تھا۔ حمایت طلب نگاہ اریبہ پر گئی' اس نے کندھے اچکائے اور باہر جانے کے لیے نکلی۔ منعم نے زبردستی روکا۔ ایک ہزار بار خود کو سا اور اس سے زیادہ اریبہ کو۔ جس مسنی نے بھنک تک نہ پڑنے دی۔
"اگر دادی کی بات شرافت سے مان لیتیں تو اب یوں منتیں نہ کرتیں۔" دادی کا دوسرا روپ بنی اریبہ کا جملہ اسے تپا گیا۔
"مان تو رہی ہوں۔"
"جی نہیں' کل رات تم اسی رشتے کی وجہ سے خودکشی کرنے والی تھیں' اور اسلام میں اس کی ممانعت ہے' ہم کوئی ایسا کام نہیں ہونے دیں گے کہ میری پیاری کزن حرام موت مرے۔"
"بکومت۔" وہ کچکچائی "اور ویسے بھی وہ میری خالی خولی دھمکی تھی' چھپکلی کو دیکھ کر میری جان نکل جاتی ہے ہمیں کیوں مرنے لگی' پلیز....."
"خالی پلیز نہیں' کان پکڑ کر پانچ اٹھک بیٹھک کرو' پھر سوچوں گی۔" منعم نے اس کے کندھے پر مکوں کی بارش کر دی۔ "باہر جا کر معاملہ سنبھالو..... ورنہ۔"
"ورنہ تم چھت سے کود جاؤ گی۔" اریبہ کہہ کر باہر بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس کی کھسیانی شکل پر دادی کا دل تو پسیجا تھا مگر نانی ٹھس بیٹھی تھیں۔
"جتنا ساری رات میں پریشان رہی کیسے آپا بتول کو جواب دوں گی۔ کم از کم یہ بھی تو کچھ دیر پریشان ہو کہ کیسے معاملہ سنبھالے گا۔"
البتہ نانی نے دادی کو معانی خیز سا دیکھا تھا اور ایک ارادہ دل میں باندھا۔
"ان چولوں کی اچھی طرح ناک رگڑوا کر ہی ہاں کریں گے۔"

ایمل رضا
میری محبت سے آؤ

ایک گلابی سمندر تھا جس میں وہ ڈوب رہی تھی یا سمندر کی وہ گلابی لہریں سرکش ہو گئی تھیں جو سمندر سے باہر نکل آئی تھیں اور اب اس کے پورے وجود پر لپٹ رہی تھیں اترا کر وہ تھوڑا سا گھومی.... لہریں اٹھتی گئیں اوپر کو.... اور ان گلابی پروں میں گھری وہ گھومتی رہی.... گھومتی رہی اور مسکراتی رہی۔ اس کی ہنسی رقص کے اس مختصر سے انداز پر پھیلتی چلی گئی۔

تہہ در تہہ لگا کر بنائے گئے نفیس اور باریک ریشوں کے فراک کو پہن کر وہ سوچنے لگی کہ یہ قیمتی لباس واقعی میں دلکش ہے یا وہ خوب صورت ترین کہ یہ لباس اس کی ذات کا حصہ بن کر دلکش ہو گیا ہے۔ خوبی اس میں ہے یا اس لباس میں وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

☼ ☼ ☼

نیوجرسی کا اپریل موسم بہار کا سندیسہ دے رہا تھا۔ موسم کی لطیف گرمی پھولوں پودوں کو مہکا رہی تھی۔ پارک انتظامیہ کی طرف سے بنائے گئے وہ ننھے ننھے لکڑی کے گھر جو درختوں کی شاخوں پر چہچہاتی پرندوں کو ٹھہرانے کے لیے نصب کیے گئے تھے چہچہاہٹوں سے گونج رہے تھے۔

ان سارے خوش کن مناظر سے گھری روش پر چلتے ہوئے جبران پر ماحول کی کسی بھی چیز نے کوئی مثبت اثر نہیں ڈالا تھا۔ گول گپے کی طرح اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ یہ گول گپا نہ اندر کیا جا رہا تھا نہ باہر اگلا جا رہا تھا۔

"تو مجھے اس تھیم پارک لے آیا ہے.... بچوں کے پارک.... تیرا کیا خیال ہے میں جھولے لوں گا اور میری ٹینشن دور ہو جائے گی۔ میرے دکھ درد کم ہو جائیں گے۔" اس نے غصے سے اپنے دوست ڈینیل کو دیکھا۔

"ریلیکس ہو جا ڈیئر.... اس وقت میں تجھے جہاں بھی لے جاتا وہ جگہ تجھے زہر ہی لگنی تھی۔"

ڈینیل باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کی طرح اچھلتا اچھلتا دور تک گیا۔ اور اس نے فرضی باسکٹ میں فرضی بال کو ڈال کر گول کیا۔

مکمل ناول

"بالکل ٹھیک کہا تو نے... واقعی مجھے تو ہر چیز زہر لگ رہی ہے۔ تو بھی اور تیرا یہ اچھلنا بھی، مجھے لگا تھا یہاں تو مجھے سننے آیا ہے... پر تو تو اپنی باسکٹ بال کی پریکٹس کرنے آیا ہے۔"

"تجھے بھی سن رہا ہوں ڈیئر... سوچا ساتھ ساتھ پریکٹس بھی کر لوں۔" پسینے اور تھکن سے بوجھل کھلاڑیوں کی طرح وہ بولا اور پھر فرضی بال کو زمین پر ٹپے دیتا دور تک گیا اور... جبران وہیں کھڑا ہو گیا۔ ڈینیل "گول" کرنے کے بعد مسکراتا ہوا اس "گھوری" ڈالنے والے کے پاس آیا اور اس نے اس "ونی بال" کی کمر کے گرد بازو ڈالا اور اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔

"اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔" وہ اپنے منگول نسل جبڑے کھول کر ہنسا۔

"اتنی پریکٹس بھی صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔" جبران نے کہا۔ منگول جبڑے تھوڑے اور کھل گئے۔

"چھوڑ سب کو... بتا مسئلہ کیا ہے۔" دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"مسئلہ نہیں... مسئلے ہیں ایک مسئلہ تو میرے وہ "پاپا" ہیں۔ جو کل ممی سے کہہ رہے تھے کہ وہ میرے سارے اکاؤنٹ فریز کروا دیں۔ کیونکہ میں پیسوں کی قدر کو نہیں سمجھتا کیا ہوا جو میں رائن سے پانچ سو ڈالر کی شرط ہار گیا کہ فٹ بال میچ برازیل والے جیتیں گے۔ اب مجھے کیا اندازہ تھا کہ برازیل والوں کو واقعی میں دو شوق ہی رہ گئے ہیں... باہر سڑکوں پر نکل جانا اور اوٹ پٹانگ فیشن کرنا۔"

"یہ تو واقعی بہت معمولی سی بات ہے۔ صرف پانچ سو ڈالرز ہی تو تھے... تمہارے پاپا کو تمہاری ماما کے کان نہیں بھرنے چاہیے تھے۔" ڈینیل نے تاسف سے تائید کی۔ (زخم پر مرہم رکھا)

"اب بتاؤ... کیا میں نے چور سے کہا تھا کہ وہ میرا والٹ چوری کرے... مانا کہ غلطی میری تھی کہ میں اسے ہوٹل کے ٹوائلٹ میں بھول گیا... لیکن کیا ایک میرے جیسا لڑکا جو ہر وقت اپنی سٹڈی میں الجھا رہتا ہے اتنی سی غلطی نہیں کر سکتا۔ مجھے تھوڑی پتا تھا کہ ہوٹل میں کوئی چور بھی ہے... اب ان ساری باتوں کا غصہ میں اس ایل ای ڈی پر نہ نکالتا تو کس پر نکالتا۔ حالانکہ غصے میں بھی میں نے اس کے سائیڈ پر صرف ایک بیٹ ہی تو مارا تھا۔ وہ پوری دھڑام سے نیچے آگری... اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔"

"ہاں... واقعی... یہ چائنیز چیزیں زیادہ پائیدار نہیں ہوتیں۔"

"ممی الگ بلیک میل کر رہی ہیں مجھے۔"

"کیا... ؟ آنٹی بلیک میل کر رہی ہیں تجھے... مجھے آنٹی سے ایسی امید ہر گز نہیں تھی... کس بات پر بلیک میل کر رہی ہیں... اور کتنے پیسے مانگ رہی ہیں تجھ سے؟"

"پیسے نہیں ڈفر... جذباتی بلیک میل کر رہی ہیں۔" جبران نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا... میں بھی کہوں، آنٹی اتنی لالچی لگتی تو نہیں۔"

☼ ☼ ☼

جوتی کے شفاف شیشے میں سورج کی روشنی قوس قزح بن کر نکل رہی تھی۔ اس نے اس ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جگر جگر کرتی جوتی کو اپنی نظروں کے سامنے کیا۔ غور سے دیکھا اور دیکھتی ہی گئی۔ پھر جیسے اسے یاد آیا کہ یہ جوتی اس کے لیے ہی بنی ہے۔ نیچے جھک کر اس نے جوتی میں اپنے خوب صورت پاؤں ڈالے۔ جوتی اور اس کے پاؤں دونوں ایک دوجے کے لیے ہی بنے تھے۔

☼ ☼ ☼

"غلطی میری ہی ہے... ماریا تب مجھے اچھی لگی تھی۔ میں نے خود ممی سے کہا تھا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تب میں ٹین ایجر تھا۔ مجھے لگا میں ساری زندگی ٹین ایجر ہی رہوں گا۔ لیکن میں بڑا ہو

گیا اور ممی ٹین ایجر بن گئی ہیں اور اب مجھے جذباتی بلیک میل کررہی ہیں کہ میں ماریا سے شادی کروں۔ میں نے خود ہی تو انہیں کسی زمانے میں کہا تھا۔"

"تو برا نہیں ہوا بھائی۔۔۔ دراصل تو بے غیرت ہو گیا ہے۔" وہ گیند کو کھلاڑیوں سے بچاتے ہوئے بولا۔ جبران کی طرف سے جب کافی دیر تک خاموشی رہی تو وہ اس کی طرف مڑا۔

"مذاق کررہا ہوں۔" مکار نسل نے پھر سے بتیس دانت نکالے۔

"چل آکولڈ کافی پیتے ہیں۔ تیرا غصہ تھوڑا کم ہوگا۔" اسے بازو سے کھینچ کر وہ پارک کی کینٹین میں لے گیا۔ وہاں سے کولڈ کافی کے دو بڑے بڑے مگ لے کر وہ پھر سے چلنے لگے۔

"ممی کہتی ہیں انہوں نے تب ہی ماریا کے ڈیڈ سے میرے لیے بات کرلی تھی۔ اور ماریا وہ اب میرے انتظار میں بیٹھی ہے، جیسے زندگی کا مقصد ہی یہ ہو۔ ایک تو ان پاکستانی لڑکیوں کو انتظار کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ ممی تو ماریا سے اس قدر انسپائر ہیں کہ اگر ممی خود لڑکا ہوتیں تو ماریا اس وقت میری ممی کی بیوی ہوتی۔ ٹھیک ہے وہ خوب صورت ہے۔ تو میں کیا کروں، میں کیا کسی سے کم ہوں۔ وہ ایم ایس سی کررہی ہے تو اپنے لیے کررہی ہے۔"

"تو کیا اب تجھے کوئی اور پسند آگئی ہے؟"

"پسند ہی تو نہیں آئی۔۔۔ ورنہ تو ممی نے ایک آپشن یہ بھی دیا تھا۔ اور اب وہ کہہ رہی ہیں کہ کوئی اور نہیں ہے تو پھر تو مجھے ماریا سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔"

"تو پھر تو جلدی سے اپنے لیے کوئی پسند کرلے نا۔" ڈینیل نے کمال کا مشورہ دیا۔

"مجھے کوئی جیکٹ نہیں پسند کرنی۔ اپنے لیے وائف پسند کرنی ہے۔" کمال کے مشورے پر جبران نے سر جھٹکا۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈریسنگ کی طرف بڑھی ہیرے کی چمک دیتے آویزے اس نے باری باری اپنے دونوں کانوں میں پہنے، پھر اس کے ساتھ کا نیکلس گردن پر لپیٹا اور بھرپور نظر سے اپنے سراپے کو دیکھا۔ آج خود کو دیکھنے سے اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔

اپنے روپ کا آخری سنگھار اس نے سب سے آخر میں کیا۔ سفید سونے کا عکس دیتے تاج کو اپنے سر پر رکھا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔

ابھی کافی وقت تھا۔ عارضی خوشیوں کے ختم ہو جانے میں کافی وقت تھا ابھی۔ سنڈریلا نے سوچا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

"اس لڑکی کا مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ اس کا نہیں۔۔۔ میری نظر کا ہے۔۔۔ اپنی وائف بنانے کے لیے مجھے کسی خاص کی تلاش ہے، کسی بہت ہی خاص کی۔۔۔ دراصل انیمیٹڈ سیریز اینڈ کمپنی میں کام کرتے کرتے میں کہیں دل سے ان ہی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔" جبران موج میں آگیا۔ اور ڈینیل کے سامنے آکر اسے اپنے خوابناک خیالات بتاتے ہوئے الٹا چلنے لگا۔

"میں کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں جو اینیمیٹڈ موویز کی ہیروئن کی طرح ہو۔۔۔ فیری ٹیل کی شہزادی جیسی۔۔۔ راپنزل کی طرح ہو، لمبے بالوں والی۔۔۔ سنو وائٹ کی طرح۔۔۔ وائٹ سنڈریلا کی طرح معصوم۔۔۔ مجھے ان سب میں سے کسی کی تلاش ہے کہ وہ آئے اور آکر مجھ سے ٹکرا جائے۔۔۔ میرے کندھے پر وہ اپنا سر رکھے اور میری ہو جائے۔۔۔"

جبران نے جوش سے بتاتے ہوئے دونوں ہاتھ کھول لیے اور پھر اگلے ہی لمحے کسی سے ٹکرا کر لڑکھڑایا۔ دوسری روش سے آتا ہوا کوئی اچانک ہی اس سے ٹکرا گیا تھا یا وہ خود بے دھیانی میں اس سے ٹکرایا تھا۔

جبران سنبھل کر پلٹا اور پھر حیرت سے وہیں سن ہو گیا۔ اس سے ٹکرانے والی سنڈریلا تھی۔

جبران اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا۔ کیا اس کے سامنے سنڈریلا ہی کھڑی تھی؟ کیا خدا نے اس کی فریاد سن لی تھی اور ایک سنڈریلا فوری طور پر بنا کر اس کے

پاس بھیج دی تھی؟ یا یہاں قریب ہی کوئی جادوگر دبکا بیٹھا تھا۔ جس نے اپنے جادو کے زور پر ایک تخیلاتی سنڈریلا کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا اور اب وہ کسی درخت کے پیچھے چھپا اس سارے کھیل کا مزہ لینے والا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر سنڈریلا کو چٹکی لے کر دیکھے کہ کیا وہ واقعی حقیقت میں وجود رکھتی ہے یا یہ اس کا وہم ہے۔ وہ اس کا وہم نہیں تھا کیونکہ سنڈریلا کی فراک پر اس کی کولڈ کافی کا پورا مگ الٹ چکا تھا اور سنڈریلا اپنے قیمتی فراک پر گرے اس کولڈ کافی کے باعث بڑے دھبے کو بھنویں جوڑے گھور رہی تھی۔

ڈینیل بھی جبران کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور حیرت سے سارا منظر دیکھنے لگا۔

معصوم سنڈریلا نے اپنے فراک کے داغ کو خوب اچھی طرح گھور کر اس خبیث لڑکے کو دیکھا جس کے ہاتھوں سے یہ کارنامہ سرانجام ہوا تھا۔

"اوہ اندھے لڑکے... تمہارے پاؤں الٹے نصب ہیں یا تمہارا دماغ؟" سنڈریلا پوچھ رہی تھی۔ جبران کو دو ہزار میگاواٹ کا جھٹکا لگا۔ سنڈریلا ایسے بھی بول سکتی تھی اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ کسی مووی میں دیکھا بھی نہ تھا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔" اس نے جبران کو کندھوں سے جھنجھوڑا۔

"وہ آئے اور آکر مجھ سے ٹکرا جائے... میرے کندھے پر وہ اپنا سر رکھ دے اور میری ہو جائے۔" وہ اس سے ٹکرا گئی تھی اور اب اس کے کندھے کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ جبران کو جیسے تھوڑا تھوڑا ہوش آیا۔ سنڈریلا کیسے بول رہی تھی۔ اس کے کانوں نے یہ الفاظ ماننے سے جیسے انکار کر دیا۔

"کس دنیا میں ہو تم لڑکے...؟" وہ اور تیز چلانے لگی تھی۔

"کیوں... کیا ہوا؟" بمشکل جبران کے منہ سے الفاظ نکلے۔ اس کے لیے یہ غم ہی بہت بڑا تھا کہ معصوم سنڈریلا کبھی کبھی یہ انداز بھی اپنا لیتی ہے۔

"کیا ہوا؟" وہ طنز سے غرائی۔ "یہ دیکھو' ساری فراک خراب کر دی ہے تم نے میری۔"

"تو جادوگرنی سے کہو نا کہ وہ پھر سے ٹھیک کر دے۔"

"اوہ مسٹر! زیادہ معصوم مت بنو..." وہ چلانا بند ہی نہیں کر رہی تھی۔ کیا وہ جبران کی فق شکل نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

"کیا تم سنڈریلا نہیں ہو... جادوگرنی والی...؟"

"سنڈریلا ہوں نہیں... سنڈریلا بنی ہوئی ہوں... اور یہ لباس جادوگرنی نے نہیں... کرسٹن نے دیا ہے مجھے... اور کرسٹن اپنے غصے میں جھاڑو والی جادوگرنی سے بھی زیادہ غضب ناک ہے۔ اس نے دیکھ لیا نا کہ میں اس کے قیمتی لباس پر کافی گرا کر لائی ہوں تو اس نے مجھے میری ایک ماہ کی تنخواہ نہیں دینی۔"

"تنخواہ... تو کیا تم تنخواہ پر سنڈریلا بنتی ہو؟"

"تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ یہ تھیم پارک ہے... آگے بڑھو سلیپنگ بیوٹی' راپنزل' باربی سب مل جائیں گی۔"

"اچھا... واقعی؟" وہ خوشی سے آگے بڑھا۔ اس تھیم پارک میں وہ اس سے پہلے کارٹون کریکٹر وغیرہ تو دیکھ چکا تھا لیکن انتظامیہ نے یہ جو فیری ٹیل ہیروئنز کو جا بجا کھڑے کرنے کا نیا طریقہ کار اپنایا تھا۔ یہ بات اس کے لیے بالکل نئی تھی۔

"ایک منٹ..." سنڈریلا جس کا اصل نام رومی تھا' نے اس کا راستہ روکا۔

"پہلے اس کا کوئی حل نکال کر جاؤ۔" اس نے اپنی فراک پر گری کافی کے دھبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جبران سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

"میرے پاس اس وقت ڈٹرجنٹ پاؤڈر ہے اور نہ ہی مجھے کپڑے دھونے آتے ہیں۔"

"تم سے کوئی اس کو دھونے کو نہیں کہہ رہا۔"

"تو پھر...؟"

"اس کی... اس کی پے منٹ کر کے جاؤ..." رومی تھوڑا ڈر کر اور کچھ سوچ کر بولی۔

"کس کی...؟" جبران کے ساتھ ساتھ ڈینیل بھی

اچھلا۔

"اس لباس کی..." رومی تن کر کھڑی ہو گئی۔

"ذرا سی کولڈ کافی ہی تو گری ہے... تھوڑی تو میں پی ہی چکا تھا۔"

"اور پورا لباس خراب ہو گیا ہے... یہ اب ڈرائی کلین بھی نہیں ہو سکے گا۔ یہ لباس اب بے کار ہو گیا ہے۔"

"لیکن کیوں...؟" جبران ہکلایا۔

"لڑکیوں کے لباس ایسے ہی ہوتے ہیں' ان ہی کی طرح حساس' اب اس کا بھی قصہ ختم ہو گیا ہے تمہاری کولڈ کافی کی وجہ سے' جلدی سے اس کی پے منٹ کرو۔" رومی نے چٹکی بجائی۔

"کتنے کا ہے یہ لباس؟" جبران نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہ مہنگا تھا۔ یہ اس کی نفاست سے عیاں تھا۔

"ڈیڑھ سو ڈالر کا۔" رومی نے انکشاف کیا اور اپنی دانست میں بہت زیادہ قیمت بتائی۔

"کیا...؟" وہ چلایا۔

"ڈیڑھ سو ڈالر کا..." اس نے ایسی بے نیازی سے کہا جیسے سمجھی ہو کہ پہلے بتاتے وقت سامنے والے تک اس کی آواز پہنچ نہیں پائی تھی۔

"اتنا مہنگا!"

"ہاں... تم دیکھ نہیں رہے کہ یہ کتنا مہنگا دکھتا ہے... اور یہ آج ہی آیا ہے۔ پچھلی سنڈریلا نے لباس خراب کر دیا تھا... اس لیے کرسٹن نے آج مجھے سنڈریلا بنا دیا اور اسے سزا دی... تم چاہتے ہو کہ اب وہ مجھے بھی سزا دے اور... میں نے تمہیں بتایا ناں کہ وہ جھاڑو والی جادوگرنی سے بھی زیادہ غضب ناک ہے۔"

"لیکن ذرا سی کولڈ کافی... اور ڈیڑھ سو ڈالر..." جیسے مجرم قرار دیا جا چکا جبران... جج کے سامنے منمنایا۔

"اس وقت میرے پاس ڈیڑھ سو ڈالر نہیں ہیں۔"

"یہ میں نہیں جانتی..." رومی نے بھنویں تانیں۔

"یہ تمہیں الٹا چلنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

"میں تو گھر میں ابھی الٹا چل لیتا ہوں... لیکن کسی کو ڈیڑھ سو ڈالر ادا نہیں کرتا۔"

"میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ جلدی سے پے منٹ کرو.... مجھے آبشار والی سائیڈ پر جانا ہے۔ اگر میں وہاں نہ ہوئی اور کرسٹن وہاں پر آ گیا تو.... میں نے تمہیں بتایا نا کہ وہ...."

"بس.... بس ازبر ہو گیا ہے۔" جبران کے بجائے ڈینیل نے کہا۔ اور رومی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے اس منحوس شکل والے لڑکے کی مداخلت کرنا ناگوار گزرا تھا۔

"چلو پھر پیسے دو۔"

"میرے پاس کریڈٹ کارڈ ہے بس۔"

"ذرا سا آگے بڑی کینٹین ہے.... کریڈٹ کارڈ کی سہولت وہاں موجود ہے۔ میں کینٹین والے سے پیسے لے لوں گی اور وہ تم سے کارڈ...." رومی نے ایسے کہا تھا کہ وہ سمجھ لے کہ وہ کس صورت پیچھے ہٹنے والی نہیں ہے۔

بڑی کینٹین جا کر.... ڈیڑھ سو ڈالر وصول کر کے.... جبران کو ہکا بکا چھوڑ کر وہ آبشار کی طرف چلی گئی تھی۔ سنڈریلا کا کاؤنٹر وہاں پر نصب تھا۔ رات گئے تک اس نے وہاں اپنی ڈیوٹی سر انجام دی۔ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ لباس بدلنے ڈریسنگ روم آئی اپنا لباس پہنا اور سنڈریلا والا داغ دار لباس کرسٹن کو تھما دیا۔

"کسی شرارتی بچے نے اس پر کولڈ کافی گرا دی تھی، اسے ڈرائی کلین کروا دینا۔"

"اچھا ویسے بچے کولڈ کافی پیتے تو نہیں...." کرسٹن نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تو پھر اس بچے کی ماں سے جا کر پوچھ لو کہ اس نے بچے کو کولڈ کافی کیوں لے کر دی۔" وہ تنگ کر بولی۔

ڈیڑھ سو ڈالر اس نے اپنے پرس میں رکھے اور گھر واپس آ گئی۔ ایک اور تھکا دینے والا دن تمام ہوا۔

☼ ☼ ☼

ڈزنی تھیم پارک ریاست کا سب سے خوب صورت اور منفرد تھیم پارک تھا جو شہر سے باہر مضافات میں واقع تھا' یہ تھیم پارک رقبے میں بھی اس قدر بڑا تھا کہ اسے مکمل طور پر دیکھنے کے لیے ایک دو دن درکار تھے۔ تھیم پارک کے ارد گرد رہائش کے لیے مختلف چھوٹے بڑے سستے مہنگے ہوٹل بھی بن چکے تھے.... جو لوگ دوسرے شہر' دوسری ریاست یا دوسرے ممالک سے آتے تھے وہ ان ہی ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے۔ اور تین چار دن لگاتار یہاں آ کر اس کا کونا کونا دیکھ کر واپس جاتے تھے۔

آج کل تو ویسے بھی سیلفیوں کا فیشن کسی مفت کے کورس کی طرح سب کے لیے تھا کچھ خبطی تو سیلفی لینے کے چکر میں ہلکان نظر آتے تھے اور پارک کے چپے چپے پر سیلفی بنواتے تھے۔

رومی اس بڑے' خوب صورت اور سیلفی کے لیے موزوں ترین تھیم پارک میں کام کرتی تھی۔ یہ اس کی نوکری کا پہلا مہینہ تھا۔ ویسے تو تھیم پارک میں لاتعداد لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ کچھ انجینئرنگ کے شعبے میں تھیں۔ کچھ کلیننگ کے شعبے میں۔ اور بھی تھیں بے تحاشا نجانے کس کس شعبے میں اور ان سب کی کوالیفکیشن بہت زیادہ ہائی تھی۔ وہ اگر ہزاروں کی تعداد میں سے انٹرویو دے کر.... پاس ہو کر یہاں تک آئی تھیں تو وہ اس لائق تھیں۔ لیکن رومی اور اس کے گروپ کی پچاس لڑکیاں اور تقریباً" پچاس ہی لڑکے تھیم پارک کی وہ واحد جماعت تھی جن کے پاس ٹیلنٹ نام کو نہیں تھا اور تعلیم کا ذرہ برابر فخر نہیں' غرور تو بہت دور کی بات ہے۔

اس پوری نااہل جماعت کو مختلف روپ بہروپ اپنا کر پارک کے مختلف حصوں میں کھڑے ہونا پڑتا تھا۔ سنڈریلا' سنو وائٹ' راپنزل' سلیپنگ بیوٹی وغیرہ وغیرہ اور لڑکے بیٹ مین' سپرمین' ہولومین' اسپائیڈر مین اور نجانے کیا کیا۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جو لڑکے لڑکیوں دونوں کے لیے مختص تھی.... اور وہ تھی "بھالو" جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

رومی کا زندگی بھر کوئی نوکری کرنے کا ارادہ تو کبھی نہ بنا تھا اور نہ ہی آگے بننے والا تھا اس کے لیے زندگی اتنی اہم نہیں تھی کہ وہ جاب کر کے پیسے جوڑ کر زندگی

کو خوب صورت بنانے کے چکر میں زندگی کو ہی بد صورت بنا دیتی۔

دوسرا اسے اس بات کا سوفی صد یقین تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کی اصل اولاد نہیں ہے۔ انہوں نے اسے کہیں سے اٹھایا ہے یا کسی گھر سے چوری کر لیا ہے۔ اور اب جلد ہی اس کے اصل ماں باپ اسے مل جائیں گے جو حد سے زیادہ امیر ہوں گے۔ اس کی زندگی اپنے آپ ہی بدل جائے گی۔ وہ آئے دن مہنگے مہنگے کپڑے پہنے گی۔ اس کی الماری نت نئے کپڑوں، پرس، سینڈلوں سے ہر وقت بھرا رہے گا۔ اس کا کمرہ، باتھ روم عالی شان ہو گا۔ اور چونکہ امیر والدین اس سے کافی زیادہ عرصہ دور رہے ہوں گے تو اسی باعث وہ پھر اس کی ہر جائز اور ناجائز یا یوں کہنا چاہیے کہ مہنگی سے مہنگی خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھیں گے۔ وہ دل کھول کر اپنے شوق پورے کرے گی۔

اس نے ڈائری میں فہرست بھی بنالی تھی۔ سب سے پہلے خلا کا سفر۔ برج خلیفہ میں شراکت داری۔ لیڈی گاگا جیسا میوزک البم.... ایک چھوٹا سا اپنا ذاتی جزیرہ.... جہاں وہ صرف گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جایا کرے گی۔ وہاں کے انگور کے باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے شامیں گزارے گی اور اور ابھی وہ ان خوابوں میں ہی ہوتی جب امی فریال اسے جاگتے میں سوتے سے اٹھا دیتیں اور اس کا دل کرتا وہ چوسنی چھن جانے والے بچے کی طرح پاؤں پٹخ پٹخ دھاڑے مار مار کر روئے۔ جزیرے کی رجسٹری پر وہ بس دستخط کرنے ہی والی تھی۔

رومی کے والد اس کے بچپن میں ہی ان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ والد کے ساتھ اس کا رشتہ دو پرانی تصویروں کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ جن کو دیکھ کر اور کبھی حالات کی ستم ظریفی کے باعث دل برداشتہ ہو کر وہ رو دیا کرتی تھی۔

رومی کے دونوں بڑے ماموں امریکہ میں آباد تھے۔ سالوں پہلے ہی دونوں نے اپنی اکلوتی بہن فریال اور ننھی رومی کو اپنے پاس امریکہ بلوا لیا تھا۔ جب تک نانی زندہ رہیں، حالات بہتر رہے پھر نانی کی وفات کے بعد دونوں بڑے ماموں اپنا ہاتھ کھینچنے لگے اور ان کی محبت آئرن گولڈ کے بے آرام صوفے کی طرح کی ہو گئی۔

امی فریال نے جاب کر لی۔ زیور وغیرہ بیچا۔ کچھ پیسے ماموں نے ڈالے اور یہ دو کمروں اور ایک لاؤنج کا چھوٹا سا گھر خرید لیا۔ یہ ماموں کی آخری مدد تھی۔ معاشی بھی اور جذباتی بھی۔ اب وہ دونوں ان دونوں سے لاتعلق، اپنی اپنی زندگیوں میں خوش حال تھے۔

امی فریال دو تین جابز کر کے گھر چلا رہی تھیں۔ انہوں نے پھر کبھی اپنے بھائیوں سے مدد کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھیں مدد ادھار لی گئی فصل ہے۔ جس کی واپسی سود سمیت ادا کرنی پڑتی ہے۔

وہ ایک صابر خاتون تھیں۔ وہ زندگی میں بہت سی مشکلات کا بڑے صبر و تحمل سے مقابلہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی مشکلات کا ذکر کبھی اپنی اکلوتی بیٹی رومی سے بھی نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس سے کبھی یہ کہا تھا کہ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوئی جاب بھی کر لے تاکہ گھر کے اخراجات میں کچھ سہولت میسر ہو۔ ایسی پریشانیوں میں بھی وہ ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہنس مکھ ہونے کی زندہ مثال تھیں۔ ان کی ذات، محبت اور احترام سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے چہرے سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ ان کے گھر یا ان کے ذہن میں اس وقت کیا چل رہا ہے۔ ان کی ذات کے بھیدوں کا دروازہ مسکراہٹ تھا۔ جو دوسروں پر ہمیشہ سے مقفل رہا تھا۔

رومی کو کبھی یہ خیال چھو کر بھی نہ گزرا کہ وہ بھی جاب کر لے اور اپنی اور امی کی زندگی کو تھوڑا بہت بدل لے۔ لیکن ایک ماہ پہلے اس کی کزن عائشہ نے اسے اپنے گھر تھیم پارٹی میں بلانے کے لیے فون کیا۔ جس نے رومی کے ارادے بدل دیے اور اس کے اندر نئے عزائم پیدا کر دیے۔ اس نے اس بات کا یقین کر لیا کہ اس کے سگے ماں باپ جو کہ بہت امیر ہیں، اب کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ اپنی معصوم سا پیاری سی بچی کو بھول چکے ہیں۔ اسے مرا ہوا جان کر فراموش کر چکے

ہیں۔ اس لیے اب اسے خود ہی اٹھ کر اپنے لیے محنت
کرنی پڑے گی۔

عائشہ نے اسے پارٹی سے ایک دن پہلے فون کیا تھا۔
اپنے دونوں ماموں زاد کزنز میں اس کی حیثیت ایسی تھی
جیسے مالٹوں، موسمبیوں کی قسموں میں چکوترے کی۔
ترش اور ناقابل برداشت کڑواہٹ کے باعث جسے
کوئی منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ عید وغیرہ پر وہ کبھی ان کی
طرف چلی بھی جاتی تو کزنز کی نظریں اس کی طرف ایسے
اٹھتیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

"یہ کیوں آگئی...."

سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول رہتے اور وہ کونے
کے صوفے کرسی پر بیٹھی اپنے ناخن کھوجتی رہتی۔
رفتہ رفتہ اس نے ان سب میں جانا ہی ختم کر دیا۔

وہ جب جب وہاں جاتی تو اسے اپنی کم مائیگی کا بڑا
احساس ہوتا۔ جیسے بہت سی پتیاں مل کر بنجر شاخوں کو
درخت بنا دیتی ہیں۔ ویسے ہی اس کی چھوٹی بڑی
پریشانیوں نے مل کر اسے مصیبت زدہ بنا دیا تھا۔ وہ امی
کے آگے رونے بیٹھ جاتی اگر اسے اس بات کا اندازہ نہ
ہوتا کہ امی اندر سے کس قدر پریشان رہتی ہیں۔

عائشہ کے فون پر اسے حیرت ہوئی تھی۔

"کل ہمارے گھر میں تھیم پارٹی ہے رومی!" اس
کے سلام کے جواب میں عائشہ نے کسی نک چڑھی
نازنین کی طرح کہا تھا۔ اس میں دونوں وصف موجود
تھے۔ وہ نازنین بھی تھی اور نک اور سر چڑھی بھی،
ماموں، ممانی کی۔

"تھیم پارٹی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔" الفاظ کھینچ کر
ادا کیے گئے۔ جیسے الاسٹک .... رومی کا دل کیا اسی
الاسٹک کی غلیل بنا کر عائشہ کے منہ پر کنکر دے
مارے۔

"میرا مطلب الفاظ سے نہیں، سچویشن سے ہے....
کبھی گئی ہو تھیم پارٹیز میں؟" پارٹی کا لفظ ادا ہونے
میں تقریباً پندرہ سیکنڈ لگے۔

"ہاں.... بہت بار۔" رومی نے دانت پیس کر کہا۔

"اچھا.... کیا واقعی؟" ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔ جیسے
اسے اس بات کا یقین ہو کہ وہ کبھی کسی تھیم پارٹی میں
نہیں گئی.... رومی لمحے بھر کو خوف زدہ ہوئی۔ وہ واقعی
آج تک کسی تھیم پارٹی میں نہیں گئی تھی۔

"فریال آنٹی ایک بار شکوہ کر رہی تھیں کہ تم لوگ
اپنی گیدرنگ میں میری بیٹی کو نہیں بلاتے تو میں نے
سوچا اس بار تمہیں خود فون کر کے بلاؤں۔"

اسے امی پر غصہ آیا۔ وہ کیوں بھلا اس کے لیے
دوسروں سے خیرات مانگتی پھر رہی تھیں اور ایسی
خیرات....

"اچھا تو تھیم ہے جنگل کا...." عائشہ نے گھٹنے پر
گھٹنا رکھنے والے انداز میں کہا اور جیسے ایک گھٹنے تلے
رومی کی گردن دب گئی۔

"اچھا....!" رومی نے افسردگی سے کہا۔ صاف ظاہر
تھا کہ وہ نہیں جاسکے گی۔

"ہر کوئی کچھ نہ کچھ بن کر آرہا ہے۔ تمہیں تو پتا ہو
گا کہ تھیم پارٹیز میں اسی طرح...." عائشہ دل کھول کر
ہنسی...."تو ہم سب ڈیسائڈ کر رہے تھے یہ سب.... تم
کیا بننا چاہتی ہو۔" رومی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا
جواب دے۔

"تم شیرنی بن سکتی ہو؟" عائشہ بولی۔ رومی کو یہ
فیاضی سمجھ میں نہ آسکی۔

"لیکن شیرنی کا لباس تو بہت مہنگا ملے گا اور
تمہارے پاس اتنے پیسے...." ریسیور اور کریڈل کے
درمیانی تار کی طرح رومی بل کھا کر رہ گئی۔

"اچھا ویسے تم لومڑی بھی بن سکتی ہو.... اس میں
تمہارے میک اپ کے پیسے بچ جائیں گے کیونکہ
تمہارا چہرہ...."

"کیا کہنا چاہ رہی ہو عائشہ؟" وہ تیز آواز میں بولی۔

"ارے بھئی۔ ڈسکس کر رہی ہوں تم سے۔ کیا تم
مائنڈ کر گئی ہو؟"

"نہیں آگے بولو...." وہ ضبط سے بولی۔

"میرے پاس ایک ڈریس پڑا ہوا ہے.... جنگل
تھیم پارٹی کے لیے۔ پچھلے سال کا۔ اگر تم پسند کرو تو
تمہارے پیسے بچ جائیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے، بھجوا دینا۔"

"وہ نا... وہ ڈریس چوہیا کا ہے... تو تمہیں چوہیا بن کر آنا پڑے گا۔" عائشہ نے ہنسی کا فوارہ چھوڑا۔ اور رومی نے فون پٹخ دیا۔

چوہیا اگلے بہت سے دن پریشان رہی۔

"کیا ہوا رومی؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا... تم پارٹی میں بھی نہیں گئیں۔" امی فریال نے ایک دن اس کے پاس آکر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ امی کو بتا نہ سکی کہ وہ تھیم پارٹی میں کیوں نہیں گئی۔ وہ سب شیروں میں چوہیا بننا نہیں چاہتی تھی۔

"امی! میں کچھ کرنا چاہتی ہوں..." اس نے پیار سے امی کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"گھر کی صفائی کرنا چاہتی ہو تو میری طرف سے اجازت نہیں ہے۔ تم میرا کام مزید بڑھا دیتی ہو۔"

"اوہ نہیں امی! میں گھر سے باہر نکل کر کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"گھر کے باہر تو نہ باغ ہے نہ پودے... کن کی کانٹ چھانٹ کرو گی تم۔" چوہیا نے اپنا ماتھا تھام لیا۔

"امی! میں کوئی جاب کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا اور امی فریال سمجھ گئیں کہ وہ دراصل پریشان کیوں ہیں۔ ان کی پینی پینی کے حساب سے ترتیب دیے گئے اخراجات میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ رومی کو زیادہ پاکٹ منی دے سکتیں۔

اگلے دن رومی نے اپنی واحد دوست اور یونیورسٹی فیلو کیتھرین سے اس بارے میں بات کی تھی کہ اگر وہ اسے کسی جاب پر لگوا سکتی ہے تو پلیز دیر نہ کرے لگوا دے۔ سفید فام تتلی کی شکل والی کیتھرین نے ایک لمحہ اسے غور سے دیکھا تھا اور پھر کہا تھا کہ ٹھیک ہے وہ اسے یونیورسٹی کے بعد ایک جگہ لے جائے گی۔ رومی اتنی جلدی بات بن جانے پر خوش ہوئی تھی۔ کلاس کے بعد کیتھرین اسے اپنے ساتھ تھیم پارک لے گئی اور لمبے سفر کے دوران رومی کو محسوس ہوا کہ کہیں اس کی دوست کیتھرین کی نیت خراب تو نہیں ہو گئی اور وہ اسے اغوا کر رہی ہے۔ ہائے... اسے اتنی جلدی لوگوں پر اعتماد کیوں ہو جاتا ہے۔ اب کون بھرے گا تاوان اور کون بچائے گا مجھے... اور جیسے ہی اس کا شک مکمل یقین میں بدلا کہ وہ اغوا کی جا چکی ہے... سامنے تھیم پارک موجود تھا۔

"کس طرح کی جاب ہے...؟" اسے اصل بات اب یاد آئی تھی... پچھلے گیٹ سے کرسٹن کے آفس جاتے ہوئے کیتھرین نے رومی کو نوکری کی نوعیت سمجھائی اور رومی چلتے چلتے رک گئی۔

"کیتھرین! تم مجھے یہاں کیا سوچ کر لائی ہو؟" رومی نے پوچھا۔ برف جمے گالوں والی کیتھرین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھنویں اچکائی تھیں۔

"تمہارے تعلیمی سرٹیفکیٹ دیکھ کر..." ایسے لاجواب جواب پر رومی نے تھوک نگلا۔

"میرا مطلب ہے کیتھرین ایسی جاب... فیری ٹیل کی ہیروئن بن کر ایک شوپیس کی طرح کھڑے رہو... بچوں اور آنے والوں کو خوش کرو۔"

"شوپیس..." کیتھرین نے ہونٹوں کو گول کیا۔ "یہ جو اونچی اونچی بلڈنگز میں ریسپشنسٹ لڑکیاں ہوتی ہیں تو تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ واقعی وہاں گائیڈ کرنے کے لیے بیٹھی ہوتی ہیں۔ یہ اپنا آپ دکھانے کے لیے وہاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ آفس والوں نے اپنی شان ظاہر کرنے کے لیے ایسی خوب صورت لڑکیوں کو وہاں بٹھایا ہوتا ہے۔ یہ جو بڑے بڑے ہوٹلز ہیں۔ وہاں لائیو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکیاں کیا شوپیس نہیں ہوتیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے انہیں کھانے پینے کی زیادہ معلومات ہے... ان سے زیادہ معلومات تو شاید میری اور تمہاری ہو... جب وہ سب بھی شوپیس ہی ہیں تو پھر اس کام میں کیا برائی ہے۔"

کیتھرین ٹھیک کہہ رہی تھی کہ نہیں۔ لیکن رومی کا دل اندر کرسٹن کے آفس میں جانے کا نہیں کر رہا تھا۔

"تم نے کبھی غور سے اپنی تعلیمی قابلیت پر نظر ڈالی ہے۔ تمہیں کیا لگا تھا کہ میں تمہیں ایپل کمپنی لے جاؤں گی یا بل گیٹس سے ملواؤں گی؟"

کیتھرین اس کی پانچ سالہ پرانی دوست تھی۔ وہ اندر ایک گھنی لڑکی کا روپ بھی رکھتی ہے روحی کو پہلے اندازہ نہیں تھا۔ میسنے، چالاک، عیار اور مکار لوگوں کو پہچاننے میں روحی ہمیشہ سے ہی ناکام رہی تھی۔ اسے اپنی اس نادانی پر بے تحاشا دکھ ہوا۔

"زیادہ مت سوچو.... آجاؤ.... میں خود سال سے یہی کام کر رہی ہوں.... کیا مجھے کچھ فرق پڑا۔ یہاں یقیناً" تمہاری بات بھی بن جائے گی۔ ان لوگوں کو صرف خوب صورتی ہی تو چاہیے ہوتی ہے۔ تمہارے پاس اگرچہ وہ بھی نہیں ہے مگر آزمانے میں حرج ہی کیا ہے۔" گھنی کیتھرین اس کی ایسی کھلم کھلا بے عزتی کرتی اسے کرسٹن سے ملوانے لے گئی۔

نام وغیرہ پوچھنے کے دوران کرسٹن مسلسل اسے اوپر سے نیچے تک گھورتا رہا۔

کرسٹن اس سارے کام کا سرغنہ.... مطلب منیجر تھا۔ وہ جو ایک مثال ہے کہ "سو چالاک عورتیں مری ہوں گی پھر وہ پیدا ہوئی ہوگی" کرسٹن کے بارے میں یہ مثال اس طرح تھی کہ "ہزار چالاک عورتیں مری ہوں گی پھر یہ سرغنہ پیدا ہوا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے.... تم کل سے آجانا.... آج سے کام شروع کرنا چاہو تو یہ اور بھی اچھا ہے۔" چالاک عورت بولی۔

"کیا.... واقعی؟" وہ اچھل کر کہنا چاہتی تھی لیکن نوکری کی نوعیت نے اسے ایسا کرنے نہ دیا۔

"ٹھیک ہے.... میں آج ہی سے کام کروں گی.... کیا بننا ہے مجھے؟" اس نے کسی قدر اشتیاق سے پوچھا۔

"بھالو۔" کرسٹن نے کوئی فائل کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب بھالو؟"

"بھالو مطلب بھالو بھالو کے اور بھی مطلب ہوتے ہیں۔ میرے علم میں نہیں تھا۔"

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس چالاک عورت نما مرد سے کیا بولے۔ کیتھرین اس کے کندھے پر تھپکی مار کر اسے "جاب" کی مبارک باد دیتی ہوئی اندر تیار ہونے جا چکی تھی۔ اپنی ایسی تہی دامنی پر اس کا دل کیا کہ وہ دل کھول کر ماتم کرے۔

"میرا مطلب ہے بھالو تو لڑکے کا کردار ہے۔"

"ڈریس میں پتا نہیں چلتا کہ اندر لڑکا ہے کہ لڑکی۔"

"لیکن یہ زیادتی ہے۔" وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔ کرسٹن نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے۔" اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"تمہارے کتنے مطلب ہیں؟ کیا تم نے مطلب گھر میں پال رکھے ہیں۔"

"نہیں اگر تم مجھے کچھ اور دے دو تو میں اچھے سے کرلوں گی۔ جیسے سلیپنگ بیوٹی یا...."

"کیا کہا؟" کرسٹن اپنی کرسی سے اٹھا۔

"سلیپنگ بیوٹی۔" اس نے اب کی بار ڈرتے ڈرتے کہا۔ کرسٹن نے ٹیبل پر پڑا چھوٹا سا شیشہ اٹھایا اور اس کے چہرے کے آگے کیا۔

"اپنا چہرہ دیکھو ذرا غور سے تمہارے اندر سلیپ ہی سلیپ ہے بیوٹی نہیں ہے۔ اس لیے اگر بھالو بننا ہے تو ٹھیک ورنہ دروازہ کھولو.... اور چلی جاؤ۔"

اور روحی نے بھالو بننا پسند کرلیا۔

بھالو کو مکمل لباس پہننا پڑتا تھا اور یہ کام زیادہ تر لڑکیوں کے حصے میں آتا تھا۔ کرسٹن بھالو کو ایک طرح کی سزا کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کام کے حوالے سے جس لڑکے لڑکی کی اسے کوئی شکایت ملتی تو وہ اسے بھالو بنا ڈالتا اور بھالو بننا سزا اس لیے لگتا تھا کہ اس کا لباس وزنی تھا اور کام صبر آزما۔ سزا اور بھالو کا سنگم اب ایسا ہو چکا تھا کہ جو کوئی بھی بھالو بنتا سب اس سے پوچھتے کہ کیا حرکت کی تھی۔ مطلب کیا گناہ کیا تھا جو بھالو بننا پڑا۔

بھالو گیٹ سے باہر کھڑا ہوتا تھا اور اسے صرف کھڑے ہی نہیں رہنا ہوتا تھا۔ ہر وقت ٹہلنا بھی تھا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں جھومتا تھا۔ گردن گھمانا۔ ہاتھ اوپر کرکے لہرانا، انگلش پاپ میوزک پر ڈانس کرنا، ہر

آنے جانے والے پر ٹافیاں اچھالنا اور وزنی بچوں کو گود میں اٹھا کر ان کے ساتھ تصویریں بنوانا۔

دو گھنٹے لگاتار یہ عمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد دوسرے سزایافتہ۔ بھالو کی باری۔ اگلے دو گھنٹے اس کا کتھک شو اور پھر سے پہلے والے کی باری۔ یہ ڈیوٹی رات گئے تک چلتی رہتی۔

بھالو کے لباس کا اوپری حصہ مسکراتا ہوا سا تھا۔ دیکھنے والا یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس مسکراتے چہرے کے اندر والا کس کرب سے گزر رہا ہے۔ اس بھالو کے لباس میں ایسی ذلالت تھی جو جیل کی سزا کاٹتے مجرموں کو ہی محسوس ہوتی ہوگی۔

رومی پورے پچیس دن تک بھالو بنتی رہی تھی۔ پورے پچیس دن تک اس نے اس ذلالت کو سہا تھا۔ بھالو کے وزنی لباس نے اس کا جوڑ جوڑ دکھا دیا تھا۔ پھر وہ مخصوص رقص جھومنا، گھومنا، پاؤں سے فرضی کک مارنا، ہاتھ اوپر اٹھا کر خوش ہونا.... خوش؟

دو گھنٹے تک جاری رہنے والی اس خوشی میں وہ کیسے کیسے غم یاد کرتی تھی، یہ کچھ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

امی فریال نے اس سے نوکری کی نوعیت پوچھی تھی اور اس نے صاف صاف جھوٹ بول دیا تھا کہ وہ تھیم پارک میں ٹکٹ فروخت کرنے والے کاؤنٹر پر بیٹھتی ہے۔ کیتھرین نے اس کے اس جھوٹ پر اس کی سرزنش کی تھی۔

"اگر تم اس کام کو صحیح نہیں سمجھتیں تو پھر یہ کام چھوڑ دو.... ورنہ تم ڈسٹرب ہو جاؤ گی۔"

کیتھرین کا فلسفہ اچھا ہوتا۔ جو وہ اسے خود پر بھی لاگو کرتی۔ کلاس میں ایک لڑکی نے کیتھرین سے پوچھا تھا کہ وہ کوئی کام بھی کرتی ہے؟ تو کیتھرین کے بجائے رومی کہنے لگی تھی۔

"یہ تھیم پارک...." کیتھرین نے اس کو انتہائی زوردار چٹکی کاٹی تھی۔

"میں تھیم پارٹیز آرگنائز کرنے والے ادارے میں کام کرتی ہوں۔" رومی ہکا بکا کیتھرین کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔ پوچھنے والی لڑکی کے جانے کے بعد وہ کیتھرین کو ایسے ہی دیکھتی رہی تھی۔

"کیا ہوا....؟" کیتھرین نے کندھے اچکائے اور پھر ایک جان دار قہقہہ لگایا۔ رومی بھی اس کے ساتھ مل کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ امی فریال کو اس نے سچ سچ بتا دیا اور وہ خاموش ہو گئیں۔ جب جب ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس مسئلے کا کیا حل نکالیں تو وہ چپ چپ سی ہو جاتی تھیں۔

اب رومی، ڈزنی تھیم پارک اور بھالو.... یہ بھی تو ایک مسئلہ ہی تھا۔

چھبیسویں دن ایک لڑکی جو سنڈریلا بنتی تھی۔ اپنے لباس کو اس بری طرح خراب کروالائی تھی کہ اس کا لباس دیکھ کر لگتا تھا۔ جیسے اس پر کسی نے اپنا غصہ نکالا ہو۔

لڑکی کا موقف تھا کہ ایک ننھی بچی سنڈریلا کی اتنی بڑی مداح تھی کہ وہ زبردستی اس کی جوتی اس کے پیروں میں سے اتار رہی تھی تاکہ وہ یہ جوتی جا کر اپنے بھائی کو دے اور اس کا بھائی جوتی سمیت ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس کے پاس آئے اور اسے بھی یہاں سے لے کر جائے جب اس نے جوتی نہ اتاری تو ننھی بچی نے....

اور کرسٹل کا موقف تھا کہ تم نے اس چالاک ننھی بچی کو کاؤنٹر کے اندر آنے ہی کیوں دیا۔ بہر حال جو بھی ہوا تھا۔ سنڈریلا سزا کے طور پر بھالو بنا دی گئی تھی اور بھالو میں سے ایک بھالو سنڈریلا۔ خوش قسمتی سے وہ رومی تھی۔

اس دن وہ پہلی بار سنڈریلا بنی تھی۔ اس کے لیے نیا لباس آیا تھا۔ وہ خود کو وقتی طور پر واقعی کسی فیری ٹیل کی ہیروئن سمجھنے لگی تھی۔ جب جبران نامی لڑکا نجانے کہاں سے آیا اور اس نے اس کا لباس خراب کر دیا۔

☼ ☼ ☼

ڈیڑھ سو ڈالر کی ادائیگی کرنے کے بعد جبران، ماریا کے انتہائی اہم موضوع کو حل کیے بنا ہی گھر واپس ہوا تھا۔ ڈینیل نے بھی اس بین الاقوامی مسئلے کو چھیڑنا مناسب خیال نہ کیا تھا۔ وہ ویسے بھی کار میں سہم کر

بیٹھا ہوا تھا۔ کیونکہ جبران کار کو کار نہیں بلکہ کوئی جیٹ طیارہ سمجھ کر چلا رہا تھا۔ ڈینیل بے چارے کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ ابھی تو اس نے باسکٹ بال میں نام بھی کمانا تھا۔ کار کی تیز رفتاری دیکھتے ہوئے اسے اپنا نام قبر کی تختی پر لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"کبھی دوبارہ سامنا ہوا تو میں اس لڑکی کو چھوڑوں گا نہیں۔" یہ تحریر جبران کے ماتھے پر لکھی تھی۔

"غلطی ویسے تیری تھی جبران....." ڈینیل نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔ "اس بے چاری کا قیمتی لباس واقعی خراب....."

"گھر آ گیا ہے تیرا....." جبران نے اسے کار میں سے باہر دھکیلا۔ ڈینیل اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ جبران کو ڈیڑھ سو ڈالر کے فضول میں چلے جانے کا دکھ نہیں تھا۔ اسے اس لڑکی پر غصہ تھا۔ کیسی چالاکی سے اس نے پیسے بٹورے تھے۔ جبران کو خیال آیا کہ اسے اس کے مینجر سے تو ضرور مل لینا چاہیے تھا۔ تاکہ اگر وہ سنڈریلا ..... اپنے لباس کی قیمت وغیرہ کے بارے میں جھوٹ بول رہی ہوتی تو پکڑی تو جاتی۔ پھر جبران بھی اسے خوب ذلیل کرتا۔

گھر تک کے باقی سفر میں جو تھوڑا بہت غصہ رہ گیا تھا وہ بھی اترا' اور پندرہ منٹ کے لگاتار غسل نے اسے مطمئن ہی کر دیا اور پہلے جیسا بنا دیا۔ باہر کھانے کی میز پر اس کے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی بیٹھے تھے۔ اس نے انہیں زوردار انداز میں ایسے جپھی ڈالی کہ ان بے چاروں کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی۔ اور ہر روز کی طرح وہ بے چارے ممی ممی ہی چلاتے رہ گئے۔

"کیا ہوا..... کیا ہوا؟" ممی گھبراتی ہوئی باہر آئیں۔

"تو آ گیا یہ شیطان؟" انہوں نے جبران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جبران ہنستے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

کھانا شروع کیے ابھی ان سب کو پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ "پاپا" بھی آ گئے۔ کوٹ کندھے پر رکھے۔ تھکے تھکے سے۔ وہ سیدھے کھانے کی میز پر ہی آ گئے۔

"ہیلو پاپا!" جبران نے نعرہ لگایا۔ یہ نعرہ تب لگتا تھا جب وہ پاپا کا کوئی نقصان کر چکا ہوتا تھا۔ ممی نے گھبرا کر جبران کی طرف دیکھا۔ اب یہ کیا گل کھلا لایا تھا۔ ہر بار انہیں اس کی طرف داری کرنی پڑتی تھی۔

دراصل "پاپا" جبران کے سگے پاپا نہ تھے۔ کبھی اس کے سگے پاپا کے فرینڈ تھے۔ ان کی زندگی میں اکثر و بیشتر گھر آیا کرتے تھے۔ جبران کے لیے چاکلیٹ لایا کرتے تھے۔ جبران کو تب وہ بڑے اچھے لگتے تھے۔ وہ ان سے "لاڈیاں" کیا کرتا تھا۔ ان کی گود میں چڑھ جایا کرتا تھا۔ انہیں انکل انکل کہتا پھرتا۔ پھر انکل کسی دوسرے ملک چلے گئے۔ اور تب آئے جب جبران کے سگے پاپا کار حادثے میں انتقال کر گئے..... سارا کاروبار انکل نے سنبھالا۔ ممی کی تو ایسی پوزیشن بھی نہیں تھی کہ وہ جبران کو ہی سنبھال سکیں۔ انکل پھر سے آئے دن گھر آنے لگے۔ جبران کے لیے چاکلیٹ لانے لگے۔

"اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں انکل ..... ابھی بھی چاکلیٹ۔"

"تو کیا اب تم چاکلیٹ پسند نہیں کرتے.....؟"

"کرتا ہوں..... لیکن اب میں چاکلیٹ اپنے پیسوں سے بھی خرید سکتا ہوں۔" انکل مسکرانے لگے۔

"اچھا تو کیا چاہیے میرے بیٹے کو۔" انکل نے ہمیشہ کی طرح اسے بیٹا ہی کہا تھا۔ لیکن اب کی بار میں کیا تاثیر شامل تھی وہ سمجھ نہ سکا۔ اور جس کا اندازہ اسے چند ماہ بعد ہوا۔

انکل نے اسے بائیک لے دی۔ وہ پہلے کی طرح ان کے گالوں کو چھو کے ان کا شکریہ نہ ادا کر سکا۔ لیکن انکل شاید شکریہ وصول کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے سرخ پھولوں کے گلدستے کے بدلے جبران کی ممی سے شکریہ وصول کر لیا۔ جبران دیکھتا ہی رہ گیا اور اس کا سارا گھر اس کی آنکھوں کے سامنے لٹ گیا۔

ممی نے انکل سے شادی کر کے انہیں جبران کا پاپا بنا دیا۔

ویسے تو شادی والی بات جبران کے لیے کوئی بڑا دھماکا ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ممی نے نہ صرف جبران سے باقاعدہ پوچھا تھا بلکہ اسے اعتماد میں بھی لیا تھا۔ شادی کی

تیاریوں میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک رہا تھا۔ اور اس نے شادی میں شرکت کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر تیاری بھی کی تھی۔

لیکن شادی سے چند روز قبل ہی جبران کی ایک پھوپھی جو ممی کے اس فیصلے پر ان سے سخت نالاں تھیں' نے جبران کو اپنے گھر بلایا تھا اور پورے پانچ گھنٹے تک اسے مختلف موویز کے وہ سین دکھائے تھے جن میں سوتیلے باپ' بیوی کے پہلے بچوں پر تشدد کرتے ہیں۔

جبران سہم کر رہ گیا تھا۔ تصور کی آنکھ سے وہ خود کو سنڈریلا کی طرح گھر میں جھاڑو لگاتے' گیلا کپڑا پھیرتے اور سوتیلے بہن بھائیوں کی خدمت کرتے ہوئے دیکھنے لگا اور کانپ کانپ گیا۔

"ننھے بچے چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا۔" پھوپھی نے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہا تھا۔

"ان کی بات نہ مانی جائے تو پھر پتا ہے بعد میں وہ کتنا تنگ کرتے ہیں۔" پھوپھی نے اسے ایک نئی گھٹی پلا دی۔ جو پھر ہمیشہ اس کی رگوں میں رہی۔

ممی نے انکل سے شادی کرلی اور اسے احساس ہوا کہ انکل' انکل والے روپ میں ہی اچھے لگتے تھے۔ پاپا بنے تو اسے اچھے نہیں لگے۔ دوسرے پھوپھی نے اس کے ذہن میں یہ بات بھی ڈال دی تھی کہ انکل تمہارے اصلی پاپا کے کاروبار پر قابض ہو گئے ہیں۔ جس پر صرف تمہارا حق ہے۔

وہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ آفس جاکر اپنا حق مانگ سکتا۔ لیکن وہ اپنا حق وصول کرلیا کرتا تھا۔ مختلف طریقوں سے۔۔۔ گھر میں بیٹ بال کھیلتے ہوئے وہ تاک تاک کر بال کے فانوس پر نشانے لگاتا رہتا۔ فانوس بے چارہ بے بس۔ کب تک خیر مناتا۔ ہار جاتا اور کرچی کرچی ہو جاتا۔ لیمپ' شیشے' پینٹنگز تو اس کے لیے معمولی بات تھی۔ ان کے نشانوں کا تو وہ اب پکا ماہر ہو چکا تھا۔ پاپا الگ پریشان کہ ان کی مہنگی مہنگی گھڑیوں کے شیشے دراز میں پڑے پڑے کیسے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ممی اس کے کارناموں پر پردہ ڈالتے نہ تھکتیں۔

پھر سوتیلے بہن بھائی ہوئے۔ وہ انہیں اٹھاتا اور ایسے پیار کرتا کہ ممی کانپ کر رہ جاتیں۔

"بیٹا! یہ ٹیڈی بیئر نہیں ہے۔۔۔" بچہ جسے وہ اتنا اوپر اچھال رہا ہوتا تھا کہ وہ چھت سے جا لگتا تھا ممی لپک کر پکڑ لیتیں۔

"اچھا۔۔۔ لگتا تو ٹیڈی بیئر جیسا ہی ہے۔" وہ بے نیازی سے کہتا اور مسکراتا ہوا باہر نکل جاتا۔

ویسے دکھاوے کو دونوں باپ بیٹے میں بہت پیار تھا۔ بڑا ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے تھے۔ کسی تقریب میں شریک ہوتے پھر تو ان کے لاڈ قابل دید ہوتے۔ جیسے بچپن کے دوست ہوں۔ لیکن اندر خانے کہیں مکا مارنے والی کیفیت چل رہی ہوتی تھی۔

"سوتیلا باپ سوتیلا ہی ہوتا ہے۔" جبران سوچتا۔

"یہ لڑکا کبھی میرا بیٹا نہیں بن سکے گا۔" پاپا سوچتے۔

ممی دونوں کو لاڈ کرتے دیکھتیں اور دل ہی دل میں ہنستیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ میں سب سمجھ رہی ہوں۔ آج بھی ممی سب سمجھ رہی تھیں۔ پاپا منہ لٹکائے اندر داخل ہوئے تھے۔ اور اب اسی انداز میں ہی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ جبران کے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے خوب مذاق ہو رہے تھے۔

"کیا بات ہے۔۔۔ آپ سیٹ لگ رہے ہیں۔۔۔ خیریت۔" ممی نے پاپا سے پوچھا۔

"وہ کنٹریکٹ کینسل ہو گیا۔" پاپا نے ممی کو بتایا۔ درحقیقت جبران کو۔ جبران کے کان کھڑے ہوئے۔ لیکن اس نے ظاہر نہ کیا۔ وہ بہن بھائیوں کے گلے اور زور زور سے دبانے لگا۔

"کون سا کنٹریکٹ۔۔۔" ممی نہ سمجھیں۔

"ڈبل ٹربل گم کی ایڈورٹائزمنٹ کا کنٹریکٹ۔۔۔ جو پانچ سال کا تھا۔"

"کیسے کینسل ہو گیا۔۔۔ آپ تو بہت ایکسائیٹڈ تھے اس کنٹریکٹ کو لے کر۔" جبران اور تیزی سے مصروف ہو گیا۔

"وہ کہتے ہیں کہ کنٹریکٹ ہماری طرف سے کینسل

ہوا ہے.... ہمارے آفس سے انہیں میل کی گئی ہے اور اب وہ کنٹریکٹ کسی اور کے پاس ہے۔" جبران تو جانتا تھا۔ ممی کو سمجھنے میں بھی پھر زیادہ وقت نہ لگا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔

جبران جو ممی کے اصرار پر ہفتے سے آفس میں کچھ وقت دے رہا تھا تو یہ سب اسی اصرار کا نتیجہ تھا۔ اس نے اب عملی طور پر بھی بتا دیا تھا کہ اسے "اینمیٹڈ سرز اینڈ کمپنی.... میں ہی کام کرنا ہے اور تعلیم کے بعد بھی اس کا مستقبل وہاں ہی ہے۔ اسے اصلی پاپا کے آفس میں نقلی پاپا کے ساتھ کام نہیں کرنا۔

"جبران! تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ میل آفس میں سے کس نے کی ہو گی۔" پاپا نے بھنویں ملا کر نادان بنتے ہوئے جبران سے پوچھا۔

"مجھے.... ؟" وہ حیرانی کی انتہا پر پہنچ گیا۔ "نہیں پاپا مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے۔ مجھے تو ابھی آفس جاتے ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ لیکن پاپا آپ پریشان نہ ہوں۔ کاروبار میں یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ دیکھیے نا آپ کا چہرہ پریشانی کے باعث کیسا عجیب سا ہو رہا ہے۔ مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جاتا۔" وہ لاڈ سے بولا۔

"تم یہ سب دیکھنے کے لیے ہی تو سب کرتے ہو۔" کانٹے والا چمچ پاپا نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"چھوڑیے آپ اس کنٹریکٹ کی پریشانی کو.... اور ہے کیا وہ ڈبل ٹربل گم.... منہ میں جاتے ہی منہ کو کیسا بد ذائقہ کر دیتی ہے۔" ممی نے مشرقی ماؤں والا کام شروع کر دیا.... پردے ڈالنے کا.... کھڑکیوں پر نہیں.... بیٹے کے کارناموں پر۔

"اب کیا میں سب کو یہ بتاتی اچھی لگوں گی کہ وہ میرے شوہر ہی ہیں.... جو ڈبل ٹربل گم کی ایڈور ٹائزمنٹ کر رہے ہیں.... مائیں نہ صرف اپنے بچوں کو مجھ سے چھپائیں گی۔ بلکہ خود بھی چھپ جائیں گی۔"

ممی بھی جبران کی ہی ممی تھیں۔ سارے لطیفے سنا کر خاموشی سے کھانا کھانے لگیں۔ پاپا کھانے کے ساتھ اپنا ضبط پی گئے۔ جبران کو ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا تو اپنے کمرے میں چلا آیا۔

☆ ☆ ☆

رات میں ممی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ جو پنچنگ بیگ پر ہلکے ہلکے مکے مارتا پریکٹس کر رہا تھا۔ دروازے کی آہٹ پر زور زور سے اس پر مکے برسانے لگا۔ اسے پتا تھا اس کے پیچھے ممی کھڑی ہیں۔ جواب اس کی طرف لپکیں گی۔

"کیا ہوا جبران.... کس بات کا غصہ ہے۔ جو پنچنگ بیگ پر نکال رہے ہو؟ کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟"

وہ جذباتی ہو کر پوچھا کرتی تھیں۔ اور اسے روکا کرتی تھیں۔ لیکن آج ممی بھی جذباتی نہ ہوئیں۔ اور خاموشی سے پیچھے کھڑی رہیں.... بہت ہو چکا یہ روز کا ڈراما.... آج انہوں نے بھی جبران کو طیش میں ہی رہنے دیا اور اسے زور زور سے انتہائی طاقت سے پنچنگ بیگ پر مکے برسانے دیے۔

بڑے بڑے باکسنگ گلوز سے ڈھکے جبران کے ہاتھ، بازو اور کندھے چند لمحوں میں ہی تھک گئے۔ ممی اسے روکنے آگے نہ بڑھیں۔ وہ اور تیزی.... سے مکے برسانے لگا۔ پنچنگ بیگ پورے کمرے میں جھولے لینے لگا۔ لیکن یہ تیزی بھی کار آمد نہ رہی۔ پسینہ پورے جسم سے بہہ نکلا۔ پٹھے بری طرح درد کرنے لگے۔ لیکن ممی دروازے پر کھڑی مسکراتی رہیں۔ ناچار اسے خود ہی پیچھے پلٹنا پڑا۔

"اوہ.... ممی.... آپ کب آئیں؟"

"کافی دیر سے کھڑی ہوں.... اور تمہیں مشقت کرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔" ممی مسکراتے ہوئے بولیں۔ بھید بھری مسکراہٹ۔

"جی کوئی کام تھا مجھ سے؟" وہ تولیہ سے چہرے کا پسینہ خشک کرنے لگا۔ آج تو بازو ٹانگوں پر بھی پسینے کی نہریں بہہ رہی تھیں۔

"کوئی خاص نہیں.... تم ورزش کر لو.... میں بعد میں آ جاؤں گی۔" ممی آج پورے موڈ میں تھیں۔

"نہیں.... نہیں آپ بات کریں.... کر لی میں نے

ورزش... اگلے ہفتے تک کی بھی...“ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس نے کہا اور دھم سے بیڈ پر بیٹھا۔
”ماریا کے ڈیڈ کا آج پھر فون آیا تھا۔“
”انہیں بتا دینا تھا آپ نے... کہ جبران نے انکار کر دیا ہے۔“
”جبران...“ می نے غصے سے اسے گھورا۔ ”تم نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی تھی بس...“
”تو کیا آج ایک دن گزر گیا...؟“
”آج آخری دن تھا...“ می نے اسے آگاہ کیا۔
”جب کوئی اور نہیں ہے تو پھر کیوں ضد کر رہے ہو۔“
”دراصل ماریا کے موضوع پر ہی بات کرنے گیا تھا آج ڈینیل کے پاس لیکن درمیان میں وہ سنڈریلا آ گئی۔“
”سنڈریلا...“
”جی... سنڈریلا!“
”تو پھر اسے گھر لے آتے... بارہ بجنے میں تو ابھی کافی وقت ہے۔ تھوڑا ہم بھی اس کے ساتھ ہنسی مذاق کر لیتے...“ می نے گھڑی کی طرف دیکھتے اور ہنستے ہوئے کہا۔ انہیں اندازہ تھا کہ ان کا بیٹا کس دنیا میں ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے بیٹے کو آج واقعی میں سنڈریلا ملی تھی۔
”ہنسی مذاق تو وہ کر گئی میرے ساتھ... پورے ڈیڑھ سو ڈالر ہتھیا لیے اس سنڈریلا کی بچی نے مجھ سے بیل کیا سو وہ الگ۔“
”ڈیڑھ سو ڈالر ہتھیا لیے۔ لیکن وہ کس چکر میں؟“
”بس کیا بتاؤں... می!“
”اچھا پھر نہ بتاؤ...“
”سنیے تو! آپ تو سیریس ہی ہو گئیں۔“ اس نے می کو اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھا لیا۔ اور تھیم پارک میں ہوئی سنڈریلا سے پہلی ملاقات کا احوال سنانے لگا۔ می ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ اور ماریا کے موضوع کو بھول گئیں۔
وہ الف لیلیٰ میں ایک شہرزاد تھی نا جو لمبی کہانی سناتے سناتے بادشاہ کو ساری رات جگائے رکھتی تھی۔
تو آج جبران بھی وہ شہرزاد بن گیا۔ می کیا بات کرنے آئی تھیں بھول گئی تھیں۔

٭ ٭ ٭

ڈیڑھ سو ڈالر سے رومی نے اپنے اور امی فریال کے لیے خوب ساری خریداری کی تھی۔ کیترین نے اسے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ یہاں اس طرح سے بھی پیسے کمائے جا سکتے ہیں۔ کافی آپ کے اوپر گرے یا نہ گرے ”آپ تو کافی والے کے اوپر گر سکتے ہیں ناں۔ ذرا سا اڑ کر جیسے سامنے والے کی ہی غلطی ہو اور بڑی آسانی سے ڈیڑھ سو ڈالر کما سکتے ہیں اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کیترین کو یہ کمال کا گر ہرگز نہیں بتائے گی۔ جو سب لڑکیاں یوں ہی کرنے لگیں۔ تو عین ممکن ہے اس گرنے کی ترکیب میں کرسٹن بھی اپنا حصہ طلب کرنے لگے۔
بیگ سے گھر کی چابیاں نکال کر اس نے گھر کا دروازہ کھولا تو ایک دم سے اس کے قدم رک گئے۔ امی فریال کے کمرے سے ان کی تیز آواز آ رہی تھی۔
”تم کیا سوچ کر آئے ہو یہاں وجاہت؟ کہ تم پچیس سال بعد آؤ گے اور میں تمہیں تمہاری بیٹی سے ملنے دوں گی۔ خاموشی سے بنا کوئی رکاوٹ بنے نہیں وجاہت نہیں... یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہیں جواب دینا ہو گا پہلے ان پچیس سالوں کا جن میں تمہاری بیٹی یہ سمجھتی رہی ہے کہ تم مر چکے ہو۔ تمہیں پہلے اپنی بیٹی کو یہ بتانا ہو گا کہ کسی غیر عورت کی خاطر تم نے مجھے چھوڑا۔ اپنی بیٹی کو چھوڑا اور اب آئے ہو تو کیوں؟ تمہیں بتانا ہو گا وجاہت... تمہیں بتانا ہو گا۔“
امی فریال تیز تیز بول رہی تھیں۔
رومی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
”بس کر دیں امی... ایکٹنگ میں آپ کا کچھ نہیں بننے والا۔“ اس نے کمنٹ پاس کیا۔ امی فریال جو شیشے کے آگے کھڑی مشق کر رہی تھیں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔
”چند روز بعد آڈیشن ہے... دعا کرو بات بن

جائے۔"

"میں تو دعا کردوں گی۔۔۔ مگر بات نے جب بننا ہوگا تب ہی بنے گی۔" امی فریال نے اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ وہ اثر لیتیں تو پچھلے کئی سالوں کی اپنی اس خواہش 'ضد اور محنت کو کب کا چھوڑ چکی ہوتیں۔

لاتعداد آڈیشن جو انہوں نے امریکہ میں بننے والے پاکستانی 'انڈین ڈراموں کے لیے دیے تھے اور جن میں وہ ناکام رہی تھیں ہمت ہار کر اس جدوجہد کو بس نہیں کیا تھا۔ وہ امریکن انگلش ڈراموں کے لیے بھی آڈیشن دے آتیں اگر ان کی ڈیمانڈز کچھ اور نہ ہوتیں۔

"تم دیکھنا ایک دن مجھے ڈراما مل جائے گا۔۔۔ اور لیڈ رول ملے گا۔" امی فریال نے جوش سے بہت دفعہ کہا ہوا فقرہ دہرایا۔

"آپ باہر آئیں۔۔۔ دیکھیے میں آج آپ کے لیے کیا کیا لائی ہوں۔" امی فریال باہر نکل آئیں۔

"یہ دیکھیے۔۔۔" وہ شال کپڑے اور نجانے کیا کیا سستا مہنگا امی کو دکھانے لگی۔ جو وہ کب سے نوٹ کر رہی تھی کہ امی کے پاس نہیں ہے۔ اس سب میں سے اس نے "کچھ" آج لے لیا تھا۔

"کیا ساری تنخواہ اس پر لگا آئی ہو۔"

"تنخواہ تو ابھی ملی نہیں۔۔۔ یہ تو ڈیڑھ سو ڈالرز ہیں۔"

"ڈیڑھ سو ڈالرز کہاں سے لیے تم نے۔۔۔ کہیں گرے ہوئے ملے تھے کیا؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔۔۔" اس نے ہنستے ہنستے ساری بات بتادی۔ جسے سنتے امی فریال کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔

"کیا کارنامہ کیا ہے تم نے جسے تم اتنے فخر سے بتا رہی ہو۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟"

"یہ بری بات ہے رومی! کسی سے اس طرح پیسے لینا۔"

"کوئی بری بات نہیں ہے۔۔۔ اس نے میرا لباس خراب کردیا تھا۔ یہ امیر لوگ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ بڑے دنوں سے میں ان امیر لوگوں سے بے عزتی سہتی آرہی ہوں۔ کوئی بچہ بازو کھینچتا ہے۔ کوئی چٹکی کاٹتا ہے۔ کتنی بار میں گری بھی ہوں۔ کئی بار میرے پاؤں میں موچ آئی ہے اور۔۔۔"

"تو پھر یہ کام چھوڑ دو۔۔۔ مگر اپنی چوری کو اس فلسفے کے ذریعے صحیح ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کررہی ہوں میں امی۔۔۔ کرسٹن نے واقعی مجھے جاب سے نکال دینا تھا وہ تو کیتھرین نے بتایا تو مجھے پتا چلا کہ ڈریسز ڈرائی کلینز سے فری میں دھلتے ہیں۔"

"تو پھر تم نے اس لڑکے کو جا کر پیسے واپس کردینے تھے۔"

"تب تک وہ جاچکا۔۔۔ ہوگا شاید۔" سنجیدگی میں وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنسی تو بے اختیار ہی امی فریال بھی ہنسنے لگیں۔

"تمہاری یہ حرکت ویسے ہے غلط۔"

"کبھی ملے گا تو اسے ڈیڑھ سو ڈالر لوٹا دوں گی۔"

"کیا اس وقت تمہارے پاس ڈیڑھ سو ڈالر ہوں گے؟"

"آپ کو ڈراما مل چکا ہوگا اور ہم امیر ہوچکے ہوں گے۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے ڈراما مل چکا ہوگا۔۔۔ یا تمہیں تمہارے اصل ماں باپ۔" امی فریال ہنسی دباتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔ وہ شریر نظروں سے امی کو دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

پانچ دن کے بعد اسے اس کی پہلی تنخواہ ملی تھی۔ پیسے ہاتھ میں لینے کے باوجود بھی بڑی دیر تک اسے یہ ہی یقین نہیں آیا کہ اب وہ بھی "کماؤ۔۔۔" ہو چکی ہے اور جب یقین آیا تو وہ سب سے پہلے آسکر اسکوائر گئی۔ جہاں کی ایک تاریک دوکان میں ایک افریقی جادوگر بیٹھتا تھا۔ وہ امی فریال کے ساتھ ایک بار اس

جگہ آئی تھی تو اس نے اس دکان کو دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ ایک دن وہ اندر جا کر اپنی قسمت کا حال ضرور دریافت کرے گی۔

آج اس کے پاس فیس کے پیسے بھی تھے اور کچھ عیاشی کرنے کا موڈ بھی۔ دکان کے باہر کھڑے ہو کر پہلے وہ کان کو دیکھنے لگی۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی اچھی قسمت کے حال کا سندیسہ دیتی عبارت کا بورڈ، جس پر ستارے، کہکشاں، مشکیزے پکڑے دو عورتیں بچھو کیکڑے اور نجانے کیا بنا تھا۔

مستقبل بتانے کی فیس پانچ ڈالر تھی۔ جو رومی نے دل کڑا کر کے دی تھی۔ فیس پہلے ہی وصول کر لی جاتی تھی۔ مبادا کسی کو مستقبل بتا دیا جائے اور وہ دیوانہ وار باہر بھاگ جائے بنا فیس ادا کیے۔ اگرچہ تاریک مستقبل یہاں کسی کو نہیں بتایا جاتا تھا۔ یہاں سب کو خوش کیا جاتا تھا۔ لیکن لوگوں کا کیا پتا جادوگر جسے ان کے لیے خوش قسمتی سمجھ رہا ہو وہ ان کے لیے بدبختی ہو۔

"جلد ہی آپ کی شادی ہو جائے گی۔" اور آدمی اسی غم میں پاگل ہو کر باہر کو بھاگ جائے۔

رومی بھی روشن مستقبل سننے کے لیے سیاہ حبشی جادوگر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان میں ایک میز تھی۔ جس پر شیشے کا بڑا سافٹ بال سائز کا گلوب رکھا ہوا تھا اور جس میں دھواں دھواں سا تھا۔ رومی اس شیشے کی گول گیند کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس گول گیند میں ہی مستقبل کی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اس نے اکثر فلموں گانوں میں دیکھا تھا.... وہی ڈم ڈم ڈی ڈی.... ڈم ڈم جیسے گانوں میں....

کالے سیاہ جادوگر نے اپنی سخت گیند جیسی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"یہاں کچھ نظر نہیں آئے گا.... یہ طریقہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ لیکن ہمیں بھی کچھ پرانے رواجوں کے ساتھ چلنا پڑتا ہے.... جو بتاؤں گا میں بتاؤں گا۔"

"تو پھر بتاؤ ناں.... میرے اصل ماں باپ.... میرا مطلب میری اصل خوشیاں کب واپس آئیں گی۔

وہ کہیں کھو گئی ہیں؟ کوئی سہیلی۔"

"انہیں وقت لے اڑا ہے۔" جادوگر کی گیند برابر آنکھوں نے ٹھپہ کھایا۔ "تو کیا آج سارے نفسیاتی مریض ہی آئیں گے۔" وہ سوچنے لگا۔

جادوگر نے پتے نکال کر پھینٹنے شروع کر دیے۔ پھر ان کو میز پر پھیلایا اور اسے کوئی ایک کارڈ چننے کو کہا۔

رومی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس کارڈ کو اٹھائے۔ جسے چھونے لگتی ذہن کہتا یہ بدقسمتی کا کارڈ ہے۔ وہ ہاتھ کھینچ لیتی۔ پھر کوئی دوسرا پکڑنے لگتی پھر ہاتھ کھینچ لیتی۔ جادوگر کڑی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کوئی پانچویں کارڈ کو چھوتے ہوئے وہ دوبارہ ہاتھ کھینچنے لگی۔ تو جادوگر نے ہاتھ میں پکڑی کوئی چیز اس کے ہاتھ پر دے ماری زور سے وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

"یہ کیا تھا؟" وہ اس اچانک حملے سے بھونچکا رہ گئی۔

"جادو کی زنجیر.... ان لوگوں کے لیے جو کارڈ اٹھاتے وقت تذبذب کا شکار ہوتے ہیں.... زنجیر اشارہ کرتی ہے کہ یہ والا اٹھا لو....."

اس نے جادو کی زنجیر کے مشورے پر عمل کیا اور وہی والا کارڈ اٹھا کر جادوگر کو دے دیا۔ جادوگر اسے ایسے پڑھنے لگا جیسے بال جبریل پڑھ رہا ہو۔

"گھر جاؤ تمہارے گھر وہ آ گیا ہے۔" جادوگر نے بڑی دیر کے بعد کہا۔

"کون؟" وہ نا سمجھی۔

"جو اس وقت تمہارے ذہن، دل و دماغ میں ہے۔"

"میرے ذہن میں میرے ابو ہیں.... اور انہیں فوت ہوئے سالوں گزر گئے ہیں۔ وہ اب دوبارہ نہیں آ سکتے۔ دوبارہ سے پڑھو.... کچھ اور لکھا ہو گا۔" وہ تنگ کر بولی۔ پانچ ڈالر ادا کیے تھے اس نے۔

"ہاں.... ہاں۔" جادوگر گھبرایا۔ "میرا مطلب ہے۔ خوشیوں بھرا وہ وقت آ گیا ہے۔ جو تمہارے ابو کے وقت میں تمہارے گھر میں تھا۔ ہوائیں انہیں لے آئی ہیں۔"

"کیا واقعی....؟"

"ہاں۔۔۔ کارڈ تو یہ ہی شو کر رہا ہے۔" جادوگر نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"میرے گھر پہنچنے سے پہلے وہ ہوائیں واپس تو نہیں چلی جائیں گی۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ بس بھاگ کر جانا۔"

وہ بھاگ کر ہی گھر واپس آئی تھی۔ امی فریال کے کمرے سے حسب معمول ان کی تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں۔

"واپس چلے جاؤ وجاہت! واپس چلے جاؤ۔" وہ اور تیزی سے اندر داخل ہوئی۔

"آپ سلیکٹ ہو گئیں ناں آڈیشن میں؟" اس نے چلاتے ہوئے پوچھا۔ جیسے اسے اس بات کا سو فی صد یقین تھا۔ امی نے چونک کر اسے دیکھا اور لمحے بھر بعد گردن ہلا دی۔

"نہیں۔۔۔" بڑے آرام سے انہوں نے خوشیوں بھری ہواؤں کو پھونک مار کر اڑا دیا تھا۔ نجانے کہاں۔۔۔ اور پانچ ڈالر کی جادوگر کی فیس کو حرام کر دیا تھا۔

"لیکن میں اگلے آڈیشن کی تیاری کر رہی ہوں۔"

"وہ کب ہے۔۔۔؟" اس نے ایک آس سے پوچھا۔

"کبھی نہ کبھی تو ہوگا ہی۔۔۔" امی کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ اور جب کتنی دیر بعد امی میز پر کھانا لگا کر واپس آئیں تو وہ تب بھی ویسے ہی کھڑی تھی۔ امی فریال نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم پریشان مت ہو رومی۔۔۔ ہمارے حالات جلد ہی بدل جائیں گے ہم دیکھنا میں کبھی نہ کبھی آڈیشن میں ضرور سلیکٹ ہو جاؤں گی۔۔۔ پھر ہمارے پاس بہت سے پیسے ہوں گے۔ تم جہاں مرضی جزیرہ خریدنا۔۔۔ خوابوں والا نہیں۔۔۔ حقیقت والا۔"

امی شاید اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ آگے سے ہنس نہ سکی۔ بے دلی سے وہ باہر آئی اور اس سے بھی بے دلی سے اس نے کھانا کھایا۔ امی اس کی ایسی صورت دیکھ کر مزید پریشان ہوتی تھی۔ رات کو سوتے وقت وہ اپنا کمبل امی کے بیڈ پر ہی لے آئی۔

"امی! آج میں آپ کے ساتھ سو جاتی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ آجاؤ میری جان میرے پاس۔" امی نے اپنی باہیں کھولیں۔

"سچ پھر وہ کہاں سوئیں گے۔۔۔؟"

"کون۔۔۔؟"

"وجاہت۔۔۔" اس نے نادان بنتے ہوئے کہا۔ امی نے سر کے نیچے سے تکیہ نکال کر اس کے اوپر دے مارا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اوہ کم آن ماما! خدا کے لیے یہاں پر تو بس کر دیں مجھے لگا نجانے کتنی ضروری بات کرنی ہے آپ نے مجھ سے۔۔۔ کلاس سے اٹھ کر باہر آیا ہوں آپ کا فون سننے کے لیے۔۔۔ اور آپ ہیں کہ ماریا ماریا کر رہی ہیں۔۔۔ اگر آپ کو وہ اتنی پسند ہے تو آپ پاپا کی دوسری شادی کروا دیں اس سے۔۔۔ دماغ تھک گیا ہے میرا یہ نام سن سن کر مجھے لگتا ہے میرے دماغ کے اندر کوئی مشین نصب ہو گئی ہے۔ کوئی ایسی گھڑی جو ٹک ٹک کے بجائے ماریا ماریا کرتی ہے۔

ابھی کلاس میں پروفیسر نے پوچھا کہ بلیک ہول کے آگے کیا ہے؟ میں نے کھڑے ہو کر کہہ دیا "ماریا" اب پوری کلاس ہنس رہی ہے مجھ پر۔۔۔ اور آپ ہیں کہ۔۔۔ آخر آپ اپنے معصوم بیٹے کو کتنا پاگل کریں گی۔ ایک ذرا سی نادانی والی بات کہ وہ مجھے پسند ہے اس کا بدلہ کب تک لیں گی آپ مجھ سے۔۔۔

اوہ پلیز ممی! یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ آپ ان ماؤں میں سے نہیں جو دودھ نہیں بخشا کرتیں۔ آپ بالآخر بخش ہی دیں گی۔ اور آپ نے یہ بات خود مجھے بتائی تھی کہ میں بچپن میں بہت بیمار ہو گیا تھا۔ اس لیے اس وقت سے پاؤڈر والا دودھ پی کر بڑا ہوا ہوں۔۔۔ اور آپ اتنی انڈین فلمز کیوں دیکھتی ہیں۔

بس میں نہیں کر سکتا اس سے شادی۔ ہاں کبھی وہ مجھے پسند تھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ میں کسی سے وعدہ کر چکا ہوں۔۔۔ بس ہے کوئی، آپ نہیں سمجھیں گی۔ وہ

ناراض ہو گئی ہے مجھ سے واپس نہیں آرہی۔ کوئی ہے۔ لمبے بالوں والی راپنزل۔۔۔ ٹیرس پر انتظار کرتی جیولٹ۔۔۔ ٹائی ٹینک کے عرشے پر کھڑی کیٹی یا۔۔۔"

ایک دھکا سا جبران کو لگا نجانے کہاں سے اور موبائل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔۔۔ زمین پر نہیں حوض میں۔۔۔ جہاں وہ بیٹھا تھا اور جو لمحے بھر میں اس پول کی تہہ میں نیچے ہی نیچے بیٹھتا جبران کے ہاتھوں کی دسترس سے دور نکل گیا۔

"اوہ میرا موبائل۔۔۔!" اس نے اتنی زور سے چلا کر کہا کہ اردگرد کی کلاسز والے سمجھے کہ "پیریڈ" ختم ہونے کی "گھنٹی" بج اٹھی ہے۔ لیکن ذرا عجیب انداز میں۔

اس نے پیچھے پلٹ کر دھکا دینے والے کو دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔

"سنڈریلا۔۔۔" جبران نے حیرت سے اور مسکرا کر کہا۔ پھر اگلے لمحے "اوہ۔۔۔ سنڈریلا۔" دانت پیستے ہوئے کہا۔

رومی سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس کے باوجود اوپر سے خود کو بڑا مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔ رومی نے پہلے نیچے جھک کر اپنی کتابیں اٹھائیں پھر خاموشی سے، چپکے سے وہاں سے نکل جانا چاہا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ بے دھیانی میں اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہی نہیں۔

"ایک منٹ رکو۔۔۔ یہ چپکے چپکے کہاں جا رہی ہو؟" جبران نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔

"کیا مطلب کہاں جا رہی ہو؟"

وہ گھبرا گئی۔ "اپنے ڈیپارٹمنٹ جا رہی ہوں۔"

"کس دنیا میں ہو تم لڑکی۔۔۔!" اس نے کہا اور رومی کو یاد آیا۔ یہ فقرہ اسی نے اس کو کہا تھا۔

"میرا نقصان کون پورا کرے گا؟"

"کیسا نقصان۔۔۔" اس نے بنتے ہوئے پوچھا۔ درحقیقت موبائل کے پانی میں گرنے کی آواز پر ہی تو اس کی روح فنا ہوئی تھی۔

"میرا موبائل تمہاری وجہ سے گر گیا ہے پانی میں۔"

"تو نکال لو۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ زیادہ معصوم مت بنو۔" وہی فقرہ۔۔۔ اسی والا۔

"کیا میں تم سے جان بوجھ کر ٹکرائی ہوں۔"

"وہ سب میں نہیں جانتا۔۔۔ میرا نقصان پورا کرو۔۔۔ پھر میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا۔"

"میری کتابیں بھی تو گر گئی تھیں۔"

"کیا تمہاری کتابوں کا سوفٹ ویئر اڑ گیا ہے۔۔۔ یا ان کی اسکرین ٹوٹ گئی ہے۔ یا ڈیٹا ختم ہو گیا ہے۔" وہ لاجواب ہو گئی۔

"تم اسے پول میں سے تو نکالو۔۔۔ شاید کچھ بچ۔" وہ خاموش ہو گئی۔ سامنے والے کے ابرو اوپر اٹھ رہے تھے۔ نتھنے پھول رہے تھے اور لمحے میں وہ انسان شیطان لگنے لگا تھا۔

"مجھے اب اس موبائل سے کچھ لینا دینا نہیں۔۔۔ مجھے نیا موبائل چاہیے۔۔۔ بالکل نیا۔۔۔ یہ موبائل میں نے آج ہی لیا تھا۔"

"یہ ڈریس آج ہی آیا ہے۔" اسے اپنا فقرہ یاد آیا۔۔۔ خدارا کوئی اسے بچا لے۔

"کتنے کا تھا موبائل۔۔۔؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا اور دل میں دعا کرنے لگی کہ یا اللہ پاک اس کا موبائل سستے والا موبائل نکل آئے۔ پھر میں زندگی بھر تجھ سے اور کچھ نہیں مانگوں گی۔

"تین سو ڈالر کا۔" پوری یونیورسٹی رومی کی نظروں کے سامنے ناچنے لگی۔ افریقی آدم خوروں والا ناچ۔۔۔ سامبا سامبا۔۔۔

"اتنا مہنگا۔۔۔؟" یعنی اللہ چاہتا تھا کہ وہ زندگی بھر اس سے کچھ نہ کچھ مانگتی رہے۔

"گھر میں رسید پڑی ہوئی ہے۔۔۔ اور اس ماڈل کی ریٹ لسٹ ویسے بھی مارکیٹ سے مل جائے گی۔ تم مجھے رقم نہ دو۔۔۔ موبائل لے کر دے دو۔" رومی کے حواس گم ہونے لگے۔

"کبھی ملا تو اسے ڈیڑھ سو ڈالر لوٹا دوں گی۔" اس

رات اس نے امی فریال سے کہا تھا اور اب اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر کہے۔ ”امی وہ لڑکا تین سوڈالر مانگ رہا ہے۔“

”چلو میرا وقت ضائع مت کرو۔ مارکیٹ جا کر موبائل لے کر دو گی یا رقم ادا کرو گی۔ میری ممی بہت سخت ہیں۔ میں موبائل کے بغیر گھر نہیں جا سکتا۔“

”کرسٹن غصے میں جھاڑو والی جادوگرنی سے بھی زیادہ غضب ناک ہے۔“ اسے سب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کیا کیا اور کیوں کہہ رہا ہے۔ اس کے سب کلاس فیلوز بھی باہر نکل آئے تھے اور اب ان دونوں کے ارد گرد کھڑے تھے۔ کیا ماجرا ہوا تھا انہیں جبران سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ڈینئل رومی کو دیکھ کر شرارت سے مسکرانے لگا تھا۔ رومی کا دل کیا تھا کہ اس منگول نسل کے دانت توڑ دے یا منہ۔

”میرے پاس ابھی رقم نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں کینٹین چلتے ہیں وہاں کارڈ کی سہولت موجود ہے میں کینٹین والے سے رقم لے لوں گا اور وہ تم سے کارڈ۔“ اُف وہ کس بری طرح اپنے ہی جال میں پھنس گئی تھی۔

”میرے پاس کارڈ بھی نہیں ہے۔ میں اتنی امیر نہیں ہوں۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور یہ سامنے والا اس میں سما جائے۔ اور یہ زمین ایسے وقتوں میں پھٹتی ہی کہاں ہے۔

”وہ سب میں نہیں جانتا۔ میری ممی بہت سخت ہیں۔ وہ بس۔ ہاں وہ جھاڑو والی جادوگرنی ہی ہیں۔ موبائل کے بغیر مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیں گی۔“

”دیکھو‘ تم بدلہ لے رہے ہو ناں!“

”تو کیا نہ لوں۔؟“ بے اختیار ہی مسکراتے ہوئے اس نے ابرو اٹھائے۔ ”تم نے کس قدر ذلیل کیا تھا مجھے اس دن‘ یاد ہے۔ اور مجھ سے ڈیڑھ سو ڈالر نکلوا کر ہی دم لیا تھا۔ کیا پتا تمہارے منیجر نے تم سے پوری رقم نہ لی ہو۔ وہ رقم تم نے خود ہی رکھ لی ہو۔“ وہ کانپ کر رہ گئی۔ اسے کیسے اس واردات کا اندازہ ہوا تھا۔

”ہو سکتا ہے اس ڈریس کو تم نے خود ہی دھو لیا ہو۔ ڈرائی کلین کروا لیا ہو۔“ وہ اور زیادہ کانپنے لگی۔ اس راز کے آشکار ہو جانے کے خدشے سے اور اس کے چلانے سے بھی۔ اس کے کلاس فیلوز ایک دوجے سے ڈریس کی بابت پوچھنے لگے تھے۔

عین ممکن تھا سب جان لینے کے بعد وہ یونیورسٹی میں ”ڈرٹی گرل“ مشہور ہو جاتی۔ جس بات کو وہ چھپاتی چلی آ رہی تھی‘ وہ ہی اس کے ماتھے کا ٹیکہ بن جاتی۔

”میرے گھر میں بھی اتنی رقم موجود نہیں ہے۔“ وہ یتیم تو بنی ہی ہوئی تھی۔ مسکین بھی نظر آنے لگی۔

”میں ایک دن بھی موبائل کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”تم کسی سے قرض لے لو۔ میں تمہیں ہر ماہ قسط۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ جبران اسے گھورنے لگا تھا اور اس کے دوست اس پر ہنسے تھے۔

”قرض تم خود ہی کسی سے لو۔ ہر ماہ قسط ادا کر دیا کرنا۔“

”یہ سب کچھ اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔ تم کچھ صبر کا مظاہرہ کرو۔“ اس کی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو بھر گئے۔ سامنے والے کو دیکھ کر ہلکا سا ترس آیا۔

”اچھا۔ تمہارا ڈپارٹمنٹ کون سا ہے؟“

”آرٹس ڈپارٹمنٹ۔!“ اس نے بتایا تو سب پھر سے کھی کھی کرنے لگے۔ آج کے دور میں آرٹس پڑھ کون رہا تھا سوائے ان اسٹوڈنٹس کے جن کی تعلیمی قابلیت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ کُند ذہن تھے۔

”تم روز یونیورسٹی آتی ہو؟ ایسا نہ ہو کہ تم یونیورسٹی آنا ہی چھوڑ دو۔“

”میں آتی رہوں گی۔ اور جلد ہی تمہارے پیسے ادا کر دوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ جبران نے کہا اور اس کی آنسو بھری آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔ ”بس چند دن کی مہلت

دے رہا ہوں۔" ڈینیل نے بھی چٹکی بجائی۔ رومی نے اپنے ہاتھ کنٹرول میں کیے۔

✲ ✲ ✲

"میں اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑتی ہوں وجاہت... وہ میرے ساتھ انصاف کرے گا۔ اس نے کبھی انسانوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کی... اب وہ ہی میرے دل سے ان دنوں کے زخموں کو نکالے گا جو میں نے تمہارے چھوڑ جانے کے بعد..."

اس نے بڑی عجلت میں امی فریال کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ انہیں بتانے کے لیے کہ امی یہ ایکٹنگ ویکٹنگ کو چھوڑیے۔ دیکھیے آپ کی بیٹی کتنی بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے۔ شیشے کے سامنے پریکٹس کرتی امی اس کی طرف مڑیں اور رومی نے ان کی آنکھوں میں اترے ایک رنگ سے اس بات کا اندازہ لگالیا کہ آج وہ پھر کسی آڈیشن میں فیل ہو کر آرہی ہیں۔

"کیا بات ہے رومی؟" امی فریال نے نارمل انداز سے پوچھا۔ وہ جب جب کہیں سے ناکام ہو کر گھر آتی تھیں۔ پہلے سے بھی زیادہ زور و شور سے پریکٹس کیا کرتی تھیں۔ اتنے سال گزر جانے کے باوجود بھی انہوں نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری تھی۔

"بولو' کیا بات ہے' کیا ہوا ہے' پریشان کیوں لگ رہی ہو؟" اس نے پریشان امی کو مزید پریشان کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ وہ امی کو ان کی زندگی کی بس ایک یہ ہی آسانی تو دے سکتی تھی۔

"کچھ نہیں... مجھے بھوک لگی ہے۔ کچھ بنا ہے تو دے دیں۔ پھر جاب پر بھی جانا ہے۔"

"اتنی اچھی جاب کو جاب مت کہا کرو۔" امی فریال کمرے سے باہر نکل آئیں۔

"تو پھر کیا کہا کروں...؟"

"کہا کرو سنڈریلا' راپنزل' سنو وائٹ بننے جانا ہے۔"

"مجھے چڑائیے مت امی... آپ جانتی ہیں مجھے یہ کام پسند نہیں۔" اس کی اس بات پر امی رکیں۔

"کام اچھا برا نہیں ہوتا... کام کا انداز اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ کام میں کوتاہی رہ جائے تو اچھا کام بھی برا اور..."

وہ امی فریال کی کوئی بھی نصیحت سن نہیں رہی تھی۔ وہ اس وقت بہت بری کیفیت سے گزر رہی تھی۔ وہ تین سو ڈالر کیسے ادا کرے گی۔ ساری رات اس نے یہ ہی سوچتے سوچتے بتادی تھی۔

گھر کی کون کون سی ایسی چیزیں تھیں جو بکنے والی تھیں۔ تقریباً "ساری ہی بکنے والی تھیں اور ان کی جگہ نئی خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس کے کپڑے' جوتے' بیگز زیادہ نہیں تھے۔ جتنے بھی تھے' سب بے کار تھے۔ ان کا صرف پیزا ہی مل سکتا تھا۔ وہ تین سو ڈالر اکٹھے نہ کرواسکتے تھے۔

کرسٹن نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو وجہ دریافت کی۔

"ہاں کرسٹن! میں بہت پریشان ہوں۔" وہ کرسٹن کی ہمدردی سمیٹنا چاہ رہی تھی کہ شاید وہ ہی اس کی مدد کردے۔

"تو پھر بھالو بن جاؤ... کیونکہ لوگ یہاں پریشان چہرہ نہیں دیکھنے آتے۔" لو جی کرسٹن نے کیا خوب حل نکالا تھا۔ الٹا اسے پریشان ہی کر دیا تھا۔ یونیورسٹی میں اس نے کیتھرین کو سارا ماجرا سنایا۔

"گھبراؤ نہیں بھئی... تم بڑی جلدی پریشان ہو جاتی ہو۔" کیتھرین نے امید دلائی۔ رومی کی تھوڑی ڈھارس بندھی۔ یہ سچی دوست ہمیشہ مشکل وقت میں اس کے کام آتی تھی۔ کیتھرین نے اپنا بڑا سارا "بوری نما" بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایک دو نوٹ اور بہت سے سکے اس نے ٹیبل پر رکھے۔

"بے فکر ہو کر لے جاؤ... جب سہولت ہو تب واپس کر دینا۔"

رومی نے وہ اسے اسی وقت واپس کر دیے۔

خود پر روتے' کرلاتے' ترس کھاتے وہ لائبریری گئی تھی اور لائبریری میں موجود تمام لڑکے لڑکیوں اور

لائبریرین نے اس نووارد کو غور سے دیکھا تھا۔
"اسٹوڈنٹ ہو یہاں کی؟"
"جی۔۔۔!" اس نے بتایا۔ یونیورسٹی کارڈ نکال کر دکھایا۔
"کبھی دیکھا نہیں پہلے تمہیں لائبریری میں۔۔۔ لائبریری یونیورسٹی کے اندر ہی تھی۔۔۔ تمہیں کیا لگا شہر سے باہر ہے؟"
"بس گھر میں ہی اتنی کتابیں پڑی ہوئی ہیں کہ لائبریری آنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔" اس نے فخریہ من گھڑت جھوٹ بولا اور لائبریرین کی بولتی بند کروادی۔
آج کے دن کے سارے اخبارات اکٹھے کر کے وہ ٹیبل پر بیٹھ گئی اور بینکوں کے ان اشتہارات کو غور سے پڑھنے لگی جن میں قرض فراہم کرنے کی یقین دہانی اس طرح کروائی گئی تھی کہ بس اگر آپ نے اخبار پر موجود اشتہار پڑھ لیا ہے تو آپ کو ملین بلکہ ملین کا قرض بھی مل جائے گا۔ اس نے پر امید ہو کر وہیں بیٹھے بیٹھے ایک دو بینک میں کال کرلی۔ واقعی قرض بہت آسانی سے فراہم کیا جا رہا تھا۔ لیکن اس کی ادائیگی کی جو جو شرائط تھیں وہ اسے گھر سے سڑک پر لا کھڑا کر دینے والی تھیں۔
"ایسا کرو، تم اپنے گھر کی لائبریری میں ہی شوق پورا کرو۔۔۔ کتاب کھول کر فون کرنے کا۔۔۔ یہاں اس کی اجازت نہیں ہے۔" لائبریرین اس کے سر پر کھڑا اسے کہہ رہا تھا۔

✻ ✻ ✻

"دیکھا، وہ لڑکی رفو چکر ہو گئی۔۔۔ میرے تین سو ڈالر کا نقصان کرنے کے بعد۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اس یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔"
جبران پھنکارتا ہوا کہہ رہا تھا۔ وہ جیسے بچوں کی لڑائی ہو جائے تو وہ کہتے ہیں کہ میں ابھی اپنے بڑے بھائی کو بلا کر لایا تو جبران نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ رومی سے پیسوں کا مطالبہ کرنے وہ ڈینیل کے ساتھ ہی آیا تھا۔ لیکن جب آرٹس ڈپارٹمنٹ کے تقریباً سارے ہی اسٹوڈنٹس نے یہ کہہ دیا کہ وہ تھیم پارک میں کام کرنے والی کسی لڑکی کو نہیں جانتے تو اس نے اپنے باقی کے دوستوں ________ کو بھی وہیں بلا لیا۔
کیتھرین نے ایک وحشی گروپ کو رومی کی چھان بین کرتے دیکھا تو چپکے سے رفو چکر ہو گئی۔
"مجھے تو پہلے ہی شک تھا وہ لڑکی شکل سے ہی فراڈ لگتی تھی۔ کیسے اس نے چالاکی سے مجھ سے ڈیڑھ سو ڈالر نکلوا لیے تھے۔ اب میں اس سے اپنے تین سو ڈالر ہر صورت نکلوا کر رہوں گا۔"
اتنے میں لائبریرین رومی کو باہر نکال چکا تھا۔ کیونکہ وہ فون پر باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ رومی کو اخبار میں سے ٹکڑے پھاڑ پھاڑ کر اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے بھی دیکھ چکا تھا۔ رومی نے بینکوں کے پتے، فون نمبرز نوٹ کرنے کے بجائے ان کے اشتہار بھی پھاڑ کر الگ کر لیے تھے۔ اب کون اتنی محنت کرے کہ ایک ایک اشتہار میں سے ایڈریس، نمبر نوٹ کرتا۔ پھرے بنا شرمندہ ہوئے وہ لائبریری سے باہر نکلی تو اسے ایک آواز سنائی دی۔
"وہ رہی۔۔۔" جیسے نعرہ لگایا گیا ہو کہ وہ رہا قاتل۔۔۔ اور ساتھ ہی آٹھ، دس لڑکے لڑکیوں کا گروپ اس کی طرف بڑھا۔ رومی نے گھبرا کر ان اصطبل کے گھوڑوں کو دیکھا۔ پیچھے لائبریرین کھڑا تھا اور آگے جبران ڈان۔۔۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی۔
"ہم نے پورا ڈپارٹمنٹ چھان مارا تمہاری تلاش میں۔۔۔ کہاں تھیں تم؟"
"اس سب سے تمہارا کیا مطلب۔۔۔ میں نے تم سے چند دن کی مہلت مانگی ہے۔۔۔ میں تمہارا نقصان پورا کردوں گی۔"
"تمہارے نزدیک چند دن کی تعریف کیا ہے۔ کیا تم مہینے دو مہینے کو چند دن کہتی ہو۔۔۔ تین دن تو گزر گئے ہیں۔"
"بس تین دن اور۔۔۔"

"اپنا یونیورسٹی کارڈ دکھاؤ۔۔۔ تمہارے گھر کا ایڈریس نوٹ کرنا ہے۔"

"یہ زیادتی ہے۔۔۔" وہ چلائی۔

"جو تم نے میرے ساتھ کیا وہ بھی ایسا ہی تھا۔۔۔ تم نے تو مجھے ایک گھنٹے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔"

"اللہ" آہستہ بولو۔۔۔ یہ میرا ڈیپارٹمنٹ ہے۔" وہ کہہ نہ سکی۔ جبران نے ہاتھ اس کے ہینڈ بیگ کی طرف بڑھایا۔

"ایک منٹ۔۔۔" اس نے کہا۔ جبران کے ہاتھ رک گئے۔ رومی نے بیگ سے یونیورسٹی کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔

"رومی۔۔۔!" کارڈ کو اور پھر اس کو دیکھتے ہوئے اس نے اس کا نام پکارا۔ "نام تو بڑا درویشوں والا ہے اور کام" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑا گروپ ہنسا۔ رومی میں ایک بغاوت سی لپکی۔

"تم بھی کون سا۔۔۔ خلیل جبران کی طرح۔۔۔ انسانی احساسات کی قدر کرنے والے ہو۔۔۔" جبران اپنے نام کی ایسی بے عزتی پر اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر جیب میں سے موبائل نکال کر اس نے اس کا ایڈریس نوٹ کیا۔ رومی نے دیکھا اس کا موبائل بالکل نیا تھا۔

"تم نے موبائل خرید تو لیا ہے۔" وہ بچوں کی طرح ایسے چلائی جیسے اس کی مشکل حل ہو گئی ہو۔ جبران نے نظریں اٹھا کر اجنبی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں اس سے مطلب۔۔۔ تم بس مجھے نیا موبائل خرید کر دو۔"

"تم دو موبائل رکھ کر کیا کرو گے۔" اس نے معصومیت سے پوچھا کہ اس نئے موبائل کے صدقے ہی اسے ایک موبائل معاف کر دے۔

"ایک تمہیں دے دوں گا۔" گروپ پھر سے ہنسا۔ ڈینیل تو دل اور جبڑے کھول کر ہنسا۔ رومی نے بڑی مشکل سے اس کا گلا دبوچنے کی خواہش پر قابو پایا۔

"اور ہاں۔۔۔ یہ لو۔" جاتے جاتے وہ پھر مڑا۔ "پول سے موبائل نکال لیا تھا۔ اسے ٹھیک کروا کر تم خود استعمال کر لینا۔"

موبائل اس کے ہاتھ میں تھما کر وہ سب چلے گئے اور رومی ایسے کھڑی رہ گئی۔ جیسے اس کی سانسیں اس سے روٹھ گئی ہوں۔

☼ ☼ ☼

"ماریا تمہیں فون کر رہی تھی۔ تم نے اس کی کال کیوں نہیں اٹینڈ کی؟" وہ گھر آیا تو ممی نے اس سے کہا۔

"میں رانگ نمبرز کی کال اٹینڈ نہیں کرتا۔" شان بے نیازی سے وہ صوفے پر گرا۔

"ماریا کا نمبر میں نے خود سیو کیا تھا تمہارے موبائل میں۔"

"دوسرے والے میں کیا ہو گا۔۔۔ اس نے مزید تین دن کی مہلت مانگی ہے۔" وہ کچھ یاد کر کے مسکرانے لگا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"آپ نہیں سمجھیں گی۔"

"مجھے سمجھاؤ بھی مت۔۔۔ جس دن تمہاری باتوں کو سمجھ گئی، اس دن پاگل ہو جاؤں گی۔ بہرحال تمہیں یہ بتانا تھا کہ ماریا تم سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ جبران کی طرف سے ہاں ہے۔"

"یہ کیا غضب کیا آپ نے ممی؟" وہ اچھلا۔۔۔ "یعنی اب خلیل جبران۔۔۔ میرا مطلب جبران کریم ماریا کے آگے پیش ہو گا کہ وہ اسے ریجیکٹ کرے یا ایکسیپٹ۔۔۔ ممی دونوں طرف سے آپ کو مایوسی ہو گی اس نے مجھے ایکسیپٹ کیا تب بھی اور ریجیکٹ کیا تب بھی۔"

"مجھے اس طرح تنگ مت کرو جبران! آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ مجھے تو ماریا بہت اچھی لگتی ہے۔"

"وہ اچھی ہو گی لیکن مجھے کسی کا انتظار ہے۔"

"ٹائی ٹینک ڈوب چکا ہے۔ جیولٹ خودکشی کر چکی ہے۔ راپنزل اپنے لمبے بال لے کر ہمارے گھر میں گھومتی پھرتی ہمارا فرش صاف کرتی پھرے۔۔۔ برداشت کر پاؤ گے وہ لمحہ؟" ممی نے ہنسی دبائی۔ جیسے

اس کی سوچ کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

"آج کل بڑے اچھے اسٹائل آگئے ہیں بالوں کے.... لمبے بال بھی ایسے سنور جائیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گی۔"

"میں روایتی ماؤں جیسی نہیں ہوں جبران.... یہ تم بھی جانتے ہو۔ میں اپنے بیٹے کی پسند کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتی مگر تم ایک بار ماریا سے مل لو۔ مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں پسند آجائے گی۔"

"تو کیا آپ مجھے پاکستان بھیج رہی ہیں.... میرے ٹیسٹ...."

"کہیں نہیں بھیج رہی میں تمہیں' وہ آرہی ہے پاکستان سے اگلے ماہ اس سے مل لو اچھی طرح بات کر لو پسند نہ آئے تو بتا دینا۔ میں کسی فیکٹری میں آڈر کر دوں گی کہ وہ فیری ٹیل کی شہزادی بنا دیں۔ میرے بیٹے کو اس سے شادی کرنی ہے۔"

"آرڈر کی کیا ضرورت ہے.... میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔" وہ ذرا شرمندہ نہ ہوا۔

☆ ☆ ☆

تین دن کی مہلت گزرنے کے اگلے دن وہ یونیورسٹی ہی نہیں گئی تھی۔ یہ تین دن بھی بڑے جاں کنی کے عذاب میں گزرے تھے۔ جبران اور اس کا دوست ڈینئیل تینوں دن اس کے ڈپارٹمنٹ آتے رہے تھے۔ اگرچہ وہ اسے مخاطب نہیں کرتے تھے۔ لیکن آتے جاتے شوخ نظروں کا تبادلہ ضرور کرتے تھے۔ جیسے کہا جارہا ہو' بچو.... کسی صورت نہیں چھوڑنا۔" وہ اس ساری صورت حال کا بڑا مزہ لے رہا تھا۔ رومی جانتی تھی ورنہ موبائل تو اس نے لے ہی لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ آتے جاتے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں کے آگے لہراتا تھا یعنی کہ دو دن رہ گئے۔ پھر انگلی ایک رہ گئی۔ دن بھی ایک رہ گیا۔ پھر آتے جاتے ہاتھ کو مخصوص انداز میں جھٹکا گیا۔ یعنی "کل" اور کل وہ یونیورسٹی گئی ہی نہیں اور پھر لگاتار کئی دن نہیں گئی۔ امی فریال سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر پر تالا ڈال کر رکھا کریں۔ شہر کے حالات خراب ہو رہے ہیں۔

"شہر کا تو پتا نہیں' تمہارے ذہن کے حالات ضرور خراب ہو گئے ہیں ان دنوں۔"

پھر ایک روز جاب پر جانے سے پہلے اس نے امی فریال کو جپھی ڈالی اور لاڈ سے بولی "اگر کوئی ایرا غیرا گھر آکر آپ کی بیٹی کے خلاف کچھ الٹا سیدھا بولے تو کیا آپ یقین کر لیں گی؟"

"میں سر پھوڑ دوں گی۔"

"ویل ڈن امی!" وہ مطمئن ہوئی۔

"اس کا نہیں تمہارا.... تم نے کچھ غلط سلط کیا ہو گا تو وہ آکر الٹا سیدھا بولے گا نا۔" امی نے ایسے کہا کہ اسے لگا کہ معصومیت کے آڈیشن میں وہ فیل ہو گئی ہے۔

کیتھرین نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ دونوں آئے تھے اور اسے نہ پا کر واپس چلے گئے۔ جبران غصے میں تھا۔ سن کر رومی کانپنے لگی۔ اللہ ان ڈیڑھ سو ڈالرز کا اس سے اس طرح حساب لے گا اسے اندازہ نہیں تھا۔ ہائے اس کی ایک ننھی سی غلطی کی کتنی بڑی سزا دے رہا تھا اسے اللہ پاک۔ وہ ان دنوں دو طرح کی کیفیات سے گزر رہی تھی۔ کبھی سوچتی۔

"میرے پاس نہیں ہیں پیسے۔ سامنا ہو گا تو دیکھی جائے گی۔" کبھی خیال آتا۔

وہ سامنے آگیا تو کیا ہو گا۔"

اپنی جاب پر بھی وہ مکمل توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ کرسٹن کی اس پر کڑی نظر تھی۔

"تم باربی بنی ہو.... لیکن تمہیں دیکھ کر ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم مصر کی حنوط شدہ ممی ہو۔"

"میں بہت تھکی ہوئی ہوں کرسٹن.... اس باربی کے لباس سے بھی اکتا گئی ہوں۔ تم مجھے سنو وائٹ کا کاسٹیوم دے دو۔"

میرے خیال سے تمہارے لیے کوئی فل کاسٹیوم زیادہ اچھا رہے گا.... وہ تمہارے اندر نئی طاقت بھی پیدا کرے گا۔" رومی سمجھ گئی۔

"ارے نہیں نہیں کرسٹن.... میں تو مذاق کر رہی

تھی... ورنہ یہ بنفشی رنگ تو میرا فیورٹ رنگ ہے۔ اور میں تو باربی کی اتنی بڑی مداح ہوں کہ میرا گھر باربی ڈولز اور باربی موویز...."

"بس.... بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے.... باقی پھر کبھی پر اٹھا رکھو۔"

"فل کاسٹیوم" کے خوف سے اس نے جھوٹ تو بول دیا تھا مگر وہ خود میں نئی طاقت پیدا نہیں کر سکی تھی۔ دوسرا اس کے خیال میں پارک میں آتے بچے بھی ان دنوں کچھ زیادہ ہی شریر ہو گئے تھے۔ دل میں آتا کہ کس کس کے ایسے بچوں کے منہ پر چانٹے مارے۔ جو تصویریں اترواتے نہ تھکتے تھے۔ مسکرا مسکرا کر رومی کے گالوں نے مسکراہٹ کی مستقل شکل اختیار کرلی۔ عام حالات ہوتے تو اسے یہ شکل شاید پسند آجاتی۔ مگر اب اسے یہ ایک گالی لگنے لگی تھی۔

اس دن بھی ایک بہت ہی شریر بچہ رومی کے اعصاب پر سوار تھا۔ اس نے باربی بنی رومی سے باربی کی ڈھیروں اسٹوری بکس 'ڈھیروں کلرنگ بکس اور ڈھیروں مووِیز خریدیں اور پھر ڈھیروں تصویریں بنوائیں۔ اس کا شاید اپنی کلاس میں کسی سے مقابلہ تھا جو نہ وہ تھک رہا تھا نہ اس کے ماں باپ۔

چھٹیوں اور مختلف تہواروں کے دنوں میں تصویر اتروانے پر بھی ٹکٹ لگتا تھا۔ رش کے دنوں میں بھی لیکن عام دنوں میں کھلی چھوٹ ہوتی۔ جس کا بچے بھرپور فائدہ اٹھاتے اور مختلف لباسوں میں ان شہزادیوں کو کٹھ پتلی کی طرح ناچنا پڑتا۔ بچے نے جاتے جاتے نہ صرف اس کا گال چوما بلکہ اسے بھی اپنا گال چومنے کو کہا۔ بچے کے مام ڈیڈ جو پہلے سے ہی ہنس رہے تھے اس بات پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

اس کے بعد بچے کے دل میں نجانے کیا آئی' اس نے اپنے مام ڈیڈ سے کچھ کہا اور مام ڈیڈ نے رومی کے پاس آکر ننھے بچے کی ننھی آرزو بتا دی کہ وہ آپ کے ساتھ گھوڑے کی سواری کرنا چاہتا ہے۔

"میں معذرت چاہتی ہوں.... ہمیں اس بات کی پرمیشن نہیں ہے۔" اجازت ہوتی بھی تو وہ گھوڑے پر نہیں بیٹھتی۔ اسے گھوڑوں سے وحشت ہوتی تھی۔ مام ڈیڈ نے تاسف سے بات سنی اور بچے کی طرف دیکھا۔ جس کے ہونٹ چوسنی کی طرح سکڑ گئے تھے اور آنکھیں چھلکنے کو تھیں۔ مام ڈیڈ کے دل چھلنی چھلنی ہو گئے۔

"آپ ہمیں پرمیشن لے دیں.... ہم اس کی اضافی ادائی کردیں گے۔"

"دیکھیے پلیز بات کو...."

"پرمیشن ہے...." کرسٹن نجانے کب وہاں آگیا تھا۔ رومی نے کرسٹن کی طرف دیکھا۔ کرسٹن نے اس کو ایسے اشارہ کیا کہ وہ آخر اضافی ادائی کو حاصل کیوں نہیں کرنا چاہتی۔

"میں گھوڑے پر نہیں بیٹھوں گی کرسٹن.... ایسا کچھ بھی کنٹریکٹ میں نہیں لکھا ہوا۔"

"کنٹریکٹ میں تو یہ بھی نہیں لکھا ہوا کہ تم کافی گرا کر اپنا لباس خراب کروالاؤ گی۔"

"وہ ایک شرارتی بچہ تھا۔"

"یہ ایک ضدی بچہ ہے۔"

"تمہیں گھوڑے سے ڈر لگتا ہے کرسٹن۔" گھوڑا آ گیا تھا۔ بچے کا ڈیڈ 'سپرمین بن کر اسے گھوڑے والی سائیڈ سے لے آیا تھا۔

"ڈرو مت.... ڈر کے آگے ہی جیت ہے۔"

"پر مجھے تو موت نظر آرہی ہے۔" گھوڑے نے گردن موڑ' نتھنے پھلا کر رومی کو دیکھا اور وہ کاؤنٹر کے ساتھ جا لگی۔ کرسٹن دبا دبا ہنسنے لگا۔

"چلو بیٹھ جاؤ.... بچوں کا دل نہیں توڑا کرتے۔"

"چاہے میری سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے۔" کرسٹن نے اضافی ادائی کے پیسے پکڑ لیے اور جیب میں ڈال لیے۔ وہ ان معاملات میں بددیانت نہیں تھا۔ اس نے آدھے پیسے رومی کو ضرور دینے تھے۔ لیکن صرف آدھے.... وہ پچاس فی صد والا بددیانت تھا۔

پندرہ منٹ بعد وہ ایک لمبی سواری کر کے واپس لوٹی تو بچہ دھاڑیں مار مار کر اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ اس کے پیچھے رومی اطمینان سے بیٹھی تھی۔ بچے کے مام ڈیڈ کی

آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ اور وہ اپنے بچے کی طرف لپکے۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے رومی سے پوچھا۔

"پتا نہیں..... جب جب گھوڑا اچھلتا تھا' یہ رونا شروع کر دیتا تھا۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور دل ہی دل میں ان چٹکیوں پر خوب ہنسی جو وہ سارے راستے بچے کو کاٹتی آئی تھی۔

"ایک اور بچہ تمہارا انتظار کر رہا ہے اور اس کا مطالبہ کچھ ایسا عجیب ہے کہ میں سمجھ نہیں پا رہا۔"

"کیا مطلب..... کون؟"

"وہ تمہارے پیچھے..... بینچ پر۔" رومی نے پلٹ کر دیکھا اور پارک کے سارے خوف ناک جھولوں میں جیسے وہ ایک دم جھولنے کا مزہ لے چکی۔ پیچھے جبران بیٹھا تھا جو اسے دیکھ کر اب اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"اس نے بتایا کہ اسی نے تمہارے ڈریس پر کافی گرادی تھی۔ یہ شرارتی ہے اس کا تو مجھے پتا نہیں..... پر بچہ اتنا بڑا بچہ نکلے گا یہ بات میرے گمان میں بھی نہیں تھی۔" رومی نے اپنی چوری کے اس طرح سامنے آجانے پر گردن جھکالی۔

"تم جانے سے پہلے میرے آفس میں مجھ سے مل کر جانا۔" کرسٹن کہتا ہوا چلا گیا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ تم کہیں نہیں بھاگو گی۔" وہ پوچھنے لگا۔ غصے سے نہیں بلکہ اس انداز میں جس میں یہ عنصر پوشیدہ تھا کہ "تو میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ تم شکل سے ہی چور لڑکی لگتی ہو۔"

"میں پیسوں کا انتظام نہیں کر سکی۔" اس نے سچ بتا دیا۔ سن کر سامنے والا ذرا مسکرایا جیسے وہ یہ ہی بات سننا چاہتا تھا۔

"تمہیں اپنا پچھلا ریکارڈ صاف رکھنا چاہیے تھا۔ ڈیڑھ سو ڈالر کے بدلے تم نے مجھے اس دن اس قدر ذلیل نہ کیا ہوتا تو آج میں بھی تم سے یہ سلوک نہ کر رہا ہوتا..... انسان کے "گناہ" اس کے سامنے آ ہی جاتے ہیں۔"

"میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟ تم قسطیں

وہ پھر سے کہتے کہتے رکی۔

"تم آفر ہی اتنی اچھی دے رہی ہو کہ مجھے پسند آ ہی نہیں رہی..... میں جان بوجھ کر نہیں مان رہا جیسے۔" اس نے طنز سے کہا۔ "اور کیا تم میری وجہ سے کلاس میں نہیں آ رہیں؟"

"ہاں.....!" رومی نے اعتراف کیا۔ اپنی کمزوری کا۔ ایک عورت کی کمزوری کا۔ ہائے یہ عورت! دنیا کے جس ـــــ کونے میں ہو۔ مرد کے مقابلے میں کمزور کیوں ہوتی ہے۔ اسے کسی دکھیارے ناول میں پڑھی ہوئی لائنیں یاد آئیں۔ جبران ـــــــ مسکرانے لگا۔ وہ اس لڑکی پر اپنی اتنی دہشت پیدا کر دے گا اس بات کا تو اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ یہ لڑکی جواب اپنا سر جھکائے کھڑی ہے اور اس دن جب غلطی سے جبران نے اس کے لباس پر کافی گرادی تھی تو یہ ہی معصوم لمحے بھر میں جھاڑو والی جادوگرنی بن گئی تھی۔

"تم نے اپنی کلاس میں کسی کو نہیں بتایا کہ تم یہ کام کرتی ہو۔"

"تو کیا تم نے بتا دیا؟" وہ خوف زدہ ہوئی۔ تھیم پارک اس کے قدموں سے نکل کر کسی دوسرے شہر جانے لگا۔ اس راز کو راز رکھنے میں اسے کتنے ـــ پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ کیسے کیسے سفید اور رنگ برنگے جھوٹ بولے تھے اس نے۔

"نہیں۔ میں نے انہیں نہیں بتایا..... لیکن جب میں نے ان سے پوچھا کہ رومی جوڈزنی تھیم پارک میں کام کرتی ہے تو سب نے کہا کہ رومی تو فیشن میگزین میں کام کرتی ہے۔" وہ ہنسا۔ تو یہ لڑکی اس طرح خیالوں خیالوں میں اپنے شوق پورے کر رہی تھی۔

"اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ تمہاری کلاس نہیں جانتی کہ....." اس کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور ہنسنے لگا۔ رومی نے تذلیل محسوس کی۔ اگر اس خبیث کا قرض ادا نہ کرنا ہوتا تو وہ اسے اچھے سے بتاتی۔

"بہرحال تم یونیورسٹی آنا شروع کرو..... وہاں بات کرتے ہیں..... وصولی تو میں ہر صورت کر ہی لوں گا

اب۔" اپنے آپ میں گم مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔ رومی اس کے اس رویے کو کچھ سمجھی اور کچھ نہ سمجھی۔ جبران چلا گیا اور اس کی جان میں جان آئی۔

☆ ☆ ☆

"گاہک ادنیٰ سے ادنیٰ معمولی سے معمولی ہی کیوں نہ ہو.... ہمارے لیے وہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کوئی بادشاہ' ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ ان کو انفرادی حیثیت دیتے ہیں۔ گاہکوں کی وجہ سے ہی یہ پارک چل رہا ہے اور ہم سب میں تم بھی شامل ہو رومی.... تم نے کیا سوچ کر اس لڑکے سے پیسے وصول کیے جب کہ ایسی کوئی انسٹرکشن تمہیں نہیں دی گئی تھی.... اور تم نے رقم بھی ڈرائی کلیننگ کی نہیں بلکہ لباس کی وصول کی۔"

"وہ ایک چور لمحہ تھا۔ میں اس لمحے کی زد میں آ گئی۔"

"زیادہ جذباتی ناول مت پڑھا کرو۔ وہ چور لمحہ نہیں تھا۔ سیدھی طرح کہو کہ تم نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ یہ غلط ہے اس حرکت کی معافی نہیں مل سکتی۔" اس نے چہرہ اٹھا کر کرسٹن کی طرف دیکھا۔ کیا وہ اسے جاب سے برخاست کرنے والا تھا۔ کرسٹن کی آنکھوں میں ایک خاص اشارہ تھا۔

پندرہ دن بھالو کی سزا دے کر کرسٹن نے عدالت کا فیصلہ محفوظ کر لیا اور عدالت برخاست کر دی۔

گھر واپس جاتے وقت اس کے دل میں نجانے کیا آئی کہ وہ پھر سے آسکر اسکوائر گئی۔ اس ہارڈ بال جیسی آنکھوں والے افریقی جادوگر کو یہ بتانے کہ وہ کس قدر جھوٹا ہے۔ لوگوں کو ان کے جذبات سمیت الو بناتا ہے۔ جادوگر نے رومی کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اور جیسے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ بڑی ہی نرمی سے گویا ہوا۔

"کچھ مت بتاؤ.... مجھے سب پتا ہے.... اس دن یقیناً" تمہارے ساتھ کچھ الٹ ہوا ہو گا.... دراصل وہ چاند گرہن کی رات تھی.... ستاروں کی گردش بدل گئی تھی۔" رومی کا غصہ لمحے بھر میں اترا۔

"کیا واقعی.... یہ ہی بات تھی؟" اس نے آس سے پوچھا۔

"ہاں.... لیکن آج ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"تو پھر آج میں پھر سے ایک کارڈ اٹھانا چاہوں گی.... نکالو کارڈز۔"

"نکالو پانچ ڈالر...." نرم گو جادوگر سفاک ہو گیا۔ رومی نے دل کڑا کر کے پانچ ڈالر نکالے۔ جادوگر نے پتے پھینٹ کر پھیلائے۔ رومی پھر سے کارڈ اٹھاتے وقت ہاتھ کھینچ لینے کا کھیل کھیلنے لگی۔ تیسرے کارڈ پر جادوگر کی زنجیر حرکت میں آنے سے پہلے وہ کارڈ اٹھا چکی تھی۔ جادوگر نے کارڈ پڑھنا شروع کیا تو اس کے چہرے پر جیسے بہت بڑا ہی برتھ ڈے لکھا گیا۔

"بہت ساری روشنی تمہاری منتظر ہے۔"

"کہاں....؟"

"تمہارے گھر... کارڈ بتا رہا ہے کہ آج جیسے وہاں سورج آیا ہوا ہے۔"

"سچ میں....؟"

"ہاں.... جلدی جاؤ.... اس روشنی کو سمیٹ لو۔"

وہ تیزی سے اٹھ کر گھر کی طرف بھاگی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے پیروں کے نیچے پہیے لگوا لے بہت ساری روشنی' جب تک وہ گھر نہیں پہنچی جادوگر کا فقرہ بازگشت کرتا رہا۔

داخلی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو اسے ایک دھچکا لگا۔ گھر میں شارٹ سرکٹ ہوا تھا۔ اور امی فریال کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ سارے تار تبدیل کروا سکتیں۔ سارے گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

"بہت ساری روشنی...." اس کا دل کیا واپس جا کر جادوگر کا منہ توڑ دے۔

☼ ☼ ☼

کرسٹن نے ایک روز پہلے ہی تمام لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ کل کوئی لڑکی چھٹی نہ کرے۔ سب کو کسی تھیم پارٹی میں جانا ہے۔

عملہ پہلے بھی اس طرح کی تھیم پارٹیز کا حصہ بنتا رہا تھا۔ لیکن رومی آج تک ان کے ساتھ کسی پارٹی میں نہیں گئی تھی۔ کیونکہ ایسی ہائی فائی پارٹیز رات گئے تک چلتی رہتی تھیں۔ اور امی فریال کی طرف سے اسے اتنی رات گئے تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اس بار کرسٹن نے بہت سختی سے سب لڑکے لڑکیوں کو آنے کا کہا تھا۔ لڑکے لڑکیاں تو ایسی پارٹیز کا انتظار کرتے تھے۔ مفت کا عمدہ کھانا کھانے کو بھی ملتا تھا اور پیسے بھی اضافی مل جاتے تھے۔ اس سب کے باوجود رومی نے جانے سے معذرت کر لی تھی۔

"میں پارک میں ہی ڈبل ڈیوٹی دے دوں گی۔"

"پارٹی پارک ٹائمنگ کے بعد ہے۔ اور انہوں نے بہت زیادہ کریو کا مطالبہ کیا ہے۔ ہماری ٹیم اتنی بڑی نہیں ہے۔ تمہاری غیر حاضری میرے لیے مشکل کا باعث بن جائے گی۔ تمہیں اضافی پیسے بھی مل جائیں گے اور میرے خیال کے مطابق تمہیں آج کل پیسوں کی ضرورت بھی بہت ہے۔" کرسٹن نے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے آخری بات کی تھی۔

رومی نے آمادگی ظاہر کی۔

پارٹی کا تھیم "کارٹون تھیم" تھا۔ ہر لڑکی اور ہر لڑکا کچھ نہ کچھ بنا ہوا تھا۔ لڑکیاں پنک پینتھر' ایلو ویرا' اسٹار بری گرل' چارلس اینجلز وغیرہ اور لڑکے ننجا ٹرٹلز' ٹوم' بین ٹین' ڈورے مون وغیرہ۔ جو لباس اسے دیا گیا تھا وہ ٹوئیٹی کا تھا۔ چھوٹی پیلی بطخ کا' پیلا روئیں دار لباس' جس کا اگلا حصہ روئی کی فلنگ سے بھرا گیا تھا۔ پیچھے دم تھی اور منہ والے حصے پر چونچ....

"تم بلاوجہ ایسی پارٹیز میں نہیں جاتیں۔ اب دیکھنا آج کے بعد تم ہر پارٹی میں جاؤ گی.... کتنا مزہ آتا ہے ایسی پارٹیز میں۔" کیتھرین نے کوچ میں سفر کے دوران اس سے کہا تھا۔

سفر تمام ہوا تو کوچ سے اترنے سے پہلے سب نے اپنے اپنے سروں پر اپنے اپنے ہیڈز رکھ لیے۔

پارٹی کسی انتہائی امیر و کبیر شخص کے بچے یا بچی کی تھی۔ سجاوٹ و آرائش اس قدر خوب صورت تھی کہ وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ کرسٹن ان سب کو ترتیب سے کھڑا کر رہا تھا اور ہدایتیں دیتا جا رہا تھا۔

"جب تک پارٹی ختم نہ ہو، تھکنے کا نام نہیں لینا۔ یہاں دو گھنٹے کا ریسٹ دینے کے لیے کسی دوسرے کو تمہاری جگہ پر نہیں بھیجا جائے گا.... آخری لمحے تک جوش کا مظاہرہ کرنا ہے۔ بچے شرارتیں کریں تو انہیں اگنور کرنا ہے۔ جب کیک کٹنے والا ہو تو سب نے ٹیبل کے پیچھے جا کر دو قطاریں بنا لینی ہیں۔ آگے پیچھے...."

کرسٹن بے چارے کو بھی ہر بار ہدایتیں دینی پڑتی تھیں۔ کیونکہ لڑکے لڑکیوں نے اس جاب کو اسٹینڈ

بائی کے طور پر لیا ہوا تھا۔ جیسے ہی انہیں کوئی مناسب کام ملتا تھا وہ یہاں سے رفوچکر ہو جاتے تھے۔

کام وہ ہی تھا جو وہ تھیم پارک میں کرتے تھے۔ جھومنا لہرانا' اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنا' وزنی بچوں کو گود میں اٹھا اٹھا کر خوش کرنا' تصویریں اتروانا' سب سمجھ کر سب اپنی اپنی پوزیشن پر کھڑے ہو گئے۔ ٹویٹی رومی بھی اپنی جگہ پر کھڑی ہو کر لمبی سی چونچ کھولنے اور بند کرنے لگی۔ اس کے ڈریس کی مناسبت سے اسے ایک سیٹی بھی دے دی گئی تھی۔ جو وقفے وقفے سے بجا کر وہ ٹویٹی کی آواز نکال رہی تھی۔

رفتہ رفتہ وہ جگہ لوگوں سے بھرنے لگی۔ بچے اپنے اپنے پسندیدہ کارٹونز کو یوں سامنے کھڑا دیکھ کر جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ اور پاگل ہوئے بھی ایسے کہ کارٹونز کو پاگل کر دیا۔ ٹویٹی کے دنیا میں اتنے مداح موجود تھے' یہ بات رومی کو اب پتا چلی تھی۔

سب سے بڑی بچی چودہ سال کی تھی جو رومی پر چڑھ دوڑی تھی۔ رومی گرتے گرتے بچی تھی۔ اس کا دل کیا کہ اس لوتھا کو اٹھا کر زمین پر دے مارے۔ لیکن کرسٹن۔۔۔۔ ایک تو اس کرسٹن کی بھی شاید دس دس کاپیاں تھیں۔ پارٹی کے بعد ہر لڑکا لڑکی کہتا کہ کرسٹن اس کے سر پر سوار رہا تھا اور کوئی سمجھ نہ پاتا کہ "وہ اصل والا کرسٹن" کس کے سر پر کھڑا رہا تھا۔

وہ لوتھا تقریباً" بیس منٹ رومی کی جان سے چمٹی رہی۔ وہ گئی تو رومی نے کھل کر سانس لیا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی جیسے سانس رک گئی۔ یہ اس کی نظروں کے سامنے کون تھا۔ یہ سب اس کے یونیورسٹی فیلوز اور اس کی کلاس کے لڑکے لڑکیاں۔۔۔۔ یہ سب یہاں کیا کر رہے تھے۔ ٹویٹی کے پاؤں تلے کا قالین جیسی ہوا میں معلق ہو گیا۔ وہ بھاگ کر کیتھرین کے پاس گئی۔

"کیتھرین! ہمارے کلاس فیلوز اور یونیورسٹی فیلوز۔"

"گھبراؤ نہیں۔۔۔۔ میں بھی دیکھ چکی ہوں ان سب کو تم پریشان مت ہو۔۔۔۔ ہم نے مکمل لباس پہن رکھا ہے۔ کوئی ہمارا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے ہیڈ کو مضبوطی سے تھامے رکھو بس۔۔۔۔"

اپنی جگہ پر واپس آ کر وہ ہیڈ کو مضبوطی سے تھام کر کھڑی ہو گئی۔ بچے اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسی سے کھیلنا چاہتے تھے اور وہ ان کے ہاتھ جھٹک رہی تھی۔ اب اسے ہوا تک سے یہ ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں وہ ہی اس کا وزنی ہیڈ اس کے سر پر سے اتار نہ دے۔ اور وہ سب کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔

☆ ☆ ☆

عین اسی وقت جب ٹویٹی نے اپنا ہیڈ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہاں سے بہت دور اپنے کمرے کے آئینے میں کھڑا جبران اپنی ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ تیار۔۔۔۔ ہو کر اس نے اپنے اوپر پرفیوم کا "فائنلی" اسپرے کیا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"کم اِن۔" اس نے کہا اور ماریا اندر داخل ہوئی۔

"آنٹی انکل جا چکے ہیں اور باقی سب بھی۔۔۔۔ آنٹی نے کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ آجاؤں۔"

ماریا نے اپنی شخصیت کے مطابق نرم لہجے میں کہا۔ وہ پرسوں ہی پاکستان سے آئی تھی۔ ممی نے اسے بالآخر بلوا لیا تھا۔ جبران کو اس کے آنے سے الجھن نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ممی نے بچپن کے دوستوں کی طرح اسے پکا وعدہ جو دے دیا تھا کہ وہ ماریا کے حوالے سے اس پر ذرہ برابر بھی زبردستی نہیں کریں گی۔ اتنی سی بھی نہیں جتنا چوہے کے دانتوں میں ایک وقت میں کیک کا ٹکڑا آتا ہے۔

ماریا اسے پسند آ گئی تھی لیکن ایک دوست کی حیثیت سے۔ وہ پاکستان میں ایم ایس سی کر رہی تھی۔ اور اس کی اعلا تعلیم —— اس کے سارے سراپے سے عیاں تھی۔ وہ بہت —— خوش مزاج اور ہنس مکھ تھی۔ وہ اپنی ان خاصیتوں کو بہت نپے تلے انداز میں لے کر چلنے کی عادی تھی۔ درحقیقت اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جو قابل اعتراض ہوتی۔

جبران کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو پہلی ہی نظر میں ماریا کے لیے اپنی رضامندی دے دیتا۔ لیکن جبران کی نظر میں ماریا میں بس ایک کمی تھی۔ نہ تو اس کے بال راپنزل کی طرح لمبے تھے۔ نہ وہ سنو وائٹ کی طرح برف سے بنی ہوئی لگتی تھی اور نہ ہی وہ جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر "اوہو" کا نعرہ لگا سکتی تھی۔

"میں ماریا کے اعزاز میں بہت بڑی پارٹی دوں گی۔" ممی نے کہا تھا۔

"پارٹی تو آل ریڈی میں کر رہا ہوں.... بہت بڑی پارٹی.... برتھ ڈے پارٹی۔" وہ خلاؤں میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ "آپ بھی آجایئے گا وہاں.... ماریا کو لے کر۔"

"تم کب سے برتھ ڈے منانے لگے۔"

"میں کبھی بھی بچہ بن سکتا ہوں.... میرے اندر کا بچہ کبھی بھی انگڑائی لے کر جاگ سکتا ہے۔" اس نے کہا تھا۔

"وہ سوتا ہی کب ہے، جو جاگے۔" ممی نے بھی تبصرہ کیا۔

"جی ہاں.... یہ اسی پارٹی کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس میں رومی ٹوٹی بنی کھڑی تھی۔

"میں بھی ریڈی ہوں.... تم کار میں بیٹھو میں بس آ رہا ہوں۔"

اس نے ماریا سے کہا اور ماریا دروازہ بند کرتے ہوئے واپس چلی گئی۔ لیکن باہر نکلنے سے پہلے.... مکمل او جھل ہونے سے پہلے اس نے ایک نظر جبران کو دیکھا تھا.... محبت سے.... اسی جبران کو جو دس سال پہلے ان کے گھر آیا تھا تو اس کی اس سے باتیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ دونوں نے تتلیوں کے رنگ اپنی انگلیوں پر اتارے تھے۔ رات کے وقت آسمان پر ستاروں کو گنا تھا۔ کیا اب آسمان پر ستاروں کی تعداد بڑھ نہیں گئی تھی۔ کیا اب انہیں ایک ساتھ نئے ستاروں کو تلاش نہیں کرنا چاہیے تھا؟

ماریا سوچتی ہوئی کار تک آئی۔

ٹوٹی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے لباس کے سارے پر جل گئے اور وہ گنجی ہو گئی۔ کیا یہ جبران ہی تھا یا اس کی نظر کا دھوکا.... نہیں، دھوکے تو بس اس کے دل نے ہی کھائے تھے۔ آج نظر بھی کھا جاتی تو وہ دل کے دھوکے بھول جاتی.... یہ واقعی جبران تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور پیچھے ڈینیل، جو آج بھی ہنس رہا تھا اور ایسے ہنس رہا تھا کہ رومی کو محسوس ہوا کہ اس کے دانتوں کی سرجری یقیناً" اسی کے ہاتھوں سے ہونے والی ہے۔

وہ پھر بھاگ کر کیتھرین کے پاس جانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو....؟" کرسٹن کی دس فوٹو کاپیوں میں سے کسی ایک نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔" اس نے آواز دبا کر کہا۔

"چپ کر کے کھڑی رہو.... اور سیٹی بجاؤ۔" وہ چپ کر کے کھڑی ہو گئی اور پھس پھسی سیٹی بجانے لگی۔ جو اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ یہ پارٹی کس کی ہے کون دے رہا ہے اور وہاں کون کون آ رہا ہے تو وہ جاب چھوڑ دیتی لیکن یہاں نہ آتی۔

جبران کے دوست بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کی تقریباً" ساری ہی کلاس وہاں موجود تھی اور اب وہ سب آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ برتھ ڈے بوائے کوئی اور نہیں جبران ہی ہے۔ "اتنا بڑا لوتھا" اس نے طنز سے سوچا۔ اس نے خود تو کبھی بچپن میں بھی برتھ ڈے نہیں منائی تھی اور وہ "لوتھا" سب سے گلے ملتے ہوئے مبارک باد اور پھول وصول کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ اسے بھی سب سے ملوا رہا تھا۔ لڑکی نے بلیک کلر کا ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ اور اس کے نیچے ڈھیلی ڈھالی پتلون کی طرز کا سلک کاٹراؤزر تھا۔ اس کے بال سلکی تھے اور بنا اسٹائل کے بھی اس پر جچ رہے تھے۔ وہ بلا شک و شبہ اس وقت امریکن ڈراموں کی ہیروئن لگ رہی تھی۔ اور سب سے بڑی خوش اخلاقی سے مل رہی تھی۔ ٹھہری ہوئی مثبت مسکراہٹ کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

روی کو لڑکی کی خوش قسمتی پر رشک آیا۔ جو جبران جیسے لڑکے کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ یقیناً "اس کا" منگیتر اور جلد ہی بننے والا شوہر تھا۔۔۔ روی جس کی قرض دار تھی اور آج اسے اپنا قرض خواہ نجانے کیوں بڑا پیارا لگ رہا تھا۔

جلن، حسد، رشک یا پھر نجانے کس جذبے کے تحت روی ایک آہ سی بھر کر رہ گئی۔ ایک آہ امی فریال نے اس کے سامنے بھری تھی۔۔۔ ہفتہ بھر پہلے۔

"کیا ہوا امی! آپ مجھے پریشان لگ رہی ہیں۔" اس نے پوچھا تھا اور امی نے ماموں کے بیٹے راحیل کی شادی کا کارڈ اس کے سامنے کر دیا تھا۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ کیا آپ کے پاس شادی پر پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں؟"

امی فریال نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ اتنی معصوم کیوں بن رہی ہے۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔

ماموں کے بیٹے راحیل کی شادی کبھی اس سے ہونی تھی۔ کبھی کہیں بہت پہلے یہ بات افواہ کی صورت سنی گئی تھی اور امی ابھی تک شاید اسی آس میں تھیں۔ آس تو تھوڑی بہت روی کو بھی تھی۔ اگرچہ کوئی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی اور جس طرح باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی اسی طرح بے قاعدہ ٹوٹ بھی گئی اور ڈائریکٹ راحیل کی شادی کا کارڈ ان کے گھر آگیا۔

ان ماں بیٹی کی حیثیت ایسی تو ضرور تھی کہ انہیں شادی پر بلایا جاتا۔ لیکن ایسی ہرگز نہیں تھی کہ ان سے رشتے داری ہی کرلی جاتی۔۔۔ اپنے وزنی لباس کے نیچے روی آنسوؤں سے بھیگنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد کیک آگیا تو کرسٹن کی ہدایت کے مطابق سب "کارٹونز" کیک والے ٹیبل کے پیچھے اکٹھے ہو کر جھومنے لگے۔ روی بھی اپنے ناتواں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایسے ہلانے لگی کہ اگر اصل ٹوئٹی دیکھ لیتی تو ضرور کہتی کہ "بہن! میں اتنی گئی گزری بھی نہیں ہوں تھوڑا تو تیز ہاتھ ہلا۔"

جبران اور ماریا بھی کیک والے ٹیبل کے قریب آگئے اور کیک کٹنے سے عین تھوڑی دیر پہلے ایک عجیب بات ہوئی۔ ایک دھکا لگا ٹوئٹی کو نجانے کہاں سے اور وہ لڑکھڑا کر گری سجاوٹی گلدان کے اوپر۔

گلدان فرش پر گر کر ٹوٹا۔۔۔ پھول بکھرے۔۔۔ آواز گونجی۔۔۔ اور اس کے سر کا ہیڈ لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا۔

اس کا لباس روئیں دار تھا۔ وہ گری بھی کارپٹ پر تھی۔ اسے چوٹ تو بالکل نہ لگی۔ لیکن گرنے کے اگلے ہی لمحے اسے احساس ہو گیا کہ اس کا ہیڈ بہت دور جا گرا ہے۔ کسی نے زبردستی سہارا دے کر اسے اوپر اٹھایا اگرچہ وہ ہرگز اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔

ہجوم نے پہلے شور کی طرف کان کیے۔ پھر اس جگہ کو دیکھا جہاں ٹوئٹی کھڑی تھی۔ اور اب جہاں اس روپ تلے ایک لڑکی کھڑی ہو رہی تھی۔ بہت سوں نے اس لڑکی کو ایک ہی لمحے میں پہچان لیا۔ روی کی گردن جھک گئی۔ ٹیبل کے پیچھے کھڑے باقی سب کارٹونز نے بھی دم سادھ لیا۔ پنک پینتھر بنی کیتھرین نے بھی۔

"روی تم۔۔۔ تم یہاں؟" جبران حیرت سے چلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ روی نے اسے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ اس کی آنکھوں اور اس کے لفظوں میں کیسی شرارت تھی۔

"تم یہاں کیسے۔۔۔ اچھا تو تم یہ کام کرتی ہو۔۔۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔" بات کر کے تائید لینے کے لیے اس نے اپنے یونیورسٹی فیلوز کی طرف رخ کیا اور سب بے اختیار ہنس پڑے۔ سب کے سب۔۔۔ روی کا دل اور آنکھیں تو پہلے سے ہی بھیگ رہی تھیں اب جیسے اس کا پورا وجود بھیگنے لگا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم کسی فیشن میگزین۔۔۔" جبران مسکراتا ہوا پھر سے اس کی طرف مڑا اور روی کی سب سمجھ میں آگیا۔ ایک زناٹے دار تھپڑ جبران کے منہ پر پڑا تھا۔

روئیں دار لباس کے اندر سے اس کا ہاتھ جبران کے گال پر پڑا تھا۔ آواز ایسی بلند تو نہ تھی۔ پھر بھی اس آواز نے سب کے قہقہے نگل لیے۔۔۔ سب کے سب

جو بیٹھے تھے' وہ کھڑے ہو گئے اور جو کھڑے تھے وہ پتھر کے بن گئے۔ ساری روشنیاں جیسے گل ہو گئیں۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے میں چمکنے لگیں جبران اور رومی کی آنکھیں.... جو ایک دوجے کو گھور رہی تھیں۔

"انجان بن کر اپنے مکر کو چھپا رہے ہو؟" وہ نخوت سے پوچھنے لگی۔ جبران رومی کو گھورتا رہا۔ وہ جو کہہ رہی تھی' ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پر اسے اس کی جرات پر بے پناہ غصہ آیا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ...." وہ اس کی طرف بڑھا۔ ڈینیل نے بروقت آگے بڑھ کر اسے روکا۔

"جب تم اتنا کر سکتے ہو کہ مجھے نیچا دکھانے کے لیے میرے کلاس فیلوز کو اکٹھا کر سکتے ہو تو میں بھی حق رکھتی ہوں کہ تمہارے منہ پر تھپڑ مار سکوں.... اور ایک ہی کیا میں تمہیں دوسرا تھپڑ مارنے کی بھی ہمت رکھتی ہوں۔" وہ چلائی۔ ٹوپی کے لباس میں ملبوس وہ اس ہائی فائی پارٹی میں کیسی ادنیٰ سی لگ رہی تھی۔ ہجوم اس ادنیٰ کی اس درجہ بغاوت کو دیکھ کر حیران تھا۔ جبران کے ممی پاپا بھی آگے بڑھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"میری حیثیت سب کو دکھانے کے لیے آپ کا بیٹا اپنے مقام سے گر گیا ہے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر وہ دم سادھے ہجوم کی طرف بڑھی۔

"میں رومی ہوں.... آپ سب کی یونی فیلو.... میں تھیم پارک میں کام کرتی ہوں.... میرے پاس اتنی اچھی کوالیفکیشن نہیں کہ میں کسی اچھی جگہ پر کام کر سکوں اور ہمارے گھر کے حالات ایسے نہیں کہ میں کوئی کام کیے بنا گزارہ کر سکوں.... میں تھیم پارک میں مختلف روپ اپنا کر کھڑی ہوتی ہوں۔ کبھی سنڈریلا' کبھی راپنزل' کبھی سنو وائٹ اور کبھی بھالو...."

آنسوؤں سے لبریز اس کی آواز پورے مجمعے نے سنی۔ اب کے ایک تھپڑ پڑا ان سب کو....

"اور آج آپ سب کے سامنے میں کیا بنی ہوں.... اور کیا بنا دی گئی ہوں...." آواز آنسوؤں سے بھیگی.... دیا۔

ٹیبل کے پیچھے کھڑے تمام کارٹونز نے اپنے ہیڈ اتارے۔ کیتھرین نے بھی اور سب بے چارگی سے رومی کو دیکھنے لگے۔

"بند کرو یہ تماشا اب.... بہت ہو گئی.... تمہیں انٹرٹین کرنے کے لیے بلایا تھا۔ دفع ہو جاؤ اب یہاں سے۔" جبران اس کے سر پر پہنچ کر دھاڑا۔

"ایسے کیسے دفع ہو جاؤں مسٹر جبران.... تماشا تم نے لگایا تھا۔ اب اس کا اختتام میں کروں گی.... یہ پارٹی تم نے میرے لیے ہی تو ارینج کروائی ہے.... میری حیثیت سب کو دکھانے کے لیے۔ اب میں سب کو انٹرٹین تو کر لوں۔" کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی کیک کی طرف.... اور ایک جھٹکے میں ہی اس نے ہاتھ مار کر کیک گرا دیا۔ تین منزلہ کیک سرخ کارپٹ پر گر کر دور دور تک بکھر گیا۔

"گھبراؤ مت مسٹر جبران.... میں اس کے پیسے بھی دوں گی۔" آنسوؤں کے باوجود بھی اس کی آواز صاف سنائی دی۔ کوئی کچھ نہ سمجھا یا شاید ضرورت سے زیادہ سمجھ گئے۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے ایک کرسٹل لیمپ کو زمین پر پٹخا۔

"میں اس کے پیسے بھی دوں گی.... یہ بھی جمع کرو۔" پھر وہ دوسرے لیمپ کی طرف بڑھی۔ اسے پٹخنے کے بعد گلدان' ٹیبل' کراکری اور نجانے کس کس کی طرف.... ایک جنون تھا جو اس میں سما گیا تھا۔ اور اب وہ بھی اس میں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

"میں اس کے پیسے بھی دوں گی.... اس کے بھی.... اس کے بھی۔" آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا تھا۔ چہرے کے ساتھ ساتھ اس کا روئیں دار لباس بھی گیلا ہو گیا۔ وہ لباس جو اس کی مجبوری تھا اور جو اس کے لیے ذلت کا نشان بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح روتے روتے اور چیزیں توڑتے توڑتے وہ اب نجانے کس چیز کی طرف بڑھ رہی تھی جب کرسٹن نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک

"بس کرو....." کرسٹن نے بس اتنا ہی کہا۔ پھر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے سینے کے ساتھ لگ کر وہ اپنے آنسو اس کی شرٹ میں جذب کرنے لگی اور ہجوم رونے کی گھٹی گھٹی آواز سننے لگا۔

☼ ☼ ☼

آسکر اسکوائر کا سارا بازار تقریباً" بند ہو رہا تھا۔ آج وہ چلتے چلتے بے خیالی میں یہاں تک نہیں آئی تھی۔ بلکہ وہ باقاعدہ یہاں ہی آئی تھی۔

اندر پہنچ کر اس نے یہاں بھی وہ ہی کام کیا تھا جو وہ پارٹی میں کر کے آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے وہ کرسٹل گلوب توڑا تھا جو دو کرسیوں کے درمیان ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ خاموشی میں چھناکے کی آواز گونجی تھی۔ اور ایک بوڑھی عورت، جو وہاں بیٹھی تھی، فوراً" اٹھ کر باہر بھاگی تھی۔ حبشی جادوگر حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔

رومی نے ٹیبل پر پڑے کارڈز پھاڑنے شروع کیے۔ سخت کارڈ کچھ پھٹ گئے اور کچھ ویسے ہی نیچے گر گئے۔ پھر وہ دیواروں پر ٹنگی موتیوں کی مالاؤں کی طرف بڑھی۔ نوچ نوچ کر انہیں اتارا۔ موتی بھی شیشے زمین پر بکھرے۔ سرخ پردے پینٹنگز۔ اس نے ہر ہر چیز کو اکھاڑ پھینکا۔ اور فرش پر دے مارا جادوگر خاموشی سے دیوار سے لگا کھڑا سب دیکھتا رہا۔ چاروں کونوں میں پڑے لیمپ بھی اس نے ایک ایک کر کے توڑ دیے اور جب دکان میں کچھ بھی ٹوٹنے لائق باقی نہ بچا تو وہ بدحواسی سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

جادوگر نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔ وہ اس جاگ چکے انسان سے مزید چیزیں توڑنے کے منظر کا منتظر تھا۔ لیکن چیزیں تو سب ختم ہو گئی تھیں۔ صرف وہ خود ہی باقی بچی تھی اور وہ بھی اس کے سامنے ٹوٹ گئی۔

فرش پر گر کر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کرسٹن! کیا تم مجھے جاب سے نکال رہے ہو؟"

کرسٹن کے آفس کا دروازہ کھول کر اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ کی بورڈ پر کام کرتے کرسٹن کی انگلیاں تھمیں۔ اور اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ جس کا لہجہ تو بے تاثر تھا لیکن سوچی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

"ریلیکس ہو جاؤ رومی..... یہاں بیٹھو۔"

"نہیں۔ مجھے جواب دو کرسٹن..... کل رات جو کچھ ہوا کیا، اس کے بعد بھی مجھے واپس اس جاب پر رکھ رہے ہو؟"

"ہاں..... تم پریشان مت ہو۔"

"میں اگلے بہت لمبے عرصے کے لیے بھالو بننے کے لیے تیار ہوں کرسٹن..... تمہیں اس کام کے لیے کسی دوسرے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ میں دو گھنٹے کی بریک بھی نہیں لوں گی..... دوپہر سے رات تک اکیلی کام کروں گی..... کبھی ہاتھ پاؤں میں درد ہونے کا نہیں کہوں گی..... تمہیں شکایت کا کوئی موقع بھی نہیں دوں گی..... اپنی موت کی مجبوری کے علاوہ میں کسی بھی دن جاب سے چھٹی نہیں کروں گی۔"

"اور اس سب کے بدلے تم کیا چاہتی ہو۔"

"مجھے کچھ پیسے چاہئیں کرسٹن.....!"

"تاکہ تم جا کر وہ پیسے اس لڑکے کے منہ پر مار سکو۔"

"ہاں.....!" اس نے تن کر کہا۔ "بولو کیا دے سکتے ہو؟" کرسٹن تاسف سے اسے دیکھنے لگا۔

اور اس دن سب پارک والوں نے بھالو کا ایک نیا ہی روپ دیکھا۔ بھالو کا ڈریس پہنے رومی اس طرح اچھل رہی تھی اور اس قدر جھوم رہی تھی کہ بچے بڑے جہاں نہ صرف خوش تھے وہیں حیرت زدہ بھی تھے۔ گیٹ کیپر نے فون کر کے جلدی سے کرسٹن کو وہاں بلا لیا۔ کرسٹن نے ہی آ کر رومی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"خود کو اتنا مت تھکاؤ رومی....." بھالو بنی رومی ساکت ہو گئی۔

"پیسے تمہیں مل گئے ہیں..... کل جا کر اس کے منہ

پر مار دینا.... لیکن اپنے ساتھ یہ سب مت کرو۔" بھالو کے مسکراتے ہیڈ کے نیچے وہ رو رہی تھی۔ کرسٹن کو سو فی صد یقین تھا۔

جبران یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا اور وہ اس سے ہی ملنے کے لیے روز اس کے ڈپارٹمنٹ جاتی تھی۔ چند روز بعد وہ اسے نظر آ گیا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور وہ پارٹی والی لڑکی آج یہاں بھی اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ روحی کو کسی کی کیا پروا تھی بھلا.... وہ جبران کے پاس پہنچی اور پرس سے پیسے نکال کر اس نے جبران کے منہ پر دے مارے.... منہ پر ہی.... کچھ پیسے اس کے چہرے پر لگ کر زمین پر گرے اور کچھ ہوا میں اڑ گئے۔ جبران ماریا سمیت سب یک ٹک اسے دیکھنے لگے۔

"جو کچھ میں نے کہا.... وہ چوری کے زمرے میں آ سکتا ہے.... لیکن جو کچھ تم نے کیا وہ سوائے ذلالت کے اور کچھ نہیں تھا۔ ان پیسوں سے وہ عزت خریدنا جو تم دوسروں کو دے سکو۔"

کہہ کر وہ رکی نہیں اور آگے بڑھ گئی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی اس حرکت سے ان سب کے چہروں پر کیا تاثرات ابھرے تھے۔

☆ ☆ ☆

جو کچھ آج یونیورسٹی میں ہوا۔ ماریا وہ سب آنٹی انکل کو بھی بتا دیتی اگر اسے اس سارے واقعات سے لے کر جبران کے رویے تک کا علم نہ ہوتا۔

پارٹی پر بہت بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ظاہر سی بات ہے۔ وہ ایسا بھی معمولی نہیں تھا کہ آنٹی انکل اس سے اس بارے میں کچھ پوچھتے ہی نہ.... ایک لڑکی ان کی ساری پارٹی کا بیڑا غرق کر گئی تھی۔ جبران پاؤں پٹختا ہوا گھر واپس آ گیا تھا اور مہمان کھانا کھا کر اور کچھ بنا کھائے ہی گھروں کو چلے گئے تھے۔ اگلے روز صبح جبران اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ وہ رات کو گھر واپس آیا تھا ممی اس کے انتظار میں تھی۔

"وہ لڑکی کون تھی جبران....؟" بات شروع کرنے کے لیے ان کے پاس اس سے بہتر جملہ نہیں تھا۔

"مجھے نہیں پتا...."

"وہ کہہ رہی تھی کہ تم نے اسے ذلیل کرنے کے لیے پارٹی ارینج کروائی تھی۔ کیا یہ درست ہے۔"

"پلیز ممی! فار گاڈ سیک...."

"مجھے جواب چاہیے جبران.... تمہارا چلانا نہیں۔"

"کیا چاہتی ہیں آپ.... جو میں تھوڑا سا وقت گھر پر گزارتا ہوں وہ بھی نہ گزاروں۔"

ممی مزید بولتیں اگر پاپا انہیں ہاتھ دبا کر خاموش ہو جانے کا اشارہ نہ کرتے۔ ماریا بڑی خاموشی سے اور جیسے وہاں اپنی موجودگی سے غافل بن کر سب دیکھ رہی تھی۔ جو کچھ آج یونیورسٹی میں ہوا تھا اس نے وہ بھی بڑی خاموشی سے دیکھا تھا۔

جبران اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گیا تھا۔ تین دن بعد وہ آج یونیورسٹی گیا بھی تھا تو اب نجانے مزید کتنے دنوں کے لیے غیر حاضر ہونے والا تھا۔

ممی ماریا کو پاکستان سے بلا کر الگ شرمندہ ہو رہی تھیں۔ اس کے آنے سے پہلے انہوں نے کیسے کیسے پلان بنا رکھے تھے کہ وہ سب ایک ساتھ کہاں کہاں جائیں گے۔ گھومیں پھریں گے۔ سالوں سے تو کاروبار نے انہیں جکڑا ہوا تھا۔ اب جبران کے اس طرح کے رویے نے انہیں جکڑ لیا تھا پھر بھی وہ ماریا کو اپنے ساتھ جگہ جگہ لے جانے لگیں۔ کبھی شاپنگ کے لیے، کبھی اپنی کسی دوست سے ملوانے، ماریا بھی ان کے ساتھ ایسے ہو جاتی جیسے وہ صرف ان کے لیے ہی پاکستان سے آئی ہے۔

ایک دن ممی نے دوبارہ ہمت کرتے ہوئے جبران سے اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں ماریا سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" جبران نے چھوٹتے ہی انہیں کہہ دیا تھا۔

"کیا.... واقعی؟" سن کر بھی جیسے انہیں یقین نہ آیا۔

دو ہفتے بعد کا دن دونوں کی منگنی کے لیے طے کر دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

رومی نے امی فریال کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ راحیل کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ امی کے لیے کیا یہ ہی غم کم تھا جو وہ انہیں مزید دکھ دیتی۔ اس کے باوجود رومی کو دیکھتے ہوئے انہیں اس بات کا احساس تو ضرور ہو گیا تھا کہ کچھ تو ضرور ہے جس کی پردہ پوشی ہو رہی ہے۔ آج دوسرا دن تھا۔ رومی آج بھی یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ کمرے میں یا تو سوتی رہتی تھی یا چھت کو گھورتی رہتی تھی۔ ایک دوبار امی فریال نے اسے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔

"کیا بات ہے رومی.... تم آج بھی یونیورسٹی نہیں گئیں۔"

"میرے سر میں درد ہے امی...."

"کیا واقعی سر میں ہی درد ہے...."

یہ سر درد کا بہانہ اب اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ مائیں اس بات کو خوب سمجھنے لگی ہیں۔ رومی نے امی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر جاب پر کیوں جاتی ہو؟"

"وہاں جانا میری مجبوری ہے۔"

"پھر اس کو بھی مجبوری سمجھ لو.... کل میں کچھ نہیں سنوں گی...." اور کل امی نے واقعی اس کا کوئی بہانا نہیں سنا تھا اور اسے یونیورسٹی بھیج دیا تھا۔

پارٹی کے دن کے بعد سے وہ پہلی بار اپنے ڈپارٹمنٹ گئی تھی اور جیسا کہ اسے توقع تھی۔ سب نے اسے دیکھا تھا۔ غور سے اور جہاں جہاں سے وہ گزرتی تھی اس کے لیے راستہ بنتا چلا جاتا تھا۔ اس نے ہینڈ فری کانوں میں لگایا اور اس کے کنکشن والی پن ہڈ کی جیب میں اڑس لی اور ایسے ظاہر کرنے لگی جیسے وہ گانے سن رہی ہے اور ایسے زندگی سے پُرجوش گانے سن رہی ہے جنہوں نے اسے اردگرد سے بیگانہ کر دیا ہے۔

کلاس میں بھی اس کا استقبال کیا گیا تھا۔ اگرچہ کسی نے کچھ کہا نہیں تھا۔ لیکن نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ کہہ گئے تھے۔ ان کی نظروں میں طنز تھا نہ ترس.... نہ ہی وہ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لیکن بس وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس میں تھوڑا قصور خود اسی کا تھا۔ جو اس نے اپنی جاب کے حوالے سے اتنے جھوٹ نہ بولے ہوتے تو آج ان کے درمیان طمانیت سے چل رہی ہوتی۔ اس نے ایک کام کو کم تر سمجھا۔ بے عزتی کا مقام جانا اور خود کم تر ہو گئی۔ اگر کیتھرین نے کسی کو سچ نہیں بتایا تھا تو اس نے بھی پہل نہیں کی تھی۔ الٹا جھوٹ پر جھوٹ ہی بولے تھے۔

ایسے ہی گزرتے آتے جاتے جبران سے بھی اس کا ٹکراؤ ہوا تھا اور وہ اپنی نظروں کے زاویے بدل گئی تھی اور خاموشی سے اپنے راستے پر چلتی رہی تھی۔ پھر ایک دن ماریا اس کے پاس آئی تھی.... صرف ماریا.... وہ جبران کے ساتھ اس کی یونیورسٹی آجاتی تھی۔ پیریڈ کے دوران کلاس سے باہر رہتی تھی۔ ایسے ہی کسی وقت میں وہ رومی کے قریب ہوئی۔ نجانے جبران کو بتا کر یا اس کو بنا بتائے۔

"میں جبران کی کزن ہوں.... اس کی ہونے والی فیانسی بھی...." ماریا نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جانتی ہوں۔" رومی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ فیانسی کے لفظ پر نجانے کیوں اس کے دل پر ایک گھونسا پڑا تھا۔ حالانکہ وہ تو جبران کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ کیا وہ اس لڑکی سے جل رہی تھی؟

"کیا تم رک کر مجھ سے تھوڑی دیر بات کر سکتی ہو۔" ماریا نے بے چارگی سے کہا۔ رومی اور کسی ایتھلیٹ کی طرح تیز تیز بھاگ رہی تھی۔

"مجھ سے کیا بات کرنی ہے تمہیں...."

"جو کچھ ہوا.... تمہارے اور...."

"تم تو جبران کی ہونے والی فیانسی ہو نا.... تو پھر اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔" کہہ کر وہ چلی آئی۔ گھر تک کے باقی سارے سفر کے دوران وہ اپنی پچیس سالہ زندگی پر بے آواز، بے تاثر چہرے سے روتی آئی تھی۔

گھر پہنچی تو امی فریال نے خوشی سے جیسے پاگل ہوتے

ہوئے اسے اپنے گلے سے لگالیا۔

"میں آڈیشن میں سلیکٹ ہو گئی ہوں رومی!" انہوں نے چلاتے ہوئے رومی کو بتایا۔

"پوری سوا قساط کے انڈین سوپ سیریل میں۔۔۔"

"کیا سچ میں؟"

"ہاں میرا رول معاون اداکارہ کا ہے۔۔۔ جو پہلی دس اقساط کے بعد فوت ہو جائے گا۔ مگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کہا ہے کہ اگر میرا رول پسند کیا گیا تو مجھے پھر سے زندہ بھی کیا جا سکتا ہے۔۔۔ اور تم دیکھنا میں اس رول میں اتنی جان ڈال دوں گی کہ ڈائریکٹر کو مجھے دوبارہ زندہ کرنا ہی پڑے گا۔" امی بے انتہا خوش تھیں اور رومی چاہ کر بھی بے انتہا خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔

"مبارک ہو امی!" اس نے جیسے زبردستی کہا۔

"پیسے بھی معقول ہیں رومی! تم دیکھنا' جلد ہی میں لیڈ رول بھی حاصل کرلوں گی۔" امی کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

رات کو ان کے سینے کے ساتھ لگ کر سوتے ہوئے وہ سوچنے لگی تھی کہ امی اس کے بچپن سے ڈراموں کی ہیروئن بننے کے لیے آڈیشن دینے جاتی تھیں۔ پھر جوں جوں ان کی عمر بڑھنے لگی۔ وہ بہن' بھابھی' خالہ اور اماں کے کرداروں کا آڈیشن دینے لگیں۔ کیا امی ابھی تک نہیں تھکی تھیں جو کہہ رہی تھیں کہ وہ لیڈ رول بھی حاصل کرلیں گی۔

ایک کردار وہ خود تھی۔ گھر میں الگ' یونیورسٹی میں الگ اور تھیم پارک میں الگ' کیا اتنے کرداروں کے بیچ کسی مزید کردار کی گنجائش باقی بچی تھی۔

صبح وہ سوتی جاگتی آنکھوں سے ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی تو امی ناشتہ دیتے اسے مسلسل گھورنے لگیں۔

"کیا بات ہے۔۔۔ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟"

"تم اب مجھ سے باتیں بھی چھپانے لگی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے سر درد کے پیچھے کون تھا؟"

"کون تھا؟" وہ نا سمجھی سے بولی۔

"جبران کون ہے۔۔۔" امی فریال اصل بات پر آگئیں۔ کپ رومی کے ہاتھوں میں تھرتھرایا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا۔۔۔" اس نے کانپتی آواز سے پوچھا۔ امی نے کچن شیلف پر پڑا پھولوں کا گلدستہ اس کے سامنے کیا۔ مہکتے پھولوں کے اندر ایک کارڈ تھا جس پر "سوری" لکھا ہوا تھا اور نیچے جبران کا نام۔۔۔

☼ ☼ ☼

"غلطی صرف میری نہیں ہے۔۔۔ تو پھر میں کیوں سوری بولوں۔" جبران نے ماریا سے کہا تھا اور ایسے لہجے میں کہا تھا کہ مال میں چلتے پھرتے خریداری کرتے لوگوں نے مڑ مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

دونوں اپنی منگنی کی تقریب کے حوالے سے شاپنگ کرنے مال میں آئے تھے اور یہ شاپنگ اس طرح ہو رہی تھی کہ ماریا نہ صرف اپنی چیزیں خریدتے ہوئے ہلکان ہو رہی تھی بلکہ وہ جبران کو بھی اس کی چیزیں پکڑ پکڑ کر دکھا رہی تھی۔ کہ وہ یہ خرید لے یہ خرید لے۔۔۔

جبران مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ماریا جانتی تھی یہ ہر چیز سے انکار اس لیے نہیں کہ اسے کوئی چیز پسند نہیں آ رہی یا وہ اپنی منگنی پر اتنا شاندار لباس پہننا چاہتا ہے جو یہاں پر موجود نہیں۔ بلکہ یہ انکار کچھ ایسا تھا جیسا اسے اس سب میں کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

چلتے چلتے جب دونوں تھک گئے تو ماریا کے کہنے پر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ چیزوں کی طرح جب جبران کا کسی طرح کی باتوں میں بھی دل نہ لگا تو ماریا نے رومی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اگر تم گلٹی فیل کر رہے ہو تو ایک بار سوری کہہ دو۔"

اور جواباً" جبران ایسے بولا تھا کہ ماریا لمحے بھر کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے کی تیزی سے نہیں بلکہ اس اور اک سے جو رومی کے ذکر پر جبران میں ایک ایسی توانائی لے آیا تھا جو صبح سے اب تک اس میں ناپید تھی اور اس کے لہجے کی تیزی میں وہ عنصر پوشیدہ تھا کہ کوئی زبردستی ہی سہی اس سے رومی کے موضوع پر بات کرلے۔ ماریا کے لیے چائنیز رائس نگلنا مشکل ہو

گئے۔

"وہ اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ غلطی صرف تمہاری ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"تم اس کی غلط فہمی دور کردو۔" جبران خاموش رہا۔ ماریا نے خود ہی تجویز دی کہ وہ پھول اس کے گھر بھجوا دے۔

"کیا تمہارے پاس اس کے گھر کا ایڈریس ہے۔" ماریا نے پوچھا۔ جبران کو یاد آیا کہ اس نے اپنے موبائل میں اس کے یونیورسٹی کارڈ سے اس کے گھر کا ایڈریس نوٹ کیا تھا اور اس یاد کے ساتھ ہی اسے رومی کا انداز بھی یاد آگیا۔

"یہ زیادتی ہے۔" وہ چلائی تھی۔

"جو تم نے میرے ساتھ کیا' وہ بھی ایسا ہی تھا۔" جواباً اس نے کہا تھا۔ پھر اس کا نام پڑھتے ہوئے اس کے دل میں جو شریر سا خیال آیا اس نے وہ بھی کہہ دیا۔

"رومی.... نام تو بڑا درویشوں والا ہے اور کام...." اور اس کے طنز پر وہ بھی خاموش نہیں رہی تھی۔

"تم بھی کون سا خلیل جبران کی طرح انسانی احساسات کی قدر کرنے والے ہو۔" جبران اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔ قرض دار کا یہ رویہ اس نے کبھی کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ اپنے موبائل میں اس کا ایڈریس نوٹ کرنے لگا تو وہ بچوں کی طرح چلائی تھی۔

"تم نے موبائل خرید تو لیا ہے۔" جیسے اس کی مشکل حل ہوگئی ہو۔

"تمہیں اس سے مطلب؟"

"تم دو موبائل رکھ کر کیا کرو گے؟" کہتے ہوئے اس کا چہرہ مسکین سا ہو گیا تھا۔

"کس بات پر مسکرا رہے ہو جبران...." ٹیبل کی سطح کو گھورتی ماریا نے پوچھا اور جیسے سانس لینا بھول گئی۔ جبران اس کی شکل دیکھنے لگا۔ کیا وہ رومی کو یاد کرتے ہوئے مسکرا اٹھا تھا۔ ایک دم سے اسے اپنا آپ شرمندہ شرمندہ لگنے لگا۔

"تمہارے پاس اس کے گھر کا ایڈریس ہے۔"

"نہیں...." اس نے جھوٹ بولا۔

واپسی کے سارے سفر میں جبران ماریا سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ ماریا جواب بھی دیتی رہی۔ لیکن جبران نے نوٹ کیا کہ جیسے ماریا کی آواز میں کچھ ٹوٹ جانے کی کسک تھی۔ کمرے میں آکر وہ بیڈ پر گر گیا۔ وہ رومی کے حوالے سے ماریا کی تسلی کرانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کیا ہو رہا تھا؟ کیوں ہو رہا تھا؟ وہ اس سب سے بے فکر ہو کر سونا چاہتا تھا۔

خواب میں اس نے دیکھا اس کے ہاتھ میں کافی کا ایک کپ ہے اور وہ مستی میں چلا جا رہا ہے۔

"اپنی وائف بنانے کے لیے مجھے کسی خاص لڑکی کی تلاش ہے.... کسی بہت ہی خاص لڑکی کی.... میں کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں جو اینیمیٹڈ موویز کی ہیروئنز کی طرح ہو۔ راپنزل کی طرح لمبے بالوں والی۔ سنو وائٹ کی طرح وائٹ .... اور سنڈریلا کی طرح معصوم۔" سب کہتے ہوئے وہ الٹا چل رہا ہے اور تب ہی کسی سے ٹکرا جاتا ہے۔ پلٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے سامنے سنڈریلا کھڑی ہے۔ اور اس کے لباس پر اس کی کافی گر چکی ہے۔

لیکن یہ خواب کہاں تھا...؟ یہ تو اس کا ماضی تھا۔ اور وہ سو بھی کب رہا تھا.... وہ تو جاگ رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند اسے پہلے بھی نہیں آرہی تھی۔ اور اب تو بالکل بھی نہیں آنے والی تھی۔

"لڑکیوں کے لباس ایسے ہی ہوتے ہیں.... ان ہی کی طرح حساس۔" اسے یاد آیا یا وہ سب خود یاد کرنے لگا۔ وقت اور اس کے دل نے اس بات کا فیصلہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

"میرا موبائل تمہاری وجہ سے گر گیا ہے.... پانی میں۔"

"تم اسے پول میں سے نکال تو لو.... شاید کچھ بچ جائے۔" کہتے ہوئے وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر رکی تھی۔

"تم کسی سے قرض لے لو.... میں تمہیں ہر ماہ قسط"

"یہ سب کچھ اتنی جلدی ممکن نہیں ہے.... تم کچھ تو صبر کا مظاہرہ کرو۔" اس کی آنکھ میں آنسو تھے۔
"تم نے اپنی کلاس میں کسی کو نہیں بتایا کہ تم یہاں کام کرتی ہو۔"
"تو کیا تم نے بتا دیا؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا تھا اور پھر ایک تھپڑ جبران کے گال پر پڑا تھا۔
"انجان بن کر اپنا مکر چھپا رہے ہو۔" وہ نخوت سے پوچھنے لگی تھی۔
"میری حیثیت سب کو دکھانے کے لیے آپ کا بیٹا اپنی حیثیت سے گر گیا ہے۔"
"تماشا تم نے لگایا تھا... اب اس کا اختتام میں کروں گی...." اور پھر جبران کے خیالوں میں وہ چیزیں توڑنے لگی تھی۔
"گھبراؤ مت.... مسٹر جبران میں اس کے پیسے بھی دوں گی۔" اور پیسے پیسے کرتی اس کی گھٹی گھٹی رونے کی آواز جبران کے کانوں میں پڑی اور ایک بے چینی نے اسے آن گھیرا۔
فوراً اٹھ کر وہ قریبی فلاور شاپ گیا۔ کارڈ پر سوری لکھ کر اس نے پھول منتخب کیے اور اگلے دن رومی کے گھر کے ایڈریس پر ارسال کرنے کا آرڈر دے دیا۔

☼ ☼ ☼

اس ڈر سے کہ کہیں وہ پھول بھی لا کر اس کے منہ پر نہ دے مارے۔ وہ اگلے دو دن یونیورسٹی ہی نہیں گیا اور تیسرے دن تھیم پارک چلا گیا۔
بھالو کا لباس پہنے وہ ہیڈ ہاتھ میں پکڑے گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔
"رومی!" جبران نے پکارا۔ اس نے دیکھا اور پھر سے چلنا شروع کر دیا۔
"رومی! میری بات تو سنو...."
"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی...." اس نے یہ بھی نہیں کہا اور مزید تیز چلنے لگی۔
"میں نے تمہیں سوری کا کارڈ اور پھول بھیجے.... کیا انہوں نے بھی تم پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ ٹھیک ہے غلطی میری تھی تو تمہاری بھی تو تھی....." اس نے کہا۔
رومی چلتے چلتے رکی۔ اس کی آنکھوں میں انگارے تھے۔
"سوری...." کہہ کر وہ پھر سے چلنے لگی۔
"تم ایسے نہیں جا سکتیں.... میں نے سوری قبول نہیں کیا۔"
وہ پھر رکی۔ "کیا چاہتے ہو؟"
"دو منٹ بات کرو مجھ سے.... کچھ کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔"
"اب کیا مجھ سے میری تنخواہ بھی پوچھنا چاہتے ہو تاکہ وہ بھی جا کر یونیورسٹی میں بتا سکو۔"
"اتنا منفی مت سوچو۔"
"تم نے اپنے متعلق مثبت سوچنے کے لیے کچھ چھوڑا ہی کب ہے۔" وہ پھر آگے بڑھی۔ جبران وہیں رک گیا۔ موبائل فون پر ماریا کی کال آ رہی تھی۔
"بولو ماریا....!" اس نے کہا۔
"دوبارہ اگر تم میرے پیچھے نہ آؤ تو مجھے اچھا لگے گا۔" رومی پلٹ کر آئی اور تیز لہجے میں بول کر واپس پلٹ گئی۔ فون کے دوسری طرف موجود ماریا نے رومی کا یہ فقرہ سن لیا تھا۔ اور اس نے کیا بات کرنے کے لیے جبران کو فون کیا تھا' وہ بھول گئی تھی۔
"تم کہاں ہو جبران؟" اس نے پوچھا۔
"تھیم پارک میں...." جبران نے بتا دیا۔

☼ ☼ ☼

منگنی کے دن قریب آ چکے تھے۔ اور ممی بابا کی تیاریاں بڑھتی جا رہی تھیں کہ ماریا نے ایک ہی جھٹکے میں ان سب تیاریوں کو نیست و نابود کر دیا۔
"میں کل پاکستان جا رہی ہوں آنٹی۔" ڈائننگ ٹیبل پر سب کے درمیان اس نے اعلان کیا تھا۔ جو کھانا ابھی شروع ہی نہیں کیا گیا تھا وہ پھر شروع ہو بھی نہ سکا۔ پانی پیتے جبران کے ہاتھ رک گئے۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو ماریا۔"

"میں یہ منگنی نہیں کر سکتی آنٹی.... جبران بہت اچھا ہے۔ پر وہ مجھے نہیں چاہتا۔ وہ کس کو چاہتا ہے، مجھے نہیں پتا.... لیکن وہ کچھ اور چاہتا ہے۔" اس نے نرم لہجے سے یہ سب کہا۔ ممی نے جبران کی طرف دیکھا۔

"جبران کو کچھ مت کہیئے گا آنٹی.... ایسی باتوں میں قصوروار کوئی نہیں ہوتا۔"

"ماریا!" ممی نے دکھ سے ماریا کو پکارا۔

"اپنے مام ڈیڈ کو میں سمجھا دوں گی آنٹی.... آپ پریشان نہ ہوں۔"

جو خود پریشان تھی وہ انہیں پریشان نہ ہونے کا کہہ رہی تھی۔ ممی نے جبران سے کچھ نہ کہا۔ کسی نے بھی کسی سے کچھ نہ کہا۔ جبران اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ ماریا کو اپنی محبت کی صفائی دے دیتا اگر وہ واقعی اس سے محبت کرتا۔ لیکن اب اس.... سچائی کے باوجود بھی وہ منتشر ہو گیا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا یا روشنی اُسے اس بات کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔

"جبران!" اور جیسا کہ وہ سوچ رہا تھا دروازے کی آہٹ کے بعد اسے پکارا گیا تھا۔ لیکن آج یہ آواز ممی کی نہیں تھی۔ اس کی کوفت دور ہوئی۔ یہ پاپا کی آواز تھی۔ جبران جو بیٹھا ہوا تھا، حیرت سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھے رہو جبران!" پاپا نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جبران تب بھی نہ بیٹھ سکا۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا!" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"پتا نہیں پاپا...." اسے واقعی نہیں پتا تھا۔

"اس طرح کمرے میں بند کیوں ہو جاتے ہو؟"

"جب خود کو سمجھ نہیں پاتا تو خود کو قید کر لیتا ہوں۔"

"اپنی نفسیات کو سمجھنا انسان کے لیے اتنا مشکل تو نہیں ہوتا.... ہاں اسے پرکھنا ضرور مشکل ترین ہوتا ہے۔"

"شاید...." وہ جیسے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"شرارت حد سے زیادہ بڑھ جائے تو بدتمیزی بن جاتی ہے۔ جبران.... اور مذاق حد سے بڑھ جائے تو ہتک بن جاتا ہے۔" نقلی پاپا آج اصل پاپا والے انداز میں بول رہے تھے۔

"جی پاپا!" اس نے گردن جھکالی۔

"تم خود کو ان میں سے کسی درجے میں دیکھتے ہو؟"

"بدتمیز اور ہتک کرنے والے کے درجے میں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"پھر اپنے درجوں کو بدل لو جبران۔"

"کیسے پاپا؟" اس نے پوچھا، بے چارگی سے۔

"معذرت کر کے...." پاپا نے اسے حل بتایا۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہے اور پھر جانے لگے۔

"پھر سب سے پہلی معذرت تو مجھے آپ سے کرنی چاہیے۔" جبران نے چہرہ اٹھایا۔ پاپا جاتے جاتے رکے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"آئی ایم سوری پاپا! ہر اس بات کے لیے جس نے میری وجہ سے آپ کو دکھ پہنچایا.... پریشان کیا اور...." آگے اس کی آواز گھٹ گئی۔ نقلی پاپا نے اصل پاپا کی طرح اسے بھینچ کر اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

✲ ✲ ✲

ایئرپورٹ کی بلڈنگ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ماریا نے جبران سے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ تم اسے نہ چاہتے ہو۔ یا شاید میرا یہ اندازہ بھی غلط ہو کہ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت تھی۔ لیکن جبران! جب بھی، جسے بھی چاہنے لگو اُسے فوراً بتا دینا.... لڑکیاں محبت کرنے لگیں تو وہ جان بوجھ کر سنو وائٹ کی طرح سو جاتی ہیں.... انہیں لڑکے کے آنسو کا انتظار ہوتا ہے.... وہ سنڈریلا کی طرح اپنا جوتا بھول نہیں جاتیں۔ وہ جان بوجھ کر اسے وہاں چھوڑتی ہیں، راپنزل کی طرح ان کے بال لمبے ہوں تو وہ واقعی انہیں کاٹ کر ایسی جگہ پر لگا دیں جہاں سے شہزادے رہنمائی کرتے ان تک پہنچیں اور انہیں آزاد کروا لیں.... کتنی

کی طرح ان کی جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر سمندر میں چھلانگ لگانے کا انتظار نہ کرو اور انہیں اپنا لو....."

ماریا صرف ایم ایس سی کی لائق اسٹوڈنٹ ہی نہیں تھی اخلاقیات میں بھی وہ فرسٹ ڈویژن رکھتی تھی.... اس نے ثابت کر دیا تھا۔

جبران بھاگا بھاگا یونیورسٹی گیا تھا۔ پھر رومی کے ڈپارٹمنٹ.... وہاں حسب معمول ہینڈ فری کانوں سے لگائے گانے سننے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے رومی دل ہی دل میں آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اس کے پاس گیا اور اس نے اس کے کانوں سے ہینڈ فری نکالنا چاہا۔ لیکن ہینڈ فری کے ساتھ ساتھ رومی کے ہڈ کی جیب سے تار بھی نکل کر اس کے ہاتھوں میں جھولنے لگی۔ ہینڈ فری کسی موبائل وغیرہ کے ساتھ لگی ہوتی تو رومی کی جیب میں ٹکتی رومی نے تڑپ کر جبران کو دیکھا۔ جبران نے بمشکل اپنی ہنسی دبائی۔

"کیا بات ہے....؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔

جبران سیریس ہو گیا۔ "ایک بات کہنی ہے تم سے۔"

"کہو۔"

"اس دن پارٹی میں۔"

"پھر وہی بات۔"

"سن تو لو۔"

"ہاں بولو۔"

"اس دن پارٹی میں میں نے تمہیں چلے جانے کو کہا۔"

"دفع ہو جانے کو۔"

"اور تم چلی گئیں۔"

"دفع ہو گئی۔"

"ہاں.... وہی.... لیکن اب ابھی مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم میرے دل سے نہیں نکل پا رہیں۔" اور اس سے پہلے کہ وہ پھر سے کوئی طنز کرتی بات کے مفہوم کو سمجھ کر وہ سُن سی ہو گئی۔ کتنے ہی پیریڈز گزر جانے کی گھنٹی جیسے ایک دم سے بجی اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔ مترنم شور چاروں طرف پھیل گیا۔

جبران رومی کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اور وہ کہاں دیکھ رہی تھی؟ وہ تو کہیں دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔

"تم بھی کچھ کہو رومی...." وہ پیار سے بولا۔

"کیا وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔" رومی سوچ میں پڑی.... نہیں.... نہیں کہ اگر وہ مذاق کر رہا ہوتا تو اس کا چہرہ اس کی آنکھیں اس ایمانداری سے اس کا ساتھ نہ دے رہے ہوتے۔

"رومی...." جبران نے پھر سے اسے پکارا۔ گھنٹیاں بجتی جا رہی تھیں۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے یہ بات کرنے کی۔" بالآخر وہ بولی۔ گھنٹیوں کا شور کانوں میں چبھنے لگا۔ جو دماغ میں غصہ تھا وہ اس کے زیر اثر بولی۔

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو مسٹر جبران.... کہ میں بھی ان لڑکیوں میں سے ہوں جو دولت کی خاطر تم جیسے لڑکوں کے آگے پیچھے منڈلاتی رہتی ہیں اور ان امیرزادوں کا جس پر دل آ جاتا ہے وہ اسے اپنا لیتے ہیں۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو۔"

"تم غلط سوچ رہے ہو مسٹر جبران.... میں تمہاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوں اور تم مجھ سے یہاں اپنی جھوٹی محبت کا اظہار کرنے آئے ہو۔"

"رومی....؟" وہ حیران ہوا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ دوبارہ میرے پیچھے مت آنا.... لیکن تم نے شاید اب اپنی انا کے ساتھ ضد باندھ لی ہے.... تم بری طرح ناکام ہو گے۔"

"تم پھر غلط سمجھ رہی ہو.... میں واقعی میں تمہیں چاہنے...."

"لیکن میں تمہیں نہیں چاہتی اور نہ ہی چاہوں گی۔" ـــ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

جبران وہیں حیران اور پریشان کھڑا رہا۔ ماریا نے تو کہا تھا کہ لڑکیاں محبت کرنے لگیں تو جان بوجھ کر سنو وائٹ کی طرح سو جاتی ہیں۔ اس نے اس سنو وائٹ کو جگانا چاہا تھا۔ اور وہ جاگ کر اور اسے دھتکار کر چلی گئی تھی۔

گھر پہنچا تو ممی کا موڈ نارمل تھا۔ حالانکہ ماریا آج ہی پاکستان واپس گئی تھی۔ ہونا تو چاہیے تھا کہ ممی اسے بھی گھر سے نکال دیتیں یا کم از کم غصہ ہی کرتیں۔ لیکن پاپا (اب اصل والے) نے شاید سارا معاملہ سنبھال لیا تھا اور اب ممی کے ساتھ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

"منہ کیوں اُترا ہوا ہے؟" ممی نے اس سے پوچھا۔

"پتا نہیں....." وہ بتا نہ سکا۔

"جو ہماری آنکھوں کو بھلی لگتی ہیں، وہ ہی ہمارے لیے راپنزل، سنڈریلا، کیٹی، باربی، فیوزن یا سنو وائٹ ہوتی ہیں۔" ممی نے ایک فقرے میں جیسے ساری بات ختم کی۔

"شہزادی چاہیے تو شہزادوں کی طرح مشکلات بھی اٹھاؤ۔" ممی کی بات نے اس کے اندر نئی روح پھونکی۔

☼ ☼ ☼

رومی اگلے دن یونیورسٹی نہیں آئی تو وہ یتیم پارک چلا گیا۔ بھالو بنی وہ بچوں کو ٹافیاں بانٹ رہی تھی۔ جبران نے بھی اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ بھالو نے سر اٹھایا اور ساکت ہو گیا۔ جبران مسکرا کر اسے گھورنے لگا۔

یک لخت رومی نے ٹافیوں کا سارا ڈبہ جبران کے اوپر اچھال دیا۔ جبران اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ حیران اور پریشان رومی کو گھورنے لگا۔ رومی نے اپنا ہیڈ اتار کر پرے پھینکا۔

"تمہارے لیے یہ سب مذاق ہے نا؟" وہ چلائی تھی۔ "تم بار بار یہاں اس لیے آتے ہو تا کہ مجھے نیچا دکھا سکو..... مجھے احساس دلا سکو کہ میں کتنا گھٹیا کام کر رہی ہوں..... یہ، یہ وزنی لباس پہن کر میں کیسی لگ رہی ہوں۔"

"رومی.....!" پریشانی میں جبران بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"ان موٹے لباسوں کے نیچے کیسے کیسے دکھ پوشیدہ ہیں۔ تم اس بات کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے مسٹر جبران! وہ لڑکیاں جو اندر سنڈریلا بنتی ہیں، ان کے لیے پورا سماج سوتیلا بن چکا ہے۔ جاؤ دیکھو نجانے کتنی ہی

جولیٹ خود کو اندر سے مار چکی ہیں۔ کتنی ہی راپنزل ہیں جن کے ماں باپ، بہن بھائی ان کے لیے جادوگر بنے ہوئے ہیں۔"

"رومی! میرا مطلب ہرگز....."

"تم کسے بےوقوف بنا رہے ہو جبران....." لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لوگ بھالو میں سے نکلی اس نئی مخلوق کو دیکھنے لگے تھے۔

"میرا یہاں آنا تمہیں اس قدر برا لگے گا، مجھے اندازہ نہیں تھا۔" شرمندہ سے لہجے میں اس نے کہا۔

"کبھی یہ لباس پہن کر دیکھو جبران..... تمہیں احساس ہو گا بہت سی باتوں کا۔" وہ نیچے بیٹھ کر رونے لگی۔

"میں چلا جاتا ہوں رومی..... پھر نہیں آؤں گا۔ لیکن تم پلیز! اس طرح سے مت روؤ....." وہ اسے اٹھانے لگا۔ رومی نے اس کا بازو جھٹکا اور لوگ بھی جیسے چونک کر رہے ہوئے۔ جبران سر جھکائے واپس چلا گیا۔

گیٹ پر نصب کیمروں کی براہ راست فوٹیج سے کرسٹن اپنے آفس میں بیٹھا سارا تماشا دیکھ چکا تھا۔ اس نے اسی وقت رومی کو اندر بلوایا تھا۔

"تم نے وعدہ دیا تھا کہ تم شکایت کا موقع نہیں دو گی۔"

"کیا میں نے دیا؟" وہ ابھی بھی آنسو پونچھ رہی تھی۔

"خود کو دے رہی ہو۔" کرسٹن نے کہا۔ "تم اسے غلط سمجھ رہی ہو۔"

"میں اسے صحیح سمجھ رہی ہوں۔ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"پھر؟" کرسٹن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"اس کی اور میری دنیا میں بہت فرق ہے کرسٹن..... یہ فرق نہیں مٹے گا۔ محبت مٹ جائے گی۔ یہ فرق اس کی محبت کو نگل لے گا۔ میں اسے بعد میں پچھتاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ میں اتنی خود غرض نہیں ہوں۔" کرسٹن چند لمحے اس کی بات پر غور کرتا رہا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے پچھتانا نہ پڑے.....

تمہارے اندازے غلط ہوں۔"

"ایسے 'اگر' 'مگر' سے شروع ہونے والی باتیں بعض اوقات بہت نقصان کا باعث بنتی ہیں کرسٹن ۔۔۔ جبران بہت اچھا لڑکا ہے 'میں اس کے لیے برا نہیں چاہتی وہ اپنی اور میری دنیا کے فرق کو نہیں جانتا لیکن میں بیس سالوں سے اس فرق کو جھیلتی چلی آرہی ہوں۔ میرے ابو کی وفات کے بعد میری ماں نے کیسے زندگی گزاری ہے' یہ میں ہی جانتی ہوں ۔۔۔ میرے دونوں ماموں ۔۔۔ خیر ان سب مشرقی باتوں کو تم نہیں سمجھ سکتے کرسٹن!"

اس نے اپنا ہیڈ پہنا اور واپس گیٹ پر آگئی۔

☼ ☼ ☼

امی فریال جس ڈرامے کے آڈیشن میں منتخب ہوئی تھیں۔ اس کی تیاریاں خوب زور و شور سے جا رہی تھی ۔ انہیں بیعانہ بھی مل گیا تھا۔ جو اتنا زیادہ تو ضرور تھا کہ انہوں نے اپنے گھر کی کافی زیادہ خراب چیزوں کی مرمت کروالی تھی۔ نئے وال پیپر لگوائے تھے گدے خریدے تھے۔ اور رومی اور اپنے لیے کچھ ملبوسات وغیرہ۔ رومی نے اپنی طرف سے انہیں بیوٹی پروڈکٹس گفٹ کی تھیں۔ امی کو اب ان ہی چیزوں کی ضرورت پیش آنے والی تھی۔

شیشے کے سامنے ہوتی پریکٹس کو بھی اب جیسے کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ امی فریال جو پہلے صرف مخصوص وقت میں پریکٹس کرتی تھیں ۔ اب انہوں نے باقی کاموں کو مخصوص وقت دے دیا تھا اور باقی سارا شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ہلکان کرتی رہتی تھیں۔

"بتاؤ رومی! اچھے سے کر رہی ہوں نا ۔۔۔" وہ رومی سے پوچھتیں۔

"ہاں ۔۔۔ بہت اچھا ۔۔۔" خلاؤں میں گھورتی رومی جیسے ایک دم سے چونکتی۔

اس دوپہر ابھی وہ گھر کے دروازے سے باہر ہی تھی کہ امی فریال کی آواز آنے لگی۔ حالانکہ اس نے امی کو کہا بھی تھا کہ امی صرف اپنے کمرے میں ہی پریکٹس

کیا کریں۔ ورنہ اردگرد کے گھروں والے سمجھیں گے کہ اس عورت پر کوئی ظلم کر رہا ہے۔

"اس سے پہلے کہ تمہاری بیٹی آجائے ۔۔۔ یہاں سے چلے جاؤ وجاہت! وہ اپنے مرحوم باپ کے بارے میں بہت اچھے خیالات رکھتی ہے ۔۔۔ اس کے لیے تم ایک مرے ہوئے باپ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے ۔۔۔ وہ تو تمہارے اصل نام سے بھی واقف نہیں ۔۔۔ اسے انجان ہی رہنے دو ۔۔۔ یہاں سے چلے جاؤ وجاہت!"

رومی دروازہ کھول کر جلدی سے اندر پہنچی۔

"تم یہاں کس آس میں چلے آئے وجاہت! کہ تمہاری بیٹی بڑھ کر تمہارے سینے سے لگ جائے گی ۔۔۔ وہ تم سے بات تک نہیں کرنا چاہے گی وجاہت!" امی فریال کہتے کہتے رکیں ۔۔۔ ان کے سامنے رومی کھڑی تھی۔

لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا ایک مرد بھی رومی کو دیکھ کر چونکا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"وہ مرد کون تھا؟"

وہ وجاہت تھا ۔۔۔ رومی کا سگا باپ ۔۔۔

☼ ☼ ☼

رات میں امی فریال بڑی خاموشی سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے لائٹ جلائی تھی۔ اور ڈرتے ڈرتے رومی کی طرف بڑھی تھیں۔ جو کمبل میں منہ دیے روئے ہی ۔ جا رہی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں اور انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بس کرو رومی ۔۔۔ مجھ سے شکایت رکھتی ہو تو کہہ دو کہ میں نے تمہیں اب تک تمہارے باپ کے بارے میں کیوں نہ بتایا۔ لیکن اس طرح روؤ مت۔" انہوں نے کہا۔ رومی نے تڑپ کر چہرے پر سے کمبل ہٹایا۔

"ہاں ۔۔۔ شکایت رکھتی ہوں ۔۔۔ اس لیے نہیں کہ آپ نے مجھے میرے باپ کے بارے میں نہیں بتایا

بلکہ اس لیے کہ آپ نے سارے دکھ اکیلے ہی کیوں جھیلے۔۔۔ مجھے کیوں نہ ان میں شریک رکھا۔ اپنے سارے غم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کہتی رہیں آپ۔۔۔ مجھے آئینہ ہی سمجھ لیتیں۔۔۔ کچھ تو بتاتیں۔"

"کیسے بتاتی۔۔۔ کیسے شریک کرتی تمہیں ان دکھوں میں۔۔۔ اور کیا بتاتی تمہیں تمہارے باپ کے متعلق کہ اس نے کسی پرائی عورت کے لیے اپنی بیٹی اور بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔۔۔ تمہیں اور کچھ تو نہ دے سکی ایک بے داغ ماضی بھی نہ دیتی۔" وہ ان کے گلے لگ گئی اور بے تحاشہ رونے لگی۔

"نہیں۔۔۔ پھر بھی آپ مجھے بتاتیں۔"

"تمہارے آگے پہاڑ جیسی زندگی تھی۔۔۔ اسے کیسے گھن لگاتی میں۔۔۔ بولو۔" دونوں ماں بیٹی ایک دوجے کے گلے لگ کر رونے لگیں۔

"تم اس سے مل لینا رومی۔۔۔ وہ چند دنوں کے لیے ہی امریکہ آیا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے ان سے نہیں ملنا۔۔۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ایسے نہیں کہتے رومی۔۔۔ جو بھی ہو جائے۔۔۔ وہ تمہارا باپ ہے۔"

"میرا باپ مر چکا ہے۔"

"وہ مرا نہیں۔۔۔ لیکن مرنے والا ضرور ہے۔" رومی نے ان سے الگ ہو کر انہیں دیکھا۔

"بہت کم وقت بچا ہے اس کے پاس۔۔۔ تم اس سے مل لو۔۔۔ تمہارے ماموں نے ابھی مجھے کال کر کے بتایا ہے۔" امی نے ایک اور انکشاف کیا۔

"وہ نہیں ان کے کیے کی سزا مل رہی ہو گی۔"

"انسان سزا اور جزا کا فیصلہ کرنے لگے تو خدا کی برابری کرنے لگتا ہے۔۔۔ خدا کی برابری شرک ہے اور شرک کفر۔۔۔ میں تمہیں کفر نہیں کرنے دوں گی رومی۔۔۔!"

انہوں نے پھر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور رومی نے جیسے صدیوں کا رونا آج سے شروع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

دن بے کیف ہو چکے تھے۔

زندگی کہاں جا رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہی تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

امی فریال نے اس سے کہا تھا کہ وہ جاب چھوڑ دے اگر وہ چاہتی ہے تو۔۔۔ اب اتنے پیسے تو ہو ہی جایا کریں گے کہ وہ زندگی بہتر ڈھنگ سے گزار سکیں۔ لیکن رومی نے جاب نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اس روز کی لگی بندھی مصروفیات جس میں اس کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں بچتا تھا' میں بکھر رہی تھی۔ جو وہ جاب چھوڑ کر بالکل ہی گھر بیٹھ جاتی تو اس نے نفسیاتی مریضہ ہی بن جانا تھا۔

ایک روز وہ آسکر اسکوائر گئی تھی۔ وہ حبشی جادوگر سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی کہ وہاں جادو کی دکان کی جگہ اب ڈیکوریشن پیس کی دکان تھی۔ وہ حیرت سے کھڑی سب دیکھنے لگی کہ کوئی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ وہی جادوگر تھا۔

"اندر آجاؤ۔" اس نے بلایا۔ وہ اندر چلی گئی۔

"میں اس رات کی معذرت۔۔۔"

"اور میں اس رات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم وہ سب نہ کرتیں تو شاید میں ابھی بھی لوگوں سے جھوٹ بول بول کر ان کے جذبات سے کھیل رہا ہوتا۔۔۔ ان کی معصومیت سے۔" رومی شرمندگی سے مسکرائی۔

"یہ تمہارے لیے۔۔۔" اس نے دل کی شکل والا ڈیکوریشن پیس اس کی طرف بڑھایا۔

"میں اس کا کیا کروں گی؟"

"کیوں۔۔۔ کیا کوئی نہیں ہے؟" وہ آنکھ دبا کر پوچھنے لگا۔

"نہیں۔"

"تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ہے۔۔۔ اور اس بار میں جھوٹ نہیں بول رہا۔۔۔ یہ کارڈز کا علم نہیں تجربے کا علم ہے۔۔۔ بس تم دونوں میں ناراضی چل رہی ہے۔"

وہ خاموشی سے دل کی شکل والا ڈیکوریشن پیس پکڑ

کر باہر نکل آئی۔

جبران اس دن کے بعد نہ تو یمیم پارک آیا تھا اور نہ ہی یونیورسٹی۔ وہ گھر پر بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا تھا اور رات کو دیر سے گھر واپس آتا تھا۔ ممی نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ آخر اتنے وقت کے لیے جاتا کہاں ہے۔

"میری محبت کا ٹائی ٹینک آئس برگ سے ٹکرا گیا ہے۔ اسے بچانے جارہا ہوں۔"

"ٹائی ٹینک میں تو سنا ہے ہزاروں مسافر سوار تھے۔ کیا تم سب کو بچاپاؤ گے؟"

"مجھے باقی کی فکر نہیں ہے۔۔۔ صرف اپنی کشتی کی پروا ہے۔"

اس کی محبت کا ٹائی ٹینک کہاں ڈوب رہا تھا اور وہ کہاں جارہا تھا؟ کسی کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایک ڈراما سیٹ پر جھیل کر آتی ہوں۔۔۔ ایک گھر آکر تمہارا دیکھنا پڑتا ہے۔" امی فریال نے اس سے کہا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"تم مرکزی کردار کو ثانوی حیثیت دے رہی ہو۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟"

"جبران کی بات کر رہی ہوں۔"

"آپ اس کے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟"

"بس جانتی ہوں۔" امی فریال نے شوخی سے کہا۔

"اور کتنا جانتی ہیں؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔۔۔ لیکن اس کی سچائی کو ضرور جانتی ہوں۔۔۔ جو اس کی محبت بھری آنکھوں سے جھلکتی ہے۔"

"آپ کب ملی اس سے؟" رومی گھبرائی۔

"تمہاری غیر موجودگی میں ایک بار گھر آیا تھا۔۔۔ مجھ سے ملنے۔ ملا اور چلا گیا۔"

"کیا کہا اس نے؟"

"صرف اتنا ہی کہ آپ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں اسے عشق میں بدلنے سے بچالیں۔"

"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"ضروری نہیں سمجھا۔ جیسے تم نے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ تم بھی اس سے محبت کرتی ہو۔" رومی نے سر جھکالیا۔

"مرد کی انا اور عورت کی ضد بہت ساری چیزوں کو ختم کردیتی ہے رومی۔۔۔ محبت کو بھی۔۔۔ تم ضدی بن کر اپنی محبت کو ختم نہ کرو۔۔۔ میں تمہیں تمہاری قسمت اپنے جیسی نہیں بنانے دوں گی۔۔۔ تمہاری ماں نے صرف ایک شخص کو چاہا۔۔۔ تمہارے باپ کو۔۔۔ اور وہ۔۔۔"

امی فریال نے اپنے آنسو صاف کیے۔

"دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دروازے پر محبت باربار دستک دیتی ہے۔ ورنہ باقی سب میری طرح محبت کو منتوں، مرادوں سے بھی نہیں روک سکتے۔" انہوں نے پھر سے آنسو صاف کیے۔ جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ رومی دکھ سے انہیں دیکھنے لگی۔

"بڑی محبت کا بڑا محصول مت مانگو رومی کہ وہ اتنا بڑا خراج ادا کردے کہ اس کے بعد نہ وہ باقی رہے نہ تم اور نہ ہی محبت۔۔۔ وہ ملے تو اب اسے ناراض مت کرنا۔"

"وہ ملے تو سہی۔۔۔ نجانے کہاں چلا گیا ہے کہ کہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ شاید دور رہ کر اپنا احساس دلا رہا ہے۔ یہ احساس بہت بڑھ گیا ہے اب۔۔۔ کوئی جا کر اسے کہے کہ وہ واپس آجائے کہ اب انتظار پر سانسیں چڑھ گئی ہیں۔" وہ تڑپ کر سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ایک اسپائیڈر مین تھا جو بڑے دنوں سے اسے پریشان کر رہا تھا۔ بھالو کو گیٹ کے ایک طرف کھڑے ہونا پڑتا تھا اور اسپائیڈر مین یا سپرمین کو دوسری طرف۔ لیکن وہ نجانے کیسا بدتمیز اسپائیڈر مین تھا جو بھاگ کر اس کی طرف آجاتا تھا۔ رومی نے اسے بتایا بھی

تھا۔
"تمہاری پوزیشن وہ ہے....." لیکن وہ بہانے بہانے سے اس کے پاس آجاتا تھا۔ کل تو حد ہی ہوگئی تھی۔ جو بچے اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ وہ کھینچ کھانچ کر انہیں بھی اس کے حوالے کرگیا تھا۔ اور خود اندر چلا گیا تھا۔
پچاس بچوں کا جھرمٹ اکٹھا ہوجائے اور بھالو جتنا مرضی بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ پریشان تو ہو ہی جاتا ہے نا ... پھر ایسے پچاس بچے جن کے ماں باپ، بچوں کو چھوڑ کر بھول ہی جاتے ہیں کہ وہ بھی تو تھیم پارک میں سیر کرنے آئے ہیں۔ رومی نے سب سے بڑی مشکلوں سے جان چھڑائی تھی اور وہ آکر کرسٹن پر چلائی تھی۔
"کرسٹن کس بدتمیز کو بنایا ہے تم نے اسپائیڈر مین اسے اپنی پوزیشن کا ہی نہیں پتا...."
"نیا لڑکا ہے.... سمجھ جائے گا۔"
لیکن وہ نیا لڑکا نہ سمجھا۔ اپنی پوزیشن پر کھڑا وہ مختلف کرتب کرتا رہتا۔ فرضی کک رومی کو مارتا اور اپنی کلائی سے رومی کی طرف جھٹکے سے ایسے اشارہ کرتا جیسے اپنی کلائی میں سے "جالا" نکال رہا ہو.... پھر رومی کو اپنی طرف کھینچنا شروع کردیتا۔
رومی نے غصے سے اپنا ہیڈ اتارا اور اس کے سر پر پہنچ گئی۔ اسپائیڈر مین گھبرایا۔
"تم ہر روز یہاں کھڑے ہو کر مجھے چڑاتے کیوں رہتے ہو۔" وہ چلائی۔ اسپائیڈر مین کچھ نہ بولا۔
"آخر کیا چاہتے ہو مجھ سے....؟" وہ پوچھنے لگی۔
اسپائیڈر مین گھٹنے کے بل بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھ اپنے دل پر رکھ کر اس کے دل کی طرف اشارہ کیا۔
رومی ایک قدم پیچھے ہٹی۔
اسپائیڈر مین نے اپنا نقاب اتار دیا۔
کرسٹن اپنے آفس میں بیٹھا ساری صورت حال دیکھ رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کیتھرین بھی وہیں تھی۔ راپنزل' سنڈریلا' باربی' سنو وائٹ' جیولیٹ بنی لڑکیاں بھی اور سب مل کر خوشی اور تجسس سے سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ جیسے انہیں اپنانے کے لیے کوئی شہزادہ وہاں آگیا ہو۔ اور وہ شہزادہ گھٹنے کے بل بیٹھا تھا۔

وہ ملے تو اب اسے ناراض نہ کرنا۔" رومی کو امی فریال کا فقرہ یاد آیا۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ بات کا آغاز کہاں سے کرے۔ سامنے والے نے اس کی مشکل حل کردی۔
"یہ پہن کر احساس ہو گیا ہے مجھے بہت ساری باتوں کا۔" جبران نے اپنے اسپائیڈر مین والے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا..... "تم یہ ہی چاہتی تھیں نا؟"
چاہتی تو وہ اسے بھی تھی۔ تب ہی تو مسکرا اٹھی تھی۔
گیٹ کیپر سیکیوریٹی گارڈز' بچے' بڑے بوڑھے' اندر کرسٹن اور تمام لڑکیاں بھی مسکرا اٹھی تھیں۔
"شادی کرو گی مجھ سے...." اسپائیڈر مین نے بھالو سے پوچھا اور بھالو آگے سے ہنس دیا۔
"ہاں...." اس نے بولنے میں بالکل بھی دیر نہ کی۔
بہار جیسے تھیم پارک کے گیٹ پر آکر رک گئی۔ سال بھر میں جتنے بھی پھول کھلتے ہیں' وہ سب کھل اٹھے۔ دنیا میں جتنی بھی خوشبوئیں تھیں' وہ بھی وہاں جمع ہوگئیں۔
جبران خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے رومی کا ہاتھ تھام لیا۔
اندر کرسٹن ہنستے ہوئے سوچ رہا تھا کہ چلو پلان کامیاب رہا' پھر وہ لڑکیوں سے مخاطب ہوا۔
"ہمارے پرانے بھالو کی تو اب شادی ہونے والی ہے.... تو بتاؤ' تم میں سے کون سی لڑکی اب بھالو بننا چاہے گی۔" اس نے پوچھا اور تمام لڑکیاں گھبرا کر وہاں سے باہر کی طرف بھاگیں۔ کرسٹن ہنسنے لگا۔
باہر جبران رومی سے پوچھ رہا تھا۔
"اگر شادی والے دن میں تمہارے لباس پر غلطی سے کولڈ کافی گرادوں تو تم مجھ سے ڈیڑھ سو ڈالر کا تقاضا تو نہیں کرو گی؟"
"بالکل کروں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
ہوا جلترنگ بن کر دھم سُر بکھیرنے لگی۔

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

ولید، نادرا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا اور اسے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔

کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی، وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔

رضا حیدر... علی مرتضیٰ کے قاتل تھے... عافیہ بیگم اور ماورا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔

معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا، سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔

ولید کی پرسوچ آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

بتاؤ ولید میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے۔ بہر حال میں...." ماورا التجا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد، ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

چھتیسویں قسط

اور ولید عزت کی کھلکھلاہٹ سے مسحور سا ہو گیا تھا، عزت کے وجود پہ جمی اس کی گرفت میں نرمی اتر آئی تھی اور اس نرمی کا احساس عزت کو بھی فوراً" ہی ہو گیا تھا۔ اس کی شرارت پہ ولید بھی شرارتی ہوا۔ اس کی ایسی شرارتوں پہ عزت کی جان پر بن آئی تھی۔

اسے کسی بھی طرح سے اس کیفیت سے نکلنا تھا کیوں کہ اس تنہائی اور قربت کے عالم میں وہ حد سے آگے بھی جا سکتا تھا' جوان دونوں کے لیے ہی مناسب نہیں تھا۔

"ولید.....!" اس نے اپنے عقب میں کھڑے ولید کو پکارا۔

"ہوں ؟" ولید کی بے خودی ہنوز تھی۔

"کیمرا آن ہے۔" وہ سمجھی' وہ چونکے گا۔

"تو کیا ہوا ؟" وہ لاپروائی سے بولا۔

"دروازہ بھی کھلا ہے۔" اس نے ڈرانے کے حربے آزمائے۔

"کھلا رہنے دو۔" ولید پھر بولا۔

"آنٹی آجائیں گی۔" ایک اور خدشہ۔

"آجائیں۔" وہی لاپروائی۔

عزت اس کی بے خودی پہ جز بز ہوئی تھی۔

اور ولید اس کی ہچکچاہٹ اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس نے اس کا رخ اپنی سمت موڑ لیا تھا۔

"کیا سمجھتی ہو ؟ کیا میں اتنا کمزور ہوں کہ ذرا سی تنہائی ملتے ہی بہک جاؤں گا؟ اس نے دلچسپی سے مسکراتے ہوئے عزت کے چہرے پہ نظریں جمائیں۔ وہ نظریں جھکا گئی تھی۔

"رخصتی نہیں ہوئی ہماری۔ نکاح ہوا ہے۔ اور جب نکاح ہو جائے تو رخصتی کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ تم میرا حق ہو۔ اور حق اگر دسترس میں ہو تو بہک جانا ایک فطری عمل ہے۔ اس میں برائی تو نہیں اور نہ ہی مجھے کسی کا ڈر ہے۔ لیکن پھر بھی میرا حق ہونے کے باوجود تم اس وقت تیمور کی عزت ہو اور اس کی عزت پہ حرف آئے' میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ورنہ موقع تو پورا تھا۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے کہتے آخر میں شرارت سے اسے دیکھا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ؟" ولید کی نظروں کی حدت اس کے چہرے کو گرما رہی تھی۔ اس کے گال لال ہو چکے تھے۔

"کیا مطلب ؟" اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔

"موقع سے فائدہ اٹھا لیا جائے یا پھر ؟" اس نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے سوال ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

اور عزت اس کے سوال پہ تپ گئی تھی۔

"ولید! وہ یک دم چیخی اور ولید ہنستے ہوئے فوراً اس سے دور ہٹ گیا تھا۔

"یار! میں نے تو بس تمہارا خیال پوچھا ہے۔ ورنہ اور بھی بہت سے کام ہیں کرنے کے لیے' وہ کر لیتے ہیں۔" ولید بات کرتے کرتے پینترا بدل گیا تھا۔

"کون سے کام ؟" عزت بھی سوال بدل چکی تھی۔

"یہی ناشتا وغیرہ کرنا ہے۔ کپڑے پریس کرنے ہیں۔ شاور لینا ہے۔ ہیلپ کروا دو تو مہربانی ہو گی۔" وہ اسے اپنے کام بتا رہا تھا۔

"اوکے۔ کروا دیتی ہوں ہیلپ۔" وہ فوراً" آمادہ ہو گئی۔ "پہلے کپڑے نکال دیں وہ پریس کر دوں۔ ناشتا بعد میں بنا دوں گی۔" وہ اپنا موبائل بند کر کے بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"اور شاور لینے والا کام ؟" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"شاور لینے والا کام ؟" وہ نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ میں شاور لیتا ہوں، تم میرے بالوں میں شیمپو لگادو۔" وہ جیسے مسرور ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا اور عزت ایک بار پھر بھڑک اٹھی تھی۔

"ولید!" وہ دبے لہجے میں چیخی۔

"سوری۔ سوری! میں تو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب ہر کام میں ہیلپ کروا رہی ہو تو پھر اس کام میں بھی کروا دو۔" وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

اور عزت اسے گھورتے ہوئے الماری کی طرف پلٹ گئی تھی۔ ولید سر کھجاتے ہوئے اس کے پیچھے آرکا تھا۔

"شلوار قمیص پہنو گے؟" عزت نے سفید رنگ کا شلوار سوٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پہنا دو۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"مجھے صرف پریس کرنا ہے۔" وہ پریس پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

"اوکے۔ کردو۔ یہ بھی بہت ہے۔" وہ احسان مند ہوا۔

"کہاں پریس کرنے ہیں؟" وہ اس کی طرف پلٹی۔

"باہر برآمدے میں۔ استری اسٹینڈ وہیں ہے۔" اس نے باہر اشارہ کیا اور عزت اس کے کپڑے لیے باہر آگئی تھی۔

اسے کپڑے استری کرتے دیکھ کر ولید کے ذہن میں بھی وہی شرارت آن سمائی تھی جو کچھ دیر پہلے عزت کے ذہن میں سمائی ہوئی تھی۔ ولید اپنا موبائل لیے اس کی بے خبری میں اس کی تصاویر اور ویڈیو بنائے جا رہا تھا۔ کپڑے استری کرنے کے بعد وہ ناشتا بنانے کے لیے کچن میں آگئی اور وہ کچن کے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا اپنا کام کرتا رہا۔

"اُف۔!" عزت ایک دم چیخی تھی، انڈا تلتے ہوئے گرم گھی اس کے ہاتھ پہ آگرا تھا اس کی چیخ پہ ولید بھی ایک دم بوکھلا گیا تھا۔

"کیا ہوا؟ زبیدہ بیگم بھی گھر میں داخل ہو چکی تھیں اور کچن میں بکھرا تماشا دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی تھیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ حیرت سے بولیں۔

وہ امی! عزت میرے لیے ناشتا بنا رہی تھی تو ہاتھ پہ آئل گر گیا۔ ولید اس کا ہاتھ پکڑے اسے کچن سے باہر لے آیا تھا۔

"شرم نہیں آئی اس سے کام کرواتے ہوئے۔ وہ ہم سے ملنے آئی تھی اور تم نے اسے کام پہ لگا دیا۔" زبیدہ بیگم نے ولید کو ڈانٹا۔

"شرم تو نہیں آئی۔ بس ایسے ہی شوق ہو رہا تھا کام کروانے کا۔ ولید نے شرارت سے کہا۔

"بے شرم۔ جاؤ اب جلدی سے برنال لے کر آؤ۔" انہوں نے فوراً اسے برنال لینے کے لیے بھیجا۔ اور عزت کو برآمدے میں رکھی کرسی پہ بٹھا دیا۔

☆ ☆ ☆
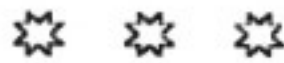
میٹنگ ہال میں پہنچ کر پتا چلا کہ میٹنگ میں کون کون شرکت کر رہا ہے۔

تیمور حیدر کی کرسی پہ آج مسز تیمور حیدر براجمان تھی۔ جس کو دیکھ کر تیمور کے قدم میٹنگ ہال کے داخلی دروازے میں ہی رک گئے تھے۔ لیکن صد افسوس کہ وہ اب واپس بھی نہیں پلٹ سکتا تھا اور وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔

"السلام علیکم سر! رک کیوں گئے۔ آیئے ناں۔" فاروقی صاحب اسے دیکھ کر فوراً اس کی طرف آئے تھے۔
"کیسے ہیں تیمور صاحب؟"
"بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔"
"کہاں تھے اتنے عرصہ سے آپ؟" اسے دیکھتے ہی سب کے طرح طرح کے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔
"میٹنگ کا ٹائم شروع ہو چکا ہے۔" ماورا کی پی اے سحرش زمان نے سب کی توجہ وقت کی طرف دلائی تھی۔
"آیئے سر! تیمور کو ماورا کے مقابل والی کرسی ملی تھی۔ ماورا اسے دیکھ کر نہ تو نروس ہوئی تھی اور نہ ہی گھبرائی تھی لیکن پھر بھی نجانے کیوں اسے شدت سے پانی کی طلب محسوس ہوئی تھی اور اس نے اپنے سامنے رکھے گلاس اور پانی کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں ہونے والی لرزش سامنے بیٹھے تیمور حیدر سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔
اس نے پانی بڑی طلب اور بڑی شدت کے احساس سے پیا تھا اور پھر ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اپنے ماتھے سے پسینہ بھی صاف کیا تھا۔
ایسی سردی کے موسم میں کسی کے ماتھے پہ پسینہ آنا تشویش کی علامت تھی اور عجیب بات تھی کہ بے وجہ ہی تیمور کو اس کی طرف دیکھ کر تشویش ہونے لگی تھی کیونکہ وہ ایک نظر دیکھنے پہ ہی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔
"آر یو او کے میم؟" اس کی پی اے بھی اس کی کیفیت نوٹ کر چکی تھی۔ یعنی تیمور غلطی پر نہیں تھا' سحرش کو بھی اس کی طبیعت کی خرابی محسوس ہو چکی تھی۔
"یس۔! آئی ایم او کے۔" وہ اپنے آپ کو اتنی دیر میں کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ اور پھر اگلے دو گھنٹے اس نے بڑی ہمت سے میٹنگ اٹینڈ کی تھی اور میٹنگ اختتام کو پہنچتے ہی وہ اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔
میم پلیز۔" سحرش اس کے پیچھے آئی۔
"خیریت؟" ماورا نے ذرا کی ذرا رک کر پوچھا۔
"فاروقی صاحب کو آپ کے سائن چاہئیں۔" سحرش نے اسے روکا۔
"آفس پہنچ کر ہو جائیں گے سائن۔" وہ بس وہاں سے جانے کی جلدی میں تھی۔
"لیکن وہ فائل ابھی مسٹر ہمدانی کے حوالے کرنی ہے کیونکہ انہوں نے بھی سائن کرنے ہیں۔" سحرش نے تحمل سے اسے وجہ بتائی اور مجبوراً ماورا کو رکنا پڑا تھا۔ فاروقی صاحب فائل لے کر باہر ہی آ گئے تھے اور ماورا ان کے بتائے ہوئے کاغذات پہ باری باری دستخط کرنے لگی' اتنے میں تیمور بھی باہر نکلا تھا اور کسی سے باتیں کرتے ہوئے سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب رک گیا تھا۔
"میں گھر جا رہی ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آفس کا کام آپ دیکھ لیجیے گا۔" وہ سحرش اور فاروقی صاحب کو کہتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی لیکن تین چار سیڑھیاں اترتے ہی اس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ اور اپنے کسی کولیگ سے بات کرتے تیمور کی نظر نے اس کا دور تک تعاقب کیا تھا اور اسے ریلنگ تھامتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔
"یعنی اب آپ از سر نو بزنس جما رہے ہیں؟" اس کا کولیگ بات کر رہا تھا مگر تیمور کا دھیان کہیں اور تھا۔
"ہوں' ہاں۔!" اس نے کافی غائب دماغی سے جواب دیا تھا۔
اوہ۔ ڈیٹس گریٹ۔ ٹھیک ہے اب ملاقات تو ہوتی رہے گی پھر۔" اس آدمی نے اجازت چاہی اور پھر اس سے ہاتھ ملانے کے بعد تیمور بھی سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔
ماورا ابھی تک خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی' وہ پھر دوبارہ سے سیڑھیاں اترنے لگی لیکن وہ اپنا توازن برقرار

نہیں رکھ پا رہی تھی اُسے خبر بھی نہیں تھی کہ اس کے پیچھے تیمور حیدر بھی آرہا ہے ۔ وہ مزید آٹھ دس سیڑھیاں اترتے ہوئے اپنی تمام ہمت اور حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور قدم لڑکھڑا گئے تھے وہ بڑے خطرناک طریقے سے گرنے کو تھی کہ بروقت تیمور نے پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

"ماورا!" اس نے یک دم ماورا کو گرنے سے بچانے کے لیے مضبوطی سے بانہوں میں جکڑ لیا تھا۔ "تیمو۔ر۔؟" ماورا کی بند ہوتی آنکھوں نے تیمور کو اپنے بے حد قریب دیکھا تھا۔

"ماورا۔ماورا۔" تیمور نے اسے زور سے جھنجوڑا لیکن وہ بے دم ہو کر اس کی بانہوں میں جھول چکی تھی۔ ماورا کی ایسی حالت پہ اور بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے' تیمور خود بھی پریشان ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے بانہوں میں اٹھائے گاڑی کی طرف بھاگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مسز تیمور حیدر کے ساتھ کون ہے؟" نرس نے ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا تھا' تیمور فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"جی۔ میں ہوں ان کے ساتھ۔" تیمور نے جیسے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔

"آپ ان کے؟" نرس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہزبینڈ۔" تیمور نے مختصراً بتایا۔

"اوہ اچھا۔ پھر تو بہت اچھی بات ہے۔ آیئے ڈاکٹر صاحبہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" نرس بڑے خوش گوار انداز سے کہتی ہوئی پلٹ گئی تھی اور تیمور اس کے پیچھے اندر آگیا تھا۔

"السلام علیکم۔" تیمور آہستگی سے بولا۔ وہ کافی ست لگ رہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ پلیز تشریف رکھیے۔" ڈاکٹر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور ماورا کی فائل سامنے رکھی۔

"آپ کون؟" سوالیہ نظریں تیمور کی طرف اٹھیں۔

"تیمور حیدر۔" وہی مختصر جواب۔

"اوہ تو آپ ان کے شوہر ہیں۔ خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔ کیونکہ ایک خوشی آپ کی منتظر ہے۔" ڈاکٹر بڑی خوش دلی سے پیش آرہی تھی۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟" تیمور کا اس طرف دھیان ہی نہیں تھا۔

"مطلب کہ آپ پاپا بننے والے ہیں۔ شی از پریگننٹ۔" ڈاکٹر نے بے حد خوشی سے اسے یہ خوش خبری سنائی تھی اور تیمور ڈاکٹر کے اس انکشاف پہ یک دم اک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ خزاں کے موسم میں بہار کا جھونکا بے یقینی کا باعث ہی تو تھا۔

"یہ۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔؟ پلیز ونس اگین۔" تیمور کی بے یقینی دیدنی تھی۔ اس کی آواز' اس کا لہجہ' اس کے الفاظ کانپ رہے تھے۔

"آپ پاپا بننے والے ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو۔" ڈاکٹر دوبارہ بتاتے ہوئے مسکرائی تھی اور تیمور نے خوشی کی انتہا کو چھوتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پہ رکھ لیے تھے۔

"اوہ گاڈ!" اس کی سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی خوشی کا اظہار کس طریقے سے کرے؟

☼ ☼ ☼

ماورا ہوش میں آئی تو کمرا خالی تھا۔ اس نے سر کو حرکت دیتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا کوئی بھی نہیں تھا اور اس

کے ہاتھ پہ ڈرپ لگی ہوئی تھی' ڈرپ کو دیکھ کر اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ اسے کیا ہوا تھا اور دماغ پر زور دینے پہ اسے یاد آیا کہ آخری آواز اور آخری لمس تیمور کا محسوس ہوا تھا۔
تیمور! وہ چونک گئی اور دل میں اک بے قراری سے بھر گئی تھی لیکن اس کی بے قراری بڑھنے سے پہلے ہی تیمور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔
"کیسی طبیعت ہے؟" وہ بیڈ کے قریب آ گیا۔
"پتا نہیں کیسی طبیعت ہے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ زندہ ہوں" ماورا کے لہجے اور انداز میں شکوؤں کی آمیزش تھی۔
"مبارک ہو۔ میں پاپا بننے والا ہوں۔" تیمور بڑی مشکل سے اپنی خوشی کنٹرول کرتے ہوئے اس کے سامنے آیا تھا۔
"کیا۔؟" ماورا نے یک دم چونک کر دیکھا تھا۔ "تمہاری رپورٹس آچکی ہیں" تیمور نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کے سامنے کی۔ ماورا نے یک دم اٹھنے کی کوشش کی تھی۔
"لیٹی رہو۔ تمہیں ریسٹ کی ضرورت ہے۔" تیمور نے بڑے آرام سے اسے لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی اور ماورا اس کے مزاج کی اس قدر نرمی پہ حیران رہ گئی تھی۔ تو گویا وہ اپنے بچے کا سن کے خوش تھا تب ہی تو اس کے مزاج میں اچانک اتنی تبدیلی آگئی تھی۔
"ڈرپ ختم ہو چکی ہے۔ آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔" نرس نے آکر ماورا کے ہاتھ سے ڈرپ اتارنے کے ساتھ آئی وی بھی نکال دیا تھا۔
چند سیکنڈز بعد ماورا بمشکل تکیے کا سہارا لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔ اور پھر بیڈ سے پاؤں نیچے اتارے تھے لیکن کمزوری کی وجہ سے بیڈ سے اٹھتے ہوئے اسے چکر آرہے تھے مجبوراً" تیمور نے آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔ کمرے سے راہداری اور راہداری سے گیٹ تک وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے آیا تھا اور ماورا اس کے ہاتھ میں پکڑا اپنا ہاتھ دیکھتی رہی۔ چپ چاپ۔ خاموشی سے۔!
ماورا کا ڈرائیور انہیں دیکھتے ہی گاڑی نکال لایا تھا۔ اور تیمور نے اسے گاڑی میں بٹھانے کے بعد اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالینا چاہا۔ مگر ماورا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"پلیز! میرے بچے کو باپ کی ضرورت ہے۔" اس نے جیسے التجا کی تھی۔
"باپ کو بھی بچے کی ضرورت ہے۔ لیکن باپ ابھی اس قابل نہیں ہے کہ اپنے بچے کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ لیکن جیسے ہی اس قابل ہو گیا۔ اپنے بچے کو اپنے پاس لے آئے گا۔ تیمور نے کہتے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔
"تیمور!" ماورا نے بے ساختہ اسے روکا۔ "میں نے ہمیشہ باپ کی محبت کے لیے ترستے ہوئے زندگی گزاری ہے۔ مجھے پتا ہے کہ یہ محرومی کیسی ہوتی ہے' میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ بھی اسی محرومی میں ترستے ہوئے زندگی گزارے' سو پلیز۔ چھوڑ دو سب کچھ۔ لوٹ آؤ۔ میرے لیے نہ سہی۔ اپنے بچے کے لیے ہی سہی۔ واپس آجاؤ۔" ماورا نے روہانسے لہجے میں اپنی محرومی کا اظہار کیا تھا وہ بھی زندگی میں پہلی بار۔
"تمہارے بابا زندہ نہیں تھے اس لیے تم نے ترستے ہوئے زندگی گزاری۔ لیکن میں ابھی زندہ ہوں۔ اپنے بچے کو ترسنے نہیں دوں گا۔ ہاں اگر مر گیا تو وہ الگ بات ہے۔" تیمور نے بڑی سختی اور سنجیدگی سے کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے تھے اور اس کے اس قدر سفاک الفاظ پہ ماورا کی روح تک کانپ گئی تھی۔

آفاق کے آپریشن کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اس لیے اس کی پوری فیملی آپریشن کے لیے اس کے ساتھ امریکہ جارہی تھی۔ سب لوگ ان سے ملنے کے لیے آئے تھے لیکن وہ خود صرف ماورا سے ملنے کے لیے ماورا کے گھر آئے تھے۔ ثمینہ یزدانی اور اشتیاق یزدانی بھی ساتھ تھے۔

"عافیہ بھابھی!" ثمینہ یزدانی کی آنکھوں میں ان کو دیکھتے ہی آنسو آگئے تھے۔

اور پھر دونوں گلے لگ کے خوب روئی تھیں۔ بی گل نے ان کو تسلی دلاسا دیا۔ ثمینہ یزدانی بی گل کے ہاتھ چوم رہی تھیں۔

"بی گل۔ آپ تو مرتضیٰ بھائی کی ماں ہیں ناں۔ آپ کے سوا کوئی نہیں تھا ان کا۔ عافیہ بھابھی کو تو بہت بعد میں بیاہ کر لائے تھے۔" ثمینہ یزدانی کو سب باتیں یاد تھیں۔

"بس بیٹا ایک انسان کی لالچ نے بہت سے رشتے نگل لیے۔ بہت کچھ بکھر گیا" بی گل نے سرد آہ بھری تھی۔

"ماورا کہاں ہے؟" السں کو آفاق کے حوالے کرتے ہوئے فارہ کو ماورا کا خیال آیا تھا۔

"جب سے آئی ہے کمرے میں پڑی ہے۔ اس کی طبیعت نہیں ٹھیک۔ تم خود پتا کرلو" عافیہ بیگم نے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور فارہ اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ ان سب کو ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں آگئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ماورا بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور ہاتھ میں پکڑی اپنی رپورٹس دیکھے جارہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ اس کے بے آواز آنسو بھی جاری تھے۔ فارہ بغیر دستک دیے اندر آگئی لیکن اندر کا منظر اس کے لیے بڑا حیران کن منظر تھا۔

"یہ کیا ہے ماورا؟" اس نے ماورا کے ہاتھ سے رپورٹس لے لی تھیں۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا لیکن پریگننسی کی رپورٹ دیکھ کر اس کے چہرے پہ خوشی کے رنگ بکھر گئے تھے۔

"ارے ماورا۔ میری جان۔ تم ماں بننے والی ہو۔" فارہ بے ساختہ خوشی سے چیختے ہوئے ماورا سے لپٹ گئی تھی اور ماورا کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

"ارے پاگل! رو کیوں رہی ہو؟ یہ تو بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔" فارہ نے اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے۔

"یہ خوشی میاں اور بیوی دونوں کی ہوتی ہے۔" دونوں اس خوشی میں خوش ہوتے ہیں۔ لیکن میں اکیلی۔ اس خوشی میں کیسے خوش ہو سکتی ہوں ؟ ماورا کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔

"ارے ڈونٹ وری یار۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب بچے کا پتا چلے گا تو سب کے دل موم ہو جائیں گے۔ بلکہ میں ابھی سب کو یہ خوش خبری سنا کے آتی ہوں" فارہ اس کے گال تھپکتے ہوئے اٹھی اور ہوا ہو گئی۔

ماورا اسے آوازیں دیتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ عافیہ آنٹی نانی بننے والی ہیں۔" فارہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی بلند آواز سے اعلان جاری کیا تھا۔

"کیا؟" عافیہ بیگم بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"جی ہاں۔ یہ رہیں آپ کے نانی بننے کی رپورٹس" فارہ نے کافی شرارت بھرے انداز سے کہتے ہوئے رپورٹس ان کے ہاتھ پہ رکھ دی تھیں۔

"اس نے اتنی بڑی بات، ہمیں بتائی ہی نہیں؟" وہ خوشی کے احساس سے کھل رہی تھیں۔
"وہ تواب بھی یہ بتاتی اگر میں نہ آتی۔" فارہ ہنسی۔
"اوہ تواس موقع پر پھر مٹھائی تو بنتی ہے ناں۔" آفاق اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔
"ارے نہیں بیٹا اتنا ٹائم ہو رہا ہے۔ مٹھائی کل سہی۔" بی گل نے روکا۔
"کل ہماری فلائٹ ہے۔ اور پرسوں میرا آپریشن۔ اس لیے آج کا کام آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ آپ لوگ بیٹھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ لیکن میری واپسی تک بچے کی اماں بھی یہاں ہونی چاہیے۔ ڈرائنگ روم میں۔" وہ جاتے ہوئے وارننگ دے کر گیا تھا اور سب ہنس پڑے تھے۔
فارہ ماورا کو بلانے کے لیے چل دی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم رضا حیدر صاحب!" مونس مرزا کی طنزیہ سی آواز ایئر پیس سے ابھری۔
"وعلیکم السلام۔ خیریت؟" وہ اس کے طرز تخاطب سے ہی جان گئے تھے کہ کوئی بات ضرور ہے۔
"بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ آپ دادا جو بننے والے ہیں۔" مونس مرزا نے رضا حیدر کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا۔
"جو حقیقت ہے وہی بتا رہا ہوں۔ اور ساتھ آپ کے لیے مٹھائی کے ٹوکرے بھی بھجوا رہا ہوں۔ ڈرائیور لے کر آ رہا ہے۔ وصول کر لیجیے گا۔" مونس مرزا نشتر پہ نشتر چبھو رہا تھا۔
یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے مونس؟ رضا حیدر غصے سے بپھر گئے۔
"یہ مذاق نہیں۔ خوش خبری ہے رضا حیدر صاحب! آپ کی نسل آگے بڑھ رہی ہے اور اب آپ کی نسل کو بڑھانے والی علی مرتضیٰ کی بیٹی ہے۔ ماورا مرتضیٰ۔ اب آپ کو وارث وہی دے گی۔" مونس مرزا خباثت سے بول رہا تھا۔
"یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔" رضا حیدر کی بات پہ مونس مرزا یک دم قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"کیوں۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی۔ یا پھر آپ کو اپنے بیٹے کے مرد ہونے پہ کوئی شک ہے۔" مونس مرزا نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔
"شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ۔" رضا حیدر نے دھاڑتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور موبائل غصے سے فرش پہ دے مارا تھا۔
"رابعہ۔ رابعہ۔" وہ وہیں کھڑے زور زور سے دھاڑنے لگے۔
"اللہ خیر کرے۔ کیا ہو گیا ہے۔؟" وہ تیزی سے اندر آئی تھیں۔
"تمہارا بیٹا کہاں ہے؟"
"وہ۔ وہ تو آفس کے لیے نکل چکا ہے۔" وہ گھبرائی ہوئی تھیں۔
"تو فون ملاؤ ابھی۔ ماورا مرتضیٰ کے نمبر پہ۔" وہ ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔
"خیریت۔؟ سب ٹھیک تو ہے نا۔؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولیں۔
"پوچھو اس سے کہ وہ کس کا پاپ ہمارے بیٹے کے سر ڈال رہی ہے۔ کس کے بچے کو ہماری نسل کا نام دے رہی ہے۔؟" رضا حیدر زہر اگل رہے تھے اور رابعہ بیگم ششدر سی رہ گئیں۔
"بچہ؟ میرے تیمور کا بچہ؟" وہ زیر لب بولی تھیں۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

ربعیہ طارق

صدقہ

"تم نے سرعبید کو دیکھا ہے؟ کتنے خوب صورت ہیں نا وہ ڈیشنگ پرسنالٹی!"

"ہاں یار! ان کے بات کرنے کا انداز بھی بہت خوب صورت ہے۔" ام حلیمہ کالج میں داخل ہوئی تو ہر لڑکی کی زبان پر سرعبید کا نام تھا۔ لڑکیاں ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہی تھیں۔ سرعبید کالج کی پرنسپل کے بیٹے تھے، جنہوں نے چند دن پہلے ہی کالج جوائن کیا تھا۔ کالج کی لڑکیاں جیسے ان کی دیوانی ہوئی جارہی تھیں مگر ام حلیمہ کو ان کی ڈیشنگ پرسنالٹی نے بالکل بھی متاثر نہ کیا تھا کیونکہ وہ زندگی کی رنگینیوں سے بالکل ناواقف تھی۔ نہ ہنستی تھی نہ کسی سے بات کرتی تھی۔ نہ کینٹین سے لے کر کھاتی تھی اور نہ باقی لڑکیوں کی طرح شوخ مزاج تھی۔ غربت کی ستائی ہوئی یہ لڑکی جو اس دنیا میں سانس تو لے رہی تھی مگر زندگی سے بہت دور تھی۔ غربت صرف افلاس کو ہی نہیں کہا جاتا' یہ وہ محرومی ہے، جو ایک ایک کرکے انسان کی ساری خوشیاں کھا جاتی ہے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ کالج کے گراؤنڈ میں جاکر بیٹھ گئی اور اپنے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگالیا۔ یوں تو وہ ہمیشہ کتابوں میں گھسی ہی نظر آتی تھی مگر نہ جانے کیوں امتحان میں ہمیشہ برے نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ وہ

یوں ہی کتابوں میں گھسی بیٹھی تھی جب اسپورٹس ٹیم کا جھرمٹ وہاں فٹ بال کھیلنے آگیا۔ اس جھرمٹ میں سر عبید بھی شامل تھے۔ وہ اسپورٹس ٹیم سے باتیں کررہے تھے مگر جب ان کی نظر ام حلیمہ پر پڑی تو وہ بات کرتے کرتے رک گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ ام حلیمہ بھی خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے حلیمہ کی جانب بڑھنے لگے تو حلیمہ نے سر جھکا کر نظریں کتاب پر جمالیں۔

"آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟" وہ حلیمہ کے سر پر کھڑے اس سے پوچھ رہے تھے۔

"سوری سر، میں چلی جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر حلیمہ اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

"میں نے آپ کو جانے کے لیے تو نہیں کہا۔" وہ حلیمہ کو گہری نظروں سے گھور رہے تھے۔ حلیمہ متذبذب سی ـــــ بیگ کندھے پر ڈال کر کھڑی ہوگئی۔ "آپ فٹ بال کھیلنا پسند کریں گی؟" سر عبید کے اس سوال پر حلیمہ انہیں حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"سوری سر! میں کھیلتی نہیں ہوں۔"

"کھیلنا چاہیے صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔" سر عبید نے کہا۔

"جی سر۔" حلیمہ نہایت ادب سے کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ سر عبید اسے جاتا دیکھتے رہے۔ حلیمہ حیران تھی اس بات پر کہ ہزاروں لڑکیاں چھوڑ کر وہ میرے پاس ہی کیوں آئے؟

✿ ✿ ✿

اگلے دن سیکنڈ ایر کی فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ حلیمہ پریشان تھی کیونکہ ابھی تک اس کی فیس کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ وہ کوریڈور میں چکر لگا رہی تھی، جب سر عبید جلدی جلدی میں چلتے ہوئے آئے اور ایک لمحے کے لیے حلیمہ کے پاس رک کر کہنے لگے۔

"ام حلیمہ آپ کو فیس جمع کرانے کی ضرورت نہیں، میں آپ کی فیس دے چکا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی وہاں سے چلے گئے تو حلیمہ حیران کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

اگلے دن حلیمہ آفس کے باہر کھڑی سر عبید کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ آئے تو حلیمہ فوراً ان کے پاس جا کر بولی۔

"سر مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" سر عبید آفس میں داخل ہوئے اور اسے بھی اندر آنے کو کہا۔ حلیمہ آفس میں داخل ہو کر دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوگئی۔

"جی فرمائیے کیا بات کرنی تھی آپ کو؟" سر عبید نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"سر آپ نے میری فیس کیوں پے کی؟" حلیمہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"آپ کی فیس میں نے نہیں ادا کی۔ دراصل ہمارے کالج کی ایک پالیسی ہے کہ ہر سال قرعہ اندازی کے ذریعے کالج کی بیس طالبات کی فیس معاف کردی جاتی ہے اور اس کی فیس کالج خود ادا کرتا ہے۔ اور اس سال ان بیس طلبہ میں آپ کا بھی نام شامل تھا اس لیے آپ کی فیس معاف کردی گئی۔" یہ سن کر حلیمہ بہت خوش ہوئی۔

"بہت بہت شکریہ سر۔" یہ کہہ کر حلیمہ باہر نکل گئی۔ حلیمہ آج پہلی بار کالج میں مسکرا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ بھی سر عبید کی گرویدہ ہورہی تھی کیونکہ ان کے لہجے میں واقعی بہت مٹھاس تھی۔

✿ ✿ ✿

اگلے دن حلیمہ کالج آئی تو سر عبید سیڑھیوں کے پاس کھڑے موبائل پر مصروف تھے۔ حلیمہ ان کے قریب سے گزری تو سر عبید نے اسے دیکھ لیا۔

"حلیمہ۔" سر عبید نے پکارا تو وہ مڑی۔

"جی سر۔"

"ادھر آئیے مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" حلیمہ ان کے پاس گئی تو انہوں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا

سارے پیک کیا ہوا گفٹ نکالا۔

"یہ آپ کے لیے ہے۔ آپ کی کلاس کی لڑکیوں سے پتا چلا تھا کہ آج آپ کی سالگرہ ہے۔ خیر سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔" حلیمہ حیران نظروں سے انہیں تکنے لگی۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آیا کہ آج تو 27 مئی ہے' اس کی سالگرہ کا دن' جو اسے کبھی یاد نہیں رہتا تھا اور نہ کبھی اسے کسی اور نے یاد دلایا تھا۔

"بہت بہت شکریہ سر' مگر میں یہ نہیں رکھ سکتی۔" وہ پر جوش انداز میں بولی۔

"رکھ لیجیے سالگرہ کے تحفے کو انکار نہیں کرتے اور اب کی بار میں نہ بالکل بھی نہیں سنوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے وہ تحفہ حلیمہ کے ہاتھ میں تھما دیا اور وہاں سے چلے گئے۔ حلیمہ کو آج پہلی بار کسی نے سالگرہ پر تحفہ دیا تھا اور وہ بھی ایک خوب صورت شخصیت نے' حلیمہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

سر عبید کے جانے کے بعد حلیمہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر گفٹ کھولنے لگی۔ یہ ایک چھوٹا سا لفافہ تھا جو نہایت خوب صورتی سے پیک کیا گیا تھا۔ لفافے کے اندر ایک چیک اور چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا تھا جس پر لکھا تھا۔

"مجھے آپ کی پسند کا نہیں پتا تھا اس لیے چیک دے رہا ہوں اپنی پسند سے اپنا گفٹ خرید لیجیے۔" اور آخری لائن پر آکر حلیمہ کی نگاہیں ٹھہر گئیں۔ "یہ خاص تحفہ ایک خاص انسان کے لیے۔" یہ پچاس ہزار کا چیک تھا' حلیمہ کو رکھتے ہوئے شرم آرہی تھی مگر انہوں نے اتنی محبت سے دیا تھا کہ اس کا جی ہی نہیں چاہا کہ وہ اسے واپس کردے۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور حلیمہ سر عبید کی محبت میں گرفتار ہوتی گئی اور سر عبید ہر روز اسے کوئی نہ کوئی نیا اور قیمتی تحفہ دیتے رہتے۔ حلیمہ کے مزاج میں بہت تبدیلی آرہی تھی' زندگی کے بدلتے ہوئے رنگ اسے ایک خوب صورت مستقبل دکھا رہے تھے۔

چند دن یوں ہی گزرنے کے بعد ایک دن جب وہ کالج سے گھر واپس گئی تو اس کی ماں نے اسے ایک دھماکے دار خبر سنائی۔ "ہم بلال سے تمہارا رشتہ طے کرچکے ہیں اور جیسے ہی تم اپنے امتحانات سے فارغ ہوجاؤں گی ہم تمہاری شادی کردیں گے۔" حلیمہ کو لگا جیسے کسی نے اس پر بجلی گرادی ہو۔ بلال اس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ ان پڑھ اور آوارہ۔ ہر وقت پان اس کے منہ میں رہتا تھا۔ دن میں ہارڈ ویئر کی دکان چلاتا تھا اور رات میں دوستوں کے ساتھ جوا کھیلتا تھا اور کبھی کبھی شراب بھی پیتا تھا۔

اماں کی بات سن کر حلیمہ ہڑبڑا اٹھی۔ "امی میں اس آوارہ لڑکے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔" حلیمہ کی بات سن کر اماں کے ماتھے پر بل پڑگئے۔

"تو کیا تیرے لیے آسمان سے کوئی شہزادہ اتر کر آئے گا۔ اچھا بھلا خاندان کا بچہ ہے۔ ٹھیک ٹھاک کماتا ہے اور سب سے بڑی بات ہے کہ وہ میرے بڑے بھائی صاحب کا بیٹا ہے میں انہیں کسی صورت انکار نہیں کروں گی۔"

"امی مجھے یہ رشتہ ہرگز قبول نہیں' میں کسی صورت بھی بلال سے شادی نہیں کروں گی۔" حلیمہ بے ساختہ بول پڑی۔

"دیکھتی ہوں تو کیسے نہیں کرے گی یہ شادی۔" یہ کہہ کر اماں جانے لگیں تو الماری میں پڑے تحفوں پر اماں کی نظر پڑگئی اور وہ مڑ کر بولیں۔ "اور یہ آج کل تجھے اتنے مہنگے مہنگے تحفے کون دیتا ہے؟" اس بات پر حلیمہ کچھ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"وہ۔ اماں.... کالج کی ایک دوست نے دیے ہیں مجھے.... بہت پیار کرتی ہے وہ مجھ سے۔" حلیمہ کی بات ختم ہوئی تو اماں طنزیہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"ہونہہ.... کسی نے صدقے کے نام پر دے دیا ہوں گے۔ اس دنیا میں کوئی کسی سے پیار نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر اماں باہر چلی گئیں اور حلیمہ کے دل پر جیسے

چھریاں چل گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

✿ ✿ ✿

اگلی صبح حلیمہ کالج گئی اور سر عبید کے آنے کا انتظار کرنے لگی اس نے ارادہ کر رکھا تھا کہ آج وہ سر عبید کو اپنے گھر رشتہ بھجوانے کا کہے گی۔ کتنی دیر وہ آفس کے پاس انتظار کرتی رہی مگر وہ نہیں آئے۔ پاس سے ایک ٹیچر گزر رہی تھیں' حلیمہ نے ان سے سر عبید کے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ وہ تو کب کے آچکے ہیں اور اردو ڈپارٹمنٹ کے اسٹاف روم میں بیٹھے ہیں۔

حلیمہ اسٹاف روم کے پاس پہنچی تو اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی حلیمہ وہیں رک گئی اس نے اندر جانا مناسب نہیں سمجھا اور وہیں کھڑی سر عبید کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

"تمہیں اس میں کالج نہیں آنا چاہیے تھا' آخر گرلز کالج میں تمہارا کیا کام تھا۔"

"ہاہاہا... تمہیں ڈر ہے کہ کوئی لڑکی مجھے پھنسا لے گی۔"

"لڑکی نے کیا پھنسانا ہے تم تو خود لڑکیاں پھنسانے والوں میں سے ہو۔"

"مطلب؟"

"مجھے پتا چل گیا ہے کہ تمہارا کالج کی ایک لڑکی کے ساتھ افیئر چل رہا ہے اور تم روز اسے مہنگے مہنگے گفٹس دیتے ہو۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"کس کی بات کر رہی ہو تم' وہ حلیمہ کی؟ او کم آن یار! وہ تو بچی ہے۔ اصل میں' میں نے کالج کی کچھ مستحق لڑکیوں کی لسٹ بنائی تھی جن میں حلیمہ سب سے زیادہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی' میں نے باقی طالبات کی بھی مالی مدد کی تھی مگر حلیمہ بہت حساس لڑکی ہے' اسے کسی سے مدد لینا پسند نہیں اس لیے اس کی مدد کے لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔"

"لیکن تمہیں ان لڑکیوں کی مدد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"دیکھو مہرالنساء! ہم ہر سال کسی نہ کسی غریب کی تو مدد کرتے ہیں نا' اگر ان لڑکیوں کا بھلا ہو جائے گا تو اس میں کیا برائی ہے؟ اور تم کیوں پریشان ہوتی ہو اگر میں نے تم سے منگنی کی ہے نا تو شادی بھی تم ہی سے کروں گا۔" اسٹاف روم سے سر عبید کی اور اس کی جو کہ ان کی منگیتر تھی کی باتوں کی آواز حلیمہ کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر حلیمہ جہاں ساکت کھڑی رہی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سر عبید تھے مگر پھر اسے اسی لمحے اپنی ماں کا جملہ یاد آیا۔

"کسی نے صدقے کے نام پر دیے ہوں گے' اس دنیا میں کوئی کسی سے پیار نہیں کرتا۔" حلیمہ کی آنکھوں سے ایک کے بعد ایک آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اور۔ میدان میں تنہا ایک جگہ پر بیٹھ کر بلک بلک کر رونے لگی اور اپنی زبان سے بار بار یہی جملہ دہراتی رہی۔

"ہم غریبوں کے حصے میں صرف صدقہ خیرات ہی آتا ہے۔"

✿ ✿ ✿

اگلے دن حلیمہ کالج آئی تو سر عبید آفس میں موجود نہیں تھے۔ حلیمہ نے ان کی میز پر ان کے دیے ہوئے سارے تحفے اور چیک بھی رکھ دیا۔ جس وقت سر عبید نے حلیمہ کو چیک دیا تو اس کے گھر میں پیسوں کی سخت ضرورت تھی مگر اس نے یہ چیک کسی خاص موقع پر سر عبید کو لوٹانے کے لیے رکھا تھا جیسے کہ ان کی سالگرہ مگر شاید وہ خاص وقت یہ تھا۔

حلیمہ چپکے سے وہ سارے تحفے میز پر رکھ کر وہاں سے چلی گئی۔ کالج کے بعد جب حلیمہ گھر گئی تو اس نے سب سے پہلے اپنی ماں سے یہ جملہ کہا۔

"اماں! مجھے بلال سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔"

✿

جس نے تیری آنکھوں میں شرارت نہیں دیکھی
وہ لاکھ کہے اس نے محبت نہیں دیکھی

اک روپ مرے خواب میں لہرا سا گیا تھا
پھر دل میں کوئی چیز سلامت نہیں دیکھی

آئینہ تجھے دیکھ کے گلنار ہوا تھا
شاید تیری آنکھوں نے وہ رنگت نہیں دیکھی

خیرات کیا وہ بھی جو موجود نہیں تھا
تُو نے تہی دستوں کی سخاوت نہیں دیکھی

صد شکر گزاری ہے قیامت تنِ تنہا
اس رات کسی نے مری حالت نہیں دیکھی

شاید اسی باعث وہ فروزاں ہے ابھی تک
سورج نے کبھی رات کی ظلمت نہیں دیکھی

شہزاد احمد

گمشدہ دوست چاندنی کے نام،

ایک لڑکی کلی جیسی
چاندی کے ورق جیسی، سونے کی ڈلی جیسی
اک لڑکی چنبیلی سی
معشوق وہ رنگوں کی، خوشبو کی سہیلی سی
اک لڑکی گلابوں سی
وہ برف کے موسم میں، ہنزہ کی شرابوں سی
وہ نام نزاکت کا
الھڑ سی جوانی پر، جوبن تھا قیامت کا
موسم کی ادا جیسی
سورج کی کرن جیسی
ریشم سے ملائم وہ، مخمل کے بدن جیسی
وہ دوست کتابوں کی
تھی دن کے اُجالوں میں، وہ رات ثوابوں کی
کیا جانیے بستی میں
اب چاندنی رہتی ہے، کس چاند کی بستی میں

منصور آفاق

اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا

تم ہی نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

کچھ ایسی دُھوپ تھی ان کے سروں پر
خدا جیسے غریبوں کا نہیں تھا

کھُلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

ہے امجد آج تک وہ شخص دل میں
کہ جو اس وقت بھی میرا نہیں تھا

امجد اسلام امجد

اپنی مرضی سے کہاں اپنے قدم کھینچتے ہیں
ہم کو دُنیا کی طرف رنج والم کھینچتے ہیں

خود سے اُکتائے ہوئے لوگوں کا اللہ وارث
جانے کیا بات ہے جن کے لیے دم کھینچتے ہیں

تیرا غم آنکھ کی پُتلی میں حفاظت سے رہے
بس یہی سوچ کے ہم گریے سے نم کھینچتے ہیں

کھینچتا رہتا ہے یہ ہجر ہمیں اپنی طرف
تھکنے لگتا ہے تو پھر ہجر کو ہم کھینچتے ہیں

نوکِ پاپوش پہ رکھی ہوئی دُنیا سُن لے
ہم نہیں جن کو ترے جاہ و حشم کھینچتے ہیں

میثم علی آغا

سوال

ریحان نے ایک دن اپنے والد سے پوچھا کہ ابا جان مجھے یہ بتایے کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟"

اس سوال سے والد صاحب بہت پریشان ہوئے۔ وہ حیران تھے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے۔ آخر انہوں نے ہمت کر کے دبے دبے الفاظ میں شہد کی مکھی اور پرندوں وغیرہ کی مثالیں دے کر اس کو بچے کی پیدائش کا راز سمجھانے کی کوشش کی۔

آخر میں انہوں نے لڑکے سے پوچھا "بیٹا! یہ بتاؤ تمہارے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا؟"

ریحان نے کہا۔ "ہماری کلاس میں آج ایک لڑکا داخل ہوا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں لاہور سے آیا ہوں' میں نے سوچا کہ آج میں بھی معلوم کروں گا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔"

وقت

میزبان نے مہمانوں سے کہا "وقت واقعی پر لگا کر اُڑتا ہے۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ آپ لوگوں کو یہاں بیٹھے پورے دو گھنٹے ستائیس منٹ ہو چکے ہیں۔"

فرق

"کیا اس پاگل خانے میں مردوں اور عورتوں کو علیحدہ رکھا جاتا ہے۔"

"جی ہاں! یہاں کے مرد اتنے بھی پاگل نہیں ہیں جتنا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔"

خبر

رشید مرزا بیمار تھے لیکن اتنی خراب حالت نہیں تھی کہ انتقال کر جائیں۔ بیماری کے باعث وہ ایک ہفتے تک آفس نہ جا سکے۔ یار لوگوں نے مشہور کر دیا کہ وہ دنیا سے گزر گئے۔ مزے کی بات یہ کہ ایک مقامی روزنامے نے یہ خبر شائع بھی کر دی۔ رشید مرزا یہ خبر پڑھ کر ہنس دیے۔ ہنستے ہوئے انہوں نے فون اٹھایا اور اپنے دوست کا نمبر ڈائل کیا۔

"یار عزیز! کیسے مزے کی بات ہے۔ آج کے اخبار کے آخری صفحے پر میری موت کی خبر چھپی ہے' تم نے پڑھی ہے وہ خبر؟" دوسری طرف سے گھبرایا ہوا جواب آیا۔

"یہ المناک خبر تو میں نے صبح سویرے ہی پڑھ لی تھی مگر یہ بتاؤ تم جنت سے بول رہے ہو یا دوزخ سے؟"

مفت مشورہ

ایک موٹی عورت نے تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر بے تابی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ ٹھیک ٹھیک بتائیں' میرے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

کمرے میں موجود صاحب نے اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور تحمل سے بولے۔

"سب سے پہلے تو آپ کو پچاس' ساٹھ پونڈ وزن کم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ میک اپ نہ کریں تو زیادہ خوب صورت لگیں گی اور دوسری بات کہ میں ڈاکٹر نہیں آرٹسٹ ہوں' ڈاکٹر کا کمرہ اوپر ہے۔"

اعتراف

جنرل میک آرتھر جب کیڈٹ تھے تو انہیں آئن اسٹائن کی تھیوری یاد کرنے کے لیے کہا گیا۔ تھیوری

بے حد مشکل تھی۔ میک آرتھر نے اسے لفظ بہ لفظ رٹ لیا۔ جب کرنل فیبو جر نے ان سے اسی تھیوری کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے پوری تھیوری لفظ بہ لفظ سنا دی۔

کرنل فیبو جر نے آنکھیں مچکا کر پوچھا۔

"کیا تم نے یہ تھیوری اچھی طرح سمجھ لی ہے؟"

میک آرتھر کے لیے یہ بڑا نازک لمحہ تھا مگر انہوں نے فوراً" جواب دیا۔

"جی نہیں۔"

پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کرنل فیبو جر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خود میری سمجھ میں بھی یہ تھیوری نہیں آئی تھی۔"

گمشدہ

ایک خاتون اپنے گمشدہ شوہر کی رپورٹ درج کروانے پولیس اسٹیشن گئی۔

انسپکٹر! اس کا قد کتنا ہے؟

خاتون! "میں نے کبھی غور نہیں کیا۔"

انسپکٹر! موٹا ہے یا دبلا؟

خاتون! "قدرے صحت مند کہہ سکتے ہیں۔"

انسپکٹر! آنکھوں کا رنگ کیسا ہے؟

خاتون! "شاید کالا یا براؤن۔"

انسپکٹر! بالوں کا رنگ کیسا ہے؟

خاتون! "میرے خیال میں کالا ہے۔"

انسپکٹر! اس نے کیا پہن رکھا ہے؟

خاتون! "مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔"

انسپکٹر! کیا کوئی اس کے ساتھ ہے؟

خاتون! "ہاں ہاں میرا عزیز کتا رومیو۔ وہ سنہری زنجیر سے بندھا ہے۔ اس کا قد تیس انچ ہے، صحت مند ہے۔ نیلی آنکھیں اور بھورے مائل کالے بال ہیں۔ اس کے الٹے پاؤں کا ناخن تھوڑا ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ بھونکتا بھی نہیں ہے۔ اس کی گردن میں زنجیر بیلٹ ہے جس میں نیلی گھنٹی بندھی ہے۔ وہ گوشت خور ہے۔ ہم کھانا ساتھ کھاتے ہیں۔ چہل قدمی ساتھ کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر خاتون نے رونا شروع کر دیا۔

انسپکٹر گھبرا کر بولا "آپ روئیں نہیں۔ پہلے ہم کتے کو ڈھونڈنے چلتے ہیں۔"

معقول وجہ

علاقے میں نئے کھلنے والے ایک بڑے اور فیشن ایبل ڈپارٹمنٹل اسٹور میں ہر سیلز مین کو ہدایت کی گئی تھی کہ گاہک اگر کوئی بھی چیز خریدے بغیر چلا جائے تو ایک مخصوص رجسٹر میں اس کی وجہ ضرور درج کی جائے۔

ایک خاتون نے ملبوسات کے شعبے میں صرف سیاہ رنگ کے بیسیوں لباس دیکھے لیکن کوئی بھی نہ خریدا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد سیلز مین کی سمجھ میں نہ آیا کہ خاتون کے کوئی بھی لباس نہ خریدنے کی وجہ کیا لکھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد آخر کار اس نے رجسٹر میں نوٹ لکھا۔ "خاتون نے بہت سارے سیاہ لباس دیکھے، مگر ایک بھی نہیں خریدا۔ وجہ غالباً" یہی ہے کہ ابھی اس کے شوہر کا انتقال نہیں ہوا۔"

(محسنہ سیف..... لطیف آباد)

پیسہ

لوگوں کا سرمایہ ہضم کر کے بھاگ جانے والی ایک انویسٹمنٹ کمپنی کا مالک جب پکڑا گیا تو اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج صاحب نے اس کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی؟ جن لوگوں نے تم پر اعتماد کیا، تم ان کا ہی پیسہ لے کر بھاگ گئے۔"

کمپنی کے مالک نے معصومیت سے جواب دیا۔

"جناب! آپ خود سوچیں جو لوگ آپ پر اعتماد نہیں کرتے، ان کا پیسہ آپ کیسے لے کر بھاگ سکتے ہیں؟"

(صائمہ امین..... کراچی)

شگفتہ جاہ

آپ سے کچھ کہنا ہے / یادوں کے جھروکے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میری اُمت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی۔ اس سے آگے بڑھنے والے کم ہوں گے۔"
(ترمذی)

فوائد و مسائل،

1۔ گزشتہ امتوں میں لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں اس امت کے افراد کی عمریں بہت مختصر ہیں اس لیے اس مختصر مہلت میں نیکی کا کام کرنے کی کوشش زیادہ کرنی چاہیے۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں چھوڑا جس کی موت کو اتنا مؤخر کر دیا کہ وہ ساٹھ سال کو پہنچ گیا۔
(بخاری)

3۔ جب انسان ساٹھ سال کے قریب پہنچ جائے تو اسے آخرت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ شاید ساٹھ سال سے آگے وہ نہ بڑھ سکے اور ساٹھ سال کے بعد تو یوں سمجھے کہ مجھے رعایتی مدت مل رہی ہے۔ اس کے بعد غفلت اور فسق و فجور نہایت خطرناک ہے۔

توفیق،

حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک دن اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔
"یارِ الٰہا! میری اولاد میں سے ہر فرد تمام رات نماز پڑھتا ہے اور ہر ایک دن میں روزہ رکھتا ہے۔"
تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ اس کی توفیق میں نے ان کو دی ہے تب وہ ایسا کرتے ہیں۔
اب میں ایک لحظہ کے لیے تجھ کو تیری رائے پر چھوڑ دیتا ہوں۔"
چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے ایسی خطا سرزد ہو گئی کہ انہوں نے تمام عمر حسرت و پشیمانی میں بسر کی۔

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا،

دینی بھائی کی دوستی تین چیزوں سے مضبوط ہوتی ہے۔

1۔ اسے اچھے نام سے پکارے۔
2۔ پہلے خود اسے سلام کرے۔
3۔ پہلے اسے بٹھائے اور پیٹھ پیچھے اس کی تعریف کرے جس سے وہ خوش ہو اور اس کے بیوی بچوں کی بھی تعریف کرے۔

صدف عمران۔ کراچی

حضرت علیؓ نے فرمایا،

جب دُنیا تمہارے سامنے (پاس آئے) تو خرچ کرو کیونکہ وہ تم کو ہی پہنچے گی اور جب وہ تم سے مُنہ موڑے تب بھی خرچ کرو کہ آخر وہ رہنے والی نہیں ہے۔"

بددُعا،

حضرت ابوالدرداؓ کو کسی شخص نے تکلیف پہنچائی تو آپ نے کہا۔
"بارِ الٰہا! اس شخص کو تندرستی، عمر دراز اور مال کثیر عطا فرما۔"
اس طرح حضرت ابوالدرداؓ نے اس شخص کو بددعا دی کیونکہ جب یہ چیزیں کسی کو ملتی ہیں تو اس کو بھٹو، غفلت میں ڈال کر غافل کر دیتی ہیں اور وہ ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔

عالم کی احتیاط،

حضرت وہب بن منبہ اور حضرت طاؤسؒ دونوں بزرگ حجاج بن یوسف کے بھائی کے پاس تشریف لے جاتے۔ حضرت طاؤس اسے نصیحت کرتے۔ ایک روز صبح کو سخت سردی تھی۔ حجاج کے بھائی نے حکم دیا کہ چادر ان کے کندھے پر ڈال دی جائے۔ حضرت طاؤس اس وقت مصروف گفتگو تھے۔ آپ نے کندھوں کو جنبش دی۔ یہاں تک کہ چادر آپ کے کندھوں سے گر پڑی۔ حجاج کا بھائی یہ دیکھ کر غصے ہوا۔ جب آپ

اس کے دربار سے باہر تشریف لائے تو حضرت وہبؒ نے حضرت طاؤسؒ سے فرمایا۔

"اگر آپ وہ چادر لے لیتے اور کسی درویش محتاج کو دے دیتے تو یہ اس سے بہتر تھا۔ جو آپ نے اسے ناراض کر دیا۔"

آپ نے فرمایا: "مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر میں لے لیتا تو کوئی دوسرا بھی میری پیروی شروع کر دے اور حاکموں سے مال لینا شروع کر دے اور اسے یہ علم نہ ہو کہ میں نے تو اس سے لے کر درویش محتاج کو دی ہے۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

سنہری باتیں،

- جس کو احساس نہ جگائے اُس کو کون جگا سکتا ہے۔
- دُعا ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے۔
- اگر عذاب آنے والا ہو اور آیا نہ ہو تو یہی وقت دُعا ہے۔
- چاند کو نمایاں ہونے کے لیے تاریکی درکار ہے۔
- اندیشہ امید سے نلتا ہے۔ امید رحمت پر ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔
- عمل بہانہ ہے، مقدر اٹل ہے، عقل اور نصیب نہ ہوں تو عمل جہالت ہے۔
- خود شناسی نہ ہو تو خدا شناسی کا عمل ممکن ہی نہیں۔
- رحم اس فضل کو کہتے ہیں جو انسانوں پر اُن کی خامیوں کے باوجود کیا جائے۔

فضل گمن۔ گلستان جوہر

عمل،

علم کے لیے عمل ایندھن کا کام دیتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ علم کا الاؤ روشن رہے تو آپ اس میں عمل کا ایندھن ڈالتے رہیں، ایسا نہ ہوا تو اس کی روشنی ماند پڑ جائے گی۔ (اشفاق احمد)

نادیہ، نجمہ۔ کراچی

صدقہ،

روایت کے مطابق ایک بار بنی اسرائیل میں سخت قحط پڑا۔ اس زمانے میں ایک عورت کے پاس کھانے کا ایک لقمہ موجود تھا۔ اس نے اسے کھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک فقیر نے سوال کیا۔

"مجھے کھانے کے لیے کچھ دے دو۔"

عورت نے وہ لقمہ اسے دے دیا اور اپنے چھوٹے بچے کو لے کر جنگل میں لکڑیاں کاٹنے چلی گئی۔

بچے کو ایک جگہ بٹھا کر لکڑیاں کاٹنے میں مشغول تھی کہ بھیڑیا اس کے بچے کو اٹھا کر لے بھاگا۔ عورت خود بھاگتی پیچھے بھاگی۔ اللہ نے جبرائیلؑ کو بھیجا۔ انہوں نے بھیڑیے کے منہ سے بچے کو چھڑا کر عورت کے حوالے کیا اور کہا۔

"تو نے اپنا لقمہ اللہ کی راہ میں دیا تھا۔ اس کے بدلے میں اس نے بھیڑیے کے منہ کا لقمہ لے کر تجھے تیرا بچہ دلا دیا۔"

آمنہ محمد نوید۔ پیچو کی ملیاں

خاموشی،

مت پوچھیں کہ ہمیں کسی بابا کا پتا بتائیں۔ آپ خود بابا ہیں۔ جب آپ کو دیوار سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھنا آ گیا اور دُنیا کی سب سے بڑی عبادت یعنی خاموشی میں داخل ہو گئے تو آپ کے اوپر انوار و برکات کی بارش ہونے لگے گی اور انواع و اقسام کا رزق آپ کا مقدر بنتا چلا جائے گا۔

(اشفاق احمد)

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

حقیقت،

کسی نے مٹکے سے پوچھا: تم اتنے ٹھنڈے کیوں

رہتے ہو؟"
ملکہ نے مسکرا کر جواب دیا "جس کا ماضی، حال اور مستقبل سب مٹی سے بنا ہو تو تکبر اور گری کس بات کی؟"

مدیحہ فہید۔ مدینہ کالونی

ایک دروازہ

ایک بادشاہ کو خبر ملی کہ اس کے شہر میں ایک بہت نیک بزرگ آئے ہیں۔ بادشاہ نے ان سے ملنے کی کوشش کی لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شہر کے کئی دروازے تھے۔ بادشاہ کبھی کسی دروازے کے پاس تو کبھی کسی دروازے کے پاس ان بزرگ کا انتظار کرتا۔ لیکن دوسرے دن پتا چلتا کہ وہ تو کسی اور دروازے سے چلے گئے۔ آخر کار بادشاہ نے سارے دروازے بند کروا دیے اور ایک دروازہ کھلا رکھ کر وہاں ان کا انتظار کرنے لگا۔

جب ایک ہی دروازہ کھلا رہ گیا تو بزرگ کا وہیں سے گزر ہوا۔ جب بادشاہ کی ان سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے کہا۔

"اب جا کے آپ سے ملاقات ہوئی ہے جب میں نے شہر کے سارے دروازے بند کروا دیے۔"

بزرگ نے جواب دیا "انسان کو رب کی راہ بھی اس وقت نصیب ہوتی ہے، جب وہ سارے دروازے بند کر کے صرف ایک دل کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔"

حورین زینب۔ کہروڑ پکا

قناعت پسند

اگر انسان قناعت پسند ہو تو وہ مٹی کے ٹب میں بھی خوش رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ حریص ہو جائے تو پوری کائنات بھی اس کے لیے چھوٹی ہے۔"

(زیرو پوائنٹ۔ جاوید چوہدری)

زوباریہ خالد۔ لاہور

اقوال دانش

٭ پیٹو اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودتا ہے۔

(فرانسیسی کہاوت)

٭ مرض کا باپ کوئی بھی ہو، خراب غذا اس کی ماں ضرور ہوتی ہے۔

(جارج ہربرٹ)

٭ تلوار سے اتنے آدمی نہیں مارے جاتے جتنے بسیار خوری سے مارے جاتے ہیں۔

(ابن سینا)

٭ تم جہاں چاہو زمین کھود لو، خزانہ تمہیں مل جائے گا شرط صرف یہ ہے کہ زمین کامیابی کے یقین کے ساتھ کھودو۔

(خلیل جبران)

٭ جو شخص دوا کھاتا ہے لیکن غذا کا خیال نہیں رکھتا، وہ اپنے معالج کی قابلیت خاک میں ملاتا ہے۔

(کہاوت)

٭ فطرت، وقت اور مستقل مزاجی تین بڑے طبیب ہیں۔

٭ مصروفیت انسان کو قابل بنا دیتی ہے "کاہلی بزدلوں کا پیشہ ہے" اس سے بچیے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

مصائب پر صبر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں عرض کیا۔

"تیری بارگاہ میں میرا کون سا فعل پسندیدہ ہے تاکہ اسے میں زیادہ کروں اور بار بار کروں۔"

حکم ہوا "یہ فعل ہمیں پسند آیا ہے کہ زمانہ طفلی میں جب تمہاری ماں تم کو مارا کرتی تھی تو تم مار کھا کر بھی اسی کی طرف دوڑتے تھے اور اس کی جھولی میں گھستے تھے۔"

پس طالب خدا کو بھی یہی لازم ہے کہ گو کیسی بھی سختی ہو، کیسی بھی ذلت اور خواری پیش آئے، ہر حال میں خدا کی طرف متوجہ رہے اور اس کے فضل کا طلب گار رہے۔

(اشفاق احمد کے بابا صاحبا سے اقتباس)

نوال افضل گھمن۔ کراچی

طیبہ سعدیہ عطاریہ ____ کھٹیالہ
ممکن نہیں ہستی سے دبے پاؤں گزرنا
ہر موڑ پہ کچھ جاننے والے ہیں صبا کے

عروسہ شہوار رفیع ____ کالا گوجرہ جہلم
کتنے سادہ، کتنے رنگین، کتنے پیارے لگتے ہیں
روٹھے روٹھے، برہم برہم، بے گانے بے گانے لوگ

نیلم شہزادی ____ کوٹ مومن
جدائیوں کے زخم، دردِ زندگی نے بھر دیے
اسے بھی نیند آ گئی، مجھے بھی صبر آ گیا

انا احب، دعائے سحر ____ فیصل آباد
تجھے بھی آ گئے تازہ بہانے
میرا بھی جی بہلتا جا رہا ہے

ملالہ اسلم ____ خانیوال
رنج سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

آسیہ فرید ____ ملتان
آیا ہی تھا ابھی میرے لب پہ وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اٹھا لیے

کائنات اصغر بوزدار ____ ڈہرکی
تم یوں ہی ناراض ہوئے ورنہ مے خانے کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

حافظہ سمیرا ____ 113۔ این، بی
یوں کسی بھولی ہوئی یاد کی تصویر نہ بن
تیری صورت میرے زخموں کا پتا دیتی ہے

آمنہ میاں نوید ____ پھپھوکی ملیاں
بول اے شام سفر رنگ رہائی کیا ہے
دل کو رکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے
وہ تیرے حسن کا جادو ہو کہ میرا غم دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اتر جانا ہے

ایشا خالد خانزادہ ____ ٹنڈو اللہ یار
کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

سلمیٰ زبیر ____ لاہور
نہ جانے قافلۂ اہل دل پہ کیا گزری
یہ اضطراب کبھی نالۂ جرس میں نہ تھا

نبیلہ امجد شاہ ____ رشکئی نوشہرہ
غیر کو برا کہہ دوں، عیب تو نہیں ایسا
آپ ہی سے شکوہ ہے آپ ہی کے بارے میں
بے وفا کہا مجھ کو آپ نے بجا لیکن
اس طرح نہیں کہتے، ہر کسی کے بارے میں

ماہ زیب ____ چونیاں
شکوہ شکایت کیا دنیا سے دنیا پیارے دنیا ہے
دکھ تو فقط اس بات کا ہے الزام تراشے تو نے بھی

سیدہ بشریٰ ایمان ہمدانی ____ بھکر
ہم بڑے ناز سے آئے تھے تیری محفل میں
کیا خبر تھی لب اظہار پہ تالے ہوں گے

رامنیہ کنول ____ دائرہ دین پناہ
کوئی سوال جو پوچھے تو کیا کہوں اس سے
بچھڑنے والے! سبب تو بتا جدائی کا

شہنیلا اسلام ____ قائم پور
پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں، ان مکینوں میں
وہ محبت نہیں رہی جالب
ہم صفیروں میں، ہم نشینوں میں

امبر گل ____ بھڈو
نگاہ ناز بھی کیا چیز ہے خدا جانے
نظر کے ساتھ زمانے بدلتے جاتے ہیں

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔
شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

پہلا خط مدوکے سے ریحانہ چوہدری کا ہے، لکھتی ہیں

سال رواں کو ریگ رواں سے تشبیہ، بہت خوب صورت لگی۔ سرورق پہ نیلم منیر بہت خوب صورت لگی، لگتا ہے کہ آپ کی فیورٹ ایکٹر ہے۔ "تاریخ کے جھروکے" پڑھا۔ واقعات بہت دیرپا اثر مرتب کرنے میں کامیاب رہے۔ مصباح نوشین کا مکمل ناول میرے ہاتھ پہ کوئی چاند رکھ۔ بہت خوب صورت عنوان کے ساتھ ایک خوب صورت اور تاثر سے بھرپور کہانی "شہر خطا" میں نایاب جیلانی ماضی حال میں اکٹھے سفر کررہی ہیں۔ دیا کا کردار؟ کیا کوئی اتنا ظالم اور حاسد بھی ہوسکتا ہے۔ یہ قسط پڑھ کے تو دل مکدر ہوگیا۔ شکر ہے کہ رقص بسمل کی بھی کچھ جھلک ملی۔ صائمہ اقبال کا افسانہ بہت ہی بہترین تھا۔ "معافی" اس نے بہت متاثر کیا، مگر وہ کیا ہے۔ منیر نیازی کے الفاظ میں "ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں" کے مصداق سہیل احمد نے دیر کردی۔ عفت سحر "خواب شیشے کا" اپنی بہترین تحریر پہ اپنی گرفت کو بہت مضبوط رکھا ہوا ہے۔ میرے خیال کا پیکر کرن نعمان کا بہت خوب صورت ناول تھا۔ کاشان کی اپنے باپ سے محبت اور اس محبت کے لیے اس کی قربانی اچھی لگی۔ مہناز یوسف کا افسانہ داستان الم ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ طنزیہ تحریر اچھی تھی۔ نادیہ حسین سے ملاقات اچھی رہی۔ دستک میں تینوں فن کار ہمارے پسندیدہ تھے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں تعریف کے لیے الفاظ نہیں، حاجرہ ریحان کے افسانے ہمیشہ بہت اچھے، معاشرتی الجھنوں کو بہت خوش اسلوبی سے انداز نگارش بخشتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک بات تو بتائیں۔ کیا شعاع میں صرف مشہور و معروف شعرا کا کلام ہی شائع ہوسکتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک صفحہ نئی شعرا بہنوں کے نام بھی رکھ چھوڑیے۔ نوال افضل گمن کی نوحہ گری عمر سعید کے نام متاثر کن اور دلوں کو گداز بخشتی ہوئی تھی۔

ج: پیاری ریحانہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہوسکے اور آپ پر جو گزری اس کیفیت کا بھی بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ آپ سے بس یہ ہی درخواست کریں گے کہ آپ بھی ہماری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ صفحات محدود ہوتے ہیں اور خط بے شمار۔ اگرچہ ہم خطوط کو ایڈٹ کرکے شائع کرتے ہیں، پھر بھی بہت سے خطوط شامل نہیں ہوپاتے ہیں۔ نظموں، غزلوں کے لیے دو صفحات ہوتے ہیں۔ ایک صفحہ پر کہنہ مشق شعرا کی اور ایک صفحے پر جدید شعرا کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی، سے لکھتی ہیں

اس بار ناولز کچھ خاص متاثر نہ کرسکے۔ "تیرے خیال کا پیکر" اچھی اسٹوری تھی۔ ایمل کا خود پرپوز کرنا کچھ خاص پسند نہیں آیا، جہاں زیب کو کاشان سے پہلے ایمل سے ڈسکس کرنا چاہیے تھا۔ پہلے ایمل کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ "جھانکنا مت" بہت زیادہ انجوائے کیا اس ناول کو، ہر سین نے ہنسنے پر مجبور کردیا۔ ڈائیلاگز بہت زیادہ

انٹرسٹنگ تھے۔ "ہاتھ میں کوئی چاند رکھ" یہ ناول بہت زیادہ اچھا جارہا تھا' جب تک باصد کی فیلنگز نشال کے لیے چینج نہیں ہوئی تھیں' لیکن اس کے بعد اس ناول کا پورا چارم ہی ختم ہوگیا۔ رباح کتنی مخلص تھی دونوں کے لیے' لیکن باصد کا التفات ایک آنکھ نہیں بھایا۔ باصد مجھے زہر لگ رہا تھا' رباح کو اسے کک آؤٹ کرنا چاہیے تھا۔ "شہر خطا" آؤٹ اسٹینڈنگ قسط تھی۔ نایاب جیلانی کا طرز تحریر اس بار بہت منفرد ہے۔ افسانوں میں "داستان الم" سپر ڈوپر تھا۔ مزاح سے بھرپور "دو ٹکڑے" متاثر کن تحریر تھی۔ لاسٹ لائن نے تو دل ہی دہلا دیا۔ "جب دیگ ہی دو ٹکڑے ہوگیا تو بیٹے کے دو ٹکڑے لے کر کیا کروں گا۔"

"برتن" نے تو دل ہی جیت لیا' بہت زیادہ پسند آیا۔ "معافی" بے حسی اور خود غرض رشتوں پر مبنی اسٹوری دل جلا گئی۔

ج۔ پیاری مسرت! پچھلے کسی شمارے میں آپ سے کہا تو تھا کہ آپ ہماری مستقل خط لکھنے والی قاری ہیں' اس لیے اگر کسی ماہ آپ کا خط شائع نہ ہو تو دل چھوٹا نہ کریں۔ مگر لگتا ہے آپ نے ہماری بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی ہے۔ تب ہی تو آپ کو اتنا افسوس ہوا۔

فائزہ بھٹی نے پتوکی سے لکھا ہے

ایک بار پھر نیلم منیر سرورق پر براجمان "گاؤن وہی پرانا" کتنی بار کا پہنا ہوا۔ فہرست پر ایک بھرپور نظر دوڑائی۔ (یقین جانیے فہرست والی لڑکی سرورق والی سے زیادہ پرکشش لگ رہی ہے۔) پہلی نظر سے ہوتے ہوئے حمد و نعت اور پھر "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں" پڑھ کے۔ صائمہ اکرم کا ناول "شہرزاد" خوش خبری' خواب شیشے کا" یہ نمیر آفندی تو بڑی شے ہے۔ "رقص بسمل" اچھا رقص چل رہا ہے۔ مگر اینڈنگ کا کوئی پتا نہیں۔ "شہر خطا" نایاب جیلانی ایک بار پھر قارئین کو متاثر کرنے کی بھرپور کوشش میں مصروف عمل۔ رات کے اندھیرے میں' سردی کی راتوں کا پُراسرار اندھیرا "جھانکتا مت" مصباح علی کا پچھلا اتنا اچھا ناول پڑھنے کے بعد ان سے اس طرح کے ناول کی امید نہ تھی۔ اسی وجہ سے کوئی مزا نہیں آیا۔ اس کے بعد مصباح نوشین کا "ہاتھ پر کوئی چاند رکھ" پڑھنا شروع کیا۔ نشال کا فیصلہ اچھا تھا۔ باصد اور رباح بھی اچھے کردار ثابت ہوئے۔ "تیرے خیال کا پیکر" کرن نعمان نئی ہیں کیا؟

ج۔ پیاری فائزہ! آپ کا خط شامل نہ ہوسکا۔ معذرت' تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

شازیہ قیصر گاؤں نروال شریف سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے فیض یاب ہوئے۔ پھر جناب دوڑے "شہر خطا" کی طرف' اس دفعہ تو اسے پڑھ کر بہت خوف آیا۔ کوئی انسان حسد میں اتنا پستیوں میں بھی گر سکتا ہے۔ دیا کے بارے میں پڑھ کر میں عجیب سے احساسات کا شکار ہوگئی۔ "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر تو میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ویسے مہواہ کیا اتنی خوب صورت ہے کہ تین مرد اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ "تاریخ کے جھروکے" تو ہر دفعہ کی طرح سو پر سے بھی اوپر اور معلومات میں اضافہ بھی۔ نادیہ حسین کو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مصباح علی کا "جھانکنا مت" پڑھ کے ہی لگا کہ کہانی مزاحیہ ہی ہوگی۔ ویل ڈن مصباح جی! ایک اچھا افسانہ "میرے خیال کا پیکر" کہانی تو اچھی تھی' لیکن بلاوجہ طوالت کا شکار نظر آئی۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" ہے میں کوثر آپی کے رشتے داروں کے متعلق بھی پتا چل گیا۔

ج پیاری شازیہ! شعاع کی محفل میں شرکت کے لیے شکریہ۔

خوب صورت ہونا اہم نہیں ہوتا۔ خوب صورت لگنا بڑی بات ہوتی ہے۔ اب مہواہ سب کو اچھی لگ رہی ہے' تو ہم اور آپ کیا کرسکتے ہیں۔

اطیبہ کنول مظفر آباد سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ذرا یہ تو بتائیں یہ مصباح علی آپ کے ہاتھ کہاں سے لگ گئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا' ان کے کتنے روپ ہیں۔ "جھانکنا مت" بہت ہی جم کر لکھا۔ بلکہ کل جب میں نے جھانکا تو یقین مانیں' میں ہنستے ہنستے ہی سو گئی۔ دوا بھی لینی نہیں پڑی۔ مکمل ناول دونوں ہی اچھے لگے۔ موضوع کے اعتبار سے مزا آگیا۔ عفت آپی کا "خواب شیشے کا" کہانی اگرچہ پرانی ہے' مگر تجسس سے بھرپور' شروع میں ہیرو کچھ اور بعد میں تو کچھ اور ہی نکل آیا۔ "رقص بسمل" بھی ٹھیک

ہی رہا۔ افسانے سارے دلچسپ تھے۔ "برتن" ذرا زیادہ پسند آیا کیونکہ ان کا کھڑاک بہت ہوتا ہے۔ سب خواتین کا مشترکہ مسئلہ دھونے کا اف! آپی میں نے "دست کوزہ گر" کا منی آرڈر مکتبہ عمران والے پتا پر دو دن پہلے ارسال کیا ہے کتاب کب تک مل جائے گی۔

ج ۔ پیاری اطیبہ! یاد آوری کا شکریہ! مصباح علی کا کوئی مجموعہ ابھی نہیں آیا ہے، ہلکی پھلکی مزاحیہ کہانیاں ہمیں بھی بے حد پسند ہیں۔ اس ماہ مصباح کا ناول پڑھیں، آپ کو مزا آئے گا۔ امتل کو ہم نے آپ کی دعوت پہنچا دی ہے۔ ان کی جانب سے شکریہ قبول کریں۔ کبھی کشمیر سائڈ پر آنا ہوا تو وہ آپ سے ملاقات ضرور کریں گی۔ آئندہ خط میں آپ اپنا فون نمبر لکھ بھیجئے گا۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

بے حد افسوس کہ دسمبر کے شعاع میں آپ ہمیں پھر بھول گئیں۔ بادشاہ لوگ ہیں جیسے آپ کی مرضی۔ کرن نعمان کا طویل ناول "میرے خیال کا پیکر" نہایت دلکش تھا۔ اسٹوری عمدہ تھی۔ کیا یہ ان کا پہلا ناول ہے ضرور بتائیے۔ "میرے ہاتھ پہ کوئی چاند رکھ" مصباح نوشین نے تو کمال کا ناول لکھا ہے۔ شروع سے اینڈ تک دلچسپی برقرار رہی۔ ناول کا اینڈ نہایت شان دار رہا انہیں مبارک ہو۔ "شہر خطا" میں نایاب جیلانی پرت پرت کھل رہی ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس میں دل لگ رہا ہے بلکہ اسٹوری بھی سمجھ میں آرہی ہے۔ مصباح علی کا "جھانکتا مت" دلچسپ نہایت مزے دار ٹینشن فری کہانی تھی اور مہناز یوسف کی "داستان الم" نے تو گویا میلہ لوٹ لیا۔ صائمہ اقبال کی "معافی" دل دکھا گئی۔ زبردست اور اچھی کہانی تھی۔ "نظر بٹو" بالکل اچھا افسانہ نہیں تھا۔

ج ۔ پیاری تسنیم! بادشاہ لوگ اور ہم؟؟ اللہ اللہ.... اگر ایک دفعہ خط شامل نہ ہوا تو آپ تو نا.... آپ کو پتا ہے جو جتنا بڑا ہو گا اس سے حساب بھی اتنا ہی بڑا لیا جائے گا۔ ہم تو بھئی چھوٹے ہی ٹھیک ہیں۔

حیدر آباد سے عائشہ انصاری لکھتی ہیں

دسمبر کے شعاع میں نعیمہ ناز کو دیکھ کر خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تحریر لاجواب تھی۔ "برتن" ٹھیک ہی تھی۔ "نظر بٹو" بہت ہی عمدہ کاجرہ جی! "معافی" صائمہ کی ایک کامیاب کوشش اینڈ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ "داستان الم" نے مسکرانے پر مجبور جبکہ "جھانکتا مت" نے کھلکھلانے کی اجازت دے دی۔ خصوصاً اس جملے نے تو "میرا تم سے وعدہ ہے "مگر تم بھی اپنے سوکھے چھوہارے جیسے بدن میں چپکے پاپڑ جیسے دل کی قسم کھاؤ۔" چھت پھاڑنے پر مجبور کردیا۔ "میرے ہاتھ پہ کوئی چاند رکھ" بالکل پسند نہیں آئی۔ "معذرت" "شہر خطا" کہانی کا کانسیپٹ لاجواب اور انوکھا سا ہے۔ جس میں کرداروں کے نام مشکل ہی سہی پر ان سے جڑی کہانی ڈھیروں تجسس سے دوچار کررہی ہے۔ اس ماہ کی قسط نے تو رونگٹے کھڑے کردیے۔

ج ۔ بہت شکریہ عائشہ! آپ نے خط لکھا۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

نایاب چند اما چھی گوٹ صادق آباد سے لکھتی ہیں

ہم پانچ بہنیں ہیں اور پانچوں ہی ڈائجسٹ پڑھتی ہیں، میری فیورٹ کہانی مکمل اور "شہر خطا" ہے۔ "شہر خطا" اس لیے کیونکہ نایاب جیلانی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ اس بار "جو تجھ سے ناتا جوڑا" میں گ، ڈ، پ تھیں مجھے ان کی بات بالکل پسند نہیں آئی کہ میرے سسرال والے مجھے دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔

ج ۔ نایاب! آپ کے خیالات گ، ڈ، پ تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثمینہ کوثر نے سرگودھا سے لکھا ہے

"رقص بسمل" تو اب تقریباً سمٹ چکا ہے۔ ایک دو اقساط ہی رہ گئی ہوں گی۔ نبیلہ کے لیے دعائیہ پیغام۔ اللہ ان کے حالات بہتر کرے۔ عفت سحر اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز سے جلوہ افروز ہیں۔ یہ قسط بھی اچھی رہی۔ مکمل ناول دونوں ہی آپ ہم سے بہتر جانتی ہیں کہ کیسے تھے؟ بہرحال میں رائٹرز کا دل نہیں توڑتی۔ مصباح نوشین کا "ہاتھ پر کوئی چاند رکھ" شروع میں تو بس ٹھیک تھا۔ مگر اینڈ بہت اچھا کیا۔ "دوستی کا جب کوئی مان بچالے" تو بہت اچھا لگا۔ کیونکہ نشال کا کردار بہت اچھا بنایا تھا شروع سے۔ دھوکا دہی اس کردار پر کبھی نہ جچتی۔ کہانی اپنا رنگ کھودیتی۔ شاباش.... "شہر خطا" نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناولٹ اچھا جارہا ہے۔ اس قسط میں انادیہ کا ماضی خاصا واضح ہوا۔ اب

اس کا حالیہ ردعمل زیادہ کھل نہیں رہا—— تو "جھانکنا مت" تو مصباح علی صاحبہ! بھئی مان گئے آپ کو، پڑھ کر ایسا لگا کہ "حاصل کشت و خوں" کے حساب اگلے ماہ ہی مچکتا کردیا۔ جتنا اس نے سحرزدہ کیا' اس نے اتنا ہی ہنسا ہنسا کر پیٹ میں درد کردیا۔ کیا چیز ہیں بھئی آپ؟ "اڑتی چڑیا" "میل ہے یا فی میل۔" اس جملے پر اتنی ہنسی آئی کہ سامنے بیٹھی میری امی خواہ مخواہ ہنسنے لگیں۔ کیونکہ انہوں نے ابھی تک افسانہ نہیں پڑھا تھا۔ وہ بھی پوری دل جمعی سے رسالے پڑھتی ہیں' شکریہ۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ خاص کر نمبرون رہا نعیمہ ناز کا "دو ٹکڑے' برتن" غزالہ روشن آپی! ہم خود بھی برتن دھونے کے اتنے ہی چور ہیں جتنی آپ کی "ہیروئن سمرین۔" بس جی کیا کریں' نادیہ حسین' ثروت گیلانی سے انٹرویو اچھے تھے۔

ج - پیاری ثمینہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ مکمل ناول اس بار آپ کو متاثر نہ کرسکے۔ ہم مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ مصباح علی کا مکمل ناول اس بار بھی شامل ہے۔ وہ واقعی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اپنی امی کو ہمارا سلام پہنچادیں۔

عمل نے ٹنڈو آدم سے لکھا ہے

"خواب شیشے کا" کہانی بنا کسی سسپنس کے اچھی جارہی ہے۔ مہاہ کا ہیرو سمجھ میں نہیں آرہا کون ہوگا۔ "معافی" اینڈ میں تو ایک دم جھٹکا لگا اور آنسو لڑھک کر آنکھوں سے گرا' بہت زبردست اس ماہ کا بیسٹ ٹاپ افسانہ تھا۔ "شہرخطا" مجھے بہت پسند آرہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ "جھانکنا مت" مزا ہی نہ آیا۔ "تیرے خیال کا پیکر" بڑا ہی عجیب پلاٹ تھا۔ ایمل کے ساتھ ہوا کیا' بتاؤ ایسا بھی ہوتا ہے بھلا' بہرحال کہانی زبردست تھی۔ "ہاتھ پہ کوئی چاند رکھ" نشال نے اچھا کیا' باصد کو انکار کرکے۔ ہر اچھی لڑکی یہ ہی کرتی ہے۔

ج پیاری عمل! بہت شکریہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ آپ کا تبصرہ پسند آیا' اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

اروی رباب سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

"سفال گر" کے خالق کے بارے میں سنا' تو رہا نہ گیا۔ عمر سعید...... آہ..... سمجھ میں نہیں آرہا کیا لکھوں؟ دل غمگین' آنکھیں اشک بار' بر زباں پروہی جو خالق کو محبوب' عمر سعید کے نام نوال کی تحریر پڑھی۔ دل خون کے آنسو رویا' وہ تحریر نہیں درد کی انتہا تھی' پڑھ پڑھ کر روئے اور رو رو کر پڑھا' پر صبر کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ادب کی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان عظیم ہوگیا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے اور انہیں ابدی جنتوں کا مکین بنائے۔ (آمین) اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی جانب' سرورق پر سجی ماڈل نیلم منیر بس ٹھیک ہی لگی۔ ایک ہی جست میں "شہرخطا" تک کا فاصلہ طے کیا۔ دیا کی خطا نے سب کچھ جلا کر راکھ کردیا۔ نایاب جیلانی کا لکھا جملہ "ہائے خاکی! تجھ پر افسوس اور لعنت" یوں لگا نادیہ کی زندگی کا ایک جملہ میں خلاصہ ہے۔ "خواب شیشے کا" عفت کا طرز تحریر سادہ اور دل موہ لینے والا ہے' پر کہانی میں کوئی تجسس نہیں۔ "رقص بسمل" نبیلہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہیں تو خدارا اس ناول کو روک دیں۔ مکمل ناول "میرے ہاتھ پر کوئی چاند رکھ" واقعی مثل ماہتاب جگمگا رہا تھا۔ خاص طور پر یہ جملہ "زندگی اگر مہلت دے' موقع دے تو نقصان کرکے بھی احسان کا بدلہ چکا دینا چاہیے۔"

اس شمارے کی جان اور میری پسندیدہ تحریر "دو ٹکڑے" تھی' پڑھ رہی تھی تو آنکھوں سے اشک رواں' اور یوں لگ رہا تھا کہ دل دو ٹکڑوں میں بٹ رہا ہے۔ میرے خالو جان جو بنگلہ دیش سے ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ ہجرت کی صعوبتیں تو جھیل ہی گئے' پر یاد وطن سینے میں دھڑکتی نہ جاسکی۔ بنگالی ہوکر پاکستان زندہ باد کے نعرے میں نے خود اپنے کانوں سے سنے۔ سارے عزیز و اقارب بنگلہ دیش میں۔ حب الوطنی کی اتنی عظیم سزا کہ ماں' باپ' بہن' اور بھائی

مبارک باد

رشک حبیبہ کے آنگن میں خوشیوں کی بارات اتری اور انہیں زندگی کے سفر میں ایک ہم سفر مل گیا۔
ہم اس پُرمسرت موقع پر انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ زندگی کا یہ خوب صورت موڑ ان کے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)

سب بچھڑ گئے۔ پتا ہی نہیں کہ کون کہاں ہے اور کون کہاں؟ ایک حصہ اپنوں کی یاد کی صورت میں بنگال میں اور دوسرا حصہ حب الوطنی کی شکل میں پاکستان میں اور اس محبت کے خراج میں اس دو ٹکڑوں میں بٹے انسان کو وطن عزیز نے اپنے سینے میں سمو لیا۔ (اللہ خالو جان کی مغفرت فرمائے۔) "آمین۔"

غزالہ روشن نے کتنے سادہ سے انداز میں دلوں میں جذبہ شکر جگا دیا۔ ایک راز کی بات بتاؤں۔ برتن دھونا مجھے بھی عذاب سے کم نہیں لگتے۔ مجھے یوں لگا یہ افسانہ میرے لیے لکھا گیا۔ تھینکس غزالہ! ممناز یوسف کی "داستان الم" ہونٹوں پر شگوفے کھلا گئی۔ (ہاہاہا) رائٹر بننا آسان نہیں۔ مصباح پچھلے ماہ جتنا رلایا اب کی دفعہ اتنا ہی ہنسایا۔ مصباح تو واقعی مصباح ہیں۔ "روشن چراغ" مصباح آپ نے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ صائمہ اقبال کی "معافی" مجھے یوں لگا جیسے سہیل احمد کو دنیا میں سزا دے دی گئی ہو آدھے وجود کے ساتھ گھسٹتی زندگی ویل ڈن صائمہ "معافی" میں ہی عظمت پنہاں ہے۔ "میرے خیال کا پیکر" اس ماہ کی فضول ترین کہانی۔ ایمل کی بے باکی ایک آنکھ نہ بھائی۔ ایک طرف ہیروئن کا بیان کہ وہ اپنے باپ کی وجہ سے مشرقی اقدار سے واقف ہے اور دوسری جانب خود گھر بلا کر تنہائی میں اظہار محبت، پوری کہانی میں صرف ایک شے اچھی لگی اور وہ ہے میجر صاحب کا مضبوط کردار۔ نادیہ حسین سے ملاقات زبردست رہی اور منیب بٹ، سجل اور ثروت کا در شعاع پر دستک دینا اچھا لگا۔ خط سب کے ہی کمال تھے۔ سب سے مزے دار تبصرہ (خط) ام عمارہ نے کیا یوں لگا میرے دل کی آواز کو عمارہ نے کاغذ پر اتارا ہو۔ تہمینہ رؤف اور مریم عابد کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی اور اقرا ملک بھئی یہ تو سب کچھ میرے بارے میں ہی لکھ رہی تھیں۔ کوثر خالد کی جیٹھانی پروین اسلم صاحبہ اور گ، ڈ، پ دونوں کا ناتا ایک سا لگا۔ کھارے پانی جیسا۔

ج پیاری اروی! طویل اور تفصیلی خط پڑھا، ہر کہانی اور ہر سلسلے پر جامع تبصرہ اور خوب صورت الفاظ کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ ایمل کی بے باکی آپ کو اچھی نہ لگی، لیکن اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی اس کے اثرات تو لازما" آنا ہی تھے۔ دوسرے وہ بدکردار نہیں تھی۔ شادی کرنا چاہتی تھی۔ میجر صاحب تو اس کی کم عمری کی وجہ سے کبھی بھی پہل نہ کرپائے۔ اس لیے اس نے خود رشتہ دیا۔ بنت سحر سدرہ سحر عمران نہیں ہیں۔

سقوط مشرقی پاکستان امت مسلمہ کی تاریخ کا عظیم ترین سانحہ ہے۔ اس سازش میں غیروں کے ساتھ اپنے بھی شامل تھے لیکن سزا ان لوگوں کو ملی جو پاکستان کے حامی تھے، محب وطن تھے اور یہ سزا وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ کیمپوں میں پڑے وہ افراد آج پاکستان سے محبت کے جرم میں بے گھر اور بے وطن ہیں۔ عبدالقادر ملا اور میر قاسم جیسے لوگ دار پر چڑھائے جا رہے ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہماری آنکھیں آج بھی نہیں کھلیں، ہم تعصب اور نفرتوں میں مبتلا ہیں۔

ثنا مسکان گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں

ٹائٹل میں ایک ہی چہرہ بار بار کیوں؟ خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ میرا موسٹ فیورٹ "خواب شیشے کا" عفت جی ہمیشہ کی طرح بہترین۔ سائرہ رضا، سمیرا حمید اور صائمہ اکرم چوہدری میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ امید ہے کہ "سیاہ حاشیہ" اور "دیمک زدہ محبت" کی طرح "شہزاد" بھی ایک بہترین کاوش ہوگی۔ اس ماہ کا شمارہ بس سو سو لگا۔ ایک جیسے موضوعات "لندن' نیویارک' امریکہ' پیرس ہمیں بالکل بھی پسند نہیں، ہمیں تو پاکستان کے گاؤں' دیہات' رسم و رواج' مہندی' چوڑیاں پسند ہیں۔ برسات' رم جھم' برستا پانی' راحت جبیں اور ثمرہ بخاری جی سال میں دو کہانیاں ہی لکھ دیا کریں۔ "بندھن" میں سعدیہ امام اور فہد مصطفیٰ اور ندا یاسر کا انٹرویو شامل کریں' پلیز پلیز۔

ج پیاری ثنا! ہمیں بھی اپنے پاکستان کی معاشرت' اس کے گلی کوچوں کی' اس کے موسموں کی اور اس کے آنگنوں میں بکھری کہانیاں اچھی لگتی ہیں' لیکن کبھی کبھی تبدیلی کے لیے دوسرے ممالک کی کہانیاں بھی شامل ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ اس بار شعاع میں صائمہ اکرم شامل ہیں اور خواتین ڈائجسٹ میں سمیرا حمید اور سائرہ رضا جلوہ افروز ہیں۔ اپنی پسندیدہ تینوں مصنفین کی تحریریں پڑھیں اور ہمیں اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ راحت جبیں اور ثمرہ بخاری تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

جڑانوالہ سے کوثر خالد رونق افروز ہیں' لکھا ہے

حمد و نعت پسندیدہ صفحہ ہے۔ "حوض کوثر" آپ کو لگتا ہے نہیں مل پائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں۔۔۔ اللہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تعالیٰ ہمیں سیدھا راستہ نصیب میں رکھے۔ عمر سعید نوال افضل ان کی کیا لگتی ہے؟ خطوں میں قاریہ کے ابا کے کمننس عمر سعید کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" سمجھ سے باہر ہے کہ آرام سکون کا خواب کیوں دیکھتی ہیں لڑکیاں۔۔۔ کیا اپنی ماں کی مشقت بھری زندگی سامنے نہیں ہوتی' اگر شادی کے بعد اکیلا مرد و عورت ہوں۔ مرد کام پر' عورت اکیلی تو پھر کیا زندگی مشکل نہ ہوگی۔ ذرا اکیلوں سے پوچھ کر دیکھیں۔ جوائنٹ فیملی کو ترستی ہیں۔ ہم تو سسرال سے 72 ڈنڈے کھا کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ نوکروں کی طرح کام کرکے بھی خوش و خرم ہیں۔ باسی تو آج بھی من پسند کھاجا ہے۔ سب کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں" میں اسلام کی بہادر خواتین کی زندگی پیش کی جائے۔ "شعاع کے ساتھ" نیکی کی شعاع سلامت رہے۔ "خواب شیشے کا" ٹوٹنے سے بچانا ہے۔ "رقص بسمل" جاری ہے۔ "تیرے خیال کا پیکر" پختہ قلم' پختہ کردار۔۔۔۔ "ہاتھ یہ چاند" یوں ہی نہیں آیا کرتا۔ پتھریلی زندگی گزارنا ہی پڑتی ہے۔ "دو ٹکڑے" نعیمہ ناز ہوں اور دل کے ٹکڑے نہ کریں۔ "برتن" ہمارے برتن کم ہوتے ہیں۔ اس پر اللہ کے شکر گزار ہیں۔ رزق کھانے کو نہیں' بانٹنے کے لیے چاہیے۔ سادہ رزق "نظر بٹو" منفرد سی آگہی لائیں حاجرہ ریحان' مگر نام ہونا چاہیے۔ "فالتو لوگ" "معافی" "اک داستان الم" تھی۔ خط آپ کے' سر آنکھوں پر فوزیہ بٹی آجاؤ کسی دن چھاپا مارنے ہمت ہے تو راولاکوٹ سے "سات سنگ" کی کوثر پروین مجھے ملنے آئی ہیں۔ عظمیٰ شفیق' تم اپنا اتا پتا بتاؤ' پندرہ منٹ کا راستہ ہے تو ہم آجاتے ہیں۔ وہیں ہمارا متضاد رویہ ملاحظہ کرلینا۔ "تاریخ کے جھروکے" بہت اچھے لگتے ہیں۔ مگر ہم نے پرانے شعاع قربان کردیے (بیچ کر) صرف 300 روپے یتیم بچوں کی ماں کو دینے کے لیے۔ خوب صورت بنے' گلسرین گھر میں نہ تھی تو دہی لگا کر گزارا کیا۔

ج ۔ پیاری کوثر! جو سادگی اور قناعت آپ کی شخصیت کا حصہ ہے' وہ سب کو نصیب نہیں ہوتی۔ بوڑھے والدین بوجھ لگتے ہیں تو پھر ساس' سسر کی خدمت کون کرے گا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم میں بہت بڑے دل اور بہت صبرو برداشت کی ضرورت ہوتی ہے' جو ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ یتیم بچوں کی مدد کی۔ بہت اچھی بات ہے' لیکن شعاع کے شمارے بیچتے ہوئے جو آپ کے دل پر گزری ہوگی' اس کا ہمیں اندازہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے۔ (آمین) آپ کی کتاب "حوض کوثر" مل گئی تھی۔ فون کرنے کا سوچا بھی تھا' بس مصروفیت کی وجہ سے ذہن سے نکل گیا۔ اس کے لیے معذرت۔ آپ نے کتاب بھجوائی' بہت شکریہ۔ عمر سعید کا نوال افضل گھمن سے ایک قاری اور مصنف کا رشتہ ہے' اس کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں۔

صائمہ بنت شاہ نواز لکھتی ہیں

میں نے آپ کے ادارے کو دو افسانے بھجوائے ہیں۔ ان کے بارے میں بتائیں اور ایک قسط وار ناول ہے' اگر آپ پڑھیں تو بھجواؤں' کیونکہ وہ خاصا ضخیم ہے۔

ج ۔ صائمہ! ضخیم ناول ضرور بھجوائیں۔ آپ کے افسانے "اعتقاد" کا انداز بیاں تقریری اور تبلیغی ہے۔ اس لیے معذرت چاہتے ہیں۔ باقی کرن میں جو افسانہ بھیجا ہے' اس کا کرن کے دفتر میں فون کرکے معلوم کرلیں۔

یاسمین کنول نے پسرور سے لکھا ہے

پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ ماڈل بڑی پیاری لگی۔ مصباح نوشین اور کرن نعمان کے ناول پسند آئے' جبکہ افسانوں میں "داستان الم" اور "نظر بٹو" زیادہ اچھے لگے۔ مشہور ماڈل نادیہ حسین سے ملاقات اچھی رہی۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں پروین اسلم کی باتیں اچھی لگیں۔

ج یاسمین! طویل عرصہ بعد آپ نے شرکت کی' بہت اچھا لگا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں۔

دستک

شاہین رشید

سمیع خان

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمد للہ۔"

"منت میں دیکھ رہے ہیں۔ اس میں بھی "رباب" آپ کی ہیروئن ہیں۔ کچھ کہیں گے اس بارے میں؟"

"رباب کے ساتھ یہ میرا چوتھا سیریل ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈائریکٹرز کو ہم پر بہت بھروسا ہے۔ وہ ہمارے کام سے مطمئن ہیں۔ اور پھر کام کے معاملے میں رباب اور میری کیمسٹری بھی کافی ملتی ہے اور جس سے کیمسٹری مل جائے کام میں آسانی ہو جاتی ہے۔"

"ڈراما سیریل "منت" کے بارے میں کیا کہیں گے رسپانس کیسا ہے؟"

"رسپانس بہت اچھا ہے اور اللہ کا بڑا کرم ہے کہ مجھے اپنے ڈراموں کا ہمیشہ اچھا رسپانس ملا ہے اور "منت" عام سیریلز سے بہت مختلف ہے۔ اس کی کہانی اور خاص طور پر میرا کردار بہت مختلف ہے۔ میں ایک ایسے انسان کا رول کر رہا ہوں جسے زندگی سے بہت پیار ہے مگر اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ جلدی مر جائے گا۔ وہموں نے اسے پریشان کیا ہوا ہے۔ بہرحال بہت مختلف قسم کا کردار ہے اس کا اسکرپٹ بہت اچھا ہے۔"

"رائٹر اور ڈائریکٹر کون ہیں؟"

"رائٹر کشور آسمل اور ڈائریکٹر "امین اقبال" ہیں۔ تحریر بھی بہترین ہے اور ہدایت کاری بھی۔"

"ڈرامہ آگے بڑھا ہے یا پیچھے کی طرف گیا ہے؟"

"ڈرامے میں اب خواتین کو زیادہ فوکس کیا جاتا ہے۔ خواتین کو مظلوم دکھایا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت ہے کہ مرد بھی مظلوم ہے۔ اگر عورت مردوں کے ہاتھوں مظلوم ہے تو مرد بھی عورت کے ہاتھوں مظلوم ہے.... پھر معاشرتی مسائل کو بھی ڈراموں کی شکل نہیں دی جا رہی.... یہ تو نہیں کہوں گا کہ ڈراما پیچھے کی طرف چلا گیا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ڈراما چند کہانیوں تک محدود ہو گیا ہے۔"

"ڈراموں میں تو بہت نام کما لیا.... فلم کے لیے کیا کہیں گے؟"

"میں جس طرح ڈراموں کی دنیا پر راج کر رہا ہوں اس طرح میری خواہش ہے کہ فلم کی دنیا میں بھی میرا راج ہو.... لوگ مجھے دیکھنا چاہیں۔ مگر فلم کے لیے

فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کروں گا۔ تاکہ نہ میں مایوس ہوں اور نہ ہی لوگ۔ صرف ہیرو بننا کوئی مسئلہ نہیں ۔ہیرو والا کام بھی ہو' کہانی بھی جان دار ہو' ڈائریکٹر بھی بہت اچھا ہو' یعنی پوری ٹیم بہت قابل ہو۔"

"آج کل ڈراموں کے لیے ایک لفظ "ریٹنگ" کا بہت استعمال کیا جاتا ہے آپ بھی ریٹنگ دیکھتے ہیں؟"

"میں تو ریٹنگ کے سخت خلاف ہوں... میرا نظریہ تو یہ ہے کہ ایک اچھا ڈراما مقبول نہیں ہوتا تو کوئی بات نہیں' آپ نے اچھی چیز ناظرین کو دکھانے کی کوشش تو کی... لیکن ایک برا ڈراما آپ کو ریٹنگ دیتا ہے تو آپ آئندہ بھی ریٹنگ کے چکر میں ایسے ہی برے ڈرامے پیش کرو گے۔ تو بس میں ریٹنگ سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ کوالٹی سے متاثر ہوتا ہوں۔"

"ایسے لوگوں کے لیے کچھ کہیں گے... یا ڈرامے کو بہتر بنانے کے لیے آپ کچھ کہیں گے؟"

"یہی کہہ سکتا ہوں کہ معیاری چیزیں پیش کریں۔ گھریلو کہانیوں' ساس بہو کے جھگڑوں اور عورتوں کی مظلومیت سے باہر نکلیں۔ اچھے موضوعات لے کر آئیں۔ ناظرین کو کچھ نئی چیزیں دکھائیں۔"

"اپنی زندگی پلاننگ سے گزارتے ہیں؟"

"نہیں... بالکل نہیں... ہمارے لیے پلان کرنے والا ہمارا اللہ ہے... وہ ہی ہمارے لیے پلاننگ کرتا ہے اور ہم اسی کے پلان سے کامیاب بھی ہوتے ہیں... اللہ اپنے بندے کو آگے بڑھنے یا کسی کام سے پیچھے ہٹنے کا راستہ خود ہی بتاتا ہے۔"

"کراچی... میں کام زیادہ ہوتا ہے... ڈیرے جمائے کراچی میں یا آنا جانا لگا رہتا ہے؟"

"ڈیرے نہیں جمائے... بلکہ آنا جانا لگا رہتا ہے کیونکہ لاہور میں میری فیملی رہتی ہے اور کام کے سلسلے میں کراچی آنا رہتا ہے۔"

"سفر سے پریشان نہیں ہوتے؟"

"ارے نہیں... سفر ہوتا ہی کتنا ہے... گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"آپ فلم کی بات کر رہے تھے مگر ٹی وی پہ آنے سے پہلے غالباً" آپ نے فلم کی تھی.... ایسا ہی ہے نا؟"

"جی.... فلم سلاخیں کی تھی اور ٹی وی فلم میں آنے کا خیال بھی نہیں تھا البتہ ہوسٹنگ کا شوق تھا اور میں "میوزک چینل چارٹ" کے لیے آڈیشن دینے گیا تھا تو وہاں راشد خواجہ نے فلم کی آفر دی اور فلم "سلاخیں" میں بک کر لیا اور یوں میرے کیریئر کا آغاز ہوا 4۔2003ء میں.... پھر گیپ دیا اور 2009ء میں دوبارہ آیا.... کیونکہ میں نے پڑھائی کی وجہ سے گیپ دیا اور 2009ء میں سوچ لیا کہ اب شوبز کو ہی اپنا پروفیشن بنانا ہے۔"

"پڑھائی متاثر ہوئی؟"

"نہیں.... کیونکہ ماسٹرز کرنا تھا.... وہ نہیں کر پایا۔ گریجویشن بہت اچھے نمبروں سے کیا۔ کیونکہ بہت اچھا اسٹوڈنٹ تھا۔ بس جی انسان کے اختیار میں کچھ نہیں۔ سب کچھ اوپر والا کرتا ہے۔"

"اتنا کام کیا.... ایوارڈز ملے؟"

"بالکل ملے.... بہترین اداکار کا "پی ٹی وی ایوارڈ" "ترنگ" ہاؤس فل ایوارڈ" بہترین اداکار کا اور لکس ایوارڈز میں دو بار نامزد ہوا.... ایوارڈ بھی کبھی مل ہی جائے گا۔"

"اس وقت کون سا اداکار ورسٹائل ہے؟"

"میری نظر میں تو "فیصل قریشی" ہیں۔"

عادل مراد

"کیا حال ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"گزشتہ دنوں وحید مراد صاحب کی برسی منائی گئی.... کیا محسوس ہوتا ہے؟"

"اب تو جی بہت برس بیت گئے۔ مگر والد صاحب کی یاد بالکل بھی دل سے نہیں گئی۔ اولاد تو خیر والد کو یاد رکھتی ہے مگر میں جب اتنے برس بعد بھی لوگوں کی محبت اپنے والد کے لیے دیکھتا ہوں تو مجھے بہت فخر ہوتا ہے۔"

"ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی کو اتنا چاہا جائے کہ برسوں بیت جانے کے بعد بھی والہانہ محبت کا اظہار ہو۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ.... عام لوگ ہوں یا میڈیا۔ سب ہی والد صاحب کو بہت یاد رکھتے ہیں اور خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔"

"کچھ یاد ہے آپ کتنے سال کے تھے جب وحید مراد صاحب دنیا سے رخصت ہوئے تھے؟"

"جی.... مجھے بھی کچھ کچھ یاد ہے اور امی بھی بتاتی ہیں کہ میں اس وقت سات سال کا تھا۔ اور میرا خیال ہے کی یہ عمر ایسی ہوتی ہے بچوں کی کہ ان کے ذہن میں بہت سی باتیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔"

"یقیناً" آپ کے ذہن میں بھی کئی باتیں ہوں گی۔"

"بالکل ہیں.... تہواروں پہ ہی ہمارا ان کا ساتھ زیادہ رہتا تھا.... تو مجھے یاد ہے کہ جب چھوٹی بڑی عید آتی تھی تو ہم سب مل کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ گھومنے پھرنے جاتے تھے اور بہت مزے کرتے تھے اور عیدی بھی ملا کرتی تھی۔"

"ڈانٹ بھی پڑی کبھی؟ یا مار؟"

"نہیں کبھی نہیں.... وہ بہت سوفٹ لہجے میں بات کیا کرتے تھے مارنا تو دور کی بات رہی' وہ کبھی ڈانٹتے بھی نہیں تھے۔ وہ ایک بہت اچھے باپ تھے۔"

"اور آپ؟"

"ہر اولاد میں والدین کی خصوصیات ضرور آتی ہیں۔ میرا نرم لہجہ اور دھیمی آواز میں بات کرنا ان ہی سے آیا اور میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ ایک اچھا باپ اور ایک اچھا شوہر ثابت ہوں۔"

"کسی نے احساس دلایا کہ آپ معروف فنکار کے فرزند ہیں؟"

"جب میں نے اسکول میں داخلہ لیا.... تب مجھے بہت زیادہ احساس ہوا کیونکہ میری ٹیچرز میرا نہ صرف بہت خیال رکھتی تھیں بلکہ میرے والد کی بہت زیادہ

تعریف بھی کرتی تھیں۔ وہ سب والد صاحب کی فلموں کی اور ان کی اداکاری کی تعریف کرتی تھیں۔"

"فلموں کی طرف کیوں نہیں راغب ہوئے؟"

"راغب ہوا تھا امریکہ میں پڑھائی کر رہا تھا کہ آفر آئی۔ پاکستان آیا۔ کام کیا۔ مگر فلم فلاپ ہو گئی۔ دل بجھ گیا اور پڑھائی کے لیے واپس چلا گیا۔ میں تو کیا پاکستان کا کوئی بھی ہیرو میرے والد کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مطلب لوگ ان کے جیسے انداز کو قبول بھی نہیں کرتے۔ مزید آفرز بھی آئیں مجھے۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔"

"آج کل جو فلمیں بن رہی ہیں اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے مطمئن ہیں آپ؟"

"مطمئن تو کسی بات سے نہیں ہونا چاہیے کہ یہ انسان کی شکست ہے۔ اطمینان کا مطلب ہے آسٹاپ، لیکن یہ ضرور ہے کہ اچھی فلمیں بن رہی ہیں، لوگ سینما ہاؤسز کا رخ کر رہے ہیں اور اگر ہم اچھا کام کریں گے تو اچھا رزلٹ ہی سامنے آئے گا۔"

"اب آپ کا ارادہ ہے فلم میں کام کرنے کا؟"

"نہ صرف فلم میں کام کرنے کا ارادہ ہے بلکہ 2017ء میں میرا ارادہ ہے فلم بنانے کا.... اور اسکرپٹ اچھا ہوا تو میں ضرور کام کروں گا۔ مگر فی الحال تو اپنے پروڈکشن ہاؤس میں مصروف ہوں۔ جس کے تحت ڈرامے پروڈیوس کر رہا ہوں۔ مجھے کیمرے کے سامنے سے زیادہ کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔"

"اسی لیے ڈراموں میں کم نظر آتے ہیں؟"

"جی۔ بے شک مجھے اداکاری کا شوق ہے لیکن پتا نہیں کیوں مجھے کوئی خاص مزہ نہیں آرہا۔ شاید کام میرے مزاج کا نہیں ہے۔ کچھ نیا کر کے دکھانے کو نہیں ہے۔ کوئی کری ایٹو کام نہیں ہو رہا۔ ایک جیسے ڈرامے بن رہے ہیں۔"

"تو آپ کا تو اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ کچھ نیا کر سکتے ہیں نا آپ؟"

"سچ بتاؤں کہ جس طرح دوسروں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اسی طرح میرے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ کری ایٹو اور منفرد کام وہاں ہوتا ہے جہاں آپ کو اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت ہو۔ خیر میں ناامید نہیں ہوں اچھا وقت ضرور آئے گا۔"

"آج کل۔ آپ کے پروڈکشن ہاؤس سے کیا کام آن ایئر ہے؟"

"میرا کیا قصور" اور ایک انڈر پروڈکشن ہے "نقارۂ خدا" جلد آن ایئر ہو گا۔

"دعا ہے آپ ہر فیلڈ میں کامیاب ہوں۔ بیگم بچے ٹھیک ہیں؟"

"جی.... الحمدللہ۔"

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل	فرینہ اعجاز
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

سے بچاؤ میں مدد کے ساتھ کولیسٹرول کی مقدار کم کرتا ہے۔ الرجی کی شکایت میں بھی کھجور بہت مدد ملتی ہے۔
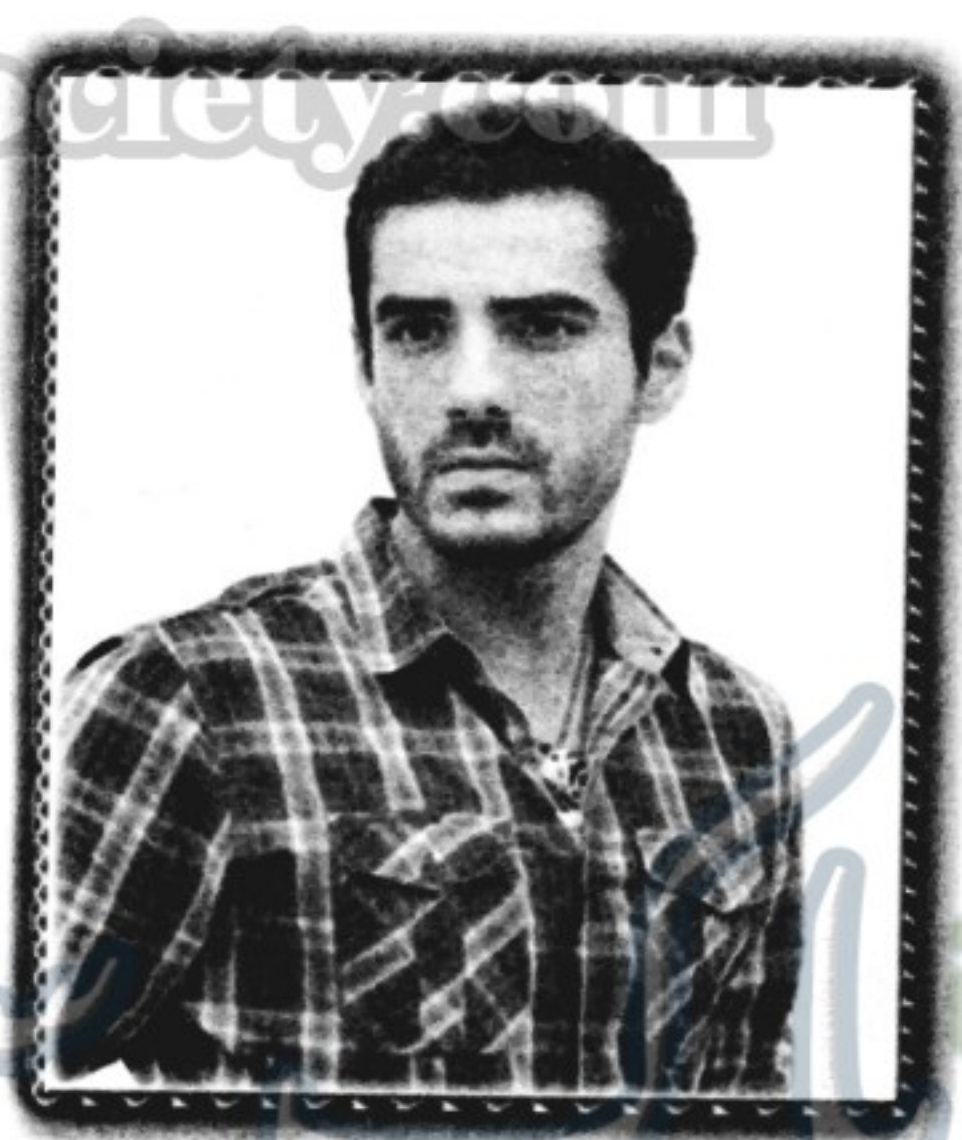
پیغام

عدیل حسین آج کل "دوبارہ پھر سے" میں بڑی اسکرین پر نظر آرہے ہیں۔ پچھلے دنوں عدیل حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ "میں ایک اداکار ہوں' کوئی سماجی کارکن نہیں' میرا اسکرپٹ ہی میرا سوشل ورک ہے۔" (عدیل! وہ جو "دوبارہ پھر سے" میں آپ نے کیا ہے' وہ سوشل ورک ہے؟) میں ان ہی کے ذریعے اپنا پیغام عوام تک پہنچاتا ہوں۔ (بلے بھئی بلے' کیا بات ہے آپ کے پیغامات کی؟) عدیل نے مزید کہا کہ اگر کوئی سوشل میڈیا پر کوئی عوامی ایشو اپ لوڈ نہ کریں یا بات نہ کریں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دردمند دل نہیں رکھتا۔ (بات میں دم تو ہے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟)

طاقت

کھجور کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں' اس میں طبی فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اگر روزانہ کھجور کا استعمال کیا جائے تو آپ کو مختلف منرلز' کاپر' آئرن' پوٹاشیم' میگنیشیم' وٹامنز بی' وٹامن بی 6' وٹامن اے اور کے وغیرہ بھی مل جائیں گے۔ کھجور میں ریشوں کی بھی قابل ذکر مقدار ہوتی ہے' جو قبض دور کرنے کے ساتھ ساتھ جسم کے فاسد مادوں کو بھی خارج کرتی ہے۔ دن میں تین کھجوریں کھا کر آپ بہترین نتائج حاصل کرسکتی ہیں۔ اگر سہ پہر میں تین کھجوریں کھالیں تو فوری توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ کھجور میں سیلنیم کی وجہ سے کینسر سے تحفظ ملتا ہے۔ کھجور ہڈیوں کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ جسم میں ہیموگلوبن کی کمی کو بھی دور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فالج اور ہارٹ اٹیک

ناکامی

لیجئے جناب! "میرا" پھر خبروں میں آگئی ہیں۔ (فن ہے یہ بھی۔) فلم "ہوٹل" کے بعد سے میرا کا برا وقت جو شروع ہوا تو آج تک چل رہا ہے۔ (کیا... فلم "ہوٹل" سے برا وقت... ویسے آپس کی بات ہے میرا کا اچھا وقت بھی آیا تھا کبھی؟) لاہور میں فلمیں بن نہیں رہیں اور جو بن رہی ہیں ان سے میرا کے تعلقات بھی اچھے نہیں ہیں۔ (بھئی میرا نے بھی تو بھارتی فلموں کے دوران ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور کراچی میں بننے والی فلموں میں ان کم عمر

اداکاراؤں کو لیا جارہا ہے۔ جو ٹی وی پر ہٹ ڈرامے دے رہی ہیں۔ اور ہٹ فلمیں؟) کچھ عرصہ قبل میرا نے "آسکر" (بھئی فلم کا نام ہے۔) بنانے کا اعلان کیا تھا جو کہ نجی اور گھریلو مسائل کی وجہ سے بن نہ سکی۔ (اور نہ بن سکتی ہے بھئی میرا کی فلم جو ہے) بہرحال میرا نے ہمت نہیں ہاری اور ہر اس فلم ساز کو منانے کی کوشش میں ہیں جن کی فلم کا اعلان ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔

خطرہ

سمیعہ ممتاز کے نام کے ساتھ ایک روتی دھوتی مظلوم قربانی دینے والی عورت ذہن میں آتی ہے۔ لیکن "جیون ہاتھی" میں سمیعہ نے ایک امیر اور خود پرست عورت کا کردار انتہائی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ سمیعہ ممتاز اس بارے میں کہتی ہیں کہ "میں بحیثیت اداکارہ' مختلف کام کرنے کی خواہش مند ہوں' مگر اداکار یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ کون سے کردار کرنا چاہتا ہے۔ خاص طور پر ٹی وی ڈراموں میں انتخاب کرنے کی آزادی مشکل سے ملتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ۔۔۔ مجھے منفرد اور مختلف کردار نبھانا پسند ہیں۔ میں خود بھی ایک ہی طرح کے کردار نہیں کرنا چاہتی۔" (تو پھر کرتی کیوں ہیں؟) لیکن مجھے پسند اور ناپسند کا زیادہ اختیار نہیں ہوتا۔ انکار کی صورت میں ہمیں ہی کام کی کمی ہو جائے گی۔ (کسی کو تو خطرہ مول لینا ہو گا' نا تبدیلی کے لیے بھئی۔۔۔) کیوں کہ میرے انکار پر دوسرا کوئی بھی فن کار یہ کردار بخوشی کرلے گا۔ (اور وہ ہٹ بھی ہو جائے گا' پھر افسوس ہو گا' ہے نا؟) سمیعہ ممتاز بنیادی طور پر "کسان" ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ کاشت کاری میرا پیشہ' میرا کام ہے۔ اداکاری تو ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ کیوں کہ میں سال میں صرف دو ماہ اداکاری کرتی ہوں' باقی پورا سال میرا کاشت کاری میں گزرتا ہے۔ (دو مہینے میں اتنا کام۔۔۔ حیرت ہے۔)

پذیرائی

سرمد کھوسٹ کا کہنا ہے "ماہرہ خان انہیں

مادھوری اور مدھو بالا لگتی ہیں۔" (کیا۔؟ ہیں۔۔۔ اچھا۔۔۔!!) انہوں نے کہا کہ زیادہ تر ٹی وی پر کام کرنے کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ جو جادو فلموں میں ہے وہ ٹی وی پر نہیں۔ سرمد نے مزید کہا کہ ماہرہ اور فواد خان جیسے مشہور فن کاروں کے ساتھ سفر کرنے پر انہیں پتا چلا کہ سب کی توجہ ماہرہ اور فواد خان پر تھی۔ (اب آپ کو تو ان جیسی پذیرائی نہیں مل سکتی نا کیوں کہ آپ؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ نائن الیون کے بعد اس وقت کی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور سابق صدر پرویز مشرف نے جو کردار ادا کیا۔ اس پر بھی سوال اٹھتا ہے جنہوں نے 600 مبینہ مشتبہ افراد کو امریکہ کے حوالے کیا۔ جنہوں نے کسی مقدمے کے بغیر کتنے برس گوانتاناموبے میں قید کاٹی اور بعد میں بے گناہ ثابت ہوئے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ پرویز مشرف اپنے فیصلے کا آج بھی فخریہ انداز میں دفاع کرتے ہیں۔ پرویز مشرف کو ڈالر تو مل گئے لیکن کتنے بے گناہ آج بھی لاپتا ہیں۔

(مظہر عباس کا تجزیہ)

امتہ الصبور

احسان کا بدلہ

حسن بن سہل سے روایت ہے کہ ایک دن میں یحییٰ ابن خالد برمکی وزیر خلیفہ ہارون رشید کی خدمت میں حاضر تھا اور وہ انصرام امور سلطنت میں مصروف تھے۔ لوگ اپنی حاجتیں لے کر ان کے پاس آتے تھے اور یحییٰ حتی الامکان ان کی حاجت روائی کر کے انہیں یکے بعد دیگرے رخصت کرتے تھے۔ ان میں سب سے پیچھے جو شخص باریاب ہوا۔ اس کا نام احمد ابو خالد احوال تھا۔ یحییٰ نے انہیں بغور دیکھ کر اپنے لڑکے فضل سے کہا کہ اس شخص کے باپ ابو خالد احوال اور میرے درمیان جو معاملہ پیش آیا۔ وہ قابل ذکر ہے۔ اس لیے میں جب کام سے فارغ ہوں تو مجھے یاد دلانا۔ میں تم سے بیان کروں گا۔

جب یحییٰ کام سے فارغ ہوئے اور کھانا کھا کر بیٹھے تو ان کے لڑکے فضل نے پوچھا۔

''ابو خالد احوال والا معاملہ کیا تھا۔''

یحییٰ نے کہا۔ ''ہاں سنو؟ میں جب خلیفہ مہدی کے زمانے میں عراق سے یہاں آیا تو اس وقت مفلس تھا اور گھر میں نقد و جنس کچھ باقی نہ تھا۔ ایک دن گھر والوں نے کہا کہ ہم نے اپنی حالت اب تک تم پر ظاہر نہیں کی مگر اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ آج تیسرا دن ہے کہ ہمارے حلق سے رزق نہیں اترا ہے۔ یہ سن کر میں بہت رویا اور بڑی دیر تک حیرانی اور پریشانی کی حالت میں سرنگوں بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرا ایک رومال تھا جو عمامہ پر میں لپیٹا کرتا تھا۔

میں نے پوچھا وہ رومال کیا ہوا؟

گھر والوں نے کہا کہ موجود ہے اور مجھے لا کر دیا۔ میں اسے لے کر ایک ملاقاتی کے پاس گیا اور کہا۔

ازراہ مہربانی اسے بیچ کر لا دو۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے سوا چار روپے قیمت اس رومال کی لا کر مجھے دی۔ میں نے گھر والوں کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ۔

''جب تک کوئی اور سبیل منجانب اللہ ہو' سے لے کر خرچ کرو۔''

دوسرے دن صبح ہی ابو خالد کے مکان پر پہنچا۔ وہ اس وقت خلیفہ مہدی کے وزیر تھے اور بہت سے لوگ ان کے دروازے کے باہر ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گھوڑے پر سوار برآمد ہوئے۔ میں نے دیکھ کر سلام کیا۔ انہوں نے پہچانا اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟

''میں نے کہا ایسے شخص کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں جس نے اپنے عمامے پر لپیٹنے کا رومال سوا چار روپے میں بیچا ہے۔''

یہ سن کر ابو خالد مجھے بغور دیکھتے رہے۔ لیکن کوئی جواب مجھ کو نہ دیا اور چلے گئے۔

میں مایوس ہو کر واپس آیا۔ اور گھر والوں سے ملاقات کا حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''تم نے برا کیا کہ ایسے شخص سے جو تمہیں کسی بڑے منصب پر ممتاز کرنا چاہتا تھا' اپنا راز ظاہر کر دیا اور اپنی اصلی حالت اسے جتا کر اپنی بے توقیری کی اور باوجود یہ کہ وہ تمہیں معزز سمجھتا تھا' اپنی قدر و منزلت اپنے ہاتھوں برباد کر دی۔''

میں نے کہا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس کا کوئی علاج نہیں۔

دوسرے دن صبح کو میں خلیفہ مہدی کے دروازے پر پہنچا تو دو دربانوں نے یکے بعد دیگرے کہا کہ۔

"یہاں تمہارا ذکر ابھی ہو رہا تھا۔"

پھر ابو خالد کا حاجب میرے پاس آکر کہنے لگا کہ آپ کہاں تھے؟ ابو خالد وزیر مجھے حکم دے گئے ہیں کہ جب تک میں خلیفہ ولید کے پاس سے واپس آؤں۔ یحییٰ ابن خالد کو ٹھہرانا۔

یہ سن کر میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں ابو خالد بر آمد ہوئے اور مجھے دیکھ کر پاس بلایا اور میری سواری کے لیے دوسرا گھوڑا منگایا پھر اس پر سوار کرا کے مجھے اپنے مسکن پر لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ابو خالد نے حکم دیا کہ۔

"فلاں فلاں غلہ فروشوں کو حاضر کرو۔" چنانچہ وہ گندم فروش حاضر ہو گئے تو ان سے ابو خالد نے پوچھا کہ۔

"میری جاگیر کا غلہ پینتیس لاکھ روپے میں تم ہی دونوں نے خریدا ہے؟"

انہوں نے کہا ہاں۔

"ابو خالد نے کہا تمہیں یاد ہے میں نے یہ شرط رکھی تھی کہ اس غلہ کی تجارت میں تم کو ایک اور شخص شریک کرنا پڑے گا۔ جس کو میں نامزد کروں گا۔ وہ شخص یہی ہے۔"

تاجروں نے شراکت کا اقبال کیا۔ ابو خالد نے مجھے ان کے ساتھ کر دیا۔ جب ہم لوگ باہر آئے تو تاجروں نے مجھ سے کہا۔

"مسجد میں چلو۔ تم سے اس معاملہ میں کچھ گفتگو کرنا ہے۔ جس سے تم کو نفع پہنچے گا۔"

پھر ایک مسجد کے اندر لے جا کر انہوں نے کہا۔

"اگر ہماری اور تمہاری شراکت قائم رہی تو تم کو گماشتہ اور آڑھتی اور غلہ تولنے والے بہت سے معتبر آدمی نوکر رکھنے پڑیں گے اور تم پر دیسی آدمی انہیں کہاں سے ڈھونڈو گے۔ کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ تم اپنا حق شرکت ہم سے کافی منافع لے کر ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو۔ اس طرح تم کو منافع پیشگی مل جائے گا اور آئندہ کوئی خدشہ تم کو نہیں رہے گا۔"

"میں نے کہا کیا منافع دو گے؟"
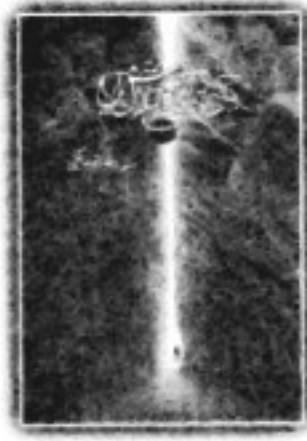
کہا پچیس ہزار درہم۔

"میں نے کہا بہت کم ہے۔"

یہ سن کر وہ دونوں تاجر میرے ہر انکار پر رقم معاوضہ بڑھاتے گئے۔ یہاں تک کہ پچھتر ہزار تک پہنچ کر کہنے لگے کہ۔

اس سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے۔

میں نے کہا کہ ابو خالد سے پوچھ کر جواب دوں گا۔"

پھر میں نے ابو خالد سے جا کر کیفیت بیان کی انہوں نے تاجروں کو جا کر پوچھا کہ

"تم پچھتر ہزار روپے معاوضہ دینے پر رضامند ہو؟"

انہوں نے کہا ہاں!

"ابو خالد نے کہا کہ جاؤ اور یہ پوری رقم انہیں ادا کردی اور مجھ سے کہا کہ یہ رقم لے کر اپنا کام چلاؤ اور تیار ہو جاؤ' میں عنقریب کسی صوبے کی گورنری تمہارے لیے تجویز کر رہا ہوں۔"

میں نے روپیہ لے کر اپنا سامان درست کیا اور کچھ عرصہ کے بعد ابو خالد نے حسب وعدہ مجھے ایک صوبے کا گورنر مقرر کر دیا۔

میری ترقی برابر کی رہی۔ یہاں تک کہ میں اس منصب وزارت تک پہنچ گیا۔ یہ کہہ کر یحیٰ برمکی نے اپنے بیٹے فضل سے پوچھا کہ۔

جس شخص نے مجھ پر یہ احسان کیا اس کے بیٹے سے کیا سلوک کرنا چاہیے؟

فضل نے کہا کہ ابو خالد کے لڑکے کا بے شک آپ پر بڑا حق ہے۔

یحیٰ نے کہا کہ اس لڑکے کے ساتھ اس کے باپ کے احسان کا پورا بدلہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں اپنے عہدہ وزارت سے دست کش ہو کر اس لڑکے کو اپنی جگہ وزیر مقرر کرا دوں۔"

چنانچہ یحیٰ نے ایسا ہی کیا۔

قلوپطرہ کی خودکشی

مصر کی ملکہ قلوپطرہ کے حوالے سے مشہور ہے کہ اپنے عاشق مارک انطونی کی موت کے بعد جب اس نے یہ دیکھا کہ سیزر کی رومن فوج کے ہاتھوں شکست سے بچنا ممکن نہیں تو اس نے ایک زہریلے سانپ سے خود کو ڈسوا کر خودکشی کر لی تھی۔ محققین کے مطابق یہ نظریہ بھی غلط ہے کیونکہ قلوپطرہ کے صرف دو سال کے بعد گزرنے والے رومن مورخ کے مطابق قلوپطرہ کی موت پرسکون انداز میں واقع ہوئی تھی۔ جبکہ سانپ کے ڈسنے کے نتیجے میں الٹیاں اور سانس کا رکنا عام علامات ہیں' چنانچہ محققین کا کہنا ہے کہ ممکنہ طور پر قلوپطرہ نے بعض نشلی دواؤں کے مرکب کی مدد سے خودکشی کی تھی۔

نیرو کی سفاکی

قدیم روم کے شہنشاہ نیرو کے حوالے سے بھی یہ مشہور ہے کہ جب روم جل رہا تھا تو وہ وائلن یا سارنگی کی طرز کا کوئی ساز بجا رہا تھا۔ جدید محققین کا کہنا ہے کہ اگرچہ نیرو کو موسیقی کا شوق تھا اور وہ کئی ساز بجایا بھی کرتا تھا' لیکن اس دور میں وائلن یا سارنگی کی طرز کا کوئی ساز ایجاد ہی نہیں ہوا تھا' اس کے علاوہ جب روم میں پہلی بار آگ بھڑکی تو اس دور کے مشہور رومن مورخ تاچوز کے مطابق نیرو شہر سے تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اصل میں نیرو کے بارے میں تمام تر تاریخی روایات دراصل مسیحی مورخین نے بیان کی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ نیرو نے مسیحیوں کے ساتھ کافی سختی سے کام لیا تھا' چنانچہ عین ممکن ہے کہ مسیحی مورخین نے اس کی سفاکی کو ظاہر کرنے کے لیے یہ روایت گھڑی ہو۔

جنوری 2017ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "نمل" نمرہ احمد کے ناول کی آخری قسط،
- "عشق آمد من" سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- "حسن الماب اور۔۔" سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- "دشت جنوں" آمنہ ریاض کا ناول،
- "راہ جنوں میں" میمونہ صدف کا ناولٹ،
- شازیہ الطاف ہاشمی، عطیہ خالد، خوشنود حنیف، نفیسہ سعید اور ناظمہ زیدی کے افسانے،
- "سراپا حقیقت، مجسم فسانہ" قارئین سے سروے،
- ڈرامانگار "عدیل رزاق" سے ملاقات،
- خواب ناک کی میزان "عائشہ جہاں زیب" سے باتیں،
- "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ" مصنفین سے سروے،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری 2017 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ہرا مسالا تکہ رانس

ضروری اشیاء :

مرغی کا گوشت	ایک کلو (بڑے پیس)
ہری مرچیں	دس سے بارہ عدد (پیس لیں)
ہرا دھنیا	آدھا گٹھی (باریک پسا ہوا)
شملہ مرچیں	دو عدد (باریک پیس لیں)
سرکہ	ایک چوتھائی کپ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

گوشت کو دھو کر خشک کر لیں۔ ایک بڑے پیالے میں پسی ہوئی ہری مرچیں، ہرا دھنیا پسی شملہ مرچیں، سفید سرکہ، کٹی لال مرچ اور نمک کو گوشت پر لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

فرائنگ پین میں تیل ڈال کر اور مسالا لگا گوشت اور بچا ہوا مسالا ڈال کر پکائیں۔ تھوڑی دیر بعد مرغی کو پلیٹ دیں جب مرغی گل جائے تو سرونگ ڈش میں نکال کر بگھارے چاول کے ساتھ پیش کریں۔

شاہی بادامی کوفتے

ضروری اشیاء :

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
ہرا دھنیا	آدھا گٹھی
ہری مرچیں	چھ سے سات عدد
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
خشخاش	ایک کھانے کا چمچہ
سفید بھنے چنے	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	ایک چوتھائی چمچہ

گریوی کے اجزاء:

پیاز	دو عدد
دہی	آدھا کپ
بادام (بھگو کر پیسٹ بنا لیں)	آٹھ سے دس عدد
خشخاش	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چمچہ
بادام	بیس گرام
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چوپر میں قیمہ، پیاز، ادرک، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، گرم مسالا پاؤڈر، خشخاش، سفید بھنے چنے اور نمک ڈال کر باریک پیس لیں اور کوفتے بنا کر رکھ دیں۔ سوس پین میں تیل گرم کر کے پیاز براؤن کر کے نکال لیں اور گرائنڈر میں پیس کر پیسٹ بنا لیں۔ تیل میں دہی، بادام کا پیسٹ، خشخاش کا پیسٹ، ادرک لہسن پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور نمک ڈال کر بھون لیں۔ گرم پانی میں بادام کو بھگو کر چھلکا اتار لیں اور دو ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ تیل اوپر آ جائے تو گریوی کا پانی ڈال کر کوفتے ڈال دیں پندرہ منٹ دم پر رکھ کر کپڑے سے پکڑ کر ہلا لیں، اوپر سے گرم مسالا پاؤڈر اور بادام ڈال کر دو منٹ تک پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

لیمن وائٹ پسندے

گوشت (انڈر کٹ) (پارچے بنوالیں)	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ

سفید مرچ پاؤڈر | آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچوں کا پیسٹ | ایک چائے کا چمچہ
لیموں | ایک عدد
بادام پاؤڈر | ایک کھانے کا چمچہ
ناریل پاؤڈر | ایک کھانے کا چمچہ
پیاز (باریک چوپ کرلیں) | ایک عدد
مکھن | آدھا کپ
نمک | حسب ذائقہ
کریم | ایک چوتھائی کپ

ترکیب:
گوشت دھو کر خشک کرلیں اور کسی بھاری چیز سے اس کو کچل لیں۔
گوشت پر لہسن ادرک، سفید مرچ پاؤڈر، ہری مرچوں کا پیسٹ، لیموں کا رس اور نمک لگا کر دو سے تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک برتن میں مکھن گرم کرکے اس میں پیاز ڈال کر ہلکی گلابی۔۔۔ کرلیں۔ اس کے بعد اس میں مسالا لگے پسندے شامل کردیں اور پانی ڈال کر ڈھک کر گلانے رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو بادام پاؤڈر، ناریل پاؤڈر اور کریم ڈال کر بھون لیں اور شملہ مرچ سے سجا کر ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

بیف حلیم

ضروری اشیاء:
گوشت | دو کلو
لونگ | پندرہ عدد
ثابت سیاہ مرچیں | پندرہ عدد
دار چینی | دو ٹکڑے
نمک | حسب ذائقہ
تیزپات | دو عدد
لہسن کے جوئے | دس سے بارہ عدد
ادرک | ایک درمیانہ ٹکڑا
قورمہ مسالا | دو کھانے کے چمچے
دہی | آدھا کپ
تیل | حسب ضرورت
جو | ایک کپ (بھگودیں)
گیہوں | دو کپ (بھگودیں)
دال چنا | ایک کپ (بھگودیں)
مکس دالیں اور چاول | ایک کپ (بھگودیں)
پیاز | تین سے چار عدد
جائفل، جاوتری پاؤڈر | آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر | آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر | حسب ضرورت
پودینا، ہرا دھنیا، تلی ہوئی پیاز، لیموں، ہری مرچیں اور ادرک | سجاوٹ کے لیے

جو، گیہوں اور دال چنا کو حلیم پکانے سے چار سے پانچ گھنٹے پہلے بھگولیں۔ ایک پتیلی میں گوشت، لونگ، ثابت سیاہ مرچیں، دار چینی، نمک، تیزپات، ثابت لہسن کے جوئے، ادرک، دہی اور جائفل، جاوتری پاؤڈر ڈال کر گوشت گلنے کے حساب سے پانی ڈالیں اور ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ دال چنا، چاول اور مکس دالوں کو نمک اور آدھا چائے کا چمچہ ہلدی پاؤڈر ڈال کر خوب اچھی طرح گل جانے تک پکائیں۔ جو اور گیہوں کو بھی اچھی طرح گل جانے تک پکالیں۔
گوشت میں شامل ثابت مسالوں کو پہلے پیس لیں۔ (جو کہ گوشت کے ساتھ ابلنے کے بعد نرم ہو چکے ہوں گے۔) اس کے بعد گلے ہوئے گوشت کو بھی چاپر میں پیس لیں، ایک بھاری پیندے کی پتیلی میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز ڈال کر تل لیں، سنہرا ہونے پر اس میں گوشت، قورمہ مسالا، ایک چوتھائی چائے کا چمچہ ہلدی پاؤڈر اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر دو سے تین منٹ تک فرائی کریں، اس کے بعد اس میں اُبلے ہوئے جَو، گیہوں، چاول، مکس دالیں اور چنے کی دال شامل کرکے آدھا سے ایک گھنٹے تک درمیانی آنچ پر خوب اچھی طرح گھوٹا دیتے ہوئے پکائیں، مزے دار اور اسپیشل بیف حلیم تیار ہے، ڈش میں نکال کر تلی ہوئی پیاز، پودینہ، ہرا دھنیا، ہری مرچوں، لیموں اور ادرک کے ساتھ پیش کریں۔

موسم سرما خشک جلد سے نجات حاصل کیجیے

موسم سرما ہمارے جسم سے نمی اور لچک چرالے جاتا ہے زیتون کا تیل ' دودھ اور ناریل ہمیں سردیوں کے ان اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔
سردیوں میں جلد خشک ہوجاتی ہے۔ ہمیں اپنی جلد کو لچک دار ' نرم و ملائم بنانے کی اشیاء کچن ہی سے مل سکتی ہیں۔ استعمال کرکے سردیوں میں بھی آپ نرم و ملائم جلد کی مالک بن سکتی ہیں۔

زیتون کا تیل

جلد کی خشکی دور کرنے کے لیے زیتون کا تیل نہایت موثر ذریعہ ہے۔
غسل سے آدھا گھنٹا پہلے زیتون کا تیل ہاتھوں ' ٹانگوں اور دیگر ایسے حصوں پر مل لیں جہاں خشکی کا خاصا اثر ہو ' ہلکا مساج کریں پھر نہالیں۔

دودھ

اگر آپ کی خشک جلد آپ کو بہت زیادہ پریشان کررہی ہو تو ریفریجریٹر سے تھوڑا سا دودھ لے کر اسے کھلے منہ کے پیالے میں ڈال دیں۔
اس ٹھنڈے دودھ میں ایک صاف کپڑا ڈال کر نچوڑیں اور خشک جلد پر پانچ منٹ تک ملیں۔ دودھ میں شامل غیر سوزشی اجزا اس کھنچاؤ کو دور کرکے خشک جلد کو پرسکون کردیں گے۔

ناریل کا تیل

سردیوں میں خشکی سے ایڑیاں ' ہاتھ اور کہنیاں سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ انہیں رات سونے سے قبل ناریل کے تیل سے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ نیم گرم پانی سے غسل کے بعد ناریل کا تیل لگالیا جائے تو جلد سے خشکی ختم ہوجاتی ہے۔
"سائنس بھی یہ کہتی ہے کہ جو جلد کو نرم و لچک دار بنانے ' صفائی کرنے کے لیے بہترین اینٹی آکسیڈنٹ ہے خاص طور پر سردیوں میں اس کا استعمال بہت مفید رہتا ہے۔
ایک کپ خشک جو لے لیں اور باریک آٹا بنالیں غسل کے ٹب میں پانی ڈال کر اس آٹے کو اس میں ملالیں۔
ہاتھ سے پانی کو چند سیکنڈ ہلائیں پھر اس ٹب میں پندرہ سے بیس منٹ کے لیے بیٹھ جائیں۔ باہر نکل کر خود کو ہلکا سا خشک کرلیں۔

ایلوویرا

خشک جلد کا سب سے بہترین علاج کنوار گندل ' گھیکوار یا ایلوویرا میں چھپا ہوا ہے۔
ایک ٹکڑا گھیکوار لے کر اس میں سے جیل نکال لیں اور خشک جلد پر ملیں۔ اس سے جلد نرم ہوگی اور جلد پر ایک ایسی تہ جم جائے گی جو مساموں میں خشکی کو داخل ہونے سے روکے گی ' جلد کسی ہوئی محسوس ہوگی بعد ازاں آپ موئسچرائزر بھی لگاسکتی ہیں۔
نہانے کے فوراً" بعد جسم چہرے پر موئسچرائزر ضرور لگائیے۔
پانی پئیں اور جلد کو اندر باہر سے نکھار دیں۔